300 سے زائد کتب سے استفادہ شدہ کتاب جسکی تکمیل
روضہ الرسول صلی اللہ علیہ وسلم کے سائے میں بیٹھ کر کی گئی

خصوصیاتِ مصطفی صلی اللہ علیہ وسلم

تالیف

مولانا محمد ہارون معاویہ

فاضل جامعۃ العلوم الاسلامیہ بنوری ٹاؤن کراچی
خطیب جامع مسجد سرور کونین
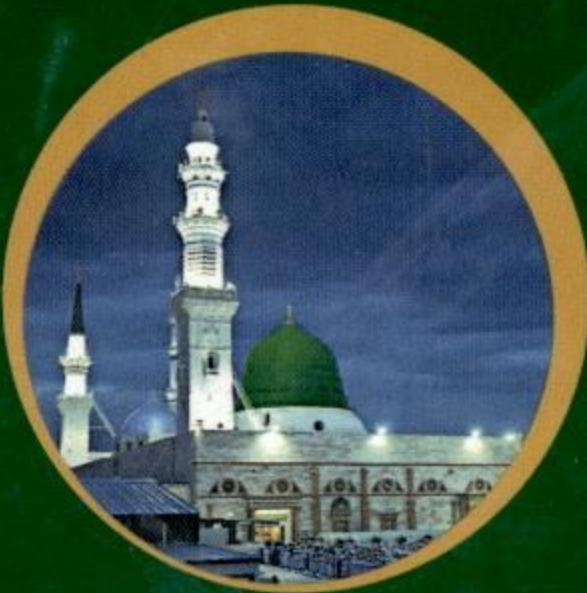
پسند فرمودہ

مولانا عزیز الرحمٰن صاحب مدظلہ

استاذ الحدیث جامعہ دار العلوم کراچی

تقاریظ

مولانا محمد انور بدخشانی صاحب مدظلہ

استاذ الحدیث جامعہ اسلامیہ بنوری ٹاؤن کراچی

مولانا مفتی عبد المجید دینپوری مدظلہ

نائب رئیس دار الافتاء جامعہ علوم اسلامیہ بنوری ٹاؤن کراچی

دار الاشاعت

اُردو بازار ○ ایم اے جناح روڈ ○ کراچی پاکستان فون: 2631861

خصوصیاتِ مصطفیٰ ﷺ

خصوصیاتِ مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم

مجمع فضل وکمال، سیدالانبیاء، مقصود الخلائق، سید الکونین، اشرف الرسل، شفیع الامم، رحمۃ اللعالمین خاتم النبیین کی سیرت کے عظیم گوشے سے چیدہ چیدہ سو امتیازی خصوصیات وکمالات پر جدید اسلوب میں جامع، مفصل و قابل قدر ذخیرہ

جلد سوئم

تالیف

مولانا محمد ھارون معاویہ

فاضل جامعہ علوم اسلامیہ بنوری ٹاؤن کراچی

واستاد مدرسہ عربیہ قاسم العلوم میر پور خاص

دارالاشاعت

اردو بازار، ایم اے جناح روڈ

کراچی پاکستان 2213768

باہتمام : خلیل اشرف عثمانی
طباعت : فروری ۲۰۰۷ء علمی گرافکس
ضخامت : 534 صفحات

قارئین سے گزارش

اپنی حتی الوسع کوشش کی جاتی ہے کہ پروف ریڈنگ معیاری ہو۔ الحمدللہ اس بات کی نگرانی کے لئے ادارہ میں مستقل ایک عالم موجود رہتے ہیں۔ پھر بھی کوئی غلطی نظر آئے تو از راہ کرم مطلع فرما کر ممنون فرمائیں تاکہ آئندہ اشاعت میں درست ہو سکے۔ جزاک اللہ

﴿........ ملنے کے پتے ....﴾

ادارۃ المعارف جامعہ دارالعلوم کراچی
بیت القرآن اردو بازار کراچی
بیت القلم مقابل اشرف المدارس گلشن اقبال بلاک ۲ کراچی
بیت الکتب بالمقابل اشرف المدارس گلشن اقبال کراچی
مکتبہ اسلامیہ امین پور بازار۔ فیصل آباد
مکتبۃ المعارف محلہ جنگی۔ پشاور

ادارہ اسلامیات ۱۹۰۔ انارکلی لاہور
بیت العلوم 20 نابھہ روڈ لاہور
مکتبہ سید احمد شہیدؒ اردو بازار لاہور
یونیورسٹی بک ایجنسی خیبر بازار پشاور
مکتبہ اسلامیہ گامی اڈا۔ ایبٹ آباد
کتب خانہ رشیدیہ۔ مدینہ مارکیٹ راجہ بازار راولپنڈی

﴿انگلینڈ میں ملنے کے پتے﴾

AZHAR ACADEMY LTD.
54-68 LITTLE ILFORD LANE
MANOR PARK, LONDON E12 5QA

ISLAMIC BOOKS CENTRE
119-121, HALLI WELL ROAD
BOLTON BL 3NE, U.K.

﴿امریکہ میں ملنے کے پتے﴾

MADRASAH ISLAMIAH BOOK STORE
6665 BINTLIFF, HOUSTON,
TX-77074, U.S.A.

DARUL-ULOOM AL-MADANIA
182 SOBIESKI STREET,
BUFFALO, NY 14212, U.S.A

اجمالی فہرست

تفصیلی فہرست

انتساب

حضور سرورِ کائنات، فخرِ مجسّم، شافعِ محشر، ساقیِ کوثر حضرت محمد عربی مصطفیٰ ﷺ کے نام، جو باعثِ تخلیقِ کائنات بن کر دنیا میں تشریف لائے اور اپنی ضوفشانیوں سے دنیا کے گھٹا ٹوپ اندھیروں کو اجالوں سے روشن کر گئے۔

رخِ مصطفیٰ کو دیکھا تو دیوں نے جلنا سیکھا
یہ کرم ہے مصطفیٰ کا کہ شبِ غم نے ڈھلنا سیکھا
یہ زمیں رکی ہوئی تھی یہ فلک تھما ہوا تھا
چلے جب مرے محمد ﷺ تو دنیا نے چلنا سیکھا

محمد ہارون معاویہ

عرضِ مؤلف

اللہ تعالیٰ نے اپنے حبیب وخلیل حضرت محمد ﷺ کے بے شمار فضائل ومناقب بیان فرمائے ہیں اور انہیں زینت رحمت سے مزین فرمایا ہے گویا کہ آپ ﷺ سراسر رحمت ہیں، آپ ﷺ کی جملہ صفات وفضائل تمام مخلوقات کے لئے باعث رحمت ہیں، آپ ﷺ کی زندگی عین رحمت اور آپ ﷺ کا رفیق اعلیٰ سے ملنا عین رحمت ہے، الغرض آپ ﷺ جن وانس کے لئے رحمت ہی رحمت ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کا شہرہ بلند فرمایا، ارشاد باری تعالیٰ ہے: ورفعنا لک ذکرک ''اور ہم نے تمہاری خاطر تمہارے ذکر کا آوازہ بلند کردیا۔''

اللہ کی قسم! بالکل ایسا ہی ہوا، دنیا وآخرت میں اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کا خوب چرچا فرمایا، دنیا میں کوئی خطیب، واعظ اور نمازی ایسا نہیں ہے جو اللہ کے نام کے بعد آپ ﷺ کا نام نہ لیتا ہو اور اشھد ان لاالہ الااللہ کے ساتھ اشھد ان محمدا الرسول اللہ نہ کہتا ہو، اللہ تعالیٰ نے اپنے اسماء حسنیٰ میں سے دو مبارک نام رؤف اور رحیم اپنے حبیب حضرت محمد ﷺ کو عطا فرمائے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے: لقد جاء کم رسول من انفسکم عزیز علیہ ما عنتم حریص علیکم بالمومنین رئوف رحیم ''دیکھو! تم لوگوں کے پاس ایسا رسول آیا ہے، جو خود تم ہی میں سے ہے، تمہارا نقصان میں پڑنا اس پر شاق ہے، تمہاری فلاح کا وہ حریص ہے، ایمان لانے والوں کے لئے وہ شفیق اور رحیم ہے۔''

اللہ تعالیٰ نے اپنے حبیب حضرت محمد ﷺ کو ایسی دل ربا شکل وصورت سے نوازا جو رعنائی وزیبائی میں بے مثل اور انتہائی حسین وجمیل ہے اور اس سے پہلے یا بعد میں کوئی بھی اس حسن وجمال میں آپ ﷺ کا شریک وسہیم نہیں۔ چنانچہ خوبصورتی کی جملہ صفات میں سے وافر حصہ آپ ﷺ کو عطا کیا گیا اور دل ربائی کی جملہ اداؤں میں آپ ﷺ کو شریک کیا گیا حتیٰ کہ مختلف قسموں کا ذوق جمالیات رکھنے والے اگر آپ ﷺ کے رخ انور کو دیکھیں تو آپ ﷺ کی ہر ادا اور ہر پہلو میں اپنے لئے سامان طمانیت پائیں اور کوئی بھی زاویہ ان کے ذوق پر گرانی کا باعث نہ ہو۔

بیشک اللہ تعالیٰ نے آدمؑ سے لے کر حضرت عیسیٰؑ تک بے شمار انبیاءؑ بھیجے، ان میں اکثر انبیاءؑ وہ ہیں جن کے حالات تو کیا ہمیں ان کے نام بھی معلوم نہیں ہیں، قرآن کریم میں صرف پچیس انبیاء کرامؑ کے نام آئے ہیں۔

ان انبیاء کے نام اور حالات معلوم نہ ہونے کے باوجود ہم مسلمان ان تمام انبیاءؑ کا احترام کرتے ہیں کہ وہ اللہ کے منتخب بندے تھے، وہ اپنے وقت کے سب سے بہتر، سب سے افضل اور سب سے اعلیٰ انسان تھے۔ ان پر آسمان سے وحی نازل ہوتی تھی، ان میں سے کسی کو کتاب اور کسی کو صحیفہ عطا کیا گیا، انہیں مختلف معجزات عطا کئے گئے۔ انہیں عزت وعظمت سے سرفراز کیا گیا۔ ہم ان سب باتوں کا اقرار کرتے ہیں لیکن اس کے ساتھ یہ بھی ایک ناقابل انکار حقیقت ہے کہ بعض ایسی چیزیں بھی تھیں جو صرف ہمارے آقا ﷺ کے ساتھ خاص تھیں۔

چنانچہ انبیاء ورسلؑ کی اس مقدس جماعت میں جناب محمد مصطفیٰ احمد مجتبیٰ ﷺ کو سینکڑوں امتیازی خصوصیات حاصل ہیں۔ امام جلال الدین سیوطیؒ نے ''خصائص کبریٰ'' میں اڑھائی سو کے قریب حضور ﷺ کے خصائص جمع کئے ہیں ان سب کی تفصیل بیان کرنے کے لئے ایک ضخیم دفتر درکار ہے۔ اسی طرح دیگر اور بھی کتابیں اس عظیم موضوع پر لکھی گئیں لیکن عربی زبان میں۔

حضور سرورِ کائنات ﷺ کی سیرت کے اس عظیم گوشے کے بارے میں چونکہ اب تک اردو زبان میں ہماری معلومات کے مطابق مستقل کوئی کتاب ترتیب نہیں دی گئی تھی، اس لئے عرصے سے اس ضرورت کو محسوس کیا جارہا تھا، چنانچہ بندے کے ایک قریبی دوست مولانا محمد عمران سردار صاحب نے اس موضوع کی طرف توجہ دلائی کہ اس عظیم الشان موضوع پر کچھ کام ہوجائے تو ایک سعادت کی بات ہوگی، محترم موصوف کا مشورہ دل کو لگا، لہٰذا اسی وقت بندے نے اللہ رب العٰلمین کی ذات پر بھروسہ کرتے ہوئے اس عظیم سعادت کے حاصل کرنے کا عزمِ مصمم کرلیا اور اپنی طاقت کی بقدر سیرت کے عنوان پر لکھی جانے والی چھوٹی بڑی تقریباً ساری کتب کو خریدا، اور شب وروز کی محنت کے بعد اللہ تعالیٰ کے فضل سے اس قدر مواد جمع ہوگیا کہ جو چار جلدوں کی ضخامت تک پہنچ گیا، اور بحمد اللہ اس طرح سیرت النبی ﷺ کا یہ عظیم باب چار ضخیم جلدوں میں آپ تک پہنچانے کی سعادت حاصل ہوئی، جس میں حضور ﷺ کی چیدہ چیدہ سو

خصوصیات کو مرتب کیا گیا یعنی ہر جلد میں پچیس خصوصیات شامل کی گئیں۔

یہ عظیم کتاب اب سے کئی مہینوں قبل آپ کے ہاتھوں تک پہنچ جاتی لیکن تاخیر ہونے کی وجہ یہ ہوئی کہ دل میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک جذبہ پیدا ہوا کہ کیوں نہ ایسا ہو جائے کہ اس مقدس کتاب کا کچھ کام صاحبِ خصوصیت حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کے مقدس شہر مدینۃ المنورہ میں روضہ رسول ﷺ کے سامنے بیٹھ کر کیا جائے، چنانچہ اللہ رب العٰلمین نے فضل فرمایا اور رمضان المبارک میں عمرے کی سعادت حاصل ہوئی، تو چونکہ اس وقت تک یہ چاروں جلدوں کی کمپوزنگ ہو چکی تھی، لہٰذا بندے نے سفر میں چاروں جلدوں کا ایک پروف اپنے ساتھ رکھ لیا، اور مسلسل تقریباً ۱۲ دن تک شب و روز روضۂ رسول کے سائے میں بیٹھ کر کتاب کو آخری ترتیب دی، یعنی کچھ کانٹ چھانٹ ہوئی، کچھ مزید اضافے ہوئے، کہیں کہیں کچھ وضاحت یا تمہیدات کی ضرورت محسوس ہوئی تو اسے پورا کیا گیا، اور مزید اس مقدس جگہ کی روحانیت کے نتیجے میں جو کچھ اللہ تعالیٰ نے ذہن میں ڈالا اسے بھی ترتیب دیا، الغرض اس کتاب کی آخری مکمل ترتیب اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے روضۂ رسول ﷺ کے سائے میں بیٹھ کر مرتّب کی، لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس میں میرا کوئی کمال نہیں یہ صرف اور صرف اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم ہی سے ہوا، ورنہ "من آنم کہ من دانم"، بہرحال اس سعادت کے ملنے پر میں اپنے اللہ وحدہٗ لاشریک کا کروڑوں بار شکر ادا کروں تو بھی کم ہے۔

اور اس بات کی وضاحت کرنا بھی ضروری ہے کہ اس کتاب کو مرتب کرنے میں بھی میرا کوئی کمال نہیں ہے کیونکہ یہ نہ تو میری تصنیف ہے اور نہ ہی تحقیق، لاشک یہ سب کچھ اکابرین کی کتب سے استفادے کے بعد ترتیب دیا گیا مواد ہے، اور اس بات کا میں کھلے دل سے اقرار کرتا ہوں، تاکہ کسی محترم کے دل میں کسی غلط فہمی کی وجہ سے بدگمانی پیدا نہ ہو، ہاں البتہ اس عاجز نے شب و روز محنت کر کے 300 سے زائد کتابوں کے ہزاروں صفحات کو بار بار کھنگالا اور مختلف کتابوں میں بکھری خصوصیات کو یکجا کیا، مشکل الفاظ کو جدید اسلوب میں ڈھالنے کی کوشش کی، جدید دور کے نئے تقاضوں کو مدنظر رکھتے ہوئے نئی ذہنیت کے حامل مسلمانوں کے لئے زیادہ سے زیادہ آسان بنانے کی کوشش کی، اس کام کے لئے مجھے کس قدر باریک بینی اور شب و روز کی

محنت سے کام لینا پڑا، میرا علیم وخبیر خدائے وحدہٗ لاشریک اس سے بخوبی آگاہ ہے، اور بے شک میری نظر بھی اسی ذات پر ہے، اور اسی ذات سے اچھے بدلے کی امید ہے، کوئی قابلِ احترام دوست مجھ گنہگار کے بارے میں کچھ بھی کہے مجھے اس کی قطعاً کوئی پرواہ نہیں ہے، پرواہ یا فکر تو تب ہو کہ دنیا والوں سے بدلے کی امید وابستہ ہو، بس میرا اللہ مجھ سے راضی ہو جائے اس کے بعد اور کچھ نہیں چاہیئے۔

اور اسی طرح اس بات کی وضاحت کرنا بھی ضروری سمجھتا ہوں جیسا کہ چاروں جلدوں میں بھی جابجا یہ وضاحت کی گئی ہے کہ خصوصیاتِ مصطفیٰ ﷺ کو لکھنے کا مقصد نعوذ باللہ دیگر انبیاء کرامؑ کی تنقیص نہیں ہے اور نہ ان کے مقام ومرتبے کو کم کرنا مقصد ہے بلکہ نیت صرف یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے آخری نبی ﷺ کو جو مقام ملا ہے امت کے سامنے اسے اجاگر کیا جائے اور امت کو تعلیماتِ نبوی ﷺ کی طرف آنے کی دعوت دی جائے بے شک جب امت اپنے نبی ﷺ کے مقام ومرتبے کو سمجھے گی تو ان کے دل میں اپنے نبی ﷺ کی محبت پیدا ہوگی اور اپنے نبی ﷺ کی سنتوں پر چلنا آسان ہوگا کیونکہ امت کے ہر فرد کی فلاح وکامرانی اب صرف اور صرف محمد مصطفیٰ ﷺ کے دامن سے وابستہ ہے، لہٰذا ذہن میں رہے کہ اگر خدانخواستہ کسی کے دل میں دیگر انبیاء کرامؑ سے متعلق ادنیٰ سا بھی منفی خیال آیا تو اس کا ایمان اس کے پاس باقی نہیں رہے گا، اور یہ بات کوئی اپنی طرف سے نہیں کہی جارہی بلکہ خود خاتم النبیین محمد مصطفیٰ ﷺ کی تعلیمات میں اس کی تلقین کی گئی ہے، جیسا کہ مختلف مقامات پر تفصیل آپ ملاحظہ فرماتے رہیں گے انشاء اللہ۔

بہر حال محترم قارئین! بندۂ عاجز کی یہ کاوش آپ کے ہاتھوں میں ہے، اگر کچھ اچھا لگے تو اس گنہگار کی آخرت کی کامیابی کے لئے دعائے خیر کے دو بول ادا کردیجئے گا، اور اگر کچھ خامی یا کمزوری نظر آئے تو برائے مہربانی ایک کمزور اور ناقص سا مسلمان سمجھتے ہوئے معاف کردیجئے گا اور اگر رہنمائی ہوجائے تو ایک بہت بڑا احسان ہوگا، آپ کے مشوروں کا دلی خیر مقدم ہے کیونکہ بندہ رہنمائی اور مشوروں کا طالب اور پیاسا ہے اور ہمیشہ رہے گا۔

اور اب ضروری ہے کہ اپنے ان تمام مہربانوں کا شکریہ ادا کروں کہ جن حضرات نے مجھے مشورے دیئے، میری رہنمائی اور حوصلہ افزائی فرمائی، جن میں سرِ دست میرے استاذِ محترم میری

مادرِ علمی جامعۃ العلوم الاسلامیہ علامہ محمد یوسف بنوری ٹاؤن کراچی کے قدیم استاذ الحدیث حضرت مولانا محمد انور بدخشانی صاحب مدظلہ ہیں کہ استاذ محترم نے اس کتاب کے لئے گراں قدر تقریظ تحریر فرما کر مجھ عاجز کے سر پر دست شفقت رکھا۔

اسی طرح شکریہ ادا کرتا ہوں استاذ محترم جامعۃ العلوم الاسلامیہ علامہ محمد یوسف بنوری ٹاؤن کراچی کے استاذ الحدیث حضرت مولانا مفتی عبد المجید دین پوری صاحب مدظلہ العالی کا کہ حضرت استاذ محترم نے باوجود شدید مصروفیات کے بندے پر شفقت فرماتے ہوئے تقریظ تحریر فرمائی۔

اور میرے مشفق استاذ کہ جن کی شفقت کے سائے تلے میں نے جامعۃ العلوم الاسلامیہ علامہ محمد یوسف بنوری ٹاؤن کراچی میں آٹھ سال کے شب وروز گزارے، استاذ الحدیث اور ناظم تعلیمات جامعۃ العلوم الاسلامیہ علامہ محمد یوسف بنوری ٹاؤن کراچی حضرت استاذ العلماء مولانا عطاء الرحمٰن صاحب مدظلہ کا بھی شکر گزار ہوں کہ حضرت استاذ صاحب نے بھی اس کتاب کے حوالے سے میری حوصلہ افزائی فرمائی اور قیمتی مشورے دیئے۔

اور اسی طرح استاذ الحدیث دار العلوم کورنگی کراچی حضرت استاذ العلماء مولانا عزیز الرحمٰن صاحب مدظلہ کا بھی شکریہ ادا کرنا ضروری ہے، کہ حضرت مدظلہ نے میرے اس کام کو خوب پسند فرمایا، میری حوصلہ افزائی فرمائی اور بہت سے اچھے اچھے مشورے بھی دیئے، اور اسی طرح میں خصوصی طور پر شکریہ ادا کرنا ضروری سمجھتا ہوں جامعۃ العلوم الاسلامیہ علامہ محمد یوسف بنوری ٹاؤن کراچی کے استاذ حضرت مولانا مفتی رفیق احمد صاحب بالاکوٹی مدظلہ کا کہ جنھوں نے میری گزارش پر ایک جامع اور مانع تقریظ تحریر فرمائی اور بہت سی باتوں کی بڑے اچھے انداز میں وضاحت فرمائی، اور بہت سے قیمتی مشورے بھی دیئے۔

اسی طرح شکریہ ادا کرنا ضروری ہے برادرِ کبیر جامعۃ العلوم الاسلامیہ علامہ محمد یوسف بنوری ٹاؤن کراچی کے فاضل، مشہور خطیب اور ایک رسالے کے مدیر حضرت مولانا حافظ محمد اصغر کرنالوی صاحب کا کہ جنھوں نے میری کتاب کے لئے تقریظ بھی تحریر فرمائی اور کتاب شروع کرنے سے لے کر آخر تک وقتاً فوقتاً ان کے مشورے بھی میرے شامل حال رہے، علاوہ ازیں

مفتی صغیر احمد صاحب، مفتی عمر انور بدخشانی صاحب، مفتی وقاص احمد صاحب، مولانا محمد سفیان بلند صاحب مولانا رشید احمد صاحب، حضرت مولانا عبداللہ صاحب شیخ الحدیث "مدرسہ عربیہ قاسم العلوم میر پور خاص مکتبہ یوسفیہ کے مالک برادر کبیر جناب حضرت مولانا محمد یوسف کھوکھر صاحب استاذ الحدیث مدرسہ عربیہ قاسم العلوم اور مولانا محمد عمران سردار صاحب، استاذ مدرسہ عربیہ قاسم العلوم، ان حضرات کا بھی شکریہ ادا کرتا ہوں، بے شک ان حضرات کا مجھ پر احسان ہے کہ مختلف موقعوں پر ان سے بھی مجھے مفید مشورے ملتے رہے اور ان کا تعاون میرے شامل حال رہا میری دل سے دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ میرے اساتذہ اور تمام پرُخلوص معاونین کو دونوں جہانوں کی خوشیاں نصیب فرمائے، آمین۔

ان کے علاوہ بھی میں دیگران تمام احباب کا شکریہ ادا کرتا ہوں، کہ جنہوں نے اس کتاب کی ترتیب سے لے کر کمپوزنگ اور کتاب کی اشاعت تک میرے ساتھ کسی بھی قسم کا تعاون کیا، خصوصاً دارالاشاعت کراچی کے مالک جناب خلیل اشرف عثمانی صاحب کا شکریہ ادا کرتا ہوں کہ جو میری تمام کتابوں کو اہتمام کے ساتھ شائع کر کے میری حوصلہ افزائی فرماتے ہیں، اللہ تعالیٰ ان تمام احباب کو دونوں جہانوں کی شادمانیاں نصیب فرمائے۔ آمین!

اور میں اپنے اللہ وحدہٗ لاشریک کی بارگاہ قدسی میں دست بدعا ہوں کہ وہ ذات پاک اس کتاب کو میری پہلی کتابوں کی طرح مفید اور کارآمد بنادے اور ہم سب کو خلوص نیت کے ساتھ دین کی اشاعت کی توفیق عطا فرمائے آمین۔

اور تمام قارئین سے بھی درخواست ہے کہ وہ مجھے، میرے والدین، اساتذہ کرام کو اپنی خصوصی دعاؤں میں ضرور یاد رکھیں، اور اگر آپ کو اس کتاب میں کوئی خامی اور کمزوری نظر آئے تو ضرور آگاہ فرمائیں آپ کا بہت شکریہ ہوگا۔ آپ کے ہر مشورے کا دلی خیر مقدم ہے اللہ تعالیٰ ہم سب کو اپنی رضا عطا فرمائے۔ آمین!

والسلام آپ کا خیر اندیش محمد ہارون معاویہ

فاضل جامعۃ العلوم الاسلامیہ علامہ محمد یوسف بنوری ٹاؤن کراچی

ساکن میر پور خاص سندھ

تقریظ

از حضرت استاذ العلماء مولانا محمد انور بدخشانی صاحب مدظلہ العالی

استاذ الحدیث جامعۃ العلوم الاسلامیہ علامہ محمد یوسف بنوری ٹاؤن کراچی

سرکار دو عالم ﷺ کی سیرت پر پہلی صدی ہجری سے لے کر گذشتہ چودہ صدیوں میں ہزاروں کتابیں اور لاکھوں مضامین و مقالات لکھے جا چکے ہیں، جن کا احاطہ کرنے کے لیے مستقل کتابیات اور فہرستیں تیار کی گئی ہیں، اگر اس پورے ادبیات سیرت کا اندازہ لگایا جائے تو شاید تاریخ انسانی میں کوئی دوسری شخصیت ایسی نہیں جس پر اس قدر اور ہمہ پہلو مواد تیار ہوا ہو، بلکہ یوں کہا جائے کہ سیرت کا موضوع محققین اور محبین و عاشقین کے لیے ایک مستقل میدان تحقیق و تصنیف بن گیا، خود متعلقات سیرت اس قدر متنوع اور وسیع ہیں کہ ان کا حاطہ کرنے کے لیے الگ کتابی جائزے کی ضرورت ہے، سیرت طیبہ کے ان مراجع و مصادر پر توجہ کریں تو ایک جہانِ سیرت اپنی تمام تر وسعتوں کے ساتھ ہمارے سامنے ہے، سیرت نبوی کے ماخذ پر غور کیا جائے تو درج ذیل سولہ علوم و فنون اس کا سرچشمہ ہیں اور ان میں سے ہر ایک اپنے مقام پر اہم ہے:

۱۔ قرآن مجید ۲۔ کتب تفاسیر ۳۔ کتب تاریخ ۴۔ کتب شمائل نبوی ۵۔ کتب دلائل النبوۃ ۶۔ کتب شروح احادیث ۷۔ کتب احادیث، خطبات، مکاتیب، معاہدات، دستاویزات، ۸۔ کتب آثار و اخبار ۹۔ اطلس و خرائط سیرت ۱۰۔ کتب نعت رسول ۱۱۔ کتب انساب ۱۲۔ کتب جغرافیہ عرب ۱۳۔ کتب تاریخ حرمین ۱۴۔ کتب اسماء رجال ۱۵۔ ادب عربی ۱۶۔ سفرنامہ حرمین

سیرت النبی کے مطالعے کا شوقین جب آگے بڑھ کر دیکھتا ہے تو اس موضوع پر

کتابوں کی کثرت اس کو ورطۂ حیرت میں ڈال دیتی ہے کہ گذشتہ چودہ سو سال سے مسلسل لکھا جارہا ہے مگر ہنوز روز اول کا معاملہ محسوس ہوتا ہے اور یہ بذات خود امتیازات سیرت کا ایک حسین اور حیران کن باب ہے، رحمت عالم کی ذات وسیرت سراپا امتیاز ہے، صحیحین میں حضرت جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی روایت ہے جس میں حضور ﷺ نے از خود پانچ درج ذیل امتیازات گنوائے، چنانچہ آپ ﷺ نے فرمایا: مجھے پانچ ایسے امتیازات دیئے گئے ہیں جو مجھ سے پہلے کسی کو نہیں ملے: (۱) ابھی ایک ماہ کی مسافت باقی ہو کہ دشمن پر میرا رعب طاری ہو جاتا ہے (۲) ساری روئے زمین میرے لئے اور میرے امتی کے لیے مسجد اور پاکیزہ بنادی گئی ہے سو جو جہاں چاہے نماز پڑھ سکتا ہے (۳) غنیمت کا مال میرے لیے حلال کر دیا گیا ہے جو پہلے کسی پر حلال نہیں تھا (۴) مجھے شفاعت کا حق عطا کیا گیا ہے (۵) پہلے انبیاء اپنی اقوام کے لیے خاص ہوا کرتے تھے، مگر میں ساری دنیا کے لیے نبی ہو کر آیا ہوں۔

رسول اللہ کے خصائص وامتیازات پر عربی زبان میں کافی کتابیں ہیں جن میں امام جلال الدین سیوطیؒ کی ''الخصاص الکبریٰ'' اور حافظ ابن قیمؒ کی ''زاد المعاد'' سرفہرست ہیں، اس کے علاوہ ابونعیم اصبہانیؒ کی ''دلائل النبوۃ'' بھی اس موضوع پر مشہور کتابوں میں سے ہے، فارسی زبان کے مشہور شاعر اور صوفی بزرگ عالم مولانا جامیؒ نے فارسی میں ''شواہد نبوت'' کے نام سے ایک مستقل کتاب لکھی جس میں انہوں نے حضور ﷺ کے وہ امتیازی اوصاف جو حضور کی ذات مبارکہ میں پائے جاتے ہیں سات الگ الگ عنوانات کے تحت بیان کئے ہیں، اردو زبان میں حضور ﷺ کی امتیازی خصوصیات وکمالات پر ایک مستقل اور مفصل کتاب کی ضرورت عرصے سے محسوس کی جارہی تھی، اس کمی کو ہمارے جامعہ علوم اسلامیہ علامہ بنوری ٹاؤن کراچی کے ہونہار نوجوان فاضل مولوی محمد ہارون معاویہ نے بخوبی پورا کیا اور انتہائی محنت کے بعد مختلف کتابوں سے مواد منتخب کر کے چار ضخیم جلدوں میں پیش کر دیا ہے، میں اس کتاب کا تفصیلی مطالعہ تو نہ کر سکا لیکن موضوع کی اہمیت کے پیش نظر امید ہے کہ کوئی قابل اعتراض بات اس میں نہ ہوگی، فاضل موصوف زمانہ طالب علمی سے ہی

جامعہ میں تقریری وتحریری سرگرمیوں میں پیش پیش رہے اور اب میر پور خاص میں دینی خدمات انجام دے رہے ہیں، نیز اس سے قبل بھی مختلف موضوعات پر ان کی تقریباً تیرہ کتابیں زیب طبع ہوکر دادِ تحسین حاصل کر چکی ہیں، دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ مؤلف کی اس محنت کو حضور ﷺ کے طفیل قبول فرمائے اور ہم سب کو آنحضرت ﷺ کی سیرت اور سنت پر چلنے والا بنائے، آمین۔

(حضرت استاذ العلماء مولانا) محمد انور بدخشانی (صاحب مدظلہ العالی)

استاذ الحدیث جامعۃ العلوم الاسلامیہ علامہ محمد یوسف بنوری ٹاؤن کراچی

تقریظ

از استاذ العلماء حضرت مولانا مفتی عبدالمجید دین پوری صاحب مدظلہ العالی

نائب رئیس دارالافتاء واستاذ الحدیث جامعۃ العلوم الاسلامیہ علامہ محمد یوسف بنوریؒ ٹاؤن کراچی

سیرت کا موضوع سدابہار گلشن کی طرح ہے جس کا ہر پھول اپنی جگہ اہم ہے۔ یہ گل چین کا ذوق ہے کہ وہ کس پھول کو چنتا ہے۔ لیکن جو پھول چننے سے رہ جائے وہ ہرگز چنے ہوئے پھول سے غیر اہم نہیں۔ سیرت کا موضوع انتہائی متنوّع ہے۔ قدیم وجدید، اپنے پرائے بہت سے محدثین نے اسے موضوع بحث بنایا ہے اور ہر مصنف نے اسے ایک نیا اسلوب دیا ہے۔ ''خصوصیاتِ مصطفیٰ ﷺ'' ایسا موضوع ہے جس پر عربی میں بہت بڑا ذخیرہ موجود ہے، اور اردو میں اگرچہ سیرتِ نبوی ﷺ کا ذخیرہ عربی سے کسی طور پر کم نہیں۔ اور متفرق طور پر یہ موضوع کسی حد تک اس میں پایا جاتا ہے لیکن اسی موضوع پر یکجا طور پر قابلِ قدر ذخیرہ نہیں تھا۔

اللہ تعالیٰ عزیز محترم مولانا ہارون معاویہ زید علمہٗ کو جزائے خیر دے کہ انہوں نے چار ضخیم جلدوں میں تصنیف کر کے اردو کے دامن کو اس موضوع سے مالا مال کر دیا۔ کتاب کی اجمالی فہرست پیش نظر ہے۔ فہرست کے عنوانات سے موضوع پر جامعیّت کا اندازہ ہو جاتا ہے۔ عزیز موصوف نے بندہ ناچیز سے کچھ لکھنے کی فرمائش کی، بندہ لکھنے لکھانے کے فن سے نابلد ہے۔ پھر بھی صاحبِ خصوصیات ﷺ کی محبت کے تقاضے اور اس پر شفاعتِ مصطفوی ﷺ کے حصول کی امید پر چند سطور حوالہ قرطاس کر دی ہیں۔

اللہ تعالیٰ سے دست بدعا ہوں کہ عزیز موصوف کی اس کاوش کو قبول فرما کر ہم سب کے لئے ذخیرہ آخرت بنا دیں، (آمین)

(حضرت استاذ العلماء مولانا مفتی) عبدالمجید دین پوری (صاحب مدظلہ العالی)

نائب رئیس دارالافتاء واستاذ الحدیث جامعۃ العلوم الاسلامیہ علامہ محمد یوسف بنوریؒ ٹاؤن کراچی

تقریظ

از حضرت مولانا مفتی رفیق احمد صاحب بالاکوٹی مدظلہ العالی

استاذ جامعۃ العلوم الاسلامیہ علامہ محمد یوسف بنوری ٹاؤن کراچی

﴿الحمد لله حمدا كثيرا طيبا مباركا فيه مباركا عليه كما يحب ربنا ويرضى والصلوٰة والسلام على حبيبه المصطفى ورسوله المجتبىٰ على اله وصحبه وعترته واهل بيته الاطهار الاتقياء وعلى كل من بهديهم اهتدىٰ. امابعد! فاعوذبالله من الشيطٰن الرجيم ،بسم الله الرحمٰن الرحيم ،ومآارسلنک الارحمة للعٰلمين﴾ ترجمہ: اور ہم نے آپ کو نہیں بھیجا مگر تمام جہانوں کے لئے رحمت بنا کر۔ (انوار البیان، مولانا عاشق الٰہی میرٹھی رحمۃ اللہ علیہ)

حضرات انبیاء کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام مخلوق میں سب سے اعلیٰ وافضل شخصیتوں کے مالک ہوتے ہیں پھر اللہ تعالیٰ نے ان میں بھی فضل وکمال کے مختلف درجات رکھے ہیں بعضوں کو دوسرے بعض پر مختلف حیثیات میں فضیلت سے نوازا، بعض کو اولوالعزمی کا خاص اعزاز بھی عطا فرمایا پھر ان تمام برگزیدہ ہستیوں کے فضائل وکمالات کو ایک ہستی میں یکجا فرمادیا، یہ ہستی مجمع فضل وکمال، سید الانبیاء، مقصود الخلائق، سید الکونین، اشرف الرسل، شفیع الامم، رحمۃ للعٰلمین، خاتم النبیین ﷺ کی ذات اطہر ہے، جو عالمگیر نبوت کے ساتھ مبعوث ہوئے۔

عالمگیر نبوت آپ ﷺ کی منفرد خصوصیات میں سے اولین خصوصیت شمار ہوتی ہے، آنحضرت ﷺ اپنی ذات اور صفات میں بے پناہ خصوصیات کے مالک ہیں جو منضبط

یا منتشر انداز میں تقریباً احادیث وسیرت کی ہر ہر کتاب میں موجود ہیں، تاہم باقاعدہ عنوان کے تحت میری ناقص معلومات کے مطابق اپنے موضوع کی جامع ومستند کتاب، نویں صدی ہجری کے مشہور مفسر ومحدث علامہ جلال الدین السیوطی (۸۴۹ھ-۹۱۱ھ) نے ترتیب دی، جس میں آنحضرت ﷺ کی بڑی بڑی خصوصیات کو تقریباً ایک سو پچاس ابواب کے تحت ذکر فرمایا ہے، اس کتاب میں تتبع واستقراء کے طور پر چیدہ چیدہ وہ تمام خصوصیات ومعجزات تقریباً جمع فرمادیئے گئے ہیں جن میں آپ ﷺ کے ساتھ کوئی اور ہستی شریک نہیں، علامہ سیوطیؒ نے اس کتاب کا نام ''کفایة الطالب اللبیب فی خصائص الحبیب ﷺ '' رکھا، جو بعدازاں ''الخصائص الکبری للسیوطی'' کے نام سے مشہور ومتداول ہوئی، عرب وعجم کے مختلف مطابع متعدد باراس عظیم کتاب کی اشاعت کا شرف حاصل کر چکے ہیں، اور مختلف بلاد میں مقامی زبانوں میں اس کتاب کے ترجمے بھی ہو چکے ہیں۔

اس کتاب اور اس خاص موضوع کی وسیع پیانے پر خدمت یہ بھی آنحضرت ﷺ کی خصوصیت وکرامت ہے، اسی کرامت وخصوصیت کا تسلسل کہیں یا مظہر، یہ زیرِ نظر مجموعہ بھی ہے جو آپ کے ہاتھوں میں ہے، اس مجموعہ میں بھی علامہ سیوطیؒ کی پیروی واقتداء سے باوصف ہوتے ہوئے حضرت مصطفیٰ ﷺ کی ایک سو (۱۰۰) منفرد خصوصیات وامتیازات کو جمع فرمایا گیا ہے۔

یہاں پر روایت پسندی کے تناظر میں ممکن ہے یہ کہا جائے کہ علامہ سیوطیؒ کی خصائص کبری جو اپنے اردو ترجمہ کے ساتھ بھی ہمارے ہاں دستیاب ہے تو اس عظیم کارنامہ پر مزید کسی اضافہ کی ضرورت محسوس ہوتی ہے یا نہیں؟ تو اس حوالہ سے صرف اتنا کہہ دینا بھی کافی ہے کہ قرآن کریم اور سیرت طیبہ یہ دونوں ایسے موضوعات ہیں کہ ان موضوعات کی جس انداز سے جن پہلوؤں سے جتنی بھی خدمت کی جائے، وہ کافی وافی نہیں کہلا سکتی یہ بھی قرآن کریم اور حضور اکرم ﷺ کی خصوصیت میں سے ہے۔

تاہم اتنی بات ضرور ہے کہ حضور ﷺ کے خصائص پر عربی کتب کے اردو تراجم میں

سلاست وروانگی کی تشنگی کا احساس باقی رہتا ہے، اس لئے اس موضوع پر سلیس ورواں انداز میں خدمت کی ضرورت زبان، لہجہ اور تعبیرات میں رونما ہونے والے تغیرات کی وجہ سے محسوس ہوتی رہے گی، موجودہ دور کی اسی ضرورت کے تحت ہمارے جامعہ کے ایک فاضل مولانا محمد ہارون معاویہ حفظہ اللہ تعالیٰ نے اپنی یہ تالیفی کوشش پیش فرمائی ہے۔

مولانا محمد ہارون صاحب بنوری ٹاؤن کے سابق طالب علم جواب فاضل کہلاتے ہیں، طالب علمی کے زمانہ میں جامعہ میں تقریر وبیان کے میدان کے شہسوار ہونے کی حیثیت سے شہرت وتعارف کے حامل رہے اور تقریری مقابلوں ومسابقوں میں سبقت سے ہمکنار ہوتے رہے ہیں، زمانہ طالب علمی ہی سے انہیں تقریر کے ساتھ ساتھ تحریر سے بھی قلبی وعملی لگاؤ ہو چکا تھا فراغت کے بعد تحریری میدان میں بھی موصوف نے نہ صرف یہ کہ اپنی سابقہ نمایاں شناخت باقی رکھی بلکہ موجودہ دور کے کثیر التالیف مصنفین کی صف میں شامل ہو چکے ہیں، موصوف فراغت کے بعد چند ہی سالوں میں ایک درجن سے زائد کتابوں کی جمع وترتیب کا اعزاز حاصل کر چکے ہیں۔

مولانا محمد ہارون معاویہ صاحب کی حالیہ تالیف "خصوصیاتِ مصطفیٰ ﷺ چار ضخیم جلدوں پر مشتمل ہے۔

جس میں آپ ﷺ کی امتیازی خصوصیات اور کمالات سے بحث فرمائی گئی ہے، کتاب کا مکمل مسودہ تو ہمارے سامنے نہیں ہے البتہ مؤلف موصوف نے مسودہ کی فہرست کے کچھ صفحات بطور تعارف کے پیش فرمائے تھے، فہرست کے مطالعہ سے اور خود مؤلف کی زبانی کتاب کا قدرے کفایت جو تعارف ہوا، اس سے کتاب کی افادیت، موضوع سے مناسبت اور امتیازی حیثیت واہمیت کا جو صحیح اندازہ ہوا وہی اس بات کا داعیہ بنا کہ آنحضرت ﷺ کے سیرت طیبہ کے امتیازی پہلو کی اس عظیم خدمت میں ہمارا بھی معمولی حصہ ہو جائے اور حضور ﷺ کی شفاعت نصیب ہو جائے ﴿اللھم ابلغنا بغیتنا ،بمنزلته صلی اللہ علیه وسلم لدیک﴾.

آنحضرت ﷺ کی امتیازی خصوصیات اور کمالات چونکہ اس کتاب کا موضوع ہے، اس لئے ایک اصولی بات کی یاددہانی بھی اس موقع پر نہایت ضروری معلوم ہوتی ہے کہ اہل فضل وکمال میں سے کسی صاحبِ فضل وکمال کی خصوصیت اور امیتازی شان کو بیان کرنے میں اولاً تو ''تقابل'' کا انداز ہی اختیار نہیں کرنا چاہئے، اگر کسی ہستی کے درجہ ورتبہ کو تقابلی مثالوں ہی سے بیان فرمایا جارہا ہو تو پھر الفاظ وتعبیرات کا چناؤ ایسا ہونا ضروری ہے کہ کسی ہستی کی تفضیل وتکریم کسی دوسری ہستی کی تنقیص وتوہین کا مظہر نہ ہو، ورنہ یہ عملِ خیر اپنی اصلیت سے جدا ہو کر مواخذہ اخروی کا ذریعہ بن سکتا ہے۔ اعاذنا الله من ذلک.

ہمارے مؤلف موصوف نے اس اصول پر کاربند ہونے کا بھرپور اطمینان دلایا ہے، اور ہمیں بھی موصوف کی گزشتہ کارکردگی کے تناظر میں احتیاط، ذمہ داری اور تیقّظ کا حسنِ ظن ہے، اس حسنِ ظن کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ اس سے قبل مؤلف موصوف نے اپنی ہر کتاب کے اصل مواد میں اپنی اختراعات اور تعبیرات سے زیادہ اپنی کتابوں کے مراجع وماخذ یعنی اسلاف کی کتابوں کے مواد پر انحصار کیا ہے جو یقیناً اعتماد اور استناد کی ضمانت کی حامل ہیں۔

اسلاف کی کتابوں پر انحصار میں مؤلف موصوف نے جس دیانت داری اور امانت داری کا ثبوت دیا ہے، اس سے مؤلف کی شخصیت اور ان کی تالیفی خدمات کو بھرپور اعتماد کا فائدہ حاصل ہوگا، انشاء اللہ، کیونکہ ہمارے اس دور میں اس نوعیت کے مرتبین ومؤلفین عام طور پر ''سرقہ علمیہ اور علمی خیانت'' جیسے القاب والزامات کے لئے بجا طور پر محل ومورد بنے ہوئے ہیں، جنہوں نے بزرگوں کی باتوں، واقعات اور حکایات بلکہ پورے کے پورے مضامین ومقالات کو اپنی تالیفات کے بھوکے پیٹ بھرنے کے لئے ''من وعن'' نقل کردینے میں بھی کوئی عار محسوس نہیں فرمائی ہاں اتنا ضرور کیا کہ جہاں ان بزرگوں نے اپنایا اپنے بزرگوں کا نام ذکر کیا ہوا تھا وہاں ہمارے بعض جدید مؤلفین نے اپنا اور اپنے کسی بزرگ کا نام ڈال دیا یا پھر ضمائر اور متکلم کے صیغوں پر اکتفاء فرمالیا۔

چوری اور بددیانتی کی اس ناخوشگوار فضا میں اگر کوئی عالم دین، پوری امانت داری، دیانتداری، اور سچائی کے تقاضوں کے ساتھ کوئی تالیفی خدمت منظر عام پر لائے تو یقیناً وہ تحسین وتشجیع کا مستحق ہے، سیرت طیبہ کی خدمت سے ادنی تعلق کے طمع کے بعد یہ دوسرا باعث ہے کہ یہ چند سطریں تحریر ہوئیں۔

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ موصوف کے علم وعمل میں مزید برکت اور ترقی نصیب ہو، ان کی دینی خدمات کو ان کے لئے ان کے اساتذہ کرام اور والدین گرامی کے لئے ذخیرۂ آخرت اور وسیلہ نجات بنائے اور ہم سب کے لئے صراطِ مستقیم پر چلنا آسان فرمائے، اور یہ اللہ تعالیٰ کے لئے کوئی مشکل کام نہیں، بہت آسان ہے ہر عمل کی توفیق وقبولیت اسی کے پاس ہے۔﴿وصلى الله على النبى الكريم وعلى أله وصحبه اجمعين﴾

(حضرت مولانا مفتی) رفیق احمد بالاکوٹی (صاحب مدظلہ العالی)

استاذ جامعۃ العلوم الاسلامیہ علامہ محمد یوسف بنوری ٹاؤن کراچی

تقریظ

محترم مولانا حافظ محمد اصغر کرنالوی صاحب مدظلہ العالی

ناظم اعلیٰ: معہد الارشاد الاسلامی (مہاجر مکی مسجد) صدر کراچی

فاضل: جامعۃ العلوم الاسلامیہ علامہ محمد یوسفؒ بنوری ٹاؤن کراچی

رسالت مآب ﷺ کی سیرت طیبہ اور اسوۂ حسنہ پر زمانہ نبوت سے اہل دانش واہل قلم اور زعماءِ امت مسلسل لکھتے آرہے ہیں، اور صبح قیامت تک لکھتے ہی رہیں گے، چونکہ بعد از خدا آمنہ کے دریتیم ہی کا مقام ہے۔ اسی بنا پر کہا گیا۔ ؎

بعد از خدا بزرگ تو ہی قصہ مختصر

حال ہی میں ایک دانشور کی تحریر مطالعہ سے گزری جس میں موصوف نے سیرت مصطفیٰ ﷺ پر لکھی جانے والی کتب کی تعداد تین ہزار سے زائد بتائی ہے، جس میں پچاس کتابیں فقط نعلین مبارک سے متعلق ہیں، چنانچہ کئی کئی جلدوں پر مشتمل ضخیم کتابیں تاجدار مدینہ راحت قلب وسینہ محمد مصطفیٰ ﷺ کی سیرت واخلاق حسنہ کی عکاسی کر رہی ہیں، آپ ﷺ کی سیرت پر تحریر شدہ کتب کی تعداد اسقدر زیادہ ہونے پر حیرت کی بات نہیں چونکہ آپ ﷺ کی سیرت کا طویل باب ہے جس کا بین ثبوت صدیقہ بنت صدیقؓ اماں عائشہؓ کا فرمان ہے کہ پورا قرآن آپ کا اخلاق ہے۔

خدائے بزرگ وبرتر کے بعد سب سے اونچی ہستی اور اس دنیا کی آخری نسل تک کے لئے ہادی ورہبر سردار انبیاء، خاتم النبیین ﷺ ہیں جس کے روشن چہرے اور بکھری زلفوں کی قسمیں خود خالق ارض وسماء نے مقدس کلام میں اٹھائی ہیں یہ آپ ﷺ کی خصوصیت ہے، نیز فرمایا کہ اے پیغمبر میں تمہیں وہ کچھ دوں گا کہ تو راضی ہوجائے گا، یہ بھی آپ ﷺ کی خصوصیت ہے، نیز قرآن میں ورفعنا لک ذکرک فرما کر آپ ﷺ کا نام ہمیشہ کے لئے بلند وبالا کردیا اور پھر آپ ﷺ کے نام کا چناؤ بھی ایسا ہوا کہ منکر بھی آپ ﷺ کا نام (محمدؐ) لے تو باعتبار معنی خود بخود آپ ﷺ کی تعریف وتوصیف ہوجائے، یہ بھی آپ ﷺ کی خصوصیت ہے، ہاں یہ بھی آپ ﷺ ہی کی خصوصیت ہے کہ ساتوں آسمانوں پر حضرات انبیاءؑ نے آپ کا استقبال کیا، پھر آپ ﷺ کے لئے

عرش کے دروازے کھلے پھر آپ کو حبیب کا لقب ملا اور خود اللہ تعالیٰ نے آپ سے گفتگو فرمائی۔

چنانچہ یہ امر باعثِ مسرت ہے کہ فاضل نوجوان عزیزم مولانا محمد ہارون معاویہ نے عوامی، علمی اور دینی خدمت کے احساس کے تحت ہادی برحق ﷺ کی اہم اہم خصوصیات کو یکجا کرنے کا عزم مصمم کیا اور چار جلدوں میں آپ کی سو خصوصیات کو جمع کر دیا۔

مولانا محمد ہارون معاویہ سلمہ اللہ تعالیٰ وابقاہ بندۂ عاجز کے ماموں زاد بھائی ہیں، ایشیاء کی معروف دینی درسگاہ جامعہ علوم اسلامیہ علامہ بنوری ٹاؤن کراچی سے سند فراغت حاصل کی ہے، زمانہ طالب علمی سے ہی تحریر و تقریر اور کتب اسلاف کا مطالعہ موصوف کا محبوب مشغلہ رہا ہے، دورۂ حدیث والے سال سے با قاعدہ میدان تالیف میں قدم رکھا اور تادم تحریر (۱۳) کتب شائع ہو کر منظر عام پر آچکی ہیں، چنانچہ میدان تالیف و تصنیف کے نشیب و فراز سے بخوبی آگاہی حاصل کرنے کے بعد خصوصیات کے لئے قلم اٹھایا ہے، یہ چار جلدوں پر مشتمل آپ ﷺ کی ۱۰۰ خصوصیات کا گرانقدر، جاذب نظر اور قابل فخر مجموعہ ہے، اس کی عظیم خصوصیت یہ بھی ہے کہ موصوف مؤلف نے صاحب خصوصیات ﷺ کے روضۂ اطہر کے سامنے بیٹھ کر ان گنت صفحات تحریر فرمائے ہیں، جسے قارئین دورانِ مطالعہ محسوس بھی کریں گے اور بہرہ اندوز بھی ہوں گے، بلاشبہ آپ اس کتاب میں ایک ایسی عظیم ہستی (ﷺ) کی ۱۰۰ خصوصیات کو پڑھ سکتے ہیں جس کے عام و خاص حالات بھی بالتفصیل محفوظ ہیں، اور ان پر نازل شدہ الہامی کتاب بھی ہو بہو محفوظ ہے، حقیقت یہ ہے کہ اس نونہال نوجوان نے اتنی کم عمری میں بہت بڑا کام کر دکھایا ہے، یہ محض خالق کائنات ہی کی کرم نوازی ہے۔

راقم الحروف نے چاروں جلدوں پر اک طائرانہ نظر ڈالی ہے اور فہرست کو بغور پڑھا ہے، بحمد اللہ ایک جامع اور منفرد کام کیا ہے، بارگاہ صمدیت میں دست بدعا ہوں کہ رب ذوالجلال موصوف کی شب و روز کی اس کاوش کو شرف قبولیت بخشے، اور علم و عمل، صحت و عمر میں برکت نصیب فرمائے، اور خود ان کے لئے اور ہمارے پورے خاندان کے لئے ذریعہ نجات بنائے، اور اہل علم و عامۃ الناس کو اس سے مستفیض فرمائے۔ آمین یارب العٰلمین۔

(مولانا حافظ) محمد اصغر کرنالوی (صاحب مدظلہ العالی)

ناظم اعلیٰ: معہد الارشاد الاسلامی (مہاجر مکی مسجد) صدر کراچی

انبیاء کرامؑ کے مراتب میں جزئی تفاوت اور ایک ضروری تطبیق

ہم جب قرآن وحدیث کا مطالعہ کرتے ہیں تو ایک طرف تو ہمیں اسلام یہ حکم دیتا ہے کہ تمام انبیاء کرامؑ کی صداقت پر یکساں ایمان لانا اور ان کو تمام پیغمبرانہ کمالات سے متصف جاننا ضروری ہے، جیسا کہ ارشادِ الٰہی ہے:

لَانُفَرِّقُ بَیۡنَ اَحَدٍ مِّنۡ رُّسُلِہٖ (بقرہ)

''ہم اس کے رسولوں میں سے کسی کے درمیان تفریق نہیں کرتے۔''

اس لئے یہ ضروری ہے کہ تمام انبیاء علیہم السلام کو یکساں صادق اور کمالاتِ نبوت سے متصف مانا جائے۔ دوسری طرف ارشاد ہے: تِلۡکَ الرُّسُلُ فَضَّلۡنَا بَعۡضَہُمۡ عَلٰی بَعۡضٍ ۔مِنۡہُمۡ مَّنۡ کَلَّمَ اللّٰہُ وَرَفَعَ بَعۡضَہُمۡ دَرَجٰتٍ ۔ واٰتَینَا عِیۡسَی ابۡنَ مَرۡیَمَ الۡبَیِّنٰتِ وأیَّدناہُ بِرُوۡحِ الۡقُدُسِ (بقرہ)

''یہ حضرات مرسلین ایسے ہیں کہ ہم نے ان میں سے بعضوں کو بعضوں پر فوقیت بخشی ہے (مثلاً) بعضے ان میں وہ ہیں جو للہ تعالیٰ سے ہمکلام ہوتے ہیں (یعنی موسیٰ علیہ السلام) اور بعضوں کو ان میں سے بہت سے درجوں پر سرفراز کیا اور ہم نے حضرت عیسیٰ بن مریمؑ علیہما السلام کو کھلے کھلے دلائل عطا فرمائے اور ہم نے ان کی تائید روح القدوس (یعنی جبرئیل) سے فرمائی۔''

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ انبیاء علیہم السلام کے مراتب کمالیہ میں جزئی تفاوت بھی

ہے، ان دونوں صداقتوں کے درمیان تطبیق کے لئے تھوڑی تشریح کی ضرورت ہے، ملاحظہ فرمائیے:۔

حضرات انبیاء کرامؑ تمام کمالات نبوت وفضائل اخلاق سے یکساں سرفراز تھے زمانہ اور ماحول کی ضرورت اور مصالح الٰہی کی بناپر ان تمام کمالات کا عملی ظہور تمام انبیاء میں یکساں نہیں ہوا بلکہ بعض کے بعض کمالات اور دوسروں کے دوسرے کمالات نمایاں ہوئے، یعنی جس زمانے کے حالات کے لحاظ سے کمال کے اظہار کی ضرورت ہوئی وہ پوری شہرت سے ظاہر ہوا اور دوسرے کمال کا جس کی اس وقت ضرورت پیش نہیں آئی بہ مصلحت یہ کمال ظاہر نہیں ہوا۔ حاصل یہ ہے کہ ہر کمال کے ظہور کے لئے مناسب موقع ومحل کی ضرورت ہوتی ہے۔ اگر کسی عارض کی وجہ سے کسی کمال کا ظہور نہ ہو تو اس سے نفسِ کمال کے وجود کی نفی نہیں ہوتی ہے، اس لئے اگر بوجہ عدم ضرورت حال ان انبیاء کرامؑ کے بعض کمالات کا عملی ظہور کسی وقت میں نہیں ہوا تو اس کے یہ معنی ہرگز نہیں ہیں کہ یہ حضرات (نعوذ باللہ) ان کمالات وفضائل سے متصف نہ تھے۔

غزوہ بدر کے قیدیوں کے باب میں حضرت ابوبکر صدیقؓ نے جب فدیہ لے کر ان کے چھوڑنے کا اور حضرت عمرؓ نے ان کے قتل کا مشورہ دیا، تو آنحضرت ﷺ نے حضرت ابوبکرؓ کی طرف اشارہ کر کے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے شدت ورحمت میں لوگوں کے قلوب مختلف بنائے ہیں۔ اے ابوبکر! تمہاری مثال ابراہیم وعیسیٰؑ کی، اور اے عمر! تمہاری مثال نوح اور موسیٰؑ کی ہے، یعنی ایک فریق سے رحم وکرم کا اور دوسرے سے شدت کا اظہار ہوا۔

(دیکھئے مستدرکِ حاکم غزوۂ بدر)

اس حدیث میں اسی نقطہ اختلاف کی طرف اشارہ ہے جو انبیاءؑ کے مختلف احوال مبارکہ میں رونما رہا ہے، لیکن حضرت محمد رسول اللہ ﷺ کی نبوت چونکہ آخری اور عمومی تھی اس لئے بضرورت احوال آپ ﷺ کے تمام کمالاتِ نبوت آپ ﷺ کی زندگی میں عملاً پوری طرح جلوہ گر ہوئے اور آپ ﷺ کی نبوت کے آفتاب عالم تاب کی ہر کرن دنیا کے لئے مشعل

ہدایت بنی اور ظلمت کدہ عالم کا ہر گوشہ آپ ﷺ کے ہر قسم کے کمالات کے ظہور سے پرُنور ہوا۔ اس موقع پر یہ بھی یاد رکھنا چاہئے کہ ان جزئی کمالات کے اظہار میں ایسا پہلو (نعوذ باللہ) پیدا نہ ہونے پائے جس سے دوسرے انبیاء ؑ کی توہین یا کسر پیدا ہو، اس سے ایمان کے ضائع جانے کا خطرہ ہے۔ (بحوالہ سیرت النبی ﷺ جلد اول)

ایک ضروری وضاحت

علامہ سیوطیؒ لکھتے ہیں کہ کیا کوئی مسلمان یہ کہہ سکتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کو دوسرے انبیاءؑ کے مقابلے میں جو خصوصیات اور فضیلتیں دی گئیں اسکے نتیجے میں بقیہ تمام انبیاءؑ میں معاذ اللہ نقص اور خامی ثابت ہو جاتی ہے، ہر مسلمان کا یہ عقیدہ ہے کہ ہمارے نبی ﷺ بغیر استثناء تمام دوسرے انبیاء کرامؑ سے افضل ہیں، مگر اس عقیدے کی وجہ سے کسی نبی کے حق میں کوئی نقص اور خامی ثابت نہیں ہوتی، اس اعتراض کا جواب بھی دینے کی ضرورت نہیں تھی مگر میں ڈرتا ہوں کہ اگر کوئی جاہل آدمی یہ اعتراض سنے گا تو وہ کہیں آنحضرت ﷺ کی ان تمام خصوصیات سے ہی انکار نہ کردے جن کی وجہ سے آپ ﷺ کو دوسرے تمام انبیاءؑ پر فضیلت حاصل ہے، جاہل آدمی یہ سوچ سکتا ہے کہ چونکہ ان خصوصیات کو ماننے کی وجہ سے دوسرے انبیاءؑ میں خامیاں ثابت ہوتی ہیں لہذا آپ ﷺ کی خصوصیات سے ہی انکار کردیا جائے، اس کے نتیجہ میں پھر وہ شخص عیاذ باللہ کفر و گمراہی میں مبتلا ہو جائے گا (اس بناء پر اس اعتراض کا جواب دینا ضروری سمجھا گیا) یہاں تک علامہ سیوطیؒ کا حوالہ ہے)

مقدمہ الکتاب

خصوصیات مصطفیٰ ﷺ جلد سوم

قابل احترام قارئین! خصائص مصطفیٰ ﷺ کی جلد سوم شروع ہونے سے پہلے جلدِ اول اور جلدِ دوم کی طرح یہاں بھی ایک مقدمہ پیش کیا جارہا ہے، جس میں نبوت اور رسالت کے بارے میں تفصیل پیش کی جارہی ہے مثلاً نبوت اور رسالت کے بارے میں قرآن کیا کہتا ہے اور نبوت ورسالت کا کیا مقام ہے اور خصوصاً دیگر انبیاءؑ کے بعد ہمارے نبی ﷺ کو جو نبوت ورسالت عطا ہوئی اس کا مقام ومرتبہ کیا ہے، چونکہ ہماری کتاب کا موضوع رسولِ اکرم ﷺ کی امتیازی خصوصیات کو واضح کرنا ہے تو موضوع کی مناسبت سے مطلقاً نبوت ورسالت کو جاننا ضروری ہے، چنانچہ اسی ضرورت کو پورا کرنے کے لئے ذیل کا مقدمہ ترتیب دیا گیا ہے، جو خصائصِ مصطفیٰ ﷺ کی جلدِ سوم میں پیش کیا جارہا ہے، امید ہے کہ دیگر خصوصیات کی طرح اس مقدمے کا مطالعہ بھی فائدے سے خالی نہیں ہوگا انشاء اللہ، لہٰذا لیجئے ملاحظہ فرمائیے۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو حضور ﷺ سے سچی محبت کرنے کی توفیق عطا فرمائے، آمین یارب العالمین۔

نبوت ورسالت کی وضاحت وتفصیل

رسالت اور نبوت ایک ہی چیز کے دو نام ہیں، رسالت ونبوت کے معنی ''سفارت'' اور پیامبری کے ہیں، رسالت اور نبوت ایسی سفارت کو کہا جاتا ہے، جو حق تعالیٰ شانہ نے انسانوں تک اپنے تشریحی احکام پہنچانے اور اپنی راہ پر انہیں گامزن کرنے کے لئے قائم کی، بعض کے نزدیک رسالت اور نبوت میں معمولی سا فرق ہے، اسی بناء پر ان کے ہاں رسول اور نبی کی تعریف میں تفاوت پایا جاتا ہے۔

حق تعالیٰ نے رسالت ونبوت کا سلسلہ جاری فرما کر انسانوں پر بہت بڑا احسان کیا، رسالت ونبوت کے ذریعے انسان کو اصل اور نقل کا اندازہ ہوا، کھرے اور کھوٹے کی تمیز ہوئی، حق کی روشنی ملی اور جہالت کا اندازہ ہوا، حق کے فوائد سے شناسائی ہوئی اور باطل کے نقصانات سے آگاہی ہوئی، نفع نقصان کی الگ الگ پہچان ہوئی اسے کامیابی وناکامی کا علم ہوا، اسے ان حقائق کا علم ہوا جنہیں مان کر انسان ہمیشہ کے لیے کامیاب وکامران ہوجاتا ہے اور ایسے مضرات سے بچنے کی توفیق ملی جو ان کے لیے سراسر نقصان اور باعث خزلان تھے۔

اللہ تعالیٰ نے انسان کی تخلیق کا مقصد کئی مقامات پر بیان کیا، کہ انسان کا مقصد پیدائش حق تعالیٰ کی بندگی اور اطاعت ہے، اس کی عبادت اور احکامات کی پیروی ہے، حق تعالیٰ کی بندگی سے دنیا وعقبیٰ کی کامیابیاں اور کامرانیاں نصیب ہوں گی، اس کی اطاعت وپیروی سے اطمینان قلب نصیب ہوگا، غرضیکہ اس کی فرمانبرداری میں اس کے لیے دونوں جہاں کی کامیابی ہے۔

اب یہ بات حاصل طلب ہے کہ اللہ کے احکامات کیا ہیں؟ اللہ نے کیا حکم دیا؟ اس نے کس چیز سے روکا؟ حلال کیا ہے اور حرام کیا؟ اور انسان کی زندگی، اس کے نشیب وفراز اور بہار زندگی کے مختلف موسموں میں اسے کیسے رہنا ہے؟ اس کا معاش اور طرز زندگی کیسا ہو؟ دنیا میں کیا کرے تو اس کی صفات میں حسن پیدا ہوگا؟ اور کون سے امور سرانجام دے تو اس کے اعمال میں پختگی پیدا ہو؟ الٰہی احکامات کی ابتداء کہاں سے ہوتی ہے؟ اور ان پر نتیجہ کب مرتب ہوگا؟ اس قسم کے بے شمار سوالات انسانی ذہن ودماغ سے نکلتے ہیں، ان سوالات کے جوابات کے لئے انسانی عقل ہے، لیکن وہ محدود ہے کتنے ہی کامل مکمل کتنے ہی ذہین فطین انسان کیوں نہ ہوں؟ وہ سوچتا چلا جائے دماغ کے روزن میں بے شمار باتیں آئیں گی، کبھی وہ اس نیلگوں آسمان کی طرف نظریں دوڑا دوڑا کر دیکھے گا، پھر اس پر سوچتا چلا جائے گا، کبھی پہاڑوں کے غیر متناہی سلسلہ پر نظریں دوڑائے گا، کبھی سرسبز

وشاداب درختوں اور لہلہاتے کھیتوں پر نظریں مرکوز کرے گا، غرضیکہ انسان اپنی ہمت وکوشش کے مطابق ہاتھ پاؤں کو حرکت دے گا مگر انسان انسان ہے، اس کی عقل بھی ایسی نہیں کہ ہر سوال کا جواب خود سے دے اور سوچے۔

بے شمار باتیں انسان کے دل پہ دستک دیتی ہیں، مگر دل بھی چونکہ انسانی دل ہے، اس میں بے شمار باتیں آتی ہیں، اور چلی جاتی ہیں، از خود آنے والی باتوں کو چاہے انسان تسلیم کرے یا نہ کرے، تسلیم کرے اس کی مرضی تسلیم نہ کرے اس کی مرضی، مگر وہ مقام ان باتوں کا ٹھکانہ اور مستقر نہیں ہے، بعض باتیں ایسی ہوتی ہیں جو گہری چھاپ کی طرح انسان کے دل پر لگ جاتی ہیں، اور کئی باتیں انسانوں کی جمعیت مل کر سوچتی ہے، اجلاسوں اور کانفرنسوں کے ذریعے نجی اور اجتماعی غور وفکر کے بعد کسی چیز کے بارے میں حتمی رائے قائم کی جاتی ہے مگر رفتہ رفتہ ان آراء اور تفکرات میں نئے نئے شوشے کسی نہ کسی گوشے سے اٹھنے شروع ہو جاتے ہیں، جس سے اجتماعی فکر کا شیرازہ بکھر جاتا ہے، کسی چیز کے خیر یا شر، بھلا اور برا ہونے کے لئے انسان کے پاس سب سے بڑے یہی تین واسطے ہیں۔ سب سے پہلے عقل سے اس کے حسن وقبح کی جانچ پڑتال کرے گا، پھر قلب وجگر کی گہرائی سے اسے جانچنے کی کوشش کرے گا، بالآخر وہ تھک ہار کر کسی دوسرے کے سہارے سوچنے اور الجھن دور کرنے کی کوشش کرے گا، مگر دوسرے بھی اسی جیسے ہوں گے، وہ منزل تک نہیں پہنچ سکتا۔

اسی طرح جب حق تعالیٰ نے انسان کو پیدا کیا، پھر اسکا سلسلہ جاری کیا، تو اس کے ارد گرد، یمین و یسار کیا کیا نعمتیں نہ تھیں؟ اوپر دیکھے تو آسمان اس کا سائبان تھا، سورج اس کے لیے روشنی بکھیر رہا تھا، چاند اس کی اندھیری راتوں میں چاندنی بکھیر رہا تھا، ستارے اس کی نظریں اپنی طرف مرکوز کراتے رہتے تھے، سبزہ اور درخت اسے اپنی طرف مائل کر رہے تھے وہ صحراء جن میں دور دور تک کوئی انسان نظر نہ آتا تھا، ایسے پہاڑ جن کی چیز مفقود تھی، غرضیکہ انسان کے لیے پیدا کی جانے والی ہر چیز تھی، مگر انسان نہ تھا اگر تھا تو خال خال، پھر جب رفتہ رفتہ انسان پھلنے پھولنے لگا تو حق تعالیٰ کا سفیر اور نمائندہ ان کی راہنمائی کرنے لگا، سب سے

پہلے جس انسان کو سفارت ونمائندگی کا شرف ملا وہ انسانوں کے باپ حضرت آدمؑ تھے، جن سے ایک طرف نسل انسانی کا آغاز ہوا دوسری طرف پیغامات ربانی کا سلسہ جاری وساری ہوگیا۔

رسالت ایک بہترین ذریعہ ہے، جس سے انسان کو اپنے خالق و مالک کی پہچان ہوئی، انسان کو معلوم ہوا کہ یہ آسمان کیوں بنایا گیا؟ زمین کی تخلیق کیوں ہوئی؟ طرح طرح کی نعمتیں پیدا کرنے کا مقصد کیا؟ یہ ساری باتیں نبوت اور رسالت کے واسطے سے انسان کو حاصل ہوئیں، اور یہ اتنا عمدہ طریقہ ہے حق تعالیٰ کی معرفت کا کہ اس کے بجز کوئی اور راہ انسان کے لیے مفید نظر نہیں آتی، اگر کسی ذریعہ اور واسطہ سے حق تعالیٰ کی سچی معرفت اور حقیقی پہچان ہوئی تو وہ صرف اور صرف رسالت ہے، جس سے انسان نے دنیا کی خیر وشر کی پہچان کی، برے اور بھلے کی پہچان کی، مضر اور مفید کی شناسائی ہوئی، دنیا اور آخرت کی پہچان ہوئی، حلال اور حرام کی تمیز ہوئی، سچ اور جھوٹ کی تمیز ہوئی، جس طرح دیکھنے کے لئے آنکھ میں پتلی ضروری ہے اسی طرح حق تعالیٰ تک پہنچنے کے لئے رسالت اور نبوت ضروری ہے، اگر یہ سلسلہ نہ ہوتا تو انسان حق تعالیٰ کی معرفت حاصل نہیں کرسکتا تھا۔ اگر رسالت ونبوت کا تاج کسی غیر انسانی مخلوق کے سر پر سجادیا جاتا، تو انسان کے لئے مشکل پیدا ہوجاتی، انسان کی ضروریات کو سمجھنا اور اس کے مرض کی تشخیص کے لیے اس کی بیمار نبضوں پر ہاتھ رکھ کر اس کی روحانی اصلاح کرنا یہ کسی منجھے ہوئے اور سنجیدہ انسان ہی کا کام ہوسکتا ہے، جو تمام انسانی خوبیوں سے سرشار ہونے کے باوجود عام انسانوں کے لیے ایک نمونہ اور آئیڈیل ثابت ہو اس لیے حق تعالیٰ نے تاج رسالت انسانوں کے سر پہ ہی سجایا۔

نبوت ورسالت اور قرآن

حضرات انبیاء کرامؑ کی رسالت اور نبوت کے ذکر سے قرآن بھرا ہوا ہے، مختلف پیغمبروں نے اپنی رسالت اور نبوت کا اقرار ان الفاظ میں کیا: ولکنی رسول من رب

العلمین (الاعراف:۸) لیکن میں پروردگار عالم کی طرف سے رسول ہوں حضرت موسیٰؑ نے فرعون کے دربار میں اعلان کیا یفرعون انی رسول من رب العلمین (الاعراف) اے فرعون میں رب العالمین کی طرف سے رسول ہوں۔

حضرت نبی کریم ﷺ کی رسالت کا ذکر کرتے ہوئے قرآن حکیم نے بتایا: ﴿وما محمد الا رسول قدخلت من قبله الرسل﴾ ''حضرت محمد ﷺ تو ایک رسول ہیں، آپ ﷺ سے قبل بہت سے رسول گزر چکے ہیں۔ حضرت رحمت للعالمین ﷺ نے اپنی رسالت ونبوت کا ذکر ان الفاظ میں کیا: ﴿انا رسول اللّٰہ بعثنی الی العباد ادعوهم الی ان یعبدالله و لا یشر کوابه و انزل علی کتاب﴾ (مسند احمد بن حنبل ج۵)

''میں اللہ کا رسول ہوں، مجھے اس نے بندوں کی طرف مبعوث کیا میں اس بات کا داعی ہوں کہ وہ اللہ کی عبادت کریں، اس کے ساتھ شرک نہ کریں، اور میرے اوپر کتاب اتاری گئی ہے، صلح حدیبیہ کے مقام پر اپنی رسالت کو واشگاف الفاظ میں بیان کرتے ہوئے ارشاد فرمایا۔'' ﴿واللّٰہ انی رسول اللّٰہ و ان کذبتمونی﴾ (بخاری) ''واللہ میں اللہ کا پیغمبر ہوں، اگر چہ تم مجھے جھٹلاؤ۔''

نبوت ورسالت کا تجزیہ

اللہ تعالیٰ نے رسالت کے ذریعے اپنا پیغام انسانوں تک پہنچایا، اور انسانوں کی رشد وہدایت اور فلاح ونجات کے لیے انسانوں کا ہی انتخاب فرمایا، انسانوں کے لیے کسی غیر انسان یا کسی دوسری مخلوق کو راہنما نہیں بنایا، حضرت آدمؑ سے اس سلسلہ کو جاری کیا، اور حضرت نبی اکرم ﷺ پر اس کو ختم کر دیا، حضرت آدمؑ سے حضرت نبی اکرم ﷺ تک کئی ہزار سال کا عرصہ گزرا، کہیں نبوت ورسالت کس انداز میں کام کرتی ہے اور کبھی کس انداز میں، سینکڑوں سالوں کی محنت سے کہیں درجنوں افراد تیار ہوئے، اور کہیں اندھیر نگری چھائی رہی، مگر رسالت مایوس نہیں ہوئی، بلکہ امر خداوندی کے تحت رسول اپنا کام کرتا رہا، اگر کسی

مقام پر ایک آدمی بھی تھا تو اس پر بھی کماحقہ محنت کی، اب ذیل میں یہ آئینہ دکھایا جاتا ہے کہ یہ لوگ کن اوصاف کے مالک تھے، جو شبانہ روز محنت کرتے تھے اور اللہ کی طرف دعوت دیتے تھے۔

نبوت ورسالت اور بشریت

اللہ تعالیٰ نے انسانوں کے لیے انسان کا انتخاب کیا، انسانوں کا قائد اور راہنما انسان ہی کو بنایا، جو انسانی ضروریات کو سمجھ کر ان کی راہنمائی کرے، کسی فرشتہ یا جن کو انسان کی عنان قیادت نہیں تھمائی، جو انسانی ضروریات اور مجبوریوں سے یکسر خالی ہوں، ورنہ جن لوگوں کو نبوت ورسالت سے سرفراز کیا گیا ان کی قوموں نے بیانگ دہل مطالبہ کیا کہ آسمان سے کوئی فرشتہ اترے، کتاب اترے، آسمان کی طرف سیڑھی چڑھتی ہو، جس پر چڑھنے والا چڑھے اور ہم بچشم خود اس کی آمد ورفت دیکھیں، مگر انسانوں کے خالق نے ساری باتیں سننے کے باوجود اپنی منشاء مرضی کے مطابق انسانوں کے لئے انسان ہی کو چنا۔

رحمت دوعالم کو کہا گیا کہ یہ لوگ فرشتوں کو دولت نبوت سے سرشار کرنے کا مطالبہ کرتے ہیں ان کو بتا دیں کہ اگر زمین کی پشت پر فرشتے رواں دواں ہوتے تو ہم ان کے لیے فرشتوں ہی کا انتخاب کرتے، مگر چونکہ یہ نوع انسانی سے متعلق ہیں اس لیے ان کا راہنما انسان ہی کو بنایا گیا، ارشاد ہے: ﴿**قل لو کان فی الارض ملٰئکة یمشون مطمئنّین لنزلنا علیهم من السما ملکا رسولا**﴾ (بنی اسرائیل:۹۵)

”فرمادیجئے: اگر زمین میں فرشتے رواں دواں ہوتے، اور آباد ہوتے تو ہم ضرور آسمان سے ان پر کسی فرشتے کو رسول بنا کر اتارتے۔“ قرآن حکیم نے واضح کیا کہ اللہ تعالیٰ نے صفت رجولیت سے موصوف ہی کو نبی بنایا، حضرت محمد ﷺ کو بتایا گیا کہ ﴿**وما ارسلنا من قبلک الا رجالا نوحی الیهم**﴾ (یوسف)

”اور ہم نے آپ سے پہلے بھی صرف آدمیوں کی طرف وحی کی، وحی نبوت صرف

مردوں کی طرف کی گئی۔

انبیاء کو جن اقوام کی طرف اور جن اشخاص کی طرف بھیجا جاتا تھا، وہ ان کی دعوت سن کر یہ اعتراض کرتے تھے کہ یہ تو ہمارے جیسے انسان ہیں۔ ان انتم الا بشر مثلنا اور پھر انبیاء بھی جواباً کہتے تھے کہ اس میں باعث عار اور قابل اعتراض بات کون سی ہے ان نحن الا بشر مثلکم. ہم تو تمہارے جیسے ہی انسان ہیں۔''

پھر انبیاء کے مخاطبین کو عام اعتراض یہ بھی تھا کہ یہ کیسے نبی ہیں، یہ کھانا کھاتے ہیں بازاروں میں چلتے پھرتے ہیں۔ انھم لیاکلون الطعام ویمشون فی الاسواق.

قرآن حکیم نے معترضین کے اعتراضات نقل کیے اس کے باوجود کہیں بھی قرآن نے الٰہی موقف کو کمزور پیش نہیں کیا کہ چند لوگ انسانوں کا رسول ہونا پسند نہیں کرتے، اس لئے نوع انسانی کے لئے انسانوں کی بجائے کسی اور کو رسالت و نبوت دی جائے، بلکہ قرآن نے یہاں تک واضح کیا کہ اللہ تعالیٰ نے جن لوگوں کو رسالت سے سرفراز کیا ان کے لیے بیویاں اور اولاد بھی بنائی، ﴿وجعلنا لھم ازواجا وذریة﴾ (رعد)

حضرت محمد رسول اللہ ﷺ سے کئی مرتبہ اعلان کروایا گیا کہ میں تمہارے جیسا انسان ہوں، صرف اتنی بات ہے کہ مجھے نبوت و رسالت کی عظیم دولت سے سرشار کیا گیا جیسا تمہیں اس دور رکھا گیا۔ ﴿قل انما انا بشر مثلکم یوحی الی﴾ (الکھف)

بخاری کی روایت کے مطابق حضرت محمد رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا ﴿انما انا بشر وانہ یاتینی الخصم فلعل بعضکم ان یکون ابلغ من بعض فاحسب انہ قد صدق واقضی لہ بذلک فمن قضیت لہ بحق مسلم فَاِنَّمَا ھی قطعة من النار فلیاخذھا اوفلیتر کھا﴾ (بخاری ج۱)

''میں انسان ہوں، میرے پاس مقدمے کا فریق آتا ہے، ممکن ہے تم میں سے ایک دوسرے سے زیادہ چرب زبان ہو میں اس کو سچا سمجھ کر اس کے حق میں فیصلہ کر دوں، جس کے لیے کسی مسلمان کے حق کا فیصلہ کیا گیا وہ یہ سمجھ لے کہ آگ کا ٹکڑا ہے پھر چاہے اس

کو لے لے جو چاہے اس کو چھوڑ دے۔"

ایک مرتبہ حضرات صحابہ کرامؓ نے یہ جملہ فرمایا تھا: ﴿اتکتب کل شیء تسمعه ورسول بشر یتکلم فی الغضب والرضا﴾ (ابوداؤد)

"کیا تم ہر چیز کو لکھتے ہو، جس کو سنتے ہو، حالانکہ رسول اکرم ﷺ انسان ہیں (کبھی) غصہ اور خوشی کی حالت میں کلام کرتے ہیں۔"

رسالت اور نبوت کا سنہری تاج انسان ہی کے سر پر رکھا گیا اور یہ حق تعالیٰ کی عظمتِ شان کی علامت اور انسانیت کا کمال ہے جو اللہ تعالیٰ نے اسے ودیعت کیا، چونکہ نبی انسان ہوتا ہے، اور ایسا عام انسان نہیں جو ہم اور آپ دیکھتے ہیں بلکہ نبی انسان ہونے کے باوجود عمدہ صفات کا مالک ہوتا ہے، اس کی زندگی نہایت پاکیزہ اور ستھری ہوتی ہے، خواہ وہ زمانہ نبوت میں ہو یا اس سے قبل کی زندگی میں جس انسان کے سر پہ نبوت ورسالت جیسی بھاری ذمہ داری عائد کی گئی اس کا تمام سلسلہ صاف اور ستھرا رہا۔ اگر حق تعالیٰ رسالت کی ذمہ داری کسی انسان کو نہ سونپے کسی فرشتے اور جن کو سونپ دیتے تو وہ امر الٰہی کو من وعن پہنچا دیتے، مگر ان احکامات کو نافذ نہ کر سکتے، ان میں وہ اوصاف ہی نہیں جن کا انسان حامل ہے، انسان کو تو ضرورت ہے ایسے قائد اور راہنما کی جس میں اس جیسی صفات ہوں، اس جیسے تقاضے ہوں، اس جیسی ضروریات ہوں، مگر اس کے باوجود وہ ممتاز اور نکھر انکھرا نظر آئے، اس کی نشست و برخاست، گفتار و کردار، چال چلن اس کا کریکٹر و کردار آئینہ کی مثل سب کے سامنے واضح اور شفاف ہو، اس کا ماضی بے داغ ہو، اس کا حال تابناک اور مستقبل روشن ہو، تمام انسانی خواہشات کے باوجود اس کی نظر غلط نہیں دیکھتی، اس کے کان غلط آواز نہیں سنتے، اس کی زبان غلط نہیں بولتی، اس کا دماغ غلط نہیں سوچتا، اس کے ہاتھ کسی گردن پر نہیں پڑتے، اس کے پاؤں کسی غلط جانب نہیں چلتے، اس کی خواہشات مادیت اور دنیوی زندگی کے تابع نہیں بلکہ احکم الحاکمین کے بتائے ہوئے طریقوں کے مطابق کام کرتی ہیں گویا کہ نبوت ورسالت کا عظیم منصب انسان ہی کو دیا گیا، جو دوسرے انسانوں کے لیے

نمونہ اور آئیڈیل بنا، جو خود بھی احکامات الٰہیہ کی پاسداری و پاسبانی کرتا رہا، اور دوسروں کے لیے حق کی مشعلیں روشن کرتا رہا، دیے سے دیے چراغ سے چراغ روشن و تاباں کرتا رہا، اگر کسی دوسری مخلوق کو یہ ذمہ داری دی جاتی تو وہ رعب ودبدبہ سے کچھ نہ کچھ کام چلا لیتی مگر اصلاح انسانیت کا جو حقیقی لطف تھا وہ کبھی حاصل نہ ہوتا۔

نبوت ورسالت وہبی ہے

نبوت ورسالت وھبی چیز کا نام ہے، کسبی نہیں ہے ﴿**الله اعلم حيث يجعل رسالته**﴾ اللہ تعالیٰ خوب جانتا ہے کہ اس عظیم منصب کو کس شخص کے سپرد کرنا ہے، یہ منصب عظیم کسی مجاہدے، محنت اور ریاضت سے انسان کو حاصل نہیں ہوسکتا، چلہ کشی، عبادت در یاضت، محنت ومجاہدے، ذکر واذکار سے انسان کو ولایت مل سکتی ہے، مگر نبوت ورسالت نہیں مل سکتی چاہے وقت کا کتنا ہی بڑا ولی کیوں نہ ہو، وہ اس انتظار میں ہو کہ اب ولایت کی منزل طے ہوگئی، رسالت ملنی چاہیے یہ امر محال ہے، یہ منصب اللہ تعالیٰ کی نعمت ہے وہ جسے پسند کرتا ہے اسے عطا فرما دیتا ہے، وھبیت کے ساتھ اس کا تعلق ہے، کسب ومحنت سے اس کا کوئی واسطہ نہیں ہے۔

رسالت ملنے سے قبل حضرت موسیٰ چالیس روز تک روزے کی حالت میں طور پہاڑ پہ رہے، حضرت عیسیٰؑ چالیس روز تک بیابان وسنسان جنگل میں محو عبادت رہے، رحمت دوعالم ﷺ قبل از نبوت چالیس سال تک غار حرا میں تفکراتی عبادت میں مصروف رہے، یہ ریاضتیں اور عبادتیں انسان میں حق تعالیٰ کے احکامات قبول کرنے کی صلاحیت اور استعداد تو پیدا کر دیتی ہیں مگر یہ محال ہے کہ اس قسم کی عبادات کو دیکھ کر حق تعالیٰ کسی کو نبوت ورسالت کا عظیم منصب دے دیں۔

قرآن حکیم میں ارشاد ہوا کہ اللہ تعالیٰ انسانوں اور فرشتوں میں سے جس کا چاہیں رسالت کے لیے انتخاب کریں، چنانچہ انسانوں میں کم وبیش ایک لاکھ چوبیس ہزار انبیاء کا

انتخاب کیا، مگر کوئی ایک بھی ایسا نہیں جس نے نبوت اور رسالت کا منصب طلب کیا ہو، یا ریاضت، مجاہدے سے اسے حاصل کیا ہو، کسب و محنت کے بعد اس کا متمنی ہوا ہو ایسا کہیں نہیں ہوا۔

نبوت، رسالت اور عصمت

اللہ تعالیٰ جس انسان کو نبوت و رسالت کا منصب عنایت فرماتے ہیں اس کی عصمت پر دنیا انگشت نمائی نہیں کر سکتی، عصمت کا معنی ہے، بچانا، روک لینا، محفوظ رکھنا، عاصم اسم فاعل ہے، بچانے والا، معصوم اسم مفعول ہے بچایا ہوا، محفوظ کیا ہوا، شریعت کی اصطلاح میں عصمت کے معنی گناہوں سے بچانے کے ہیں، اور معصوم کا معنی ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے گناہوں سے بچایا ہوا ہے، اس سے کوئی گناہ صادر نہیں ہوسکتا، مسلمانوں کے اجتماعی عقیدہ میں یہ بات ہے کہ اولاد آدم میں معصوم صرف اور صرف انبیاء کی ذات مقدسہ ہیں، انبیاء چنے ہوتے ہیں، اس لیے ان سے گناہوں کا صدور نہیں ہوسکتا۔ ارشاد ربانی ہے: ﴿انهم عندنا لمن المصطفين الاخيار﴾ ''پیغمبر ہمارے ہاں منتخب اور پسندیدہ لوگ ہیں۔''

چونکہ انبیاء کو حق تعالیٰ نے نفوس قدسیہ سے مختص کیا ہے، اور انہیں روحانی و جسمانی ملکات و کمالات سے نوازا ہے وہ تمام مخلوق سے صوری اور معنوی کمالات سے ممتاز ہو گئے، وہ اسرار خداوندی کے خزانے بنا دیئے گئے، انبیاء حق تعالیٰ کے اسمائے صفات کے مظہر ہیں، انسانوں میں وہ لوگ حق تعالیٰ کی تجلی خاص کا محل ہیں اور مہبط وحی ہیں۔ ﴿اللّٰه اعلم من حيث يجعل رسالته﴾ ''اللہ تعالیٰ بہتر جانتا ہے کہ کہاں اپنا پیغام بھیجے۔''

جب اللہ تعالیٰ علی کل شیء قدیر ہے، علیم بذات الصدور ہے، تو وہ خوب جانتا ہے کہ اس امانت کا کون مستحق اور اس ذمہ داری سے عہدہ برا ہونے کا کون سب سے زیادہ لائق ہے، جب حق تعالیٰ انتخاب ہی ایسے شخص کا کریں، تو پھر ظاہر ہے اسے گناہوں سے بچانا اور

محفوظ رکھنا بھی اسی کا کمال ہے۔ رسالت ونبوت کی نعمت سے جسے مالا مال کیا جاتا ہے. اللہ تعالیٰ خود اس کی راہنمائی کرتا ہے اور اسے محفوظ بھی رکھتا ہے، کہ کہیں اس کی زبان سے ایسا جملہ نہ نکل جائے جو شان رسالت کے خلاف ہے۔ ﴿لاتحرک به لسانک لتعجل به﴾ ''(وحی ہونے سے پہلے) اپنی زبان نہ ہلایا کیجئے، یہ زبان کی عصمت ہے کہ نبی امر خداوندی کے بغیر زبان کو حرکت نہ دے۔'' خواہش نفس سے نبی کوئی بات نہ کرے۔ ﴿وما ینطق عن الهوی ان هو الا وحی یوحی﴾ ''اور نبی اپنی خواہش نفس سے کچھ نہیں بولتا، وہ وہی کہتا ہے جو اس کی طرف وحی ہوتی ہے۔'' نبی کا دل بھی آواز حق کے بغیر نہیں دھڑکتا۔ ﴿لولاان ثبتناک لقد کدت ترکن الیهم شیئا قلیلا﴾ ''اگر ہم نے آپ کو ثابت قدم نہ بنایا ہوتا، تو آپ ان کی طرف کچھ کچھ جھکنے کے قریب ہو جاتے۔'' نبی کا ذہن بھی کوئی ایسی بات نہیں سوچتا جو عصمت کے خلاف ہو۔ ﴿سنقرئک فلاتنسی الا ماشاء اللّٰه﴾ ''ہم آپ کو ایسا پڑھائیں گے کہ آپ بھولنے نہ پائیں گے، مگر جو چاہے اللہ بھول چوک ہو سکتی ہے، جو عصمت کے منافی نہیں ہے مگر اس کا اہتمام یہ کیا گیا کہ اپنے نبی ﷺ کو قرآن اس انداز میں پڑھانے کا کہا گیا، جو بھولنے نہ پائے بعض آیات منسوخ التلاوت ہیں، جو خود حضور ﷺ نہیں بھولے بلکہ اللہ کی حکمت کے تحت وہ بھلا دی گئیں،

نبی کی رائے میں بھی عصمت کا اس انداز میں خیال رکھا گیا ہے، کہ کوئی بات نبی اپنی مرضی کے مطابق نہ کرے۔

﴿انا انزلنا الیک الکتاب بالحق لتحکم بین الناس بما اراک اللّٰه﴾ ''بے شک ہم نے آپ کے پاس یہ نوشتہ بھیجا ہے، واقعہ کے موافق تا کہ آپ ان لوگوں کے درمیان اس کے مطابق فیصلہ کریں، جو کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو بتلا دیا ہے۔ قرآن حکیم میں رحمت للعالمین ﷺ کی عصمت فعلی کا یوں ذکر ہے۔ ﴿ما ضل صاحبکم وما غوی﴾ ''تمہارے دوست نہ راہ حق سے بھٹکے اور نہ غلط رستہ پر چلے۔'' رسول رحمت ﷺ ضلالت اور غوایت دونوں سے معصوم ہیں۔

ان آیات سے اندازہ ہوتا ہے کہ حق تعالیٰ تاج رسالت جس کے سر پر رکھتے ہیں اس کی حفاظت بھی آپ ہی کرتے ہیں، اس سے کوئی ایسی بات سرزد نہیں ہونے دیتے جو تکمیل مشن اور مقصد آمد کے لیے سم قاتل ہو، نبی گناہ نہیں کرتا اور نہ ہی گناہ کی طرف چل کر جاتا ہے، اگر بفرض محال گناہ نبی کی طرف چل کر آئے تو حق تعالیٰ نبی اور گناہ کے درمیان اپنی قدرت کی چادر حائل کر دیتے ہیں جس سے نبی بچ نکلتا ہے، جیسا کہ حضرت یوسفؑ کا مشہور واقعہ ہے کہ عزیز مصر کی بیوی نے محل کے دروازے بند کر دیئے، اور یوسفؑ کو دعوت گناہ دینے لگی، مگر حضرت یوسفؑ کی زبان پر معاذ اللہ معاذ اللہ کا ورد جاری ہو گیا، اللہ نے اپنی قدرت کا اظہار کیا، یوسفؑ گناہ سے بچ گئے۔

نبوت ورسالت کی ہمہ گیری

اللہ تعالیٰ نے انسانوں کی رشد و ہدایت اور فلاح ونجات کے لیے ہر قوم میں انبیاء کا سلسلہ جاری رکھا حق تعالیٰ نے چونکہ جنت اور دوزخ دونوں چیزوں کو پیدا کیا ہے، دوزخ حق تعالیٰ کے غضب کا مقام ہے اور جنت اس کے انعامات کی جگہ ہے، جنت کی خوشخبری سنانے اور دوزخ کے ہولناک منظر سے ڈرانے کے لیے ہر دور میں نبی بھیجے **وان من امة الا خلا فیھا نذیر** ﴾ ''کوئی بھی ایسی قوم نہیں جس میں کوئی ڈرانے والا نہ آیا ہو۔''

قرآن حکیم میں انبیاء کے ذکر میں آتا ہے۔ ﴿**فبعث اللّٰہ النبیین مبشرین ومنذرین وانزل معھم الکتاب بالحق**﴾ پھر اللہ نے نبی بھیجے، خوشخبری سنانے والے، اور ڈرانے والے، اور ان کے ساتھ سچی کتاب اتاری۔''

حضرت ابراہیمؑ حضرت اسحاق، حضرت یعقوبؑ، حضرت نوح، حضرت داؤد، حضرت سلیمان، حضرت ایوب، حضرت یوسف، حضرت موسیٰ وہارون، حضرت زکریا و یحییٰ، حضرت عیسیٰ، حضرت الیاس، حضرت اسماعیل، حضرت یسع، حضرت یونس، حضرت لوط علیہم الصلوٰۃ والسلام کے ذکر کے بعد یوں ارشاد ہوا۔ ﴿**اولئک الذین اٰتینھم الکتب و**

الحکم و النبوۃ﴾ ''یہ وہ لوگ تھے جن کو ہم نے کتاب، حکم اور نبوت دی۔'' حضرت رحمتہ للعالمین ﷺ کا ارشاد ہوا۔ ﴿یاایھاالنبی اتق اللّٰہ و لا تطع الکٰفرین المنٰفقین﴾ ''اے نبی اللہ سے ڈریئے اور کافروں اور منافقوں کی پیروی نہ کیجئے۔''

اور یہ بات بھی سمجھ لینی چاہئے کہ انبیاءؑ مطاع مطلق ہیں، قرآن حکیم میں ہر پیغمبر کی مطلقاً اطاعت کا حکم دیا گیا۔ ارشاد ربانی ہے:

﴿وماارسلنا من رسول الا لیطاع باذن اللّٰہ﴾ ''اور ہم نے کوئی رسول نہیں بھیجا، مگر یہ کہ اس کی تابعداری کی جائے اللہ کے حکم سے۔'' دوسرے مقام پر رسول کی اطاعت کو اللہ کی طاعت کہا گیا ہے۔ ﴿ومن یطع الرسول فقد اطاع اللّٰہ﴾ ''اور جس نے رسول کی اطاعت کی پس تحقیق اس نے اللہ کی اطاعت کی۔'' دوسرے مقام، پر واضح طور پر اللہ کی اطاعت کے ساتھ رسول اللہ ﷺ کی اطاعت کا یوں حکم دیا گیا۔ ﴿قل اطیعوا اللّٰہ و اطیعوا الرسول﴾ ''فرد یجئے اللہ کا حکم مانو اور رسول کا حکم مانو۔'' رسول کی اطاعت کرنے والے کو جنت کی بشارت دی گئی۔ ﴿ومن یطع اللّٰہ و رسولہ یدخلہ جنٰت تجری من تحتھا الانھر خالدین فیھا﴾ ''اور جو کوئی اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرے، داخل کرے گا اسے باغات میں، جن کے نیچے نہریں جاری ہیں، ان میں وہ ہمیشہ رہے گا۔'' اور اطاعت نہ کرنے والے کو ساتھ ہی جہنم کی آگ سے ڈرایا گیا۔

حضرت رحمت للعالمین ﷺ سے کہلوایا گیا۔ ﴿قل ان کنتم تحبون اللّٰہ فاتبعونی یحببکم اللّٰہ ویغفرلکم ذنوبکم﴾ ''فرما دیجئے اگر تم اللہ سے محبت رکھتے ہو، تو میری اتباع کرو، اللہ تم سے محبت کرے گا اور تمہارے گناہ معاف کردے گا۔''

حضرت رحمت للعالمین ﷺ کی اتباع کے ساتھ ساتھ آپ ﷺ کی زندگی کو امت کے لیے بہترین نمونہ قرار دیا گیا۔ ﴿لقد کان فی رسول اللّٰہ اسوۃ حسنۃ﴾ ''البتہ تحقیق تمہارے لیے رسول اکرم ﷺ کی زندگی میں بہترین نمونہ موجود ہے۔'' ان آیات میں مطلقاً نبی کی رسالت ونبوت کی اتباع کا حکم دیا گیا ہے۔ نبی کی اطاعت کرنے والوں کو جنت

کی خوشخبری سنائی گئی، اور نافرمانوں کو دوزخ کے بھیانک حالات سے ڈرایا گیا، پھر نبی کی زندگی کو امت کے لئے اسوہ حسنہ قرار دیا گیا، نبی کی اطاعت کو اللہ کی اطاعت قرار دیا گیا۔

منصبِ رسالت و نبوت

منصب رسالت جس قدر عظیم ہے اسی قدر اس میں گنجلک اور الجھن پیدا کی گئی، اس منصب کو اگر ایک طرف لوگوں نے قدر کی نگاہ سے دیکھا تو دوسری طرف کئی ناعاقبت اندیش جہلاء نے اس منصب کا تمسخر اڑایا، کبھی یوں کہا گیا کہ اس منصب کے لائق یہی شخص تھا کوئی اور اس کے اہل نہیں تھا، کبھی یوں کہا گیا کہ ہماری آنکھوں کے سامنے فرشتہ وحی لے کر کیوں نہیں اترتا کبھی یہ ہرزہ سرائی کی گئی کہ یہ رات کو بیٹھ بیٹھ کر آیات بناتا ہے اور صبح کو وہ پڑھ کر سنا دیتا ہے، کبھی یوں کہا جاتا کہ اگر یہ نبی ہے تو چاند کے دو ٹکڑے کر دے، اگر یہ نبی ہے تو زمین سے چشمے اور نہریں جاری کر دے، اگر یہ نبی ہے تو اس کے پاس اللہ کے خزانے کیوں نہیں؟ اگر یہ نبی ہے تو بازاروں میں کیوں چلتا پھرتا ہے، یہ کھاتا پیتا اور ہنستا مسکراتا کیوں نظر آتا ہے؟ غرضیکہ جہالت کی ماری ہوئی انسانیت نے اپنے ذہنوں کی بھڑاس نکال نکال کر انبیاء کو ستایا اور پریشان کیا، انسانوں کے ایک گروہ نے انبیاء پر الزامات عائد کیے، ان کی عصمت اور پاکیزگی پر حملے کیے ان کے حلیے اور وضع قطع کی نقلیں اتاریں، ان کو دشنام دیا گیا کسی نے کہا کہ حضرت عزیر اللہ کے بیٹے ہیں، کسی نے کہہ دیا کہ حضرت عیسیٰؑ اللہ کے بیٹے ہیں، کسی نے انبیاء کو طعنہ آمیز دھمکیاں دیں۔ حضرت موسیٰؑ پر تو نامردگی کا الزام لگا دیا تھا، غرضیکہ جتنے منہ اتنی باتیں ہوتی رہیں، حالانکہ اللہ وحی کے ذریعے ان تمام الزامات واتہامات کی صفائی پیش کرتے رہے کہ جس منصب پر تم کیڑے نکالتے ہو، اور اپنے فرسودہ ذہنوں کے مطابق بات کرتے ہو اس منصب کا یہ تقاضا قطعاً نہیں ہے، حضرت رحمت دو عالم ﷺ سے کہلوایا گیا، کہ انہیں آپ اتنا کہہ دیں کہ میرے پاس اللہ کے خزانے نہیں ہیں نہ میں فرشتہ ہوں اور نہ ہی غیب دان ہوں۔

﴿ولااقول لکم عندی خزائن اللّٰہ ولااعلم الغیب ولااقول انی ملک﴾ حضرت مریم پر جب انگشت نمائی کا اندیشہ ہوا، اورلوگوں نے حضرت عیسیٰ کی ولادت سے متعلق دریافت کیا تو حضرت مریم نے اپنے نومولود بچے کی جانب اشارہ کردیا، حضرت عیسیٰ نے ماں کی گود سے ماں کی صفائی پیش کی۔ ﴿انی عبداللہ اتنی الکتٰب وجعلنی نبیا﴾ ''میں اللہ کا بندہ ہوں اللہ نے مجھے کتاب دی اور مجھے نبی بنایا ہے۔''

پھر ایک وقت آیا کہ حضرت عیسیٰؑ کے پیروکاروں نے حضرت مریم اور حضرت عیسیٰ کی الوہیت اور خدائی کا دعویٰ کردیا قرآن حکیم نے اس نظریہ کا توڑ پیش کیا، اور واضح کیا کہ یہ دونوں ماں بیٹا ایک ذات کے بندے اور پیروکار ہیں، ان میں خدائی صفات نہیں ہیں، وہ تو اللہ کے در کے سوالی اور محتاج ہیں۔

حضرت نبی اکرم ﷺ کے سامنے صحابہؓ نے عرض کیا یارسول اللہ ہم مختلف شہروں اور علاقوں میں جاتے ہیں، مختلف شاہوں اور حکمرانوں کو دیکھتے ہیں کہ ان کی رعایا ان کے سامنے سجدہ ریز ہورہی ہے، اور ہمارے نزدیک آپ کا رتبہ اور مقام ان شاہوں سے کہیں زیادہ ہے اگر حکم فرمائیں تو ہم آپ کو سجدہ کیا کریں حضرت نبی اکرم ﷺ نے اپنے عظیم منصب کی لاج رکھتے ہوئے ارشاد فرمایا: کہ میری امت میں یہ جائز نہیں کہ کوئی انسان کسی انسان کے سامنے سجدہ کرے، اگر ایسا ہوتا تو میں عورت کو حکم دیتا کہ وہ اپنے شوہر کے سامنے سجدہ کرتی۔

اللہ تعالیٰ نے جو عظیم منصب انبیاء کو دیا اس کا تقاضا یہ ہے کہ حق تعالیٰ کی ربوبیت وبندگی کا ڈنکا بجایا جائے، اللہ کی مخلوق کو جہالت کی تاریکیوں سے علم کی روشنیوں کی طرف لایا جائے، شرک کے اندھیروں سے نکال کر توحید کی مشعل ان کے ہاتھ میں تھمادی جائے، رسومات ورواجات کا قلع قمع کردیا جائے، اوران کی جگہ نبوت ورسالت کے نورانی طریقوں کو رواج دیا جائے، مخلوق خدا کو بندوں کی بندگی سے نکالا جائے، دنیا کے آستانوں سے

انسانوں کو ہٹا کر ایک اللہ کے آستانہ رحمت کے سامنے انہیں جھکا دیا جائے، اللہ کے حکم کے مطابق مخلوق کی خدمت کی جائے، اور پھر رسول و نبی انسانوں کو زندگی کی صحیح لائن بتائے، جس پر چل کر دونوں جہانوں میں ان کی کامیابی ہوگی۔

رسول کی ذمہ داری ہے کہ وہ انسانوں کو اللہ کی کتاب کی تعلیم سے سرشار کرے، انکے قلوب سے کھوٹ، کینہ، اور حسد کی بیماریوں کو مانجھ دے، اور انہیں ایسی قابل فہم باتوں کی تلقین کرے، جن پر چل کر ان کی زندگی منشاء خداوندی کے مطابق گزرے، حضرت رحمت اللعالمین ﷺ کی بعثت کے ذکر میں حق تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں۔ ﴿**هو الذی بعث فی الامیین رسولا منهم یتلوا علیهم اٰیته ویزکیهم ویعلمهم الکتٰب والحکمة**﴾

اللہ نے امیوں سے ایک باعزت رسول اٹھایا، جو ان پر آیات تلاوت کرتا ہے اور ان کے دلوں کا تزکیہ کرتا ہے اور انہیں کتاب کی اور حکمت کی تعلیم دیتا ہے، گویا کہ اس مقام پر نبوت کے ذمہ چار کام لگائے گئے۔ (۱) تعلیم کتاب (۲) تعلیم حکمت (۳) انسانوں کا مجموعی لحاظ سے تزکیہ (۴) انسانوں پر آیات کتاب کی تلاوت۔

جس شخص کو رسالت کا تاج پہنایا گیا ہے، اس کی ذمہ داری ہے کہ وہ معاشرہ کی اصلاح کا بیڑہ اٹھائے، لوگوں کو اللہ کی منشا کے مطابق اوامر کی اتباع کا حکم دے اور نواہی سے بچنے کی تلقین کرے، جس طرح ارشاد ربانی ہے۔ ﴿**یامروهم بالمعروف وینههم عن المنکر**﴾ ”وہ انہیں نیکی کا حکم دیتا ہے، اور بدی سے انہیں روکتا ہے۔“

تو یہ ایک صاحب منصب شخص کی ذمہ داری ہے، کہ وہ کرہ ارض پر خالق کائنات کے احکامات نافذ کرے، اس کی مخلوق کے دلوں کی کجی اور زیغ کو دور کرے، ان سے زنگال اتار کر انہیں آئینہ کی طرح صاف کر دے، ان کو ایسا بنا دے کہ وہ صبح و شام یاد الٰہی سے سرشار رہیں ان کے سر اللہ کی یاد سے جھکے ہوں اور دل اللہ کی یاد سے دھڑک رہے ہوں، ان کی آنکھیں اس کی یاد سے اشکبار ہوں جنت کی آس اور امید رکھیں، اور جہنم کے عذاب الیم سے ڈرتے رہیں۔

منصب رسالت کے مخاطبین کی ذمہ داری ہے، کہ وہ اس منصب کی تعظیم وتوقیر کریں وہ اس عظیم منصب کا لحاظ رکھیں، اس کی عظمت وقدر کا ہر وقت پاس رہے، رسول جس بات کا حکم دیں اس کے سامنے سر تسلیم خم کرلیا جائے، او جس سے روکیں اس سے فوراً رکا جائے، جو چیز تھما دیں اسے لے لیا جائے۔ ﴿وما اتاکم الرسول فخذوہ ومانھاکم عنہ فانتھو ا﴾ ''اور جو چیز تمہیں رسول دے اسے لے لو اور جس چیز سے وہ تمہیں روکے اس سے رک جاؤ۔''

حضرت نبی اکرم ﷺ کے بارے میں قرآن حکیم نے اس بات کی تصریح کی ہے کہ آپ ﷺ پر اس لیے کتاب اتاری تا کہ آپ لوگوں کے درمیان فیصلے کریں۔ ﴿انا انزلنا الیک الکتاب بالحق لتحکم بین الناس بما اراک اللّٰہ﴾ ''بے شک ہم نے آپ کی طرف حق کے ساتھ کتاب اتاری تا کہ لوگوں کے درمیان آپ فیصلے کریں، جو آپ کو اللہ دکھائے۔'' جب اہل ایمان رحمت دو عالم ﷺ کے فیصلے سنتے تو پکار اٹھتے تھے، سمعنا واطعنا ہم نے سن لیا اور ہم نے اطاعت کی۔

نبوت ورسالت محمدی ﷺ

تمام انبیاء کے آخر میں حضرت محمد رسول اللہ ﷺ کو رسالت سے سرفراز کیا گیا تھا، جتنا یہ منصب آپ کو آخر میں ملا اس سے ہزار ہا گنا زیادہ مرتبہ اور مقام بھی بلند ملا، آپ کو صرف رسول نہیں امام المرسلین بنایا گیا، آپ کو صرف نبوت سے سرشار نہیں کیا گیا بلکہ نبی الانبیاء بنایا گیا، نبیوں کا نبی اور نبیوں کا امام'' آپ کی رسالت صرف مکہ والوں کے لیے نہیں، مدینہ والوں کے لیے نہیں، طائف اور حجاز والوں کے لیے نہیں بلکہ عرب وعجم کے لیے، شرق سے غرب تک کے لیے، شمال سے جنوب تک کے لیے دنیا کے ایک گوشہ سے دوسرے گوشہ تک کے لیے بلکہ اولین وآخرین کے لیے، قیامت کے صبح طلوع ہونے تک کے لیے آپ کو نبی ورسول بنایا گیا، جس طرح آپ کی رسالت دائمی ہے اسی طرح آپ کا

پیام سرمدی ہے آپ کی شریعت دائمی ہے آپ کے اصول محکم اور عالمگیر ہیں، آپ کی نبوت ورسالت ہمہ گیر اور عالمگیر ہے، آپ کے سر پہ صرف رسالت ونبوت کا تاج ہی نہیں رکھا گیا بلکہ آپ کو کائنات کے لیے رحمت بنایا گیا ہے۔

آپ ﷺ کو رسالت سے اس وقت نوازا گیا، جب چاروں سمت جہالت وسفاہت کا دور دورہ تھا، نشان نور گم تھا، اور ظلمت کا بسیرا تھا، حق وصداقت کی شعاعیں دور دور تک نظر نہیں آتی تھیں، قتل وبربریت عام تھی، لڑائی جھگڑے خواہ مخواہ مول لئے جاتے تھے، ایک معمولی سی بات پر جھگڑا چلتا تو نسلوں کی نسلیں فنائیت کے گھاٹ اتار دی جاتی تھیں، کہیں جانوروں کو پانی پلانے پہ جھگڑا اور کہیں گھڑ دوڑ میں جھگڑا اہل عرب کی ذہانت وفطانت کا یہ عالم تھا کہ اپنے شجرے تو ایک طرف رہے اپنے جانوروں کے شجرہائے نسب بھی از بر تھے، مگر دوسری طرف ان کی جہالت کا یہ عالم تھا کہ سچ اور جھوٹ کی کوئی تمیز نہ تھی، حق وباطل ان کے ہاں ایک ترازو میں تلتے تھے۔

حضرت ابراہیم واسماعیل کے نام لے کر جیتے تھے، دین کے علمبردار اور سپہ سالار کہلاتے اور فخر محسوس کرتے تھے، مگر اس دین حنیف کی پاسداری کا یہ عالم تھا کہ یہی دین کے علمبردار گھٹیا افعال میں مبتلا تھے، برائیوں اور بدیوں نے ان کے ارد گرد ڈیرے جمائے ہوئے تھے، دین کے علمبردار شرک کے خوگر بن چکے تھے، اسماعیل، وابراہیم کا تعمیر کردہ خانہ کعبہ جو محض عبادت خدا کے لیے بنایا گیا تھا، نت نئے دیوتاؤں کی آماجگاہ بنا ہوا تھا تین سو ساٹھ بتوں کو سجدے اور رکوع کے قابل سمجھ رکھا تھا، اور انہیں خانہ کعبہ میں سجا رکھا تھا مختلف بیماریوں کے مختلف شفادہندے تجویز کر رکھے تھے، انسانی اعضا میں تین سو ساٹھ جوڑوں کی نسبت سے تین سو ساٹھ بت بنائے ہوئے تھے۔

ظلم کی حد یہ تھی کہ جاہل باپ اپنی بچی کو زندہ درگور کر دیتا تھا، جب کسی طویل سفر پہ روانہ ہوتا تو اپنی اہلیہ کو کہہ جاتا تھا، کہ اگر بچہ پیدا ہو تو فبہا اگر بچی پیدا ہو تو اسے گھڑا کھود کر زمین میں ڈال دینا، کئی لوگوں نے اسلام قبول کرنے کے بعد حضرت رحمت دو عالم ﷺ کو اپنی

داستان سنائی تو آپ ﷺ کی آنکھیں اشکبار ہو گئیں۔

اس عالم میں جب دنیا بالکل تباہی کے دہانے پہ کھڑی حالت یاس میں انگلیاں پیس رہی تھی، آس وامید کی کرن بن کر نبی اکرم ﷺ جلوہ گر ہوئے، آپ نے جہالت کے اندھیروں میں علم کے چراغ روشن کئے، امیوں میں تعلیم کتاب وحکمت جاری کی شرک وکفر کے اندھیاروں میں توحید وسنت کے دیپ جلائے، آپ نے کئی سال مکہ میں ظلم وستم برداشت کئے طعنے سہے، گالیاں سنیں، اپنے ساتھیوں کی قربانیاں پیش کیں، آزمائشوں کے دریا عبور کئے پھر اپنے صحابہ کو حبشہ کی طرف ہجرت کرنے کا حکم دیا، پھر اپنے ساتھیوں کے ہمراہ خود مدینہ کی طرف ہجرت کی جہاں رہ کر آپ نے ایک ریاست قائم کی، جو سب سے پہلی اسلامی ریاست تھی، یہاں آپ نے امر خداوندی کے تحت کفر کے سرخیلوں اور سرغنوں کا مقابلہ کیا، کئی معرکوں میں انہیں شکست وہزیمت سے دوچار کیا، اور اسلام کی صداقت وحقانیت کا لوہا منوایا، اور اسلامی پرچم بلند کیا۔

آپ ﷺ نے رفتہ رفتہ اصلاح امت کی طرف بھی توجہ دی، عبادت وریاضت کی تعلیم دی، کتاب وسنت کے اصول وقوانین بیان کئے، اسلامی زندگی کیسے بنتی ہے؟ اس پر محنت کی، امت میں دین کی نہریں اور چشمے کیسے جاری ہوں؟ اس کی منصوبہ بندی کی، صحابہ کرامؓ کی جماعتوں کی جماعتیں اشاعت اسلام کے لیے مختلف علاقوں میں روانہ کردیں، عدل وانصاف قائم کیا، غرضیکہ منصب رسالت کا جو جو تقاضا تھا اسے پورا کرتے تھے۔

آپ ﷺ چالیس سال تک تفکراتی عبادت کے لئے غار حرا کی طرف جایا کرتے تھے، چالیس سال کی تکمیل پر جبرائیل وحی لے کر حاضر ہوئے، پھر سلسلہ نبوت چل پڑا، کچھ عرصہ خاموش تبلیغ کی، پھر حکم خداوندی سے اعلانیہ کام شروع کردیا، فاران کی بلندیوں پہ پہلی اعلانیہ دعوت دی، مکہ اور مدینہ کل تیئس سال تک اللہ کے پیغامات پہنچاتے رہے، دشمنوں کو دوست بناتے رہے، اجنبیوں کو قریب لاتے رہے، مخالفوں کو حامی بناتے رہے، مارنے والوں کو معاف کرتے رہے اپنے رشتہ داروں کے قاتلوں کو عام معافی دیتے رہے مدینہ میں

رہائش پزیر ہونے کے بعد مکہ فتح کیا،ازیں دوران مخالفوں کو عام معافی دی،اپنے اخلاق اور عمدہ خصائل سے بڑے بڑے دشمنوں کوموم کرلیا کرتے تھے۔

ختم رسالت وختم نبوت

پہلے پہلے اللہ قوموں کی اصلاح کے لیے نبی بھیجتے تھے،ان کے تقاضے کے مطابق نبی آتے رہے، یہ وہ وقت تھا جب امتیں یا تو صحیح معنوں میں امتیں نہ تھیں،اگر تھیں تو ان میں ابھی خامی تھی،وہ بہت بڑی ذمہ داریاں اٹھانے کی استعدادنہیں رکھتی تھیں، پہلے لوگ بس اتنا ہی کرسکتے تھے کہ ان کا کوئی مسئلہ الجھ گیا تو نبی نے آ کر سلجھادیا،تاریخ انسانی کے یہ دواہم موڑ ہیں،ایک ختم نبوت سے پہلے کا دوراور دوسراختم نبوت کے بعد کا دور چونکہ نبوت ورسالت کا مقصدتو یہی ہوتا ہے، کہ خالق اپنے خاص بندے کے ذریعے اپنا پیغام مخلوق تک پہنچاتے، اب پہلی امتوں میں یہ صلاحیت نہ تھی کہ وہ اللہ کا پیغام دوسروں تک پہنچادیں،وہ ابھی خام حالت میں تھیں جس طرح سونا کان سے نکل کر خام حالت میں ہوتا ہے پھراس پر بتدریج پختگی اورتوانائی آتی رہتی ہے،جب رفتہ رفتہ خامی دور ہوتی گئی،انسان میں اللہ تعالیٰ کے احکامات دوسروں تک پہنچانے اورنبوی طریقے کے مطابق محنت کرنے کی صلاحیت پیدا ہوگئی،تو اس نورانی سلسلہ کوختم کردیا گیا،ختم رسالت ونبوت سے پہلے جوانسانیت کی خامی تھی،رفتہ رفتہ دور کی جاتی رہی،اسی بناء پر ہرقوم اورامت میں نبی اوررسول تشریف لاتے رہے،مگران میں سے کسی کی تعلیم کو بقاءودوام حاصل نہ ہوسکا،اورایسانہ ہوناضروری تھا،اس لیے اگران کی تعلیم کو بقاحاصل ہوجاتا تو اس سلسلہ کو بمہر کردیا جاتا جس سے انسانوں میں وہ پختگی پیدانہ ہوسکتی،جو بہت بڑی ذمہ داری اٹھانے کی صلاحیت رکھتی اگر یہ پختگی اور جماؤ پیدا نہ ہوتا تو پھر خلافت ونیابت کا تصورنہ ابھرسکتا جوختم نبوت کے بعد ابھر کرسامنے آیا۔

ختم نبوت کے بعد جوہرانسانیت کی خامی دور کرنے کا مرحلہ ختم ہو چکا تھا،اب انسانی صلاحیتوں اوراستعدادوں میں پختگی وتوانائی آچکی تھی،اب اس سلسلہ کو بند کرنا ناگزیر

تھا، اب نبیوں اور رسولوں کا آنا، ان کی تعلیمات میں کمی بیشی اور ردوبدل کرنا سخت مضر تھا، اسی بناء پر ایک رسول کی تعلیم کو اصح، اور انفع قرار دیا گیا اس کی نبوت کو اکمل اور اعلیٰ قرار دیا گیا، اس کے دین کو عالمگیر اور دائمی بنا دیا گیا، اس کی نبوت کو قیامت تک کے لیے حتمی اور آخری قرار دیا گیا، اس کے بعد کوئی نبی نہیں آئے گا، رسول نہیں آئے گا، کوئی کتاب نہیں آئے گی، ارشاد ربانی ہے۔ ﴿ما کان محمد ابا احد من رجالکم ولکن رسول اللّٰہ وخاتم البنیین﴾ ''حضرت محمد ﷺ تمہارے مروں میں سے کسی کے باپ نہیں ہیں، مگر وہ اللہ کے رسول اور خاتم النبیین ہیں۔'' لغت عرب میں ختم کے معنی بند کرنے ''مہر لگانے'' ختم کر دینے اور کام سے فارغ ہو جانے کے ہیں مثلاً ختم الاناء برتن کا منہ بند کر دیا، ختم الکتاب خط پر مہر لگا دی۔ ختم علی القلب دل پر مہر لگا دی، ختم الشیی (بلغ آخرہ) شے کے آخر تک پہنچ گیا، ختم القوم (آخرھم) قوم کا آخری آدمی، ختم العمل (فرغ من العمل) کام سے فارغ ہو گیا۔　(جستہ جستہ از حدیث کا درایتی معیار)

حضرت رحمت دو عالم ﷺ پر نبوت و رسالت کا سلسلہ ختم کر دیا گیا، آپ تمام انسانوں کے رسول ہیں، ہر قوم کے ہر گروہ کے لیے رسول ہیں، علیحدہ رسول و نبی کی ضرورت ختم ہو گئی، ارشاد ربانی ہے: ﴿وما ارسلنٰک الا کافۃ لِلناس بشیرا ونذیرا﴾ ''اور ہم نے آپ کو عام انسانوں کے لیے خوشخبری سنانے والا اور ڈرانے والا بنا کر بھیجا ہے۔''

حضرت محمد ﷺ سے ہی کہلوایا گیا۔ ﴿قل یاایھاا لناس انی رسول اللّٰہ الیکم جمیعا﴾ ''آپ فرما دیں اے لوگو! میں تم سب کی طرف رسول بنا کر بھیجا گیا ہوں۔''

آپ ﷺ کو جو دین دیا گیا، اس دین کو کامل و مکمل قرار دیا گیا، کہ آج میں نے تمہارا دین تمہارے لئے مکمل کر دیا ہے۔

حضرت رحمت اللعالمین ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ بنی اسرائیل کی قیادت انبیاء کرتے تھے، جب کسی نبی کا وصال ہو جاتا تھا، تو دوسرا نبی اس کا جانشین ہوتا تھا، مگر میرے بعد کوئی نبی نہ ہوگا، بلکہ خلفاء ہوں گے۔　(بخاری ج ا کتاب المناقب)

حضرت محمد رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: میری اور مجھ سے پہلے گزرے انبیاء کی مثال ایسی ہے جیسے ایک شخص نے ایک عمارت بنائی اور خوب حسین وجمیل بنائی مگر اس کے ایک کونے میں ایک اینٹ کی جگہ چھوڑ دی، لوگ اس عمارت کے گرد چکر لگا کر دیکھتے، اور اس کی خوبی پر اظہار حیرت کرتے ہوئے کہتے تھے کہ اس جگہ اینٹ کیوں نہ رکھی گئی؟ وہ اینٹ میں ہوں اور میں خاتم النبیین ہوں۔ (بخاری ج ۱)

حضرت نبی اکرم ﷺ کا ارشاد گرامی ہے ﴿فجئت فختمت الانبیاء﴾ (پس میں آیا اور میں نے انبیاء کا سلسلہ ختم کر دیا۔) حضرت رحمت دو عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا: ﴿ان الرسالة والنبوة قد انقطعت فلا رسول بعدی ولا نبی﴾ (مسند احمد بن حنبل) "رسالت ونبوت کا سلسلہ ختم ہو گیا، میرے بعد اب نہ کوئی رسول ہے اور نہ نبی۔" آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ﴿کان کل نبی یبعث الی قومه خاصة ویبعث الی کل احمر واسود﴾ (مسلم ج ۱) "ہر خاص نبی اپنی قوم کی طرف بھیجا جاتا اور میں ہر سرخ وسیاہ کی طرف بھیجا گیا ہوں۔" آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ﴿ارسلت الی الخلق کافة وختم بی النبیون﴾ (مسلم) "میں تمام مخلوق کی طرف بھیجا گیا ہوں اور میرے اوپر نبیوں کا سلسلہ ختم ہو گیا۔"

نبوت ورسالت کی بحث کا خلاصہ

(۱) رسالت ونبوت کے ذریعے حق تعالیٰ مخلوق تک اپنا پیغام پہنچاتے ہیں۔

(۲) رسول انسان ہوتے ہیں لیکن عام انسانوں جیسے نہیں، بلکہ ان میں اعلیٰ صفات ہوتی ہیں۔

(۳) انبیاء گناہوں سے معصوم ہوتے ہیں۔

(۴) رسالت کسب ومحنت سے نہیں ملتی، بلکہ وہبی چیز ہے، جسے خدا چاہتا ہے دے دیتا ہے۔

(۵) ہمہ گیر اور عالمگیر رسالت صرف حضرت محمد ﷺ کی ہے۔

(۶) نبی مطاعِ مطلق ہوتا ہے، اس کی اتباع ضروری ہے۔

(۷) منصبِ رسالت عظیم ہوتا ہے اس کا لحاظ رکھنا ضروری ہے۔

(۸) رسالتِ محمدی تمام رسولوں کی رسالت سے افضل و اعلیٰ ہے۔

(۹) آپ ﷺ رسالت و نبوت کے آخری تاجدار ہیں، آپ کے بعد نبوت کا سلسلہ بند کر دیا گیا، آپ ﷺ والا کام آپ کی امت کے ذمہ لگا دیا گیا ہے، نبوت ختم ہوگئی مگر کارِ نبوت ابھی باقی ہے، امت کے ہر شخص کے لیے یہ ضروری ہے کہ وہ نبوی دین کو خود بھی سیکھے اور دوسروں کو سکھائے۔ (چیدہ چیدہ از اسلامی عقائد)

یَا رَبِّ صَلِّ وَسَلِّمْ دَائِمًا اَبَدًا عَلٰی حَبِیْبِکَ خَیْرِ الْخَلْقِ کُلِّهِم

❁❁❁❁❁

خصوصیت نمبر ۵۱

رسولِ اکرم ﷺ کو اللہ تعالیٰ نے خاص رعب عطا فرمایا تھا

قابلِ احترام قارئین! رسولِ اکرم ﷺ کی امتیازی خصوصیات میں سے یہ اکاون نمبر خصوصیت ہے، جسکا عنوان ہے "رسولِ اکرم ﷺ کو اللہ تعالیٰ نے خاص رعب عطا فرمایا تھا" جیسا کہ آنے والے اوراق میں اس خصوصیت کی وضاحت کی جارہی ہے، لیکن اس وضاحت سے پہلے گزشتہ خصوصیات کی طرح یہاں بھی بتاتا چلوں، کیونکہ میری زندگی کا یہی سب سے بڑا سرمایا ہے کہ بحمد اللہ دیگر خصوصیات کی طرح اس خصوصیت کو بھی میں نے ریاض الجنۃ میں بیٹھ کر روضہ رسول ﷺ کے سائے میں ترتیب دیا ہے، کیونکہ میرا ایمان ہے کہ روضہ رسول ﷺ کے سائے میں بیٹھ کر روضہ اقدس میں آرام فرمانے والے عظیم پیغمبر ہم سب کے پیارے آقا ﷺ کی خصوصیت کو لکھنا اور ترتیب دینا بہت بڑی سعادت ہے، میری دلی دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ بار بار مجھے مدینہ بلائے اور پھر اپنے محبوب ﷺ کی محبوب مسجد اور پھر پیارے روضہ کے سامنے بٹھا کر آقا ﷺ کی سیرت کے ہر ہر گوشے کو لکھنے کی توفیق عطا فرمائے آمین۔

بہر حال محترم قارئین! خصوصیات مصطفیٰ ﷺ جلدِ سوم کی پہلی اور مجموعی طور پر اکاون نمبر خصوصیت شروع کی جارہی ہے، بے شک دیگر خصوصیات کی طرح یہ خصوصیت بھی ہمارے نبی ﷺ کی ایک عظیم خصوصیت ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضور پاک ﷺ کو دیگر انبیاءؑ کی بنسبت ایک خاص رعب عطا فرمایا تھا جیسا کہ آپ ﷺ نے خود بھی فرمایا کہ مجھے خاص رعب عطا کیا گیا جو دیگر انبیاء کو عطا نہیں کیا گیا، آنے والے اوراق میں احادیث کی روشنی میں اسی کی تفصیل کو پیش کیا گیا ہے، امید ہے کہ انشاء اللہ اس خصوصیت کا مطالعہ بھی ہمارے

دلوں میں آپ ﷺ کی محبت میں اضافے کا ذریعہ ہوگا انشاءاللہ۔ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہم سب کو حضور ﷺ سے سچی محبت اور آپ ﷺ کی جملہ تعلیمات پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے آمین یارب العالمین۔ لیجئے اب آنے والے اوراق میں ایک ضروری تمہید کے بعد اس خصوصیت کی تفصیل ملاحظہ فرمائیے:۔

ایک ضروری تمہید

دیگر انبیاء کے مقابلے میں جس قدر خصائص آپ ﷺ کو عطا ہوئے ہیں ان میں سے بہت سے خصائل متعدد و معتبر احادیث میں مختلف تعدادوں میں نام بنام خود زبان اقدس ﷺ سے ادا ہوئے ہیں، صحیحین میں حضرت جابرؓ سے مروی ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا! مجھے پانچ چیزیں ایسی دی گئی ہیں جو مجھ سے پہلے کسی پیغمبر کو نہیں دی گئیں، مجھے رعب اور دھاک کے ذریعے سے فتح ونصرت دی گئی، میرے لئے تمام روئے زمین سجدہ گاہ بنائی گئی، غنیمت کا مال میرے لئے حلال کیا گیا جو مجھ سے پہلے کسی پیغمبر کے لئے حلال نہیں تھا، مجھے شفاعت کا مرتبہ عنایت ہوا، مجھ سے پہلے انبیاء خاص اپنی اپنی قوموں کی طرف مبعوث ہوتے تھے اور میں تمام دنیا کے لئے مبعوث ہوا۔ صحیح مسلم میں حضرت ابو ہریرہؓ نے آنحضرت ﷺ کی زبانی چھ باتیں گنائی ہیں، مجھے جوامع الکلم عنایت ہوئے، رعب وداب سے نصرت دی گئی، مال غنیمت میرے لئے حلال کیا گیا، تمام روئے زمین میرے لئے مسجد بنی، میری بعثت تمام دنیا کی طرف ہوئی، انبیاء علیہم السلام کا سلسلہ میری ذات پر ختم ہوا۔

احادیث کی دیگر روایتوں میں بعض اور خصائص بھی زبان اقدس ﷺ سے بیان ہوئے ہیں مثلاً یہ کہ میرا معجزۂ وحی قیامت تک کے لئے ہے، میرے پیروکار تمام انبیاءؑ سے زیادہ ہیں، میری نبوت اولین ہے، مجھ کو فلاں فلاں سورتیں دی گئیں جو کسی اور کو نہیں ملیں، فلاں فلاں وقت کی نمازیں خاص میری امت کے لئے فرض ہوئیں، مگر حقیقت میں ان میں بعض جزئیات ایسی ہیں جو ان ہی چھ عنوانات کے تحت کسی نہ کسی حیثیت سے درج

ہیں۔سورتوں کی خصوصیات جوامع الکلم میں داخل ہیں، بعض نمازوں کے اوقات کا اضافہ ختم نبوت کے مدارج کے اندر ہے۔قرآن کریم میں آپ ﷺ کی دو خصوصیتیں مذکور ہوئیں ہیں وہ ان سب کو جامع ہیں، یعنی تکمیلِ دین اور ختمِ نبوت ان دونوں سے متعلق پچھلی جلدوں میں تفصیلی کلام پیش کر دیا گیا ہے، ان ہر دو خصوصیات کی اہمیت کے پیش نظر ایک بار پھر انکا مطالعہ کرلیا جائے تو بہتر ہے، انشاء اللہ۔بہر حال اجمال کو چھوڑ کر ذیل میں ہم کو نمایاں خصوصیات پر قرآن پاک اور احادیث صحیحہ کی روشنی میں ایک تفصیلی نظر ڈالنا ہے۔

چنانچہ خصوصیات مصطفیٰ ﷺ کی اس تیسری جلد میں پہلے مندرجہ بالا احادیث میں آنے والی خصوصیات کی تفصیل کو پیش کیا جارہا ہے اور اس کے بعد دیگر خصوصیات پیش کی جائیں گی انشاء اللہ، لیجئے ملاحظہ فرمایئے:۔

اکاون نمبر خصوصیت کی وضاحت احادیث کی روشنی میں

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے جو انبیاءؑ دنیا میں آئے وہ دو قسم کے تھے، یا بظاہر کمزور اور بے یار و مددگار تھے اور ان کو دنیاوی طاقت کا کوئی حصہ عطا نہیں ہوا تھا، پیغمبروں کی بڑی تعداد ایسی ہی تھی، دوسرے وہ انبیاء ہیں جن کو دنیا کی ظاہری طاقت بھی ملی تھی اور وہ صرف چند ہیں، حضرت موسیٰؑ حضرت داؤدؑ اور حضرت سلیمانؑ، مگر ان میں سے کسی کو بھی نام نامی کے رعب اور ہیبت کا انعام عطا نہیں ہوا اور تاریخ اس بات پر شاہد ہے۔آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا آغاز گوایوبی، بے چارگی اور مسیحی غربت سے ہوا، مگر انجام موسوی طاقت راداری سلطنت اور سلیمانی شان وشکوہ پر ہوا اور ان سب سے مافوق یہ تھا کہ آپ ﷺ کی تمام تر قوت، طاقت، رعب وہیبت سب اللہ کی راہ میں صرف ہوئی، اس سے گم گشتوں نے راستہ پایا، بھولوں نے یاد کیا، سننے والوں نے آواز دی اور یہ اثر پیدا ہوا کہ آپ ﷺ جس راستے سے نکل جاتے، گناہ گار اور مجرم سر اطاعت خم کر دیتے اور اپنی سیہ کاریوں پر ندامت کا اظہار کرتے تھے۔

متعدد احادیث میں ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ مجھے فتح و نصرت، رعب و ہیبت کے ذریعہ بخشی گئی، یہاں تک کہ میری دھاک ایک مہینہ کی مسافت تک پر کام کرتی ہے۔
علامہ ابن خلدون نے مقدمہ میں فنون جنگ پر بحث کرتے ہوئے نہایت خوبی سے بتایا ہے کہ لڑائیوں میں کسی ایک فریق کو جو فتح ہوتی ہے، وہ اسی وقت ہوتی ہے جب دوسرے فریق پر پہلے کی خداداد مرعوبیت چھا جاتی ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اسم گرامی کو یہ شرف اسلئے عطا ہوا تا کہ مزید خونریزی کے بغیر ملک میں امن وامان اور سکون واطمینان پیدا ہو جائے اور صدائے حق کیلئے راستہ صاف ہو، قرآن مجید میں بھی اللہ تعالیٰ نے اس وصف کے عطا کرنے کا وعدہ فرمایا تھا "سَاُلْقِیْ فِیْ قُلُوْبِ الَّذِیْنَ کَفَرُوا الرُّعْبَ. (انفال) "عنقریب کافروں کے دلوں میں رعب ڈالوں گا۔"

چنانچہ یہ وعدہ پورا ہوا اور قرآن نے شہادت دی کہ فَقَذَفَ فِیْ قُلُوْبِهِمُ الرُّعْبَ. (احزاب وحشر) "اور خدا نے ان کے دلوں میں رعب ڈال دیا"۔

چنانچہ بڑے بڑے دل گردہ رکھنے والے بہادر زہر میں تلواریں بجھا بجھا کر آئے مگر جب روئے روشن پر نظر پڑی تو کانپ کر رہ گئے، بڑے بڑے سرکش قبائل آپ کا نام سن کر دم بخود ہو جاتے تھے، مدینہ کے آس پاس کے یہود جو بڑے بڑے قلعوں میں بیٹھ کر فرمانروائی کرتے تھے اور جن کو اپنی فوجی قوت اور جنگی سامانوں پر ناز تھا جب انہوں نے سرتابی کی، بے لڑے بھڑے آپؐ کے سامنے اطاعت کی گردن ڈال دی، خیبر کے قلعہ نشین یہود جو سب سے زیادہ مضبوط تھے، جب ایک صبح کو ان کے قلعوں کے سامنے دفعتاً لشکرِ اسلام طلوع ہوا تو ان کے منہ سے چیخ نکل گئی کہ "محمد کا لشکر" ابوسفیان جو بارہا ایک فریق مقابل کی حیثیت سے میدانِ جنگ میں فوجوں کے پرے لگاتا رہا، فتح مکہ کے دن جب حضرت عباسؓ اسکو لے کر اسلام کے موجزن دریائے الٰہی کا نظارہ دکھا رہے تھے اور رنگ برنگ کے علم نگاہوں کے سامنے سے گزر رہے تھے تو ہر نئے دستہ اور نئے علم کو دیکھ کر کانپ

کانپ جاتا تھا۔ باایں ہمہ اس مجسمہ ہیبت کا حال کیا تھا، نا آشنا ڈرتے تھے اور وہ ان کو تسکین دیتا تھا، بے خبر اس سے رعب کھاتے تھے، اور باخبر پرواہ نہ کرتے تھے کہ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗ اَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَآءُ بَيْنَهُمْ. ”محمد رسول اللہ اور ان کے ساتھی کافروں پر بھاری اور آپس میں رحم دل ہیں“۔

ایک بدوی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا، جیسے ہی چہرہ مبارک پر نظر پڑی، کانپ گیا، فرمایا ڈرو نہیں، میں بادشاہ نہیں ہوں، ایک قریشی عورت کا بیٹا ہوں جو سوکھا گوشت پکا کر کھایا کرتی تھی۔ حضرت مخرمہ صحابیؓ نے اپنے بیٹے اسود سے کہا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم زنان خانہ میں ہیں، آپ کو آواز دو، وہ ہچکچانے لگے، باپ نے کہا جانِ پدر! محمد صلی اللہ علیہ وسلم جبّار نہیں، یہ ہیبت، یہ وقار، یہ دبدبہ، یہ رعب، تیغ وسنان کی چمک، فوج وعسکری کے تلاطم، جلادوں کی صف بندی اور تیغ وبکف سپاہیوں کی نمائش سے نہیں پیدا ہوا بلکہ۔

ہیبت حق است ایں از خلق نیس　　ہیبت ایں مردِ صاحبِ دلق نیست　(رومی)

(بحوالہ سیرت النبی ﷺ جلدِ سوم)

اور رسول اکرم ﷺ کی اس عظیم خصوصیت سے متعلق قاضی سلیمان منصور پوریؒ اپنی مایہ ناز کتاب رحمۃ اللعالمین میں رقمطراز ہیں، استفادہ عام کے لئے اُسے بھی پیش کیا جاتا ہے ملاحظہ فرمائیے:۔

نبی ﷺ کے ۲۳ سالہ عہد نبوت پر نظر ڈالو، سرور عالم تبلیغ ودعوت کے لیے شہر مکہ کے اندر اور آبادیِ مکہ سے باہر، یکہ وتنہا رات ہو یا دن تن تنہا تشریف لے جایا کرتے تھے، مگر کسی شخص کو حضورؐ پر جاں ستاں حملہ کرنے کا حوصلہ نہیں ہوا۔

منڈیوں اور میلوں میں جہاں ہزار ہا اشخاص اور پچاسوں مختلف قبائل کا اجتماع ہوا کرتا تھا، حضور ﷺ جاتے اور کلمہ توحید کا اعلان فرماتے، دیوتا دیوی کے ماننے والوں میں سے کوئی بھی حضور ﷺ پر حملہ آور نہ ہوسکتا تھا۔

مکہ سے دور دراز قبائل میں جو خشونت اخلاق اور خوں ریزی دبے باکی میں بہت زیادہ مشہور تھے، حضور نے تبلیغ کے لئے متعدد چکر لگائے، اس سفر میں ابوبکر صدیقؓ کے سوا اور کوئی بھی حضور کے ہمرکاب نہ ہوتا تھا، ابوبکرؓ سے بھی ان قبائل کو کچھ تعارف نہ تھا، حضور ﷺ ہر جگہ دعوت فرماتے، ہر ایک کے سامنے بتوں کی نفی فرماتے لیکن کوئی بھی حضور ﷺ کے سامنے برسر پیکار نہ آتا۔

آغار سفر ہجرت سے تین روز پہلے ایک ایک قبیلہ کا بہادر دشمنوں نے جمع کرلیا تھا، انہوں نے حضورؐ کے گھر کا محاصرہ کرلیا تھا، لیکن ہر ایک کے دل پر کتنا رعب تھا کہ تختے توڑ کر اندر داخل ہونے کی کسی میں جرأت نہ تھی، ساری رات اس انتظار میں پوری کردی کہ حضورؐ خود ہی باہر تشریف لائیں تو یہ حملہ کریں جب حضورؐ تن تنہا باہر بھی نکلے تو **شاھت الوجوہ لاینصرون** کے کلام سے ان کو غصہ بھی دلایا اور مٹھی بھر خاک اٹھا کر ان کے سروں پر بھی پھینک دی، بایں ہمہ کسی نے سر نہ اٹھایا اور حضور کے چہرہ تاباں کی طرف کوئی نظر اٹھا کر بھی نہ دیکھ سکا۔

طائف کا حکمران اور تمام باشندے حضورؐ کے خلاف ہیں، مگر ان کی سنگ باری اور شرارت صرف اسی حد تک محدود ہے کہ حضورؐ کی تقریر نہ ہوسکے، آخر وہی اہل طائف ہیں اور وہی ان کا حکمران ابن عبد یالیل، کہ خود مدینہ میں حاضر ہوتے اور داخل اسلام ہوجاتے ہیں

نصرت بالرعب کی مثالیں اس زمانہ کی بڑی بڑی سلطنتوں کے حالات سے بھی ہویدا ہیں، یمن سلطنت ایران کے قبضہ سے نکل جاتا ہے، اور کسی جنگ کے بغیر مطیع اسلام ہوجاتا ہے، مگر سلطنت ایران یمن کی طرف منہ بھی نہیں کرتی، اس لیے کہ حضورؐ کا رعب ان کے دل ودماغ پر چھایا ہوا تھا۔

شمالی عرب سلطنت روما کے اقتدار سے نکل جاتا ہے اور روما کا شہنشاہ فراہمی افواج اور حملہ آوری کا حکم بھی جاری کردیتا ہے اور اسی کی مدافعت کے لیے حضورؐ عرب کی سرحد تبوک تک تشریف بھی لے جاتے ہیں مگر ایک مہینہ کی راہ پر (یروشلم میں) بیٹھے ہوئے ایمپرر کا دل

خوف سے بھر جاتا ہے اور سابقہ احکام جنگ کو منسوخ کر کے دم بخود ہو کر بیٹھ جاتا ہے۔

عرب کی قدیم ترین سلطنتیں حیرہ وغسان قائم ہیں، انہی کے دربار کے شعرائے خاص حسان بن ثابت اور کعب انصاری تاج پوش بادشاہوں کو چھوڑ کر بوریا نشین رسولؐ کے آستان پر حاضر ہو گئے ہیں، مگر ان سلطنتوں میں سے کسی کو یہ حوصلہ نہیں پڑتا کہ اپنے شعرائے خاص کو واپس لینے کے لیے ہی اظہار طاقت کریں اور دربار عالی کے خدام تک کوئی دھمکی سے ملا ہوا فقرہ بھی پہنچا سکیں۔

ذی ظلیم، ذی ایران کی حکومتیں یمن کی جانب اور مکہ سے متصل قائم ہیں ان میں سے ہر ایک حکومت کے پاس باقاعدہ فوج بھی موجود ہے اور خزانے بھی معمور ہیں، وہ گھر بیٹھے حضور کا کلمہ پڑھنے لگے ہیں، عدوان وسرکشی کا خیال تک بھی ان کے دماغ میں نہیں آتا۔

ذوالکلاح حمیری اپنے گھر میں بیٹھا پندرہ ہزار علاموں سے سجدہ کراتا اور خدا کہلاتا ہے لیکن ایسے رسولؐ سے وہ بھی دل ہی دل میں ڈر رہا ہے، جس نے کئی ایسے دعاوی فرعونیت کو غرقاب کر دیا، اس عبدہ ورسولہ کہلانے کا رعب مسجود ومعبود بننے والے کو مغلوب کیے ہوئے ہیں۔

نبی ﷺ کی یہ صفت خاص نزدیک ودور ہر جگہ جلوہ گستر تھی، امیر المومنین علی المرتضیٰ کا فقرہ ہے، من راٰہ بدیهةً هابَهٗ جو کوئی حضور کے سامنے یکا یک آ جاتا وہ دہشت زدہ ہو جاتا یہ وہ نصرت الٰہیہ تھی جو رعب بن کر حضورؐ کی حشمت وعظمت کو دوبالا کر رہی تھی، "وصلی اللّٰہ علی حبیبه محمد واٰله وبارک وسلم"

يَا رَبِّ صَلِّ وَسَلِّمْ دَائِمًا اَبَدًا عَلٰى حَبِيْبِكَ خَيْرِ الْخَلْقِ كُلِّهِم

(بحوالہ رحمۃ اللعالمین جلد سوم)

خصوصیت نمبر ۵۲

رسولِ اکرم ﷺ کے لئے اللہ تعالیٰ نے ساری زمین کو سجدہ گاہ بنایا

قابلِ احترم قارئین! رسولِ اکرم ﷺ کی امتیازی خصوصیات میں سے یہ باون نمبر خصوصیت ہے، جسکا عنوان ہے ''رسولِ اکرم ﷺ کے لئے اللہ تعالیٰ نے ساری زمین کو سجدہ گاہ بنایا'' جیسا کہ آنے والے اوراق میں اس خصوصیت کی وضاحت کی جارہی ہے، لیکن اس وضاحت سے پہلے گزشتہ خصوصیات کی طرح یہاں بھی بتادیا جائے تو بہتر ہے، کیونکہ میری زندگی کا یہی سب سے بڑا سرمایا ہے کہ بحمد اللہ دیگر خصوصیات کی طرح اس خصوصیت کو بھی میں نے ریاض الجنۃ میں بیٹھ کر روضہ رسول ﷺ کے سائے میں ترتیب دیا ہے، اللہ تعالیٰ قبول فرمائے، آمین یارب العالمین۔

بہرحال محترم قارئین! منجملہ خصوصیات میں سے ذیل کی خصوصیت بھی آپ ﷺ کی ایک عظیم خصوصیت ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کے لئے اور آپ ﷺ کے صدقے آپ ﷺ کی ساری امت کے لئے ساری زمین کو سجدہ گاہ بنادیا، بے شک یہ صرف آپ ﷺ ہی کی خصوصیت ہے اس سے پہلے کسی بھی نبی اور کسی بھی امت کے لئے ساری زمین کو سجدہ گاہ نہیں بنایا گیا، مزید تفصیل آپ آنے والے اوراق میں ملاحظہ فرمائیں گے انشاء اللہ، دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہم سب کو اپنے پیارے نبی ﷺ سے سچی محبت کرنے اور آپ ﷺ کی تمام تعلیمات پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے، آمین یارب العالمین۔

باون نمبر خصوصیت کی وضاحت قرآن واحادیث کی روشنی میں

اسلام کے علاوہ جس قدر مذاہب ہیں وہ اپنے مراسمِ عبادت کے ادا کرنے کیلئے چند گھری ہوئی چار دیواروں کے محتاج ہیں، گویا ان کا خدا ان ہی کے اندر بستا ہے، یہود اپنے

صومعوں اور قربان گاہوں سے باہر نہ خدا کو پکار سکتے ہیں اور نہ قربانی کے نذرانے پیش کر سکتے ہیں، عیسائی اپنے کنیسوں کے بغیر خدا کے آگے نہیں جھک سکتے، یہاں تک کہ بت پرست قومیں بھی اپنے بت خانوں ہی کی چہار دیواری کے اندر اپنے دیوتاؤں کو خوش کر سکتی ہیں لیکن اسلام کے عالمگیر مذہب کا خدا اس آب وگل اور سنگ وخشت کی چہار دیواریوں میں محدود نہیں، وہ ہر جگہ ہے اور ہر جگہ سے پکارا جاسکتا ہے، کوہ وصحرا، خشکی وتری، مسجد وغیر مسجد، ہر جگہ اس کے سامنے سجدہ کیا جاسکتا ہے، وہ جس طرح مسجدوں کے اندر ہے، مسجدوں کے باہر بھی ہے، اس کی قربانی مشرق ومغرب ہر جگہ گزرانی جاسکتی ہے۔

اَیْنَمَا تُوَلُّوْا فَثَمَّ وَجْهُ اللّٰهِ. ''جدھر منہ پھیرو، ادھر ہی خدا کا منہ ہے۔''

آپ ﷺ نے فرمایا کہ ''میرے لئے تمام روئے زمین سجدہ گاہ بنائی گئی۔'' یہ مسئلہ ہر چند ایک معمولی بات معلوم ہوتی ہے، مگر اسکے اندر وہ صداقت پنہاں ہے جو اسلام کی عالمگیری اور اسکے آخری مذہب ہونے کا اعلان عام کرتا ہے۔ (بحوالہ سیرت النبی ﷺ جلدِ اول)

اور آپ ﷺ کی اس خصوصیت سے متعلق صاحبِ رحمۃ اللعالمین لکھتے ہیں کہ یہود اپنے کنیسہ اور عیسائی اپنے کلیساء کے بغیر نماز نہ پڑھا کرتے تھے، مجوسی بھی پاک آگ کے آتش کدہ کے بغیر سرگرم عبادت نہ ہوا کرتے تھے، ہنود کا یہی حال مندروں کے متعلق تھا۔

مسلمانوں کی نماز نہ محراب عبادت کی محتاج اور نہ کسی نبی ہادی کی قبول توبہ کی ان کو حاجت ہے، ان کا گرمایا ہوا دل اور روشن آنکھیں آگ کی حرارت اور ضیا سے بے نیاز ہیں، اسی لیے روئے زمین کا ہر ایک بقعہ اور ہر ایک قطعہ ان کی سجدہ ریزی کے لیے موزوں ہے:

﴿یذکرون اللّٰہ قیاما وقعودا وعلی جنوبھم﴾ بیٹھے اور لیٹے لیٹے ذکر کی حالت طاری ہے اس لئے اللہ تعالیٰ نے روئے زمین کو حضور کی مسجد بنا دیا۔

یہ شرف اسی حقائق شناس کو ملا جس کی نگاہ میں کائنات کا پتہ پتہ توحید کے ترنم میں ہے، جس کے سامنے ریگستان کا ذرہ ذرہ انوار قدسی کا آئینہ دار ہے، جسے ہر شے مظہر جمال لم یزلی اور مرآۃ جلالی قدسی نظر آتی ہے جس کے کانوں میں پتھروں کی تسبیح اور سبزہ کی تحمید ہر

وقت گونج رہی ہے، جسے آسمان وزمین کی فضاء تکبیر وزمزمہ تہلیل سے بھری ہوئی نظر آتی ہے، اسی کے لیے تمام روئے زمین مسجد بھی بنادی گئی۔

اور آپ ﷺ نے اپنے اس خصوصیت سے متعلق حدیث شریف میں ﴿جُعِلَتْ لِیَ الارضُ مَسْجِدًا وَّ طُهُوْرًا﴾ فرمایا کہ روئے زمین کو میرے لئے مسجد وطہور بنادیا گیا چنانچہ سمجھ لیا جائے کہ یہاں طہور سے مراد وضو ہے اطراف بدن کا ہدایت شرعی کے مطابق پانی سے دھونا وضو کہلاتا ہے، وضو نماز کے لیے شرط ہے۔ مگر نماز کا ترک کسی حالت میں روا نہیں، عام طور پر یہ سمجھا جاسکتا تھا کہ شرط کے نہ ہونے سے مشروط بھی مفقود ہوجانا چاہیے اور جہاں وضو کے لیے پانی میسر نہ ہو، وہاں نماز بھی معاف ہوجانی چاہیے۔ لیکن کیا نماز ان لوگوں پر معاف ہوجاتی ہے جو گھاس کے پتے پتے سے وحدہ لاشریک کے سننے والے اور درخت کے پتے پتے کو دفتر معرفت جاننے والے ہیں۔ ضرور تھا کہ انسان حصول طہارت کے لیے کوئی دوسری تدبیر اختیار کرتا انسان مٹی ہی سے بنا ہے مٹی ہی اس کی اصل ہے اور مٹی ہی اس کو بن جانا ہے، مٹی ہی مخلوقات کا گہوارہ ہے اور مٹی ہی سے کائنات ارضی اپنی خوراک حاصل کرتی ہے، اس لیے اس مٹی ہی کو طہور بھی بنادیا گیا، ہندوؤں میں سندھیا کے لیے ہون ضروری ہے اور ہون کے لئے تین چیزوں کا ہونا ضروری ہے اس میں سے ایک گھی بھی ہے گھی کے سولہ چمچے آگ میں ڈالنا ضروری ہیں ہر ایک چمچہ چھ ماشہ کا ضروری ہے (ستیارتھ پرکاش)

سندھیا کے لیے ہون کی شرط نے اور ہون کے لیے ۳۶ چیزوں کی موجودگی کی شرط نے ہندو قوم کے افراد کو سندھیا سے محروم کردیا ہے۔ مٹی کہاں نہیں مل سکتی؟ جہاں پانی نہ ہوگا، وہاں پر مٹی تو ضرور مل جائے گی، خاک آلود ہاتھوں کا چہرے پر پھرالینا اس عجز وتفرکو ہی ظاہر کرتا ہے، جس نے طہور تراب پر ایماندار کو مجبور کیا۔ الغرض یہ خصوصیت نبی ﷺ ہی کی ہے کہ حضور ﷺ نے تُرابِ روئے زمین کو ہمارے لیے طہور بتادیا اور حضوریِ بارگاہ ربانی سے کسی حالت میں بھی دور ومہجور نہ ہونے دیا۔ (بحوالہ رحمۃ اللعالمین جلدِ اول)

یَا رَبِّ صَلِّ وَسَلِّمْ دَائِمًا اَبَدًا عَلٰی حَبِیْبِکَ خَیْرِ الْخَلْقِ کُلِّهِم

خصوصیت نمبر ۵۳

رسولِ اکرم ﷺ کی پیروی کرنے والوں کی تعداد سب سے زیادہ ہے

قابلِ احترام قارئین! رسولِ اکرم ﷺ کی امتیازی خصوصیات میں سے یہ ترپین نمبر خصوصیت ہے، جسکا عنوان ہے ''رسولِ اکرم ﷺ کی پیروی کرنے والوں کی تعداد سب سے زیادہ ہے'' جیسا کہ آنے والے اوراق میں اس خصوصیت کی وضاحت کی جارہی ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ بھی آپ ﷺ کی ایک عظیم خصوصیت ہے کہ تمام انبیاءؑ کے مقابلے میں آپ ﷺ کی پیروی کرنے والوں کی تعداد سب سے زیادہ ہے، جیسا کہ آپ آنے والے صفحات میں اس کی تفصیل ملاحظہ فرمائیں گے انشاء اللہ، جسے ہم نے احادیث کی روشنی میں ترتیب دیا ہے، امید ہے کہ انشاء اللہ اس کے مطالعے سے ہمارے قلوب میں آپ ﷺ کی محبت میں اضافہ ہوگا، دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہم سب کو آپ ﷺ کی تمام سنتوں پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے، آمین یارب العالمین۔ لیجئے تفصیل ملاحظہ فرمائیے:۔

ترپین نمبر خصوصیت کی وضاحت احادیث کی روشنی میں

دنیا میں لاکھوں پیغمبر آئے، مگر آج دنیا میں ان کی تعلیم وہدایت کی ایک یادگار باقی نہیں، یہاں تک کہ تاریخ کے اوراق میں بھی ان کا نام ونشان نہیں، وہ انبیاء جن کے صرف حالات معلوم ہیں، ان کی نسبت وہیں یہ بھی معلوم ہے کہ ان کی آواز پر لبیک کہنے والے چند سے آگے نہ بڑھ سکے۔ حضرت نوحؑ سے لے کر حضرت عیسیٰ علیہ السلام تک ایک ایک پیغمبر کا کارنامہ دیکھتے جایئے، حضرت موسیٰ کے سوا ایک بھی ایسا نہ ملے گا جن کے ماننے والے سو (۱۰۰) بھی ہوں، حضرت موسیٰ علیہ السلام کی کوششوں کے جولانگاہ صرف بنی اسرائیل کے چند ہزار نفوس تھے جو قدم قدم پر راہِ حق سے ہٹ ہٹ جاتے ہیں، کہیں

گوسالے کو پوجتے ہیں، کہیں خدا کو ان آنکھوں سے دیکھنے پر اصرار کرتے ہیں، کہیں سرفروشی اور جانبازی سے گھبرا کر میدانِ جنگ میں جانے سے انکار کر بیٹھتے ہیں، حضرت موسیٰ علیہ السلام کے معجزانہ کارنامے صرف اسی قدر اثر دکھاتے ہیں کہ چند دہائی انسان ان کی شیریں گفتاری کا دم بھرتے ہیں، مگر اس سے پہلے کہ مرغ بانگ دے، ابن آدم کو دشمنوں کے پنجہ میں اسیر کراتے ہیں اور تین دفعہ اس کے پہچاننے سے منکر ہوتے ہیں، لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ حال ہے کہ مکہ کی گلیوں میں آپ ﷺ نے تن تنہا بے یار و مددگار متلاشیانِ حق کو صدائے توحید دی، جواب میں ایک آواز بھی بلند نہ ہوئی، لیکن ۲۳ سال نہ گزرنے پائے تھے کہ ریگستان عرب کا ذرہ ذرہ لَا اِلٰـهَ اِلَّا اللّٰه سے پرشور ہو گیا اور جب آپؐ نے اسی مکہ کی سرزمین کے لئے حجۃ الوداع کا اعلان کیا تو کم و بیش ایک لاکھ جانثار و فدا کار دائیں بائیں کھڑے تھے۔

صحیح مسلم میں ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا جس قدر میری نبوت کی سچائی کا اعتراف کیا گیا ہے، کسی اور پیغمبر کی سچائی کا نہیں کیا گیا کہ بعض انبیاء ایسے بھی ہیں جن کو سچا کہنے والا ان کی امت میں صرف ایک ہی نکلا۔

صحیحین میں ہے کہ آپ نے فرمایا ''ایک دفعہ مجھ پر (عالم مثال میں) قومیں پیش کی گئیں، بعض پیغمبر ایسے تھے کہ ان کے پیچھے صرف ایک ہی دو آدمی تھے، بعض تنہا ہی تھے، ان کے ساتھ کوئی بھی نہ تھا، اتنے میں ایک بڑی بھیڑ نظر آئی۔ خیال ہوا کہ یہ میری امت ہوگی، تو بتایا گیا کہ یہ موسیٰؑ اور ان کی قوم ہے، پھر کہا گیا کہ دوسرے کنارے کی طرف دیکھو تو اتنا سوادِ اعظم نظر آیا کہ اس سے افق چھپ گیا، پھر کہا گیا ہے کہ اب ادھر بھی دیکھو، بڑی تعداد کثیر دکھائی دی، کہا گیا ہے کہ یہ سب تیری امت ہے۔'' (مسلم شریف) (بحوالہ از سیرت النبی ﷺ جلد سوم)

اور رسول اکرم ﷺ کی اس عظیم خصوصیت سے متعلق سیرت حلبیہ کے مصنف اپنے انداز میں یوں رقم طراز ہیں کہ خود آپ ﷺ کے زمانے کے لوگوں کے علاوہ آپ سے پہلے کے زمانے والوں کے لئے بھی اور آپ کے بعد کے زمانے والوں کے لئے بھی، یہاں تک

کہ درختوں اور پتھروں کے لئے بھی آپ کو نبی بنایا گیا، ایک روایت کے الفاظ یہ ہیں کہ "ہر نبی صرف اپنی قوم کی طرف بھیجا جاتا رہا ہے، یعنی اپنے زمانے کے تمام انسانوں کی طرف یا کسی خاص جماعت اور امت کی طرف۔"

چنانچہ ان میں سب سے پہلے حضرت نوح ہیں کیونکہ ان کو ان تمام انسانوں کی طرف نبی بنا کر بھیجا گیا، تھا جو ان کے دور میں اس زمین پر بستے تھے۔ جب ان کو یعنی حضرت نوح کو اللہ تعالیٰ نے اس بات کی خبر دی کہ سوائے کشتی والوں کے ان پر کوئی ایمان نہیں لائے گا تو انہوں نے ان باقی تمام آدمیوں کے لئے اللہ تعالیٰ سے بدعا کی کہ ان پر عذاب نازل فرمائے، کشتی کے یہ لوگ کل ملا کر اسی آدمی تھے جن میں چالیس مرد تھے اور چالیس عورتیں تھیں۔ مگر کتاب عوارف المعارف میں یہ ہے کہ کشتی والوں کی تعداد چار سو تھی۔

(ان دونوں میں لوگوں کی تعداد کے بارے میں جو اختلاف ہے اس کو دور کرنے کے لئے) یہ کہا جاتا ہے کہ چار سو کی تعداد انسانوں اور غیر انسانوں سب کی ملا کر تھی کیونکہ اس میں جانور بھی تھے اس طرح یہ اختلاف دور ہو جاتا ہے۔

غرض حضرت نوح کی بدعا کے بعد طوفان آیا اور تمام زمین پر بسنے والے اس سے ہلاک ہو گئے، صرف وہ لوگ زندہ بچے جو ان پر ایمان لے آئے تھے، تو اگر نوحؑ تمام انسانوں کے پیغمبر نہ ہوتے تو ان کی مخالفت کرنے اور بت پرستی کرنے کی وجہ سے نوح سے ان کے حق میں بدعا نہ کرتے کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ ﴿وما كنا معذبين حتى نبعث رسولا﴾ "اور ہم کبھی سزا نہیں دیتے جب تک کہ کسی رسول کو نہیں بھیج لیتے۔"

یہ بات ثابت ہے کہ نوح ہی وہ پہلے نبی ہیں جو بتوں کی پوجا کرنے والوں کے خلاف نبی بنا کر بھیجے گئے، کیونکہ بت پرستی سب سے پہلے ان ہی کی قوم نے شروع کی ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے ان کو نبی بنا کر ظاہر فرمایا تا کہ وہ لوگوں کو بت پرستی سے روکیں۔

آدمؑ کے متعلق روایت ہے کہ وہ سب سے پہلے رسول ہیں جن کو اللہ تعالیٰ نے ان کی اولاد کی طرف نبی بنا کر بھیجا تھا کہ وہ اللہ تعالیٰ پر ایمان لائیں اور اس کے پسندیدہ

طریقوں پر چلیں۔

بعض علماء نے لکھا ہے کہ آدم کو وہ سب باتیں بتلائیں جو حق تعالیٰ کو پسند ہیں نیز وہ جو ناپسند ہیں تو اس کے ذیل میں ان کو یہ بھی حکم فرمایا تھا کہ وہ اللہ تعالیٰ کی پسندیدہ باتوں پر عمل کرنے کے لئے حضرت حوا کو حکم دیں اور ناپسند باتوں سے بچنے کی ہدایت کریں۔

چنانچہ حق تعالیٰ کا ارشاد ہے: ﴿**وقلنا یا اٰدم اسکن انت وزوجک الجنة وکلا منها رغداحیث شئتما ولا تقرباهذه الشجرة**﴾ ''اور ہم نے حکم دیا کہ اے آدم رہا کرو تم اور تمہاری بیوی بہشت میں پھر کھاؤ دونوں ان میں سے بافراغت جس جگہ سے چاہو اور نزدیک نہ جاؤ اس درخت کے۔''

چنانچہ بعض علماء کا قول ہے کہ نبوت و پیغمبری کی حقیقی اور عین منشاء یہی ہے۔ بہرحال اس کے باوجود بھی یہ بات ظاہر ہے کہ حضرت نوحؑ کی نبوت اگر چہ ساری دنیا کے لوگوں کے لئے عام تھی مگر وہ عمومیت اس عمومیت کے برابر نہ تھی جو آنحضرت ﷺ کو عطا فرمائی گئی تھی کیونکہ رسول اللہ ﷺ کی نبوت ان لوگوں تک کے لئے بھی عام ہے، جو آپ کے زمانے کے بعد دنیا میں آنے والے ہیں۔ لہذا اب یہ اعتراض ختم ہو جاتا ہے کہ طوفان کے بعد زمین پر سوائے مومنوں کے کوئی باقی نہیں رہا تھا اور جس سے حضرت نوحؑ کی نبوت کا سب کے لئے عام ہونا ثابت ہو جاتا ہے اور جب حضرت نوحؑ کی نبوت بھی ساری دنیا کے لئے عام تھی تو آنحضرت ﷺ کے اس ارشاد کا کیا مطلب ہوگا کہ مجھے پانچ چیزیں ایسی عطا فرمائی گئی ہیں جو مجھ سے پہلے کبھی کسی کو نہیں دی گئیں، اور ان میں سے ایک میری نبوت کا ساری دنیا کے لئے عام ہونا ہے تو گویا پچھلی سطروں میں نوحؑ اور آنحضرت ﷺ دونوں کی نبوتوں کے عام ہونے کے باوجود ان میں جو فرق ظاہر کیا گیا ہے اور اس کے ذریعے آپ ﷺ کی نبوت کی فوقیت ظاہر کی گئی ہے اس کے بعد یہ اعتراض ختم ہو جاتا ہے۔

اس اشکال کا ایک جواب علامہ حافظ ابن حجرؒ نے بھی دیا ہے مگر اس پچھلے جواب کے بعد وہ بھی اہم نہیں رہتا) علامہ ابن حجر نے اس کا یہ جواب دیا تھا کہ نوح کی نبوت کو جو

عمومیت حاصل ہوئی وہ طوفان کے بعد حاصل ہوئی، کیونکہ اس وقت سوائے ان کے ماننے والوں کے زمین پر کوئی دوسرا باقی نہیں رہا تھا) ورنہ اصل کے لحاظ سے ان کی نبوت کو یہ عمومیت حاصل نہیں تھی، جب کہ آنحضرت ﷺ کی نبوت اصل کے لحاظ سے ہی ساری دنیا کے لئے عام تھی۔

کہا جاتا ہے کہ حضرت نوحؑ کے تبلیغ شروع کرنے اور طوفان کے آنے کے درمیان ایک سو سال کا فاصلہ تھا، یہ بات ثابت شدہ ہے کہ آدمؑ سے لے کر نوحؑ سے پہلے پہلے جتنے نبی گزرے ہیں ان سب کی نبوت کا اصل منشاء اور مقصد یہ تھا کہ لوگوں کو اللہ تعالیٰ کی ذات پاک پر ایمان لانے کی ہدایت کریں اور خدا کے ساتھ شرک نہ کرنے کی ہدایت کریں، اگرچہ اس پر سب کا اتفاق ہے کہ شرک اور بت پرستی حضرت نوحؑ کے زمانے میں شروع ہوئی اور اس کے بعد سے ہی باقی ہے۔

اس بارے میں یہودیوں اور ان کے ساتھ یہودیوں کے ایک خاص فرقے عیسویہ جو عیسیٰ اصفہانی کے پیرو ہیں ان کا دعویٰ یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ خاص طور پر صرف عربوں کے لئے ظاہر ہوئے تھے، بنی اسرائیل کے لئے نہیں اور یہ کہ آنحضرت ﷺ سچے نبی تھے (مگر صرف عربوں کے لئے ہی آپ کی پیروی کرنی ضروری تھی دوسری قوموں کے لئے نہیں) تو یہودیوں کا یہ قول فاسد اور لغو ہے، کیونکہ جب انہوں نے یہ بات تسلیم کر لی کہ آپ ﷺ اللہ کے رسول ہیں اور یہ کہ آپ سچ بولتے ہیں جھوٹ کچھ نہیں کہتے تو پھر انہوں نے آپ کی اس بات پر کیوں یقین نہیں کیا کہ آپ ساری دنیا کے نبی بنا کر بھیجے گئے ہیں کیونکہ یہ حدیث تواتر کے ساتھ ثابت ہے کہ آپ تمام انسانوں کی طرف اللہ کے رسول بنا کر بھیجے گئے تھے۔

مولف سیرتِ حلبیہ کہتے ہیں: حق تعالیٰ کا ارشاد ہے ﴿وما ارسلنا من رسول الا بلسان قومه﴾ ''اور ہم نے تمام پہلے پیغمبروں کو بھی ان ہی کی قوم کی زبان میں پیغمبر بنا کر بھیجا۔'' (جس کا مطلب بظاہر یہ ہوتا ہے کہ ہر نبی صرف اس قوم کے لئے ہوتا ہے جن کی زبان وہ بولتا ہے، لہٰذا کسی نبی کو ساری دنیا کا نبی کیسے کہا جا سکتا ہے کیونکہ وہ ساری دنیا کی

زبانیں تو ظاہر ہے بول نہیں سکتا) اس اشکال کا جواب بعض علماء نے دیا ہے کہ اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ اس نبی کی نبوت صرف اسی قوم تک محدود ہے بلکہ مطلب یہ ہے کہ جس قوم میں وہ تبلیغ کر رہا ہے اسی کی زبان وہ بولتا ہوتا کہ وہ خود پہلے ان کی ہدایت کرے اور پھر اس سے ہدایت حاصل کرنے والے دوسروں تک وہ پیغام پہنچادیں۔ اور اس طرح اس نبی کی زبان نہ جاننے والوں یعنی دوسری قوموں تک ترجمانوں کے ذریعہ اس نبی کا پیغام پہنچ جائے۔

لہٰذا یہ بات ثابت ہے کہ آنحضرت ﷺ ساری دنیا کے انسانوں کے لئے نبی بنا کر بھیجے گئے تھے اگرچہ آپ اور آپ پر نازل ہونے والی کتاب یعنی قرآن پاک عربی ہیں، جیسا کہ حضرت موسیٰؑ اور حضرت عیسیٰؑ بنی اسرائیل کی طرف نبی بنا کر بھیجے گئے تھے اور موسیٰ کو عبرانی زبان میں کتاب یعنی تورات دی گئی اور عیسیٰؑ کو سریانی زبان میں انجیل دی گئی حالانکہ بنی اسرائیل میں بہت سے لوگ وہ بھی تھے جو عبرانی زبان یا سریانی زبان نہیں سمجھتے تھے جیسے اروام تھے کہ وہ بنی اسرائیلی تو تھے مگر ان کی زبان یونانی تھی واللہ اعلم۔

(بحوالہ سیرتِ حلبیہ)

يَا رَبِّ صَلِّ وَسَلِّمْ دَائِمًا اَبَدًا عَلٰى حَبِيْبِكَ خَيْرِ الْخَلْقِ كُلِّهِم

خصوصیت نمبر ۵۴

رسولِ اکرم ﷺ کی دعوت تمام دنیا والوں کے لئے تھی

قابل احترم قارئین! رسولِ اکرم ﷺ کی امتیازی خصوصیات میں سے یہ چون نمبر خصوصیت ہے، جسکا عنوان ہے "رسولِ اکرم ﷺ کی دعوت تمام دنیا والوں کے لئے تھی" جیسا کہ آنے والے اوراق میں اس خصوصیت کی وضاحت کی جارہی ہے، بحمد اللہ دیگر خصوصیات کی طرح اس خصوصیت کو بھی اللہ تعالیٰ روضہ رسول ﷺ کے سائے میں بیٹھ کر ترتیب دینے کی توفیق عطا ہوئی، اللہ تعالیٰ اپنی بارگاہ میں مقبول ومنظور فرمائے، آمین یارب العالمین۔

بہر حال محترم قارئین! ذیل میں آنے والی خصوصیت بھی ہمارے نبی ﷺ کی امتیازی اور عظیم خصوصیت ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کی دعوت کو تمام دنیا والوں کے لئے بنایا جبکہ دیگر انبیاء اکرام کی دعوت محدود علاقے اور محدود زمانے تک کے لئے ہوتی تھی جیسا کہ اس خصوصیت کے ذیل میں وضاحت کی گئی ہے، لیجئے اب اس خصوصیت کا مطالعہ شروع فرمایئے۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے، آمین یارب العالمین۔

چون نمبر خصوصیت کی وضاحت قرآن واحادیث کی روشنی میں

رسولِ اکرم ﷺ کے پیروؤں اور حلقہ بگوشوں کی کثرت تعداد کا ایک اور سبب یہ ہے کہ آپ ﷺ سے پہلے جس قدر انبیاء آئے وہ خاص خاص قوموں اور قبیلوں کی طرف بھیجے گئے، ان کی دعوت عام نہ تھی، یہاں تک کہ حضرت عیسیٰؑ نے بھی اپنے کو بنی اسرائیل کی کھوئی ہوئی بھیڑوں کی گلہ بانی تک محدود رکھا، لیکن آنحضرت ﷺ کی بعثت روئے زمین کی ہر قوم اور جنس کی طرف ہوئی، کالے گورے، رومی، حبشی، عرب، عجم، ترک، تاتار، چینی، ہندی، سب آپ ﷺ میں برابر کے حقدار ہیں۔

قرآن نے کہا: ﴿وَمَا اَرْسَلْنٰکَ اِلَّا کَافَّةً لِّلنَّاسِ﴾ ترجمہ: "اے محمد! ہم نے تم کو تمام ہی انسانوں کے لئے بھیجا ہے۔"

اور فرمایا: ﴿تبٰرک الذی نزل الفرقان علٰی عباده لیکون لِلْعٰالمِیْنَ نَذِیْرًا﴾ "بابرکت ہے وہ جس نے اپنے بندہ پر قرآن اتارا تا کہ وہ تمام دنیا کو ہوشیار کرے"

صحیحین میں ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ مجھ سے پہلے نبی خاص اپنی قوم میں بھیجا جاتا تھا اور میں تمام دنیا کے لئے بھیجا گیا ہوں۔" اس معنی کی بکثرت روایتیں حدیث کی دوسری کتابوں میں بھی آئی ہیں" اس کی عملی دلیل یہ ہے کہ تمام پیغمبروں کے حالات پڑھتے جائیے، سب کے پیروؤں کو اس کی زندگی میں خود اسی قوم و ملک کے اندر محدود پاؤ گے لیکن آپ ﷺ کے حلقہ بگوشوں میں خود آپ ﷺ کی زندگی میں عرب کے علاوہ سلمان عجمیؓ، صہیبؓ رومی، بلال حبشیؓ سب کو پاؤ گے، سلاطین عالم کے نام آپ ﷺ کا دعوت نامہ بھی اسی تعمیم دعوت کی مستحکم عملی دلیل ہے۔ (بحوالہ سیرت النبی ﷺ جلد سوم)

یَا رَبِّ صَلِّ وَسَلِّمْ دَائِمًا اَبَدًا عَلٰی حَبِیْبِکَ خَیْرِ الْخَلْقِ کُلِّهِم

خصوصیت نمبر ۵۵

رسولِ اکرم ﷺ کو اللہ تعالیٰ نے جوامع الکلم عطا فرمائے

قابلِ احترام قارئین! رسولِ اکرم ﷺ کی امتیازی خصوصیات میں سے یہ پچپن نمبر خصوصیت ہے، جسکا عنوان ہے "رسولِ اکرم ﷺ کو اللہ تعالیٰ نے جوامع الکلم عطا فرمائے"

بہر حال منجملہ خصوصیات میں سے خصوصیتِ ھٰذا بھی ایک عظیم خصوصیت ہے کہ خود زبان اقدس سے ارشاد ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے وہ جوامع الکلم عطا فرمائے جو دیگر انبیاء کو نہیں ملے، اس سے معلوم ہوا کہ اللہ رب العٰلمین کو اپنے آخری نبی ﷺ سے سب سے زیادہ پیار تھا کہ اپنے آخری نبی ﷺ کو وہ کچھ عطا کیا جو کسی بھی نبی کو عطا نہیں کیا، بے شک "ذٰلِکَ فَضْلُ اللّٰہِ یُؤْتِیْہِ مَنْ یَّشَاءُ"۔

امید ہے کہ انشاء اللہ اس خصوصیت کے مطالعے سے بھی ہمارے دل میں حضور ﷺ کی محبت میں اضافہ ہوگا، دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہم سب کو حضور ﷺ کی تمام تعلیمات پر دل وجان سے عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے آمین یارب العالمین

پچپن نمبر خصوصیت کی وضاحت قرآن واحادیث کی روشنی میں

دنیا میں آسمانی صحیفے اب بھی کسی نہ کسی صورت میں موجود ہیں، مگر ان میں ایک کے سوا وصف جامعیت سے سب محروم ہیں، توراۃ اقوام کی تاریخ اور احکام وقوانین کا مجموعہ ہے عقیدہ توحید رسالت کے سوا تمام دیگر ضروری عقائد سے اور رسم قربانی کے علاوہ تمام دیگر مسائل عبادات سے اور چند معمولی باتوں کو چھوڑ کر تمام وقائق اخلاق سے یکسر خالی ہیں۔ زبور صرف دعاؤں اور مناجاتوں کا ذخیرہ ہے۔ سفر ایوب میں صرف عقیدہ تقدیر رضا کی تعلیم ہے۔ امثال سلیمان صرف مواعظ وحکم ہیں۔ دیگر انبیائے بنی اسرائیل کے صحیفے صرف توبہ

وندامت، پیشین گوئی اور ماتم ہیں۔انجیل کا صحیفہ حضرت مسیح علیہ السلام کی سرگزشت اور تعلیماتِ اخلاقی کا مجموعہ ہے،لیکن محمد رسول اللہ ﷺ کو جو صحیفہ ملا وہ جوامع الکلم ہے یعنی وہ تمام باتوں کی جامع ہے،وہ تورات بھی ہے زبور بھی ہے اورانجیل بھی اور کچھ ان سے زیادہ بھی،اس لئے آپؐ نے اپنے خصائص میں یہ ارشاد فرمایا ہے کہ مجھے جوامع الکلم عنایت ہوئے ،بیہقی میں حضرت واثلہؓ بن اسقع سے روایت ہے کہ آپؐ نے فرمایا''مجھے تورات کی جگہ سبع طوال (سات بڑی سورتیں)اورزبور کی جگہ مئین (تقریباً سو آیتوں والی سورتیں) انجیل کے قائم مقام مثانی دی گئیں۔اورسور مفصلات زیادہ ملیں''۔ابونعیم میں یہی روایت ان الفاظ میں ہے کہ مجھے مثانی تورات کی جگہ،مئین انجیل کی جگہ،حوامیم زبور کی جگہ اورمفصلات علاوہ بریں ملیں''۔

اس لئے قرآن مجید،تورات،زبور،انجیل کو جامع ہے اوران کے سوا کچھ اور بھی ہے،وہ تاریخ اقوام بھی ہے،اخلاق ومواعظ بھی ہے،دعاومناجات بھی ہے،اس میں دین کامل کے تمام عقائد ہیں،تمام مراسمِ عبادات ہیں،تمام معاملات کے احکام وقوانین ہیں،اس میں ایک مسلمان کی زندگی کے ہر دوراور شعبہ کیلئے کامل ہدایات اور صحیح تعلیمات موجود ہیں،صرف تورات کے اسفار خمسہ یہود کی مذہبی زندگی کا کامل مجموعہ نہیں،صرف انجیل عیسائیوں کی مذہبی حیات کا سرمایہ نہیں،یہاں تک کہ ان کے عقائد اور عبادات بھی اُن کے صحیفوں کے رہین منت نہیں اوروہ اُن کی صحیح تعلیم سے یکسر خاموش ہیں،لیکن اسلام قرآن سے باہر کچھ نہیں،باہر جو کچھ ہے تو احادیث اُس کی عملی توضیح وتفسیر ہے،وہی تنہا مسلمانوں کی ہرضرورت کا کفیل اور ہر سوال کا مجیب ہے اوراسی لئے اس کے پیرو کامل حَسْبُنَا كِتَابُ اللّٰه (ہم کو خدا کی کتاب کافی ہے) کا نعرہ بلند کرتے ہیں۔

قرآن جوامع الکلم ہے کہ اس کی ایک ایک آیت کے اندر سینکڑوں لطائف ہیں، اس کے ایک ایک لفظ سے متکلمین اورفقہاء نے چندر چند مسائل نکالے ہیں اورصوفیا اور ارباب حال نے متعدد نکتے پیدا کئے ہیں،تاہم اس کی لطافتوں اورنزاکتوں کا خاتمہ نہیں ہوا

اور اسکی جوامع الکلم کا حصر نہ ہوسکا۔

تو معلوم ہوا کہ ''جوامع الکلم'' سے مراد قرآن مجید بھی ہے، کون ہے جو قرآن کے جامع ہونے سے انکار کر سکے، مگر حقیقت یہ ہے کہ اس جگہ وہ کلام مقدس بھی مراد ہے جسے ''حدیث نبوی'' علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کہا جاتا ہے۔

جب کوئی شخص ان الفاظ پاک پر غور کرے گا، جو حضورؐ پر نور کے دل وزبان سے گوش عالمیاں تک پہنچے، اسے یقین ہو جائے گا کہ بے شک یہ کلام ''کلام نبوت'' ہے، مختصر، سادہ، صاف، پرصدق معانی کا خزینہ، ہدایت کا گنجینہ۔

اسی کتاب ''خصائص مصطفیٰ ﷺ'' کی چاروں جلدوں کے متعدد مقامات پر احادیث پاک کو جابجا پیش کیا گیا ہے، قارئین کو تدبر اور تفکر کے بعد کلام نبوی کی جامعیت کا حال کھل جائے گا، اور بخوبی سمجھ میں آجائے گا کہ یہ کلام صدق صرف مطلع نبوی ہی سے جلوہ گر ہوسکتا ہے، اب ذیل میں برکت کے لئے اور بطور نمونہ دو احادیث پیش کی جارہی ہیں ان میں سے دوسری حدیث کی مکمل تشریح پیش کی جائے گی، جس کے مطالعے سے انشاء اللہ آپ ﷺ کی زبان اقدس سے نکلے ہوئے جوامع الکلم کی اہمیت کا اندازہ ہو جائے گا، لیجئے ملاحظہ فرمائیے:۔

پہلی حدیث پاک یہ ہے: ﴿**ایاکم والظن فان الظن اکذب الحدیث ولاتجسسوا ولا تحسسو اولا تنافشوا ولاتحاسدوا ولاتباغضوا ولاتدابروا وکونوا عباداللّٰہ اخوانا کما امرکم اللّٰہ تعالیٰ، المسلم اخو المسلم لایظلمہ ولایخذلہ ولا یحقرہ بحسب امرء من اشراک یحقر اخا المسلم کل المسلم علی المسلم حرام مالہ ودمہ وعرضہ ان اللّٰہ لاینظر الی صورکم واجسادکم ولکن ینظر الی قلوبکم واعمالکم التقوی ھھنا التقوی ھھنا ویشیر الی صدرہ الا لایبیع اخوانا ولایحل لمسلم ان یھجر اخاہ فوق ثلاث واخرجہ الستۃ الا النسائی وھذا لفظ مسلم عن ابی ھریرہ رضی اللّٰہ**

تعالیٰ عنه ﴾

ترجمہ...... ''خبردار بدگمانی کو عادت نہ بنانا، بدگمانی تو بالکل جھوٹی بات ہے ، (۲) لوگوں کی عیب جوئی نہ کرنا (۳) اور نہ ایسی باتوں کو اپنے کان تک پہنچنے دینا (۴) بڑھنے کے لیے مت جھگڑنا (۵) باہمی حسد نہ کرنا (۶) باہمی بغض نہ رکھنا (۷) کسی کی پس پشت برائی نہ کرنا (۸) اے اللہ کے بندو آپس میں بھائی بھائی ہوکر رہنا جیسا کہ تم کو اللہ کا حکم ہے (۹) مسلم مسلم کا بھائی ہے بھائی پر نہ کوئی ظلم کرلے (۱۰) نہ اسے رسوا کرے نہ حقیر جانے (۱۱) انسان کے لیے یہی برائی بہت زیادہ ہے کہ اپنے مسلم بھائی کو وہ حقیر سمجھا کرے (۱۲) مسلم کا خون عزت دوسرے مسلم پر بالکل حرام ہے (۱۳) اللہ تعالیٰ تمہاری صورتیں اور جسموں کو نہیں دیکھتا وہ تو تمہارے دلوں اور عملوں کو دیکھتا ہے (۱۴) دل کی طرف اشارہ کرکے فرمایا تقوی یہاں ہے تقوی یہاں ہے۔ (۱۵) خبردار ایک کی خرید پر دوسرا شخص خریدار نہ بنے۔ (۱۶) اللہ کے بندو! بھائی بھائی بنو۔ (۱۷) مسلم پر حلال نہیں کہ اپنے بھائی کو تین دن سے زیادہ چھوڑ دے۔ (بحوالہ بخاری، ترمذی و مسلم)

اس کے بعد دوسری حدیث بمع مکمل تشریح کے پیش کی جارہی ہے، جس کے ایک ایک کلمہ مبارک کی وضاحت ہمارے ایمان میں اضافے کا ذریعہ بنے گی انشاء اللہ۔ واضح رہے کہ اس حدیث کی تشریح ہم نے قاضی محمد سلیمان منصور پوریؒ کی شاہکار تصنیف ''رحمۃ اللعالمین'' جلد سوم سے لی ہے مزید تفصیل جاننے کے لئے وہاں مراجعت کی جاسکتی ہے، استفادہ عام کے لئے اسے یہاں بھی نقل کردیا گیا ہے، ملاحظہ فرمائیے:۔

دوسری حدیث پاک یہ ہے ﴿عن علی رضی اللہ تعالیٰ عنه قال سالت رسول اللّٰہ صلی اللہ علیه وسلم عن سنته فقال المعرفة راس مالی والعقل اصل دینی والحب اساسی والشوق مرکبی وذکر اللّٰہ انیسی والثقة کنزی والحزن رفیقی والعلم سلاحی والصبر ردائی والرضاغنیمتی العجز فخری والزهد حرفتی والیقین قوتی والصدق شفیعی والطاعة حسبی والجهاد

خلقی وقرة عینی فی الصلوٰۃ﴾

ترجمہ:......"حضرت علیؓ سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے سوال کیا کہ حضور ﷺ کا طریقہ (سنت) کیا ہے فرمایا معرفت میرا راس المال ہے، عقل میرے دین کی اصل ہے محبت میری بنیاد ہے، شوق میری سواری ہے ذکر الٰہی میرا انیس ہے اعتماد میرا خزانہ ہے حزن میرا رفیق ہے، علم میرا ہتھیار ہے، صبر میرا لباس ہے، رضا میری غنیمت ہے، عجز میرا فخر ہے، زہد میرا حرفہ ہے، یقین میری خوراک ہے، صدق میرا ساتھی ہے، طاعت میرا بچاؤ جہاد میرا خلق ہے اور میری آنکھوں کی ٹھنڈک نماز میں ہے۔"

تشریح......اب ذیل میں حدیث میں بیان کردہ ہر ہر خصلت کو وضاحت کے ساتھ پیش کیا جاتا ہے ملاحظہ فرمائیے:

(۱)......المعرفة راس مالی (معرفت میرا رأس المال یعنی میری اصل پونجی ہے)۔ راس المال اس رقم کو کہتے ہیں، جس کے بغیر تجارت کا آغاز ہی نہیں ہوسکتا، جس سے تاجر اپنی تجارت کو شروع کیا کرتا ہے، حدیث بالا میں معرفت کو راس المال فرمایا گیا ہے۔

معرفت لغت میں شناخت کو کہتے ہیں، اصطلاح عرفاء میں اس کا استعمال ابتداء پر بھی ہوتا ہے اور نہایت پر بھی۔ واضح ہو کہ معرفت کی ابتداء خود نفس انسانی کی شناخت سے ہوتی ہے، سعید وہ ہے جس کے شعور کا آغاز خود اپنے عیوب کی شناخت سے ہو۔

بائبل اور قرآن مجید میں سیدنا آدمؑ کی بابت ہے کہ تمیز کے بعد سب سے پہلے انہوں نے یہ شناخت کیا کہ وہ برہنہ ہیں، پھر اسی وقت انہوں نے درختوں کے پتے جمع کیے اور ان کو ٹانک ٹانک کر اپنی برہنگی کا پردہ بنایا۔ پدر اعظم کا اپنی اولاد کو یہ پہلا سبق ہے، کہ جب انسان کو اپنا کوئی نقص یا عیب نظر آئے تو فوراً اس کے ازالہ کی تدبیر کرنا چاہیئے،

لغت اور شرح میں معرفت اور علم کے دو الفاظ ہیں جو شناخت کے لیے آتے ہیں، اہل علم کے نزدیک لفظ علم کا درجہ لفظ معرفت سے برتر ہے، گو متصوفین کی اصطلاح میں اب

لفظ معرفت کا درجہ لفظ علم سے برتر سمجھا جاتا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: **واذاسمعوا ماانزل الی الرسول تری اعینھم تفیض من الدمع مما عرفوا من الحق۔** ''جب انہوں نے وہ کلام سنا جو رسول پر اتارا گیا تب ان کی آنکھوں سے آنسو بہتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں کیونکہ انہوں نے حق کی شناخت کر لی۔''

ویوم نحشرھم کان لم یلبثوا الاساعۃ من النھار یتعارفون بینھم ''جس دن ہم ان کو اٹھائیں گے (اور وہ سمجھیں گے) گویا دن کی ایک گھڑی کے برابر ہی وہ قبروں میں رہے ہیں تب وہ آپس میں ایک دوسرے کی شناخت کر لیں گے۔'' **وجاء اخوۃ یوسف فدخلوا علیہ فعرفھم** ''جب یوسف کے بھائی مصر آئے اور یوسف کے سامنے گئے تو یوسف نے ان کو شناخت کر لیا۔'' **الذین اٰتیناھم الکتاب یعرفونہ کما یعرفون ابناء ھم** ''جس کو ہم نے کتاب دی ہے، وہ اس کی شناخت رکھتے ہیں جیسی شناخت ان کو اپنے فرزندوں کی ہے۔''

ہر چہار آیات بالا میں معرفت کا لفظ مستعمل ہوا ہے اور اس فعل کے فاعل انسان ہیں، اب لفظ علم کو مندرجہ ذیل آیات میں دیکھیئے: **فاعلموا انما انزل بعلم اللّٰہ** ''جان لو کہ یہ اللہ کے علم سے نازل کیا گیا ہے۔'' **انزلہ بعلمہ** ''اللہ نے قرآن کو اپنے علم سے نازل فرمایا ہے۔'' **قل رب زدنی علما** ''اے نبی یہ دعا کیجئے کہ اے رب مجھے علم میں بڑھائیو۔''

ان آیات میں علم کو ذات رب العالمین سے نسبت ہے۔ بلحاظ معنی معرفت وعلم میں فرق یہ ہے کہ معرفت کسی شے کی ذاتی شناخت کو کہتے ہیں اور علم کا اطلاق اس شے کے اندرونی احوال پر آتا ہے۔ لہٰذا معرفت کو تصور اور علم کو تصدیق کہا جا سکتا ہے۔

حدیث بالا میں معرفت کو راس المال فرمانے سے اسی ابتدائی سلوک کی طرف اشارہ فرمایا گیا ہے۔ جب کہ انسان کو اپنے بندہ ہونے کی اور رب العالمین کے مالک ہونے کی شناخت کا آغاز ہوتا ہے، یہی شناخت یہی احساس بندہ کے لیے ہادی راہ بن جاتا ہے۔

واضح ہو کہ اہل تصوف نے امارت اور شواہد معرفت پر تفصیلی گفتگو کی ہے شبلیؒ فرماتے ہیں، جنید بغدادیؒ سے پوچھا گیا عارف کسے کہتے ہیں؟ فرمایا پانی کا رنگ ظرف کے رنگ کا سا نظر آیا کرتا ہے، اس قول کے معنی یہ ہیں کہ بندہ پر الوان عبودیت کا ظہور ہوتا ہے، وہ کبھی ابتلائے ربانی کے سامنے صابر ہوتا ہے، اور کبھی نعمائے ربانی کے سامنے شاکر، کبھی وعدہ ہائے صدق کی بشارت سے اس کا قلب خلد بہار ہوتا ہے، اور کبھی مواعید الٰہی سے وہ سراپا عجز وانکسار! ذوالنون مصری فرماتے ہیں کہ عارف کی تین نشانیاں ہیں:۔ ۱......نور معرفت پر نورِ ورع غالب ہو، ۲......اعتقاد باطن حالت ظاہر سے متناقض نہ ہو، ۳......نعم الٰہیہ کی فراوانی سے محارم الٰہیہ میں نہ گر پڑے۔

حقیقت یہ ہے کہ معرفت سے ہیبت پیدا ہوتی ہے، اور اس ہیبت ہی کے اندر انس وانشراح ہوتا ہے، حدیث صحیح میں ہے:﴿انا اعرفکم باللّٰہ و اشدکم لہ خشیۃ﴾ ’’میں تم سب سے بڑھ کر اللہ کا عرفان رکھتا ہوں اور سب سے زیادہ اس کے سامنے خشیت والا ہوں۔‘‘ گویا معنی بالا کو الفاظ بالا میں ظاہر فرما دیا گیا ہے۔

یاد رکھنا چاہئے کہ معرفت وہ نور ہے، جو مومن کے سینہ میں رکھ دیا جاتا ہے کہ وہ صفات ربانی کو سمجھ سکے اور شواہد وبراہین کا استعمال کر سکے۔ عارف ،صفات پر ایمان رکھتا ہے، اور ان کو تشبیہ سے بالاتر سمجھتا ہے ،وہ تشبیہ کی نفی کرتا ہے اور تعطیل سے پرہیز کرتا ہے، آگے بڑھ کر وہ صفات وذات کی تفریق سے اجتناب کرتا ہے اور آگے بڑھکر وہ جملہ وسائل وسائط ، براہین، اور شواہد سے منہ موڑ کر اپنے قلب وروح کو اپنے ملک کے انعام پر چھوڑ دیتا ہے، تب اسے معرفت کا حصہ بقدر ظرف حاصل ہو جاتا ہے۔ ﴿صراط الذین انعمت علیھم﴾ کا اشارہ اسی راز کی طرف ہے۔

(۲)......العقل اصل دینی (میرے دین کی جڑ عقل ہے) عیسائیوں کا یہ اعتقاد ہے کہ مذہب میں عقل کو دخل نہیں، وہ عقیدہ تثلیث کے متعلق کہا کرتے ہیں کہ اس کی بنیاد فہم انسانی سے بالاتر ہے۔ وہ شاگرد کو تثلیث کی تعلیم دیتے ہوئے کہا کرتے ہیں کہ اس لقمہ کو حلق

سے نیچے نگل جاؤ خواہ تمہارا دل چاہے یا نہ چاہے۔ مگر اسلام ایسے احکام نہیں دیتا، عقل اور عاقلین کی فضیلت آیات قرانیہ سے بخوبی واضح ہے۔

۱...... کذالک نفصل الأیٰت لقوم یعقلون ”ہم اسی طرح آیات کو کھول کھول کر عقل والوں کے لیے بیان کیا کرتے ہیں۔“

۲...... ولقد ترکنا ایة بینة لقوم یعقلون ”ہم نے اس کے روشن نشان چھوڑے ہیں عقل والوں کے لیے۔“ قرآن پاک میں خارج از عقل لوگوں کی مذمت فرمائی گئی ہے۔

۳...... ویجعل الرجس علی الذین لایعقلون ”رجس انہی پر ہے جو عقل نہیں رکھتے۔“ بتلایا گیا کہ علم و عقل لازم وملزوم ہیں اور انہی دونوں کی آمیزش سے نتائج صحیحہ پیدا ہوتے ہیں۔

۴...... وما یعقلها الا العالمون ”ان باتوں کی عقل اہل علم ہی کو ہے۔“

بیشک جو شخص احکام شریعت کو پڑھے گا اور ان حکمتوں پر بھی غور کرے گا جن کی وجہ سے ان احکام کا نفاذ ہوا تو اسے بالیقین معلوم ہو جائے گا کہ عقل کے ساتھ احکام شرعیہ کا تعلق بہ طریق مستحکم ہے۔

نماز کے لیے یہ حکم پڑھئے! ان الصلوٰة تنهی عن الفحشاء والمنکر ولذکر اللّٰه اکبر. (سورۂ عنکبوت) ”نماز تو بدکاریوں اور برے کاموں سے روکنے والی ہے اور تحقیق اللہ کا ذکر سب سے بڑا ہے۔“

روزے کے لیے یہ حکم پڑھئے: کتب علیکم الصیام کما کتب علی الذین من قبلکم لعلکم تتقون ”تم پر روزے لکھ دیے گئے جیسا کہ تم سے پہلوں پر لکھے گئے تھے تا کہ تم تقویٰ حاصل کرو۔“

ادائے زکوٰة کے متعلق یہ حکمت معلوم کیجئے: لئن شکرتم لازیدنکم. اگر تم شکر کرو گے تو میں تم کو بڑھاؤں گا۔“

حج کی بابت جو حکم ہے اس کے فوائد پر غور کیجئے: لیشھدوا منافع لھم. ''تا کہ تم اپنے اپنے نفع کو دیکھ لو۔''

قصاص کا اثر مجرم کے لیے: لیذوق وبال امرہ. ''تا کہ اپنے برے کام کا وبال دیکھے۔'' قصاص کا اثر فائدہ مالک کے لیے: ولکم فی القصاص حیٰوۃ. ''تمہاری زندگی قصاص ہی کے جاری کرنے میں ہے۔

ہاں عقل ہی کو دوسرے مقام پر فطرت انسانی بتلایا گیا ہے، عقل ہی برہان کی برتری کو تسلیم کرتی ہے اور اسی لیے مخالفین کو فرمایا گیا: قل ھاتوا برھانکم ان کنتم صدقین. ''کہہ دیجئے کہ تم اپنی برہان پیش کرو، اگر تم سچے ہو عقل، جبر و اکراہ کے مخالف ہے اور اسی لیے کتاب حمید میں ہے: لا اکراہ فی الدین. ''دین کے معاملہ میں کچھ جبر نہیں۔''

ان جملہ شواہد سے ثابت ہے کہ اسلام کا شجرہ پاک سرزمین عقل میں لگایا گیا ہے اور علم کے پانی سے اسے پالا گیا ہے۔ نبی الامی ﷺ کا یہ فرمانا کہ العقل اصل دینی اس دین کے منجانب اللہ ہونے پر دلیل حتمی ہے وما یذکر الا اولوا الالباب.

مسلمان نوجوانوں میں دیکھا جاتا ہے کہ وہ عقل سے مراد خود اپنی عقل اپنا فہم سمجھا کرتے تھے یہ دانستگی کی پہلی دلیل ہے۔ جو لوگ قانون سلطنت کے فہم سے بھی عاری ہیں، جو لوگ خود انسانوں کی بنائی ہوئی، ایجادات کے قفل اتارنے سے عاجز ہیں، ان کا کیا حق ہے، اپنی عقل سے برتر عقل کا کوئی درجہ ہی تسلیم نہ کریں اور اپنے فہم کو صاحب شریعت کے فہم سے بالاتر سمجھنے لگیں۔

۳......وَالْحُبُّ اَسَاسِیْ (محبت میری بنیاد ہے) واضح ہو کہ تغزل وابیات میں لفظ عشق کا استعمال زیادہ تر ہوتا ہے۔ مگر فرقان حمید اور حدیث پاک میں لفظ عشق اور اس کے مشتقات کا استعمال نہیں ہوا، اس سے ظاہر ہے کہ یہ ایک ذلیل لفظ ہے اور اصل لغت کے لحاظ سے معنی حب سے عاری ہے، قاموس میں ہے "الجنون فنون و العشق من فنّہٖ جنون" کی بہت سی اقسام ہیں، عشق بھی یکے از انجملہ ہے۔ لہذا لفظ حب کی تحقیق پر زیادہ

توجہ کرنا چاہیئے ،زبان عرب میں اس لفظ سے پانچ محاورات پائے جاتے ہیں:

ا......حَبَّبَ الْاَسْنَانُ دانت روشن اور صاف ہیں۔

۲......حَبَّ الماءُ پانی نتھرا ہوا پاکیزہ ہے،انہی معنی کے لحاظ سے بلبلے کو حباب کہتے ہیں،

۳......حَبَّ الْبَعِیْرُ اونٹ نے گھٹنے ٹیک دیے،اس محاورہ میں حب کو لزوم وثبات کے معنی میں لیا گیا۔

۴......حَبّ دانہ وتخم یا اصل شے،اسی لیے سویدائے دل کو حَبَّۃَ الْقَلْبِ کہتے ہیں ،اسی لیے دانہ کو حب (جس کی جمع حبوب ہے) بولتے ہیں۔

۵......حَبَّ الْمَاءُ وہ جوہڑ جس میں پانی ٹھہر جاتا ہے،یہاں حفاظت ونگہداشت کے مفہوم کو ملحوظ رکھا گیا ہے۔

اصل مادہ کے ان معانی کو دیکھو،اور پھر یہ بھی خیال کرو کہ لفظ حُبّ کو جب کہ وہ بطور اسم مستعمل ہوتا ہے۔حرکت ضمہ دی گئی ہے ،جو جملہ حرکات میں قوی تر ہے اور اس سے مقصد یہ ہے کہ حُبّ میں اوصاف صفاد بہا اور علو وارتقاء اور لزوم وثبات کا ہونا پایا جائے ،حُبّ ہی کو جملہ فضائل کا اصل الاصول قرار دیا جائے اور حُبّ ہی کے حفظ وتمسک کو مایہ حیات انسانی ثابت کیا جائے۔

بیشک محبت ان جملہ اوصاف پر حاوی ومشتمل ہے،اللہ تعالیٰ نے اثبات محبت کے متعلق کلام پاک میں فرمایا ہے:﴿یحبونھم کحب اللّٰہ والذین امنوا اشد حبا للّٰہ﴾ ”یہ لوگ غیروں سے ایسی محبت کرتے ہیں جیسی اللہ سے مگر جو ایمان والے ہیں وہ اللہ کی محبت میں بہت زیادہ محکم ہیں۔“

اللہ تعالیٰ نے اپنی محبت کا بندوں کو ہونا اور بندوں کی محبت کا اللہ عزوجل کو ہونا ہر دو امور کا ثبوت فرمایا ہے فسوف یاتی اللّٰہ بِقَوْم یحبھم ویحبونہ۔”اللہ تعالیٰ ایسی قوم کو اسلام میں لائے گا جن سے اللہ محبت کرتا ہوگا،اور وہ اللہ سے محبت رکھتے ہوں گے

احادیث پاک میں بھی اس امر کا وضوح کے ساتھ بیان فرمایا گیا ہے:۔

۱......ان احب الاعمال الی اللّٰہ الایمان با للّٰہ ثم الجهاد ''اعمال میں سے اللہ تعالیٰ کو سب سے زیادہ پیارا ایمان ہے ہو پھر جہاد ہے۔''

۲......احب العمل الی اللّٰہ مَادَاوَمَ علیه صاحبه. ''سب سے پیارا عمل اللہ کے ہاں وہ ہے، جس پر عمل والا مداومت کرے۔''

۳......ان اللہ یحب ان یوخذ بر خُصَتِه. ''اللہ کو پسند ہے کہ اس کی رخصت پر عمل کیا جائے۔''

۴......احب الاعمال الی اللّٰہ الصلوٰة علی اول وقتها. ''سب اعمال سے زیادہ پسند اللہ تعالیٰ کو وہ نماز ہے، جو اول وقت پر پڑھی جائے۔''

احادیث بالا میں تو اللہ تعالیٰ کی اس محبت کا ذکر تھا جو اسے اپنے بندوں کے اعمال سے ہے اب بندوں کی محبت کا ذات پاک کے ساتھ ہونا، آیت ذیل میں بصراحت ہے۔قل ان کان ابائکم وابناءکم واخوانکم وازواجکم وعشیرتکم واموال اقترفتموها وتجارة تخشون کسادها ومساکن ترضونها احب الیکم من اللّٰہ ورسوله وجهاد فی سبیله فتربصوا حتی یاتی اللّٰہ بامره. ''کہہ دیجئے کہ اگر تمہارے ماں باپ، بیٹے، بیٹیاں، بہن، بھائی، بیویاں اور خویش قبیلہ اور مال جسے تم سمیٹتے ہو اور تجارت جس کے گھٹنے سے ڈرتے ہو اور مکانات، جن کو پسند کرتے ہو، تم کو اللہ سے اور اس کے رسول سے اور راہ خدا میں جہاد کرنے سے زیادہ پیارے ہیں تب انتظار کرو یہاں تک کہ اللہ اپنا حکم جاری فرمائے۔''

اس آیت میں انسان کی اس محبت کا جو اسے مادر، پدر، دختر، پسر، برادر وخواہر، خویش وقبیلہ، تجارت وصنعت، قصر وباغ اور مال وزر سے ہوتی ہے، اثبات فرمایا گیا ہے اور بتایا گیا ہے کہ ان سب اشیاء کی محبت کا انسان کے لئے ہونا ایک فطری امر ہے۔

اس کے بعد اجنبیت کا مسئلہ شروع فرمایا کہ اگر مذکورہ بالا محبت مغلوب ہے اور اللہ

تعالیٰ ورسول اللہ ﷺ کی محبت ان جملہ انواع محبت پر غالب تر ہے، تب تو سب کچھ ٹھیک ،لیکن اگر خدانخواستہ اللہ ورسول ﷺ کی محبت سے ان اشیاء کی یا ان اشخاص کی محبت بڑھ گئی تب معاملہ سخت مشکل ہے اوراس بارہ میں جو کچھ حکم اللہ تعالیٰ چاہے گا وہی جاری فرمائے گا۔

حکم بالا میں قرآن کریم نے تمدن اور تبتّل کا راز منکشف کر دیا ہے اور توحش وترہب کو چھوڑ کر افراط وتفریط کے وسط میں شاہراہ عدل قائم فرمادی ہے۔

اللہ تعالیٰ سے محبت کی حقیقت اگر معلوم کرنی ہو تو اس کے لیے ایک ہی لفظ بیان کر دینا کافی ہے، وہ عبودیت ہے، یہی محبت یا عبودیت جملہ محاسن اعمال کی سرچشمہ ہے ،محبت ہی سے اثابت الی اللہ کی صفت پیدا ہوتی ہے اور محبت ہی خوف ورجا کا معدن ہے ،محبت ہی ہے جو انسان کو کبھی مقام رضا پر اور کبھی مقام شکر پر متمکن کر دیتی ہے۔صبر بھی وہی صبر ہے جس کی بنا محبت پر ہو، ورنہ اس کا نام بیچارگی ہوگا۔ زہد بھی وہی زہد ہے جس کا منشا محبت ہو، ورنہ اس کا نام عدم دسترس ہوگا، حیا بھی وہی حیا ہے جس کی ولادت محبت سے ہو، جو ادب وتعظیم کی ہوا میں پلی ہو ورنہ اس کا نام انفعال طبع ہوگا۔فقر بھی وہی فقر ہے، جو محبت کو بجانب محبوب ہو اور دل اپنی تمام تر قوت کے ساتھ محبوب کی جانب منجذب ہو جائے، ورنہ اس کا نام تنگ دستی ہوگا۔

الغرض محبت ہی قوت القلوب ہے، اور محبت ہی غذاء الارواح ہے ،محبت ہی قرۃ العیون ہے، محبت ہی حیوۃ الابدان ہے، محبت ہی دل کی زندگی ہے۔محبت ہی کامیابی کو دوام وبقا کا تاج پہناتی ہے۔محبت ہی بقا کو بلندیٔ ارتقاء پر بٹھلاتی ہے۔

اب ہم مدارج محبت کا ذکر کرتے ہیں۔

ا......محبت کی ابتداء علاقہ سے ہوتی ہے، یعنی دل کا تعلق جو کسی جانب پیدا ہو جائے

۲......اس تعلق کو ارادہ قوی بناتا ہے۔

۳......اب کشش پیدا ہوتی ہے، اور جس طرح پانی نشیب میں خود بخود جاتا ہے اسی طرح محبّ کو محبوب کی طرف وہ کشش لیے جاتی ہے۔

۴......اب سوزش پیدا ہوتی ہے اور دل میں ہر وقت ایک جلن رہنے لگتی ہے۔

۵......اب پیار نمودار ہوتا ہے اور صفت محبت سے دل آشنا ہو جاتا ہے۔

۶......اس پر ترقی وافزونی ہونی ہوئی تو شغف کا تسلط ہو جاتا ہے اور محبت کا اثر قعر قلب (دل کے گہراؤ) تک پہنچ جاتا ہے، مصائب کے برداشت اور موانعات کی سبکی نظر آنے لگتی ہے، تدابیر قرب اور مواصلات وصل کی درستی میں شب و روز گزرنے لگتے ہیں۔ محبوب کے سوا باقی دیگر تفکرات منقطع ہو جاتے ہیں، محبوب ہی کی کا تصور جسم پر اور محبوب ہی محبت دل پر حکمران بن جاتی ہے۔

۷......اس سے اگلی حالت کا نام عشق ہے، یہ لفظ اسم عشقہ سے بنایا گیا ہے، یہ ایک بیل زرد پھولوں والی ہوتی ہے، جس درخت پر چڑھ جاتی ہے، اسے خشک کر دیتی ہے اور یہی حال اس مرض کے مریض کا بھی ہوتا ہے۔

۸......اس سے آگے درجہ یتیم کا ہے، یتیم کے معنی ''غلامی'' ہیں۔ اس وقت انسان خود اپنے ہی خیالات کا غلام بن جاتا ہے اور ان سے رہائی پانا اس کے اختیار سے باہر ہو جاتا ہے۔

۹......اعلیٰ ترین درجہ کا نام عبودیت ہے، جب کہ محبّ ہر ایک دعویٰ سے دست بردار ہو جاتا ہے جب کہ دنیا میں کوئی شے اس کی نہیں رہ جاتی ہے جب کہ اس کا جسم، اس کا دل، اس کی روح، اس کی تمنا اس کی مراد خود اپنے لیے نہیں رہ جاتی ہے، اور وہ ان سب کو خوشی خوشی چھوڑ کر معبود کے معبود ہونے پر بس کر جاتا ہے اور اس امر پر قانع بلکہ شاکر ہوتا ہے کہ وہ اپنے معبود کا عبد کہلایا کرے۔

۱۰......اس سے بھی بالاتر درجہ خُلّت کا ہے، اب تو جسم کا ایک ایک بال اور نبض کی ایک ایک حرکت اور سینہ کا ایک ایک سانس متفق المراد بن جاتے ہیں جذبات اور متمنیات کا خاتمہ ہو جاتا ہے دل و دماغ، طبع و روح میں پوری طاقت اور کامل وحدت کے ساتھ ایک ہی محبوب کا خالص رضوان مقصود و مطلوب بن جاتا ہے، وہ بھی اس شان کے ساتھ کہ محبّ کا

مقصود نہیں بلکہ محبوب کا مقصود م، محبّ کا مطلوب نہیں بلکہ محبوب کا مطلوب۔

عام طور پر فہم انسانی اس کیفیت کے تعلق سے نارسا ہے اور اس درجہ کی تکمیل صرف سیدنا ابراہیمؑ نے اور سیدنا مصطفےٰ ﷺ نے کی ہے الفاظ درود پاک میں یہی دو نام ایک دوسرے کے مشبہ ومشبہ بہ کی طرح واقع ہوئے ہیں، ایک کو تقدیم کی اولیت حاصل ہے اور دوسرے کو اتمام کی افضلیت۔

اللھم صل علی محمد وعلی ال محمد کما صلیت علی ابراھیم وعلیٰ ال ابراھیم انک حمید مجید .اللھم بارک علی محمد وعلی ال محمد کما بارکت علی ابراھیم وعلی ال ابراھیم انک حمید مجید.

یہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اختتام سے پیشتر ان اسباب کا ذکر کردیا جائے جو جالب محبت اور جاذب محبت ہیں تا کہ کوئی سعادت مندان سے تمتع حاصل کر سکے، اسباب بقا وارتقائے محبت الٰہیہ درج ذیل ہیں:

۱......قرأت فرقان حمید: قرأت کے تحت میں تاویر معانی اور فہم مراد ربانی (ہردو) شامل ہیں۔

۲......نماز فرائض کے علاوہ نوافل کی مواظبت وکثرت۔

۳......دوام ذکر: اس لفظ کے اندر ذکر لسانی، اور قلبی دونوں شامل ہیں، ذکر بالحال اور ذکر بالعمل بھی اسی مفہوم کے اندر ہیں۔

۴......اسماء وصفات الٰہیٰ کا مطالعہ ومشاہدہ بذریعہ قلب۔

۵......اللہ عز وجل کی نعمت ہائے ظاہری وباطنی اور احسانات مادی و روحانی کا تذکار۔

۶......مقامات عبادت میں کمال ادب اور حضور تام کے ساتھ وقوف قلبی۔

۷......ذوق حضور میں قلب کا انکسار کلی۔

۸......اپنی خواہشات کا احکام ربانی پر ایثار۔

۹......محبین وصادقین کی مجالست۔

ان اسباب سے منافرت جو اللہ تبارک وتعالیٰ اور بندہ ناچیز کے درمیان بعد ودوری کا موجب ہیں، ان امور کی مواظبت سے امید ہے کہ وہ سرچشمہ محبت جو انسان کی سرزمین قلب میں ودیعت ہے، اور جسے خس وخاشاک علائق نے بند کررکھا ہے، پھر فوارہ سال جوش زن ہو اور پوری رفتار سے چلتا ہوا کشت زارتمنا کی سیرابی کا ذریعہ بنے۔ **اللھم ارزق حبک وحب من یقربنی الی حبک.**

قارئینِ کتاب کو حضور ﷺ کے الفاظ **والحب اساسی** پر ایک باراور تدبر کرلینا چاہئے کہ جس ایوان عظمت نشان کی بنیاد ''محبت'' ہو، وہ عمارت کیا ہوگی اور اس مکان کا مکین کس نشان کا ہوگا۔ یہی سبق ہے جو سیرت محمدیہ کے پڑھنے والے کو یادرکھنا چاہئے۔

۴......**وَالشَّوْقُ مَرْكَبِي** (شوق میری سواری ہے) واضح ہو کہ قرآن مجید میں لفظ ''شوق'' وارد نہیں ہوا اور بجائے اس کے لفظ ''لقاء'' کا استعمال ہوا ہے۔ اس کی وجہ غالباً یہ ہے کہ علمائے فن کے نزدیک فیصلہ طلب یہ امر ہے کہ حصول دیدار کے بعد بھی شوق باقی رہتا ہے یا نہیں؟ بعض کی رائے یہ ہے کہ ''شوق'' تو اس سفر کا نام ہے، جو محبّ کو بجانب محبوب لے جاتا ہے، لہٰذا جب منزل مقصود پر پہنچ گئے تو سفر کا خود بخود خاتمہ ہوگیا۔

مگر حدیث پاک میں اس لفظ کا استعمال ہوا ہے، حدیث زیرشرح میں بھی اور ایک دوسری صحیح حدیث میں بھی، جس کے الفاظ یہ ہیں۔ **اسالک لذۃ النظر الی وجھک والشوق الی لقائک.** ''تیرے چہرہ پر نگاہ ڈالنے کی لذت اور تیرے لقا کے شوق کا سوال کرتا ہوں۔''

حدیث زیرشرح میں شوق کو مرکب بنایا گیا ہے، جس کے معنی یہ ہیں کہ شوق آثار محبت میں سے ایک اثر کا نام ہے اور اس کا درجہ اصل محبت سے کمتر ہے، کیونکہ شوق محبت ہی سے پیدا ہوتا ہے۔ ہاں شوق!

وہ چنگاری ہے جو دل کو گرمائے رکھتی ہے وہ لپٹ ہے جو شمع قلب سے اٹھتی ہے

شوق ہی اعضاء جوارح کو منقاد اعمال بناتا ہے اور شوق ہی اعمال میں مداومت پیدا کرتا ہے شوق ہی ہے جو آلائے اخروی کو نعم دینوی سے بھی قریب تر دکھاتا ہے اور شوق ہی ہے جو ہر ایک شکستہ پر کو مائل پرواز رکھتا ہے، شوق ہی ہے جو غاروں کی گہرائی کو ناپتا اور پہاڑوں کی چوٹیوں کو لکدکوب بناتا ہے، یہ شوق ہی ہے جو محبت صادق کی راہ میں مشعل افروزی کرتا ہے اور یہ شوق ہی ہے جو کسی درمیانی منزل پر محبِّ آبلہ پا کو آرام نہیں لینے دیتا۔

یہ یاد رکھنا چاہیے کہ مقدار شوق مقدار محبت پر مبنی ہے، یہ محال ہے کہ فراوانی محبت میں شوق قاصر پایا جائے یا کمی محبت کی صورت میں شوق کثیر الوجدان ہو۔ سچ ہے کہ سالک کے لیے شوق سے بڑھ کر کوئی سواری نہیں، یہ وہی مرکب ہے جو کھائیوں کو پھاندتا ہے اور امتحان کے خطرناک پُل پر سے صاف گزرتا ہوا جنت اللقاء تک پہنچا دیتا ہے۔ "**فطوبی للمشتاقین وطوبی للمحبین**"۔

۵......ذِکْرُ اللہِ اَنِیْسِی (اللہ کا ذکر میرا مونس ہے)

امام ابن القیمؒ فرماتے ہیں: ذکر ہی اہل ایمان کا زادِ راہ ہے جسے لے کر وہ سفر کیا کرتے ہیں، ذکر ہی وہ منشور (پاسپورٹ) ہے جسے دکھا کر وہ آگے بڑھ سکتے ہیں، ذکر ہی دلوں کی زندگی ہے، جس کے بغیر اجساد بمنزلہ گور رَہ جاتے ہیں، ذکر ہی وہ ہتھیار ہے جس سے رہزنوں اور دشمنوں کو ہٹایا جاتا ہے، ذکر ہی وہ پانی ہے، جس سے دل کی آگ بجھائی جاتی ہے، ذکر ہی وہ دوا ہے جس سے باطن کا روگ دور کیا جاتا ہے، قرآن مجید میں ذکر کو دس طریقے سے بیان کیا گیا ہے:۔

۱......ذکر کا حکم دیا گیا: حکم مطلق بھی: **یایھا الذین اٰمنوا اذکروا اللّٰہ ذکرا کثیرا** "اے ایمان والو! اللہ کا ذکر کیا کرو، بہت ذکر کرنا۔" اور حکمِ مقیّد بھی **واذکر ربک فی نفسک تضرعا وخفیۃ** "اپنے رب کو یاد کرو، اپنے دل میں عاجزی اور خوف سے۔" **وسبحوہ بکرۃ واصیلا** "اللہ کی تسبیح کیا کرو صبح وشام۔"

۲......غفلت ونسیانِ ذکر سے نہی فرمائی گئی **ولا تکونوا کالذین نسوا اللّٰہ**

فانساھم انفسھم ''مت ہوتم ویسے جنہوں نے اللہ کو بھلا دیا اور اللہ نے ان کو نسیان میں چھوڑا۔''

۳......فلاح ونجات کو کثرت ذکر پر معلق فرمایا ہے **واذکرواللّٰہ کثیرا لعلکم تفلحون** ﴿ ''اللہ کا ذکر بہت بہت کیا کرو کہ تم فلاح پاؤ۔''

۴......اہل ذکر کی مدح وثنا فرمائی ہے **والذاکرین اللّٰہ کثیرا والذاکرات اعداللّٰہ لھم مغفرۃ واجرا عظیما** ''مرد اور عورتیں اللہ کا بہت بہت ذکر کرنے والے ان کے لیے اللہ نے مغفرت اور اجر عظیم مقرر کر رکھا ہے۔''

۵......غافلین ذکر کے خسران کا اعلان فرمایا گیا ہے: **یا الذین اٰمنو الاتلھکم اموالکم ولااولادکم عن ذکر اللّٰہ ومن یفعل ذٰلک فاولئک ھم الخسرون** اے ایمان والو! تمہارا زر ومال اور تمہاری اولاد تم کو اللہ کے ذکر سے غافل نہ کردیں جس نے ایسا کیا وہ نقصان اٹھانے والا ہے۔

۶......ذکر کو جملہ اعمال سے افضل واعلیٰ بتلایا ہے **ان الصلوٰۃ تنھی عن الفحشاء والمنکر ولذکر اللہ اکبر** ''نماز بدکاریوں اور برے کاموں سے ہٹا دیتی ہے اور اللہ کا ذکر تو بہت بڑھ کر ہے۔

۷......قرآن مجید پر تدبر سے واضح ہوتا ہے کہ جملہ اعمال صالحہ کا اختتام بیان ذکر پر ہوتا ہے، چنانچہ حکم نماز پر غور کیجئے **فاذاقضیتم الصلوٰۃ فاذکرواللّٰہ قیاما وقعودا وعلی جنوبکم**. ''جب تم نماز سے فارغ ہوجاؤ تو اللہ کو یاد کرو، کھڑے بیٹھے اور کروٹ پر لیٹے ہوئے۔اور اختتام حکم نماز جمعہ کو پڑھیئے **فاذاقضیت الصلوٰۃ نتشروافی الارض وابتغوامن فضل اللّٰہ واذکرواللّٰہ کثیرا لعلکم تفلحون** ''جب نماز ہوچکے تب اپنی اپنی جگہ پھیل جاؤ، اللہ کے فضل کی تلاش کرو اور اللہ کا بہت بہت ذکر کرو تا کہ تم فلاح پاؤ۔'' اور اسی طرح اختتام حکم صیام پر تدبر کیجیے **ولتکبروا اللّٰہ علی ماھدٰکم**. تا کہ تم اللہ کی بزرگی کرو، اس لیے کہ اس نے تم کو ہدایت کی ہے۔اور اسی طرح اختتام حکم حج کو

دیکھیے فاذا قضیتم مناسککم فاذکروا اللہ جب مناسک پورے کر چکو تب اللہ کا ذکر کرو۔ اور اختتام حیات بھی اگر ذکر پر ہو تو اس کے لیے حدیث پاک میں داخلہ جنت کا وعدہ ہے ادخله الله الجنة.

۸......ذاکرین کو ہی صاحبانِ عقل و ہوش فرمایا گیا ہے: ﴿ان فی خلق السمٰوات والارض واختلاف الیل والنهار لأیٰت لاولی الالباب الذین یذکرون اللّٰه قیاما وقعودا وعلی جنوبهم﴾ ''آسمانوں اور زمین کی پیدائش میں اور شب و روز کے الٹ پلٹ کرانے میں بیشک نشانیاں ہیں عقل و مغز والوں کے لیے جو اللہ کو کھڑے بیٹھے اور کروٹوں پر یاد کیا کرتے ہیں۔''

۹......ذکرِ الٰہی جملہ اعمال کے ساتھ ساتھ پایا جاتا ہے اور اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ذکر ہی روح الاعمال ہے نماز کے متعلق ہے ﴿واقم الصلوٰة لذکری﴾ ''نماز کو قائم کرو میرے ذکر کے لیے۔'' حدیث شریف میں چند اعمال کا ذکر کر کے ان کا ذکر الٰہی کے لیے ہونا ظاہر فرمایا گیا ہے: ﴿وانما جعل الطواف بالبیت والسعی بین الصفاء والمروة ورمی الجمار لاقامة ذکر اللّٰه﴾ ''خانہ کعبہ کا طواف، صفا و مروہ کے درمیان سعی اور کنکریوں کا چلانا ذکر الٰہی کی اقامت کے لیے مقرر ہوا ہے۔''

صحیح مسلم کی حدیث عن ابی ہریرہؓ میں اہل ذکر کو مفردون فرمایا گیا ہے یعنی اہل تفرید وتوحید۔ ابو درداءؓ سے مسند احمد میں ہے، نبی ﷺ نے فرمایا: ﴿الا انبئکم بخیر اعمالکم وازکاها عند ملیککم وارفعها فی درجاتکم وخیرلکم من انفاق الذهب و الفضة وان تلقوا عدوکم فتضربوا اعناقهم ویضربون اعناقکم قالوا وماذلک یارسول الله قال ذکر اللّٰه عزوجل﴾ ''کیا میں تمہیں آگاہ نہ کروں کہ تمہارے اعمال میں بہتر کیا ہے اور تمہارے مالک کے نزدیک سب سے ستھرا کیا ہے اور تمہارے درجات میں سب سے بلند تر کیا ہے اور جو زر و سیم کے خرچ سے بھی بہتر ہے جو اس سے بھی بہتر ہے کہ دشمنوں کو ملو ان کی گردنیں کاٹو یا وہ تمہاری گردنیں کاٹیں، صحابہ نے عرض کیا کہ اے اللہ

کے رسول وہ کیا ہے فرمایا اللہ کا ذکر۔"

صحیح مسلم میں ہے نبی ﷺ نے فرمایا: ﴿لایقعد قوم یذکرن اللّٰہ الا حفتهم الملائكة وغشيتهم الرحمة ونزلت عليهم السكينة وذكرهم اللّٰه فی من عنده﴾ جو لوگ اللہ کا ذکر کرنے کو بیٹھتے ہیں، فرشتے ان کے گرداگرد آجاتے ہیں، رحمت ان پر چھا جاتی ہے سکینہ ان پر نازل ہوتا ہے، اور اللہ تعالیٰ ان کا ذکر اپنے فرشتوں سے فرماتا ہے۔

صحیح مسلم میں حضرت معاویہؓ سے مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ صحابہ کے حلقہ میں تشریف لائے اور پوچھا کہ کیوں بیٹھے ہو، عرض کیا کہ ہم اللہ تعالیٰ کی حمد کررہے ہیں، اس امر پر کہ ہمیں اسلام کی راہ دکھلائی، اور اہم پر احسان فرمایا فرمایا، کیا قسمیہ کہتے ہو؟ صحابہ نے عرض کیا کہ ہاں قسمیہ عرض کرتے ہیں: فرمایا! ﴿اما انی لم استحلفكم تهمة لكم ولكن اتانی جبريل عليه والسلام فاخبرنی ان اللّٰه يباهی بكم الملائكة﴾ سنو! میں نے تم سے حلف نہیں لیا بہ سبب جھوٹ کے تہمت کے، لیکن میرے پاس تو جبریلؑ ابھی آئے تھے، انہوں نے مجھے خبر دی کہ اللہ تعالیٰ تمہاری وجہ سے ملائکہ پر فخر کرتا ہے۔

ایک اعرابی نے حضور ﷺ سے سوال کیا کہ کون سا عمل افضل ہے، فرمایا: ﴿ان تفارق الدنيا ولسانک رطب من ذكر اللّٰه﴾ "جب تو دنیا چھوڑے تو تیری زبان اللہ کے ذکر سے تروتازہ رہے۔ ایک اور شخص نے عرض کیا کہ مجھے احکام اسلام تو بہت زیادہ معلوم ہوتے ہیں مجھے صرف ایک چیز بتلا دیجئے فرمایا: ﴿لایزال لسانک رطبا من ذکر اللّٰه﴾ "تیری زبان برابر ذکر الٰہی میں جاری رہنی چاہئے۔ مسند وغیرہ میں جابر سے روایت ہے کہ نبی ﷺ تشریف لائے اور فرمایا: ﴿یا یها الناس ارتعوا فی ریاض الجنة﴾ اے لوگو! چمن ہائے بہشت کی سیر کرو۔ لوگوں نے عرض کیا کہ چمن ہائے بہشت کسے کہتے ہیں، فرمایا: ﴿مجالس الذکر﴾ "ذکر کی مجلسیں۔" اور فرمایا "صبح وشام ذکر الٰہی برابر کیا کرو، تم

میں سے جوکوئی یہ چاہتا ہو کہ اس امر پر غور کرے کہ اللہ کا درجہ خود اس کے دل میں کیا ہے ،کیوں کہ اللہ تعالیٰ بندے کو ویسا ہی درجہ عطا فرماتا ہے جو اس کے نزدیک اللہ کا درجہ ہوتا ہے۔

صحیح ترمذی ومسند وغیرہ میں ہے، نبی ﷺ نے اپنے پدر بزرگوار ابراہیمؑ سے روایت کیا ہے: ﴿اقرا امتک منی السلام واخبرهم ان تربة الجنة طيبة التوبة عذبة الماء وانها قيعان وان عراسها سبحان الله والحمد لله ولااله الا الله والله اكبر﴾ ''اپنی امت سے میرا اسلام کہہ دیجئے اور بتا دیجئے کہ جنت پاکیزہ زمین، میٹھے پانی والی ہے، وہ سفید جگہ ہے اور وہاں کے گل، بوٹے سبحان اللہ والحمد اللہ الخ ہیں۔''

صحیحین میں ابوموسیٰؓ سے روایت ہے۔ نبی ﷺ نے فرمایا: ﴿مثل الذی يذكر ربه والذی لا يذكره مثل الحی والميت﴾ ''جو شخص اللہ کا ذکر کرتا ہے اس کی مثال زندہ جیسی ہے اور جو شخص ذکر نہیں کرتا، اس کی مثال مردہ جیسی ہے۔''

روایت صحیح میں ہے کہ نبی ﷺ نے اللہ تعالیٰ سے روایت کرتے ہوئے فرمایا: ﴿من ذكرنی فی نفسه ذكرته فی نفسی ومن ذكرنی فی ملاء ذكرته فی ملاء خير منهم﴾ ''جوکوئی شخص میرا ذکر چپکے چپکے کرتا ہے میں بھی اس کا ذکر اپنی ذات سے کرتا ہوں، جوکوئی میرا ذکر کسی گروہ کے اندر کرتا ہے میں بھی اس کا ذکر ایسے گروہ میں کرتا ہوں جو ان کے گروہ سے بہتر ہے۔''

یاد رکھئے، کہ ذکر کے تین طریقے ہیں: صرف زبان ذکر کر رہی ہو، یہ ادنی درجہ ہے۔ صرف دل ذکر کر رہا ہو، یہ متوسط درجہ ہے۔ دل اور زبان دونوں ذکر کر رہے ہوں، یہ درجہ اعلیٰ ہے۔ یہ بھی یاد رکھئے، اقسامِ ذکر بھی تین ہیں:۔

۱......اسماء وصفات اور ان کے معانی کا ذکر، ثنائے ربانی اور توحید الٰہی۔

۲......امر ونہی، حلال وحرام کا ذکر اللہ تعالیٰ کے انعام واکرام احسان اور عطیات کا بیان

یاد رکھئے کہ مراتب ذکر بھی تین ہیں:۔

۱......وہ ذکر جو غفلت ونسیان کو اڑا دیتا ہے۔

۲......وہ ذکر، جو قیود سے چھڑا کر بقائے شہود تک پہنچا دیتا ہے۔

۳......وہ ذکر، جو انسان کو اپنی یاد سے فراموش کر کے ذکر حقانی ہی کے ساتھ وابستہ وزندہ کر دیتا ہے۔ مبارک ہے وہ انسان، جسے ذکر ربانی نے اپنا فریفتہ بنالیا ہے۔ مبارک ہے وہ صاحب ایمان جس نے فنائے عالم کا سبق بقائے رب العالم سے سیکھ لیا ہے۔

۶......اَلثِّقَةُ كَنْزِی (اعتمادِ الٰہی میرا خزانہ ہے) اصل اس بارہ میں سیدنا موسیٰ کی ماں کا واقعہ ہے، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے ﴿فاذا خفت علیه فالقیه فی الیم و لاتخافی و لاتحزنی﴾ جب تجھے موسیٰ کی جان کا ڈر ہو، تب اسے دریا میں ڈال دینا اور ایسا کرتی ہوئی نہ خوف کھانا نہ غم کرنا۔ یہ ظاہر ہے کہ اس خاتون بلند پایہ کو اگر اللہ عز وجل کے فرمودہ پر اعتماد قوی نہ ہوتا تو وہ کبھی اپنے ہاتھوں سے اپنے بچہ کو دریا میں نہ ڈال دیتی۔

لہٰذا یہ سمجھ لینا چاہئیے کہ اعتماد ہی چشم توکل کی پتلی ہے، اور اعتماد ہی دائرہ تفویض کا مرکز ہے، اور اعتماد ہی قلب سلیم کا سویدا ہے، یہ اعتماد بوقت یاس بھی ہوتا ہے اور انسان مصائب کی حالت میں اپنے رب پر اعتماد کرتا ہے اور اس کے خلاف نہ زبان پر کوئی حرف لاتا ہے اور نہ دل میں کوئی وسوسہ، یہ اعتماد بوقت امید بھی ہوتا ہے، اور انسان کو اللہ تبارک وتعالیٰ کی سابقہ ربوبیت اور اپنے عدم استحقاق کی حقیقت بخوبی منکشف ہو جاتی ہے۔

واضح ہو کہ ایسا اعتماد تمام نظام عام پر چشم بصیرت کے کھولنے سے حاصل ہوتا ہے جب کہ انسان کو نظر آجاتا ہے کہ جمادات کا ذرہ ذرہ، نباتات کا پتہ پتہ، ارضیات وسماویات کا ریزہ ریزہ ہر ایک عرض کا جوہر اور ہر ایک جوہر کا وجود اسی کے انعام سے فیض یاب اور اسی کے احسان کی دولت سے مالا مال ہے، یہ نظارہ بندہ کے اعتماد کو قوی بناتا ہے، اور یقین کلی بندھ جاتا ہے کہ یہ ناچیز بندہ بھی اس کے لطفِ عام سے کبھی محروم نہیں رہ سکتا۔

۷......وَ الْحُزْنُ رَفِيقِی (اندوہِ دل میرا رفیق ہے) خوف وخشت بھی ایسے دو لفظ ہیں جو اردو میں حزن کے مترادف سمجھے جاتے ہیں، لیکن زبان عرب میں ہر ایک لفظ کا مفہوم

الگ الگ ہے، خوف کا اطلاق زیادہ تر حسی اشیاء پر ہوتا ہے، خشیت کا اطلاق غیر حسی اشیاء پر بہ کثرت ہوتا ہے، حزن اس اندوہ قلب کو کہتے ہیں جو کسی دوسرے کی بہتری و بہبودی کے متعلق دل ہی دل میں جوش زن ہوتا ہے، گولب خاموش ہوتے ہیں، کتاب اللہ میں لفظ حزن کا استعمال انبیاء واصفیاء کے لیے بہ کثرت ہوا ہے، اللہ نے نبی ﷺ کی بابت فرمایا ہے: ﴿**لایحزنک قولھم**﴾ ''ان کی باتوں سے اے نبی آپ کو حزن نہ ہونا چاہیئے ۔''

چونکہ نبی ﷺ کی شفقت ورافت نوع انسانی کے ساتھ بہت بڑھی ہوئی تھی اور حضور ﷺ ان نافرمانوں کے عواقب امور کا خیال کرتے ہوئے اکثر اندوہ گین رہتے تھے، لہذا اللہ تعالیٰ نے حزن نہ کرنے کا حضور کو ارشاد فرمایا قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے اس حدیث نبوی کی بھی روایت کی ہے جو نبی کریم ﷺ نے غار ثور میں رفیق صادق ابوبکرؓ سے فرمائی تھی یعنی لاتحزن صدیق کا فدائی دل نبی ﷺ کے رنج وآزار کو دیکھ کر پاش پاش ہورہا تھا، تب نبی ﷺ نے "**لاتحزن ان اللہ معنا**" فرما کر باب حزن سے قصر انس تک پہنچایا۔

اس ارشاد میں نقطہ لطیف یہ تھا کہ اس معیت ربانی کا درجہ جس میں نبی، صدیق داخل وشامل تھے، اس حزن سے برتر واعلیٰ ثابت کیا جائے جسے عشق نے سلامتی یار کے متعلق بھیانک بنادیا تھا۔

یہ یادرکھنے کی بات ہے کہ اسم اعظم ''اللہ'' کے ظلال میں جو معیت شامل ہے وہ جملہ اسماء حسنی کے ظلال سے بدرجہ علیا ہے اور کمالات عارف کی تکمیل اسی اسم ذات ''اللہ'' کی سیر میں ہوتی ہے اور جب معیت الہیٰ کا ظہور ان اللہ معنا، کے نور میں ہوتا ہے تو جملہ اسماء کی ظلمت ورفعت بھی اسی کے تحت میں داخل ہوتی ہے اور کائنات کے جملہ اسباب وعلل ساقط ومضمحل ہوجاتے ہیں۔ مادر موسیٰ کو جو وحی ربانی ہوئی، وہ یہ تھی: ﴿**لاتخافی ولا تحزنی انا رادوہ الیک وجاعلوہ من المرسلین**﴾ ''آپ خوف نہ کیجئے اور نہ حزن کیجئے، ہم اسے تیرے پاس واپس کریں گے، ہم اسے مرسلین میں سے بنائیں گے۔'' ذرا غور کرو، کہ خوف حسی کے مقابلہ میں بھی ایک بشارت موجود ہے اور حزن غیر حسی کے ساتھ

بھی ایک بشارت شامل ہے۔خوف کے مقابلہ میں یہ کہ بچہ جسے تو دریا میں ڈال دے گی، اللہ تعالیٰ اسے تیرے ہی پاس واپس کردے گا۔حزن غیر حسی کے مقابلہ میں یہ کہ اسے نبوت کی وہ نعمت ملے گی، جس کا ادراک ہواس نہیں کرسکتے ،ان آیات پر تدبر اور تتبع کے بعد حدیث زیرِعنوان کا مطلب واضح ہوجاتا ہے، کہ وہ حزن جو ہر وقت پیراہن دل پاک رکھتا تھا، وہ یا تو امت آثمہ کی بخشش کا تھا یا امت عاصیہ کی ہدایت کا۔

دل قدسی میں خلق خدا کی محبت بھری تھی، اور عامۃ الناس کی ہمدردی وغم گساری حضورؐ کے رگ وپے میں ساری تھی،ایک ایک جان کی نجات کا خیال حضورؐ کو اس طرح رہتا جیسے گڈریا کو اپنی ایک ایک بکری کا،اس کی سو بکریوں میں سے اگر ایک بھی علیحدہ ہوجاتی اور جھاڑیوں میں رہ جاتی ہے تو گڈریا سمجھتا ہے کہ اگر اسے ساتھ نہ لیا گیا تو وہ بھیڑیے کا شکار ہونے والی ہے،وہ اس ایک کے پیچھے جاتا ہے اور اسے ہلاکت کے منہ سے نکال لاتا ہے۔ نبی ﷺ کا یہ حزن کبھی قلب پاک سے الگ نہ ہوا، بسا اوقات تہجد میں سارا سارا وقت امت کے لیے دعا کرنے میں وقف فرمادیتے ،ایک رات کا واقعہ ہے کہ صرف اسی ایک آیت کے دہرانے میں پوری رات بسر فرمادی: ﴿**ان تعذبھم فانھم عبادک وان تغفرلھم فانک انت العزیز الحکیم**﴾ ''اگر تو ان کو عذاب دے گا تو یہ تیرے بندے ہیں اور اگر تو ان کو بخش دے گا تب تو غالب حکمت والا ہے۔''

۸......وَالْعِلْمُ سَلَاحِی (میرا ہتھیار علم ہے)واضح ہو کہ متصوفین متاخرین نے علم کا درجہ حال سے کم قرار دیا ہے،حالانکہ معاملہ بالعکس ہے۔علم حاکم ہے،حال محکوم ہے۔علم ہادی ہے،حال تابع ہے۔علم امام ہے،حال ماموم ہے۔دائرہ علم دنیا وآخرت پر وسیع ہے،دائرہ حال صرف صاحب حال تک ہے۔حال ایک تیغ بُراں ہے،اگر علم کی حفاظت نہیں تو یہ تلوار اسی کی کاٹ کرتی ہے جس کے ہاتھ میں ہو۔حال ایک ایک آگ ہے جس پر کسی کی نگرانی نہ ہو،حال ایک منہ زور گھوڑا ہے،اگر اس کے منہ میں علم کا لگام نہیں تو وہ اپنے سوار کی اور پھر خود اپنی ہلاکت کا موجب ہوتا ہے۔

لیکن علم ہی ہے، جو حیات القلوب ہے، نور البصائر ہے، شفاء الصدور ہے، ریاض العقول ہے، علم ہی لذت الارواح ہے، اور علم ہی مونس متوحشین ہے، علم ہی وہ میزان ہے، جس میں اقوال واحوال واعمال وزن کیے جاتے ہیں، علم ہی وہ حاکم ہے جو شک ویقین اور ضلالت وارشاد میں فیصلہ دیتا ہے، علم ہی سے اللہ تعالیٰ کی معرفت ملتی ہے، اور علم ہی سے رب العالمین کی تحمید وتمجید وتوحید نصیب ہوتی ہے، علم ہی حلال وحرام میں فرق بتلاتا ہے، علم ہی مواریث وارحام کے مدارج ظاہر کرتا ہے۔

امام احمد بن حنبلؒ فرماتے ہیں کہ علم کی ضرورت اکل وشرب سے بھی قوی تر ہے، آب وخورش کی ضرورت تو شب وروز میں دوبار پڑتی ہے، مگر علم کی ضرورت ہر ایک سانس پر ہے۔ علم ہی ہے جس کی تلاش میں کلیم اللہ موسیٰ نے سفر طویل اختیار کیا تھا، اور اس سفر میں تین مسائل کو ثمر سفر قرار دیا تھا۔ علم ہی ہے جس کی طلب ودرخواست کرنے کا حکم اللہ عزوجل نے نبی ﷺ کو دیا تھا "وقل رب زدنی علما" پڑھا کر، کہ اے اللہ مجھے علم میں بڑھایا کر۔ ذرا یہ تو خیال کرو کہ وہ کتا یا باز جسے شکار پر سدھایا گیا، اور شکار پر لگایا گیا ہو، جسے عربی میں معلم کہتے ہیں، وہ تھوڑا سا علم سیکھنے سے کس درجہ کو پہنچ جاتا ہے، کہ اس کا پکڑا ہوا شکار حلال ہوتا ہے اور اس کی جنس کے دوسرے حیوان غیر مسلم کا پکڑا ہوا شکار حرام۔

یہ معلم جارحہ انسانی کہلانے کا مستحق بن جاتا ہے، جب کہ اس کے ابنائے جنس نجس العین ہیں۔ یہ درجہ اس کو کیوں ملا اس کا سبب صرف علم ہے، صرف علم۔ اب یہ بھی یاد رکھیئے کہ علم وہ ہے جس کی ابتدائی علامت اقامت دلیل ہے اور جس کی آخری شناخت رفع جہل ہے۔ ہاں علم کے تین مدارج ہیں:۔

درجہ اول...... (یا ابتدائی) وہ علم ہے جو قوت باصرہ کے واسطہ سے حاصل ہوتا ہے، وہ جو استفادہ صحیحہ سے قوت سامعہ کو حاصل ہوتا ہے، وہ جو ایک بڑی تعداد انسانی کے تجربہ متواتر کا نتیجہ ہوتا ہے۔

درجہ دوم...... وہ علم ہے جو اجسام زکیہ وباطن طاہرہ میں پیدا ہوتا ہے، وہ جو اہل ہمت عالیہ

کے انفاس صادقہ کو عطا ہوتا ہے، ایسی حالت میں جب کہ ہر طرف خاموشی چھائی ہوتی ہے۔

درجہ سوم...... وہ علم ہے جسے عام طور پر علم لدنی سے موسوم کیا جاتا ہے، یہ علم عبودیت کا ثمرہ اور متابعت احکام حقہ کا پھل ہوتا ہے، جب کمال انقیاد کا مادہ راسخ ہو جاتا ہے اور جب مشکوٰۃ نبوت سے اخذ نور کی رغبت ترقی پذیر ہو جاتی ہے، تب جواد مطلق کی جانب سے وہ معارف ایمانیہ اور حقائق اصلیہ کھول دیے جاتے ہیں، جس تک کسی فلسفی یا منطقی کا تخیل بھی نہیں پہنچ سکا ہوتا، ایسا علم خود اپنے لیے دلیل بھی ہے اور دوسرے کے لیے مدلول بھی۔

اس مقام پر ان مخالفین و معترضین کو بھی توجہ دلانا ضروری ہے جو کہا کرتے ہیں کہ ''اسلام بزور شمشیر پھیلایا گیا ہے،'' غور کیجئے کہ نبی ﷺ تو علم کو اپنی تلوار بتلا رہے ہیں اور ان فتوحات عظیمہ کو جو حاصل ہوئیں ثمرات علم قرار دیتے ہیں۔ درحقیقت اللہ کے نبی ﷺ کا فخر اینٹ چونہ، پتھر کی دیواروں، خندقوں پر قابض ہو جانے میں نہیں سکندر، تیمور، ہلاکو خان، بونا پارٹ نے ایسے تماشے دنیا میں بہت کھیلے ہیں اللہ کے نبی ﷺ کا امتیاز تو دلوں کے قلعوں اور قلوب کے حصوں کو فتح کر لینے میں ہے۔

یہ نظارہ خیبر میں نظر آیا کہ جن دنوں اسلامی لشکر نے ان یہودیوں کے جو ہمیشہ اہل ایمان کے خلاف ملک بھر میں آتش جنگ وجدال کو بھڑکائے رکھتے تھے، چند قلعے فتح کر لیے، تو انہی ایام میں نبی ﷺ کے حضور میں حبشہ کے نومسلم سرداران دربار بھی حاضر ہوئے اور اسی اثنا میں ملک یمن سے بھی کئی سو مسلمانوں کا قافلہ باریاب سعادت ہوا، لہٰذا اللہ تبارک وتعالیٰ کو منظور یہ تھا کہ یہودیوں کو کھلی آنکھ سے دکھلایا جائے، کہ وہ اللہ کے اور اس کے رسول کے مقابلہ میں اینٹ پتھر کی دیواروں کے بھروسہ پر اڑے بیٹھے ہیں، جس کا علم سمندر پار حبشہ کو فتح کر رہا ہے، جس کا علم یمن کے بلند ترین پہاروں کی چوٹیوں پر اپنا علم صداقت نصب کر رہا ہے یہ وہ ملک ہیں جو کبھی حجاز کے زیر نگین نہ ہوئے تھے۔

یہ حبش وہی ملک ہے جس کے جنرل اوٹرم نے یمن کو فتح کر کے ۶۰ ہزار فوج کا لشکرِ جرار مکہ مکرمہ کے فتح کرنے اور کعبۃ اللہ کے گرانے کے لیے مکہ سے چار میل کے فاصلہ پر

لاڈالا تھا، یہ واقعہ (جسے قرآن پاک نے واقعہ اصحاب الفیل کے نام سے بیان فرمایا ہے) نبی ﷺ کی ولادت اقدس سے صرف پچاس دن پہلے کا ہے۔ ان حملہ آوروں کو کیا معلوم تھا کہ خود ان کا بادشاہ رسول حجازی کی کفش برداری کی تمنا کرے گا اور سارا ملک اسی کعبہ کی سمت اللہ تعالیٰ کے سامنے سر عبودیت کو جھکائے گا۔

یاد رکھئے کسی ملک وقوم کو بزور شمشیر فتح یا مغلوب کرنے کے لیے ضروری ہے کہ حملہ آور کے پاس شمشیر زن بھی موجود ہوں، جن کی دھاک ایسی بندھی ہوئی ہو کہ لوگ ان کی تلوار سے ڈر ڈر کر اپنا پہلا پیارا مذہب چھوڑنے پر آمادہ ہو جائیں۔ اب سوال یہ پیدا ہوگا کہ ایسے بہادر، ایسے تلوار یے، ضرار بن الازور، شرجیل بن حسنہ عدی بن حاتم، عکرمہ بن ابی جہل، مقداد بن الاسود الکندی، مقدام بن معدی کرب، خالد بن ولید، زبیر بن العوام، اور علی مرتضیٰؓ جیسے کیوں کر اس شخص کے مطیع وفرمابردار ہو گئے تھے۔ ان کی تلواروں پر نہتے، غریب ومسکین، بکریاں چرانے والے یتیم نے کیوں کر قبضہ کر لیا تھا، یہ ظاہر ہے کہ ایسے جری، ایسے بطل تو خوف شمشیر سے مطیع نہ ہوئے ہوں گے اور انہوں نے تو صرف خوف جان سے اپنے اپنے قدیم پیارے مذہب کو نہ چھوڑ دیا ہوگا۔ جب یہ امر مسلم ہو جائے تو قابل غور یہ رہ جائے گا کہ جب نبی ﷺ کے پاس کوئی ایسی شئے کوئی ایسی قوت کوئی ایسی کشش موجود ہے، جو شیروں کا شکار کرتی ہے، تو پھر ان کو کیا ضرورت پڑی تھی کہ بھیڑوں اور لومڑیوں کے لیے تلوار کا استعمال کریں۔ غور وفکر جتنا گہرا ہوتا جائے گا اسی قدر جلد یہ واضح ہو جائے گا، کہ حضورؐ کا یہ فرمان **العلم سلاحی** حقیقت کا مظہر ہے، جس کا کوئی بطلان نہیں ہو سکتا۔ جو کامیابی نبی ﷺ کو حاصل ہوئی، اس کا ذریعہ وہی علم صحیح تھا جو اللہ عزوجل نے حضورؐ کو ارزانی فرمایا تھا۔ وہ علم، جو ظلمات کو دور کر دیتا اور چلنے والوں کو نور میں لے آتا ہے۔ وہ علم جو آنکھوں کو روشن، دل کو بینا بنا دیتا ہے۔ وہ علم ہے کہ "**ھٰذا بصائر للناس**" کی صفت اسی پر صادق آتی ہے۔

۹......**وَالصَّبْرُ رِدَائِیْ** (صبر میرا شاندار لباس ہے) قرآن مجید میں (۹۰) مقامات پر صبر کا ذکر فرمایا گیا ہے کتاب حمید نے ۱۶ طریقوں سے صبر کی توصیف فرمائی

ہے، ہم اختصار کے ساتھ انشاء اللہ ان طریقوں کا ذکر کریں گے۔

اول...... اللہ تعالیٰ نے صبر کا امر فرمایا: ﴿قال موسی لقومہ استعینوا باللّٰہ واصبروا﴾ ''موسیٰ نے اپنی قوم سے فرمایا کہ خدا تعالیٰ کا سہارا رکھو اور مستقل رہو۔'' ﴿واستعینوا بالصبر والصلوٰۃ﴾ ''صبر اور نماز سے مدد حاصل کیا کرو۔'' ﴿اصبروا وصابروا﴾ ''صبر رکھو اور آپس میں صبر کی تعلیم دیا کرو۔'' ﴿واصبر وما صبرک الا باللّٰہ﴾ صبر کرو، تیرا صبر تو اللہ کے لیے ہے۔''

دوم...... عدم صبر سے نہی فرمائی فرمایا: ﴿فاصبر کما صبر اولوا العزم من الرسل ولا تستعجل لھم﴾ ''صبر کیجئے، جیسا کہ باہمت رسولوں نے صبر کیا اور ان کے لیے جلدی نہ کیجئے۔'' ﴿ولا تولوھم الادبار﴾ ''دشمنوں کو پیٹھ مت دکھاؤ۔'' ﴿ولا تھنوا ولا تحزنوا﴾ ''اپنا دل تھوڑا نہ کرو غمگین نہ ہو۔''

سوم...... اہل صبر کی ثناء فرمائی: ﴿والصابرین فی الباساء والضراء وحین الباس اولئک الذین صدقوا واولئک ھم المتقون﴾ ''جو تکلیف میں اور تنگی میں اور لڑائی میں صبر کرتے ہیں، وہی ہیں جنہوں نے سچ کر دکھایا اور یہی لوگ متقی بھی ہیں۔''

چہارم...... اہل صبر کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے اپنی محبت کا ذکر فرمایا: ﴿واللّٰہ یحب الصابرین﴾ ''اللہ تعالیٰ صبر والوں کے ساتھ محبت کرتا ہے۔

پنجم...... اہل صبر سے اپنی معیت کا اعلان فرمایا ﴿ان اللّٰہ مع الصابرین﴾ ''بے شک اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔'' یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ ایک معیت عامہ ہے جو بذریعہ علم واحاطہ ہوتی ہے اور ایک معیت خاصہ جس کا نتیجہ حفاظت ونصرت وتائید الٰہی ہوتا ہے آیت بالا میں معیت خاصہ ہی کا ذکر ہے۔

ششم...... صبر کو اہل صبر کے لیے بہتر بتلایا: ﴿ولئن صبرتم لھو خیر للصابرین﴾ ''اگر تم صبر کرو، تو ایسا کرنا صبر کرنے والوں کے لیے بہتر ہے۔'' ﴿وان تصبروا خیر لکم﴾ ''اور صبر کرو تو یہ تمہارے لیے بہتر ہوگا۔''

ہفتم......اعلان فرمایا کہ اہل صبر کو جزا بطریق احسن عطا ہوگا۔﴿ ولنجزين الذين صبروا اجرهم باحسن ما كانوا يعملون﴾ ''ہم صبر کرنے والوں کو ان کے عمل کی جزا بہترین طریق سے دیں گے۔''

ہشتم......خبر دی کہ اہل صبر کو عطیہ بلا حساب ملے گا۔﴿انما يوفى الصابرون اجرهم بغير حساب﴾ ''صبر والوں کو ان کا اجر پورا پورا بلا حساب دیا جائے گا۔''

نہم......اہل صبر کو بشارت دی گئی۔﴿وبشر الصابرين﴾ ''صبر کرنے والوں کو بشارت پہنچا دیجئے۔''

دہم......اہل صبر کی نصرت وامداد کی ضمانت فرمائی۔﴿بلى ان تصبروا وتتقوا وياتوكم من فورهم هٰذا يمددكم ربكم بخمسة اٰلاف من الملائكة مسومين﴾ ''ہاں! اگر تم صبر وتقویٰ رکھو اور دشمن تم پر فوراً آجائے تو تمہارا رب تمہاری مدد پانچ ہزار ملائکہ سے جو نشان والے ہوں گے فرمائے گا۔'' حدیث شریف میں ہے. واعلم ان النصر مع الصبر.

یازدھم......اللہ تعالیٰ نے خبر دی کہ اہل صبر ہی اہل عزم ہوتے ہیں:﴿ولمن صبر وغفر ان ذٰلك لمن عزم الامور﴾ ''جس نے صبر کیا اور معافی دی، تو یہ کام بڑی ہمت کے ہیں۔''

دوازدھم......فرمایا کہ اعمال صالحہ اور حظوظ عظیمہ والے اہل صبر ہی ہوتے ہیں:
﴿ويلكم ثواب اللّٰه خير لمن اٰمن وعمل صالحا ولا يلقها الا الصابرون﴾ ''تمہیں خرابی ہو، اللہ کا عطیہ ایمان اور نیک عمل والے کے لیے بہتر ہے اور اس کو صرف صبر والے ہی حاصل کر سکتے ہیں۔''﴿وما يلقها الا الذين صبروا وما يلقها الا ذو حظ عظيم﴾ ''اس کو صبر والے ہی حاصل کر سکتے ہیں اور اسے وہی پا سکتے ہیں جو بڑی قسمت والے ہیں۔''

سیزدھم......بتلایا کہ آیات الٰہی سے انتفاع وعبرت صرف اہل صبر ہی حاصل کر سکتے

ہیں:﴿ان اخرج قومک من الظلمٰت الی النور وذکر هم بایام اللّٰه ان فی ذٰلک لاٰیٰت لکل صبار شکور﴾ ''ہم نے موسیٰ کو کہا اپنی قوم کو تاریکی سے نکال کر نور میں لا، اور ان کو تاریخ الٰہیہ کا سبق دے کیونکہ اسی میں ہر صابر وشاکر کے لیے بہت نشانیاں ہیں۔'' اور فرمایا:﴿ومن اٰیاته الجوار فی البحر کالاعلام ،ان یشایسکن الریح فَیَظْلَلْنَ رواکد علی ظهره،ان فی ذالک لایت لکل صبار شکور﴾ ''اللہ کی نشانیوں میں سے وہ جہاز ہیں جو سمندر میں چلتے ہیں اور علم کی طرح بلند ہیں، اگر اللہ چاہے تو ہوا رک جائے اور یہ سب جہاز سمندر کے اوپر کھڑے کے کھڑے رہ جائیں، اس میں نشانات ہیں، ہر ایک صبر کرنے اور شکر کرنے والے کے لیے۔''

چہاردھم......بتلایا ہے کہ مطلوب ومحبوب تک فائز ہونا مرعوب سے نجات پانا، جنت العلیٰ کا داخلہ ان ہی لوگ کے لیے ہے جنہوں نے صبر کیا۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے: ﴿والملائِکة یدخلون علیهم من کل باب سلام علیکم بما صبرتم فنعم عقبی الدار﴾ ''فرشتے ہر طرف ان کے پاس حاضر ہوں گے اور کہیں گے کہ اپنے صبر کے بدلے آج تم سلامتی میں ہو، اور آخرت کا گھر تو بہت ہی اچھا ہے۔''

پانزدھم......اہل صبر درجہ امامت پر فائز ہو جاتے ہیں:﴿وجعلنا منهم ائمة یهدون بامرنا لما صبروا﴾ ''ہم نے انہی میں سے امام بنائے جو ہمارے حکم سے لوگوں کی رہنمائی کرتے تھے، جب کہ انہوں نے صبر کیا۔''

شانزدھم......اللہ تعالیٰ نے صبر کا ذکر فرقان حمید میں اسلام وایمان اور یقین وتقویٰ اور توکل وشکر کے ساتھ ساتھ فرمایا ہے، اور اس سے واضح ہو جاتا ہے کہ اللہ عزوجل کے ہاں صبر کا کیا درجہ ہے۔ یہاں تک سولہ اقسام کا ذکر ختم ہو گیا، اب یہ یاد رکھیے کہ صبر ایمان کے لیے ایسا ہی ہے جیسا کہ سر بدن کے لیے ہے بدن پر سر نہ ہو تو زندگی کہاں، ایمان کے ساتھ صبر نہیں تو ایمان کہاں؟ سیدنا عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا قول ہے:﴿ خیر عیش ادرکناه بالصبر﴾ صحیح حدیث میں ہے:﴿عجبا لامر المومن ان امره کله له

خیر ولیس ذلک لاحد الا لمومن ان اصابته سراء شکرو کان خیرله وان اصابته ضراء صبرفکان خیر له﴾ ''مومن کی حالت بھی عجیب سی ہے یعنی اس کی حالت سراپا خیر ہے اور یہ بات مومن کے سوا کسی دوسرے کو حاصل نہیں، اگر اسے کوئی شے خوش کرنے والی حاصل ہوتی ہے تو وہ شکر کرتا ہے اور یہ اس کے لیے بہتر ہوتا ہے، اور اگر اسے کوئی شے ضرررساں پہنچتی ہے تو صبر کرتا ہے، اور ایسا کرنا ہی اس کے لیے بہتر ہے۔''

واضح ہو کہ صبر کے لغوی معنی حبس (روک کے) ہیں۔ محاورہ ہے (قُتِلَ فلانٌ صبرا) فلاں شخص باندھ کر مارا گیا؛ آیت ذیل میں بھی یہی معنی ہیں: ﴿واصبر نفسک مع الذین یدعون ربھم بالغداۃ والعشی یریدون وجھه﴾ ''اپنے آپ کو ان لوگوں کے ساتھ ساتھ رکھیے جو اپنے رب کو صبح وشام پکارا کرتے ہیں اور صرف اسی کی ذات کے خواستگار ہوتے ہیں۔'' اصطلاح میں صبر کو اس لیے صبر کہتے ہیں، کہ اس میں بھی دل کو گریہ وزاری سے اور زبان کو شکوہ سے اور جوارح کو بے قراری سے روک لینا ہوتا ہے، معنی بالا کو ذہن میں رکھتے ہوئے یاد رکھو کہ صبر کی تین اصناف ہیں: صنف اول: طاعتِ الٰہی پر صبر۔ صنف دوم: معصیت الٰہی سے صبر۔ صنف سوم: امتحان الٰہی پر صبر۔

صنف اول ودوم میں انسان کے کسب کا بھی دخل ہے، مگر صنف سوم میں کسب انسانی کو کوئی دخل نہیں، سیدنا یوسف علیہ السلام کے حالات پر غور کرتے ہوئے کہہ سکتے ہیں کہ باپ کی جدائی پر صبر اور چاہ میں گرا دیے جانے پر صبر بھی مقامات صبر میں سے ہیں، مگر امراۃ العزیز کی بات پر انکار کرنا صبر کی اعلیٰ قسم تھا، خصوصاً جب امور ذیل کو بھی زیرِ نظر رکھا جائے۔ ا۔ جوانی (۲) خالی مکان (۳) مجردی (۴) نفس کے مطابق خواہش کا ہونا (۵) بے وطنی جہاں خویش اقارب کا نہ دباؤ ہوتا ہے، نہ ان کی طرف سے حیا ہوتی ہے (۶) محکومی (۷) حسین عورت کی ذاتی درخواست (۸) اس درخواست کے ساتھ ساتھ ہر قسم کا مکر وفریب (۹) لالچ اور خوشامد (۱۰) دھمکی، یہ سب ایسی چیزیں ہیں، جن کی موجودگی صدیق کے منصب صبر کو نہایت بلند کر دینے والی ہیں۔ ابن تیمیہؒ کا قول ہے کہ صبر پر طاعات

کا درجہ صبر از پرہیز محارم سے اکمل و افضل ہے، کیونکہ نبی ﷺ کے نزدیک فعل طاعت ترک معصیت سے زیادہ محبوب ہے اور عدم طاعت کا نقصان وجود معصیت کے نقصان سے زیادہ سنگین ہے۔ اب یہ بھی یاد رکھئے کہ صبر کی تین حالتیں ہیں۔(۱) صبر باللہ (۲) صبرِ للہ (۳) صبر مع اللہ۔

۱......صبر باللہ کے معنی یہ ہیں کہ صبر اپنے نفس کے لیے نہ ہو، بلکہ اللہ کے لیے ہو، جیسے فرمایا گیا ہے: ﴿واصبر وما صبرک الا باللّٰہ﴾ ''صبر کیجئے اور آپ کا صبر تو اللہ ہی کے لیے۔''

۲......صبرِ للہ کے معنی یہ ہیں کہ صبر کا باعث محبت الٰہی اور ارادہ تقرب الٰہی ہو، نہ قوتِ نفس کا اظہار ہو اور نہ خلق خدا میں تعریف کرنے کا شوق ہو۔

۳......صبر مع اللہ کے معنی یہ ہیں کہ بندہ اپنے نفس کو اوامرِ الٰہی اور محارم الٰہی کا مطیع بنادے جہاں چلنے کا حکم ہو چل پڑے، جہاں رک جانے کا حکم ہو، رک جائے۔ یہ صبر صدیقین کا ہے اور یہی سخت ترقسم صبر کی ہے۔

خواجہ جنید بغدادیؒ سے صبر کی بابت پوچھا گیا تو فرمایا صبر تو کڑوی سے کڑوی دوا کو گھونٹ گھونٹ پینا ہے، وہ بھی اس طرح کہ پیشانی پر بل نہ آنے پائے۔ یحییٰ بن معاذؒ کہتے ہیں کہ زاہدین کے صبر سے محبین کا صبر زیادہ سخت ہوتا ہے، یعنی یار سے صبر ہونا بہت زیادہ تعجب کا موجب ہے۔

امام المحدثین امام بخاریؒ نے کتاب الادب میں نبی ﷺ سے یہ روایت بیان کی کہ حضور ﷺ سے دریافت کیا گیا کہ ایمان کیا ہے؟ فرمایا: ﴿الصبر والسماحۃ﴾ ''صبر اور سیر چشمی۔'' اب یہ مسئلہ خوب یاد رکھئے کہ اللہ تعالیٰ سے اپنی حالت کا عرض کرنا بے صبری میں داخل نہیں! حضرت یعقوبؑ فرماتے ہیں: ﴿انما اشکوا بثی وحزنی الی اللّٰہ﴾ ''میں اپنی پریشانی اور اندوہ قلبی کی شکایت اللہ سے کرتا ہوں۔'' ایوبؑ کی جناب احادیث میں دعا ہے: ﴿رب انی مسنی الضروانت ارحم الرّٰحمین﴾ ''اے رب مجھے نقصان

اور ضرر آلگا ہے اور تو سب رحم کرنے والوں سے زیادہ رحم کرنے والا ہے۔''

نبی ﷺ کی سیرت پڑھنے والے جانتے ہیں کہ حضورؐ نے احکام الٰہی کی تبلیغ اہل ایمان کی تعلیم اہل خسران کے انذار، اہل عالم کی تدبیر اور اعلائے کلمۃ الحق کی تدبیر میں کس قدر مصائب ونوائب، ہموم وغموم کی برداشت فرمائی تھی۔

کبھی حضور ﷺ کے آستان فیض پر غلاظت گرائی جاتی جس سے تشتت طبع اور پریشانی دماغ پیدا ہو، کبھی حضور ﷺ کی راہ پر گڑھا کھود کر اسے باریک باریک لکڑیوں سے پاٹ دیا جاتا، گڑھے میں کانٹے بھر دیے جاتے کہ حضورؐ جب نماز تہجد کے لیے نکلیں تو زمین سمجھ کر اس پر پاؤں رکھیں اور گڑھے میں جا گریں، کبھی حضور ﷺ کی پشت مبارک پر (بحالت سجود) اونٹ کی اوجھڑی رکھ دی جاتی اور اسے کفار کی تفریح طبع کا سامان سمجھا جاتا، کبھی حضور ﷺ پر پتھر برسائے جاتے اور قرات قرآن پاک سے آپ کو روکا جاتا، کئی سال کا ایسا زمانہ بھی حضور ﷺ پر گزرا ہے، جب حضورؐ کو ایک گھاٹی میں محصور رکھا گیا ہے، اور دانہ وخورش کا داخلہ بند کیا گیا۔ یہ حضور ﷺ ہی کا حوصلہ تھا، حضورؐ ہی کا دل تھا کہ صبر کیا کہ مالک نے بھی ﴿وما صبرک الابا للّٰہ﴾ کے تمغہ سے حضورؐ کو مشرف فرمایا۔ سچ ہے ایسے ہی مقدس رسول ﷺ کے لب مبارک سے یہ زیبا تھا کہ ﴿الصبر ردائی﴾ فرماتے اور صبر کو تجمل وشان اور شوکت ووقار کا خلعت قرار دیتے۔ **صلی اللّٰہ تعالیٰ علی حبیبہ بقدر صبرہ علی بلائہ وشکرہ علی اٰلائِہٖ وبارک وسلم**

۱۰......وَالرِّضَاءُ غَنِیْمَتِیْ (رضا الٰہی میری غنیمت ہے) واضح ہو کہ رضا کہ متعلق ائمہ تصوف کے تین اقوال ہیں۔

۱......اہل خراسان کہتے ہیں کہ رضا بھی مقامات میں سے ایک مقام کا نام ہے اور انتہائے توکل یہی ہے، اور اس مقام کو بندہ اکتساب سے حاصل کر سکتا ہے۔

۲......اہل عراق کہتے ہیں کہ رضاء منجملہ احوال ہے، یہ مکاسب میں سے نہیں، بلکہ مواہب میں سے ہے۔

۳......تیسرے گروہ نے ہر دو اقوال کو جمع کر دینا چاہا، وہ کہتے ہیں کہ رضا ابتدائی درجہ میں اکتسابی ہے، اور منجملہ مقامات ہے اور انتہائی درجہ میں محض عطیہ ربانی ہے، لہذا منجملہ احوال ہے، گروہ اول کی دلیل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اہل رضا کی مدح وثنا فرمائی ہے، اور اس صفت کے لیے شوق دلایا ہے، اگر یہ مقام اکتسابی نہ ہوتا اور مقدور بشری سے باہر ہوتا، تو ایسا نہ کیا جاتا، نبی ﷺ نے فرمایا ہے: ﴿ذاق طعم الایمان من رضی باللّٰہ ربا وبالاسلام دینا وبمحمد رسولا﴾ ''ایمان کا ذائقہ اس شخص نے چکھا جو اللہ کے رب ہونے پر، اسلام کے دین ہونے پر اور محمد ﷺ کے رسول ہونے پر راضی ہوگیا۔'' نیز فرمایا کہ جو شخص اذان سن کر یہ الفاظ پڑھتا ہے ﴿رضیت باللّٰہ ربا وبالاسلام دینا وبمحمد رسولا﴾ اس کے گناہ بخش دیے جاتے ہیں۔ یہ دونوں احادیث اس شان کی ہیں کہ مقامات دین کا انہی پر مدار ہے، غور کریں تو ان سے چار امور کا ثبوت ملتا ہے۔

ا......اللہ تعالیٰ کی ربوبیت والوہیت پر رضامندی۔

ب......نبی ﷺ کی رسالت اور حضور کی اطاعت پر رضامندی۔

ج......دین الہیٰ پر رضامندی۔

د......دین الہیٰ کے سامنے تسلیم وانقیاد کا اقرار۔

ہم کہہ سکتے ہیں کہ جس شخص میں یہ ہر چہار امور جمع ہو جائیں تو وہ صدیق ہے۔ ہاں! دعویٰ زبان سے آسان ہے مگر کامیابی امتحان دشوار ہے، خصوصاً جب کہ معاملہ یہ ہو کہ نفس کی مراد خواہش اس کے خلاف ہو۔

یاد رکھئے کہ الوہیت پر رضامندی کے معنی یہ ہیں کہ محبت وانابت اور تبتل الی اللہ میں توحید حاصل ہو خوف ہو تو اسی کا ہو۔ امید ہو تو اسی سے ہو، جملہ قوی کا انجذاب اسی کی جانب ہو، اور عبادت کا مقصود توحید فی الاخلاص ہو۔ ربوبیت پر رضامندی کے معنی یہ ہیں کہ تدبیر الہیٰ کی توحید حاصل ہو، توکل واعتماد اور استعانت میں توحید ہو، اللہ تعالیٰ کے ہر ایک فعل کا خیر مقدم خوشنودی کیساتھ کرے۔

رسالت محمدیہ پر خوشنودی کے معنی یہ ہیں کہ احکام نبویہ کے مقابلہ میں اطاعت کلی اور تسلیم کلی شیوہ بن جائے اور حضور کی محبت بھری تعظیم اپنی جان سے بڑھ کر ہو۔ ہدایت اور حکم اور فیصلہ نبی ﷺ کی آستان پاک ہی سے حاصل کرے اور کسی دوسرے کی حکومت کا روادار نہ ہو، خصوصاً علوم الٰہیات کے متعلق، جہاں کسی دوسرے کا قول چل ہی نہیں سکتا۔

اسلام پر خوشنودی کے معنی یہ ہیں کہ جب اسلام کا کوئی حکم از قسم امر یا نہی ملے، اسے پورے انشراح خاطر سے قبول کرے اور اس کے خلاف اگر چہ وہ کتنے ہی معروف عالم کی طرف منسوب ہو، ہرگز قبول نہ کریں۔ اس مقام پر پہنچ کر بہت سے نام کے عالم یا صوفی ودرویش یا شیخ تم کو مخالفت کرتے ہوئے نظر آئیں گے، مگر رضا باسلام تو یہی ہے کہ جو حکم اسلام کا نہیں، اس پر ہرگز اہل ایمان کو یقین یا اطمینان نہیں کرنا چاہیئے۔

اب یہ یاد رکھئے کہ رضا کا مقام توکل وتفویض اور تسلیم کے بعد آتا ہے اور چونکہ اس کے حصول میں صعوبت تھی، اس لیے اللہ تعالیٰ نے اس کی فرضیت کا حکم نازل نہیں فرمایا، البتہ اس کا شوق ضرور دلایا ہے، یحییٰ بن معاذؒ سے سوال ہوا کہ مسلم مقام رضا کیوں کر حاصل کرسکتا ہے۔ کہا جب وہ چار باتوں میں پختہ ہو جائے۔ (۱) عطا کو قبول کرے (۲) عدم عطیہ میں راضی رہے (۳) انقباض میں عبادت کرے (۴) انشراح میں حاضر درگاہ رہے۔

سیدنا امام حسین بن علیؓ سے کسی نے ذکر کیا کہ ابوذرؓ یوں کہتے ہیں کہ ان کو فقر غنی سے اور مرض صحت سے زیادہ محبوب ہے۔ امام نے فرمایا: اللہ تعالیٰ ابوذرؓ پر رحم فرمائے، میرا قول تو یہ ہے کہ جس شخص کا اعتماد اللہ تعالیٰ کے بہترین انتخاب پر ہے وہ اللہ تعالیٰ کی پسند کے سوا اور کسی شے کی تمنا ہی نہ کرے گا۔

فضیل بن عیاضؒ نے بشر حافیؒ سے فرمایا تھا۔ ''رضا کا درجہ زہد سے برتر ہے، کیوں کہ جو راضی ہے وہ اس حالت سے دوسری حالت کا آرزومند ہی نہیں۔'' امیر المومنین حضرت عمر فاروقؓ نے ابوموسیٰ اشعریؓ کو لکھ کر بھیجا تھا: ﴿**الخیر کلہ فی الرضا فان استطعت ان ترضی والا فاصبر**﴾ ''رضا میں تو سراپا خیر ہے اگر تم میں استطاعت ہے تو

اس درجہ میں رہو، ورنہ "صبر" کیا کرو۔"

اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں فرمایا ہے: ﴿یایتھاالنفس المطمئنة ارجعی الی ربک راضیة مرضیة فادخلی فی عبادی وادخلی جنتی﴾ "اے اطمینان والے نفس، اپنے رب کی طرف رجوع کر، دراں حالیکہ تو رضا والا ہے اور رضا حاصل کردہ ہے، اب میرے بندوں میں شامل ہو جا، میری جنت میں داخل ہو جا۔"

یہ وہ قول ہے جو دنیا سے رخصت ہوتے وقت بھی بندہ سے کہا جائے گا، اور میدانِ قیامت میں بھی اسی کلمہ سے مومن کو مسرورالوقت کیا جائے گا، اللہ پاک کے پسندیدہ عباد کی جماعت میں داخلہ اور جنت میں پہنچنا، ہر دو انعام راضی و مرضی ہونے کی صفت پر ہیں۔

۱۱. وَالْعَجْزُ فَخْرِی (عاجزی میرا فخر ہے) عام طور پر مشہور تو یہ الفاظ ہیں الفقر فخری لیکن ماہرین علم الحدیث نے ظاہر کردیا ہے کہ الفقر فخری کے الفاظ نبی کریم ﷺ سے ثابت نہیں۔

صاحب مجمع البحار نے بھی والعجز فخری کے الفاظ کو بیان کیا ہے جیسا کہ حدیث زیر شرح میں موجود ہیں۔ عجز کے معنی درماندگی ہیں اور کسی مفوضہ کام کو نہ کرسکنا، اس کے مفہوم میں داخل ہے، مفوضہ کام نہ کرسکنے کو کوئی مناسبت نبی ﷺ کی ذات اقدس سے نہیں ہوسکتی، کیوں کہ حضورؐ کی حیات طیبہ تو سراپا سعی، مکمل جہد اور کامل عمل کا نمونہ رہی ہے۔

لہٰذا عجز سے مراد عجز بہ درگاہِ احدیت ہے اور یہی معنی رب العالمین کے جاہ وجلال اور خاتم النبیین کے مقام واحوال پر صادق آتے ہیں۔ اہل ثروت کے حال پر نگاہ ڈالئے کہ دنیا میں تھوڑی سی کامیابی کے بعد ان کے غرور و پندار کی کیا حالت ہوتی ہے اور رسول اعظم ﷺ کی سیرت کو بھی غور سے دیکھئے۔ وہ رسول ﷺ جس کی نصرت وتائید زمین کے ہر ذرہ اور آسمان کے ہر ستارہ سے ہوتی ہو، جس کا حکم نفوس پر فرماں روا ہو، جس کی عظمت سے مابین السماء والارض پر آوازہ ہو وہ لحہ بہ لحہ لحظہ بہ لحظہ عجز وافتقار اور تضرع وانکساری ہی کے تحیات وطیبات درگاہ احدیت اور آستان صمدیت پر پیش کررہا ہے، اور افتقار کو افتخار سمجھ رہا ہے۔

نبی ﷺ کی سکھلائی ہوئی دعاؤں کے کلمات زاکیات کو دیکھئے جن سے غفلت قلب کا نور اور حجابِ روح دور ہو جاتا ہے، کہ غافل سے غافل شخص کا دل بھی جاگ اٹھتا ہے اور بے اختیار سطوت الٰہی اور احتشام لم یزلی کے سامنے جھک پڑتا ہے۔ نمونہ کے طور پر ایک دعا کا اندراج کیا جاتا ہے، ناظرین اس کے اسلوب بیان پر غور کریں علو مکانی کا اندازہ کریں اور دیکھیں کہ جس دل کی زبان سے یہ الفاظ نکلے وہ خود بھی اظہار عجز اور نیاز کو اپنے لیے کس قدر مایہ ناز و فخر و امتیاز سمجھتا ہے اور متبعین کو بھی کس نمونہ پر تیار کرنا چاہتا ہے۔

﴿اللّٰهُمَّ اِنَّکَ تَرٰی مَکَانِیْ وَتَسْمَعُ کَلَامِیْ وتَعْلَمُ سِرِّیْ وعَلَانِیَّتِیْ ولایَخْفٰی علَیْکَ شیءٌ مِن اَمْرِی واَنَا الرَّجل الْمُشْفِقُ وَمُقِرٌّالمُعْتَرِفُ بِذَنْبِیْ واَنَا الْمُسْتَغِیْثُ الْمُسْتجِیْرُ اَسْاَلُکَ مَسْئَلَةُ الْمِسْکِیْنِ وَابْتَهِلُ اِلَیْکَ اِبْتِهَالَ الْمُذْنِبِ الذَّلِیْلِ وَاَدْعُوْکَ دُعَاءَ الخَائِفِ الضَّرِیْرِ وَدُعَاءَ مَنْ خَضَعَتْ لَکَ رَقْبَتُهٗ وَفَاضَتْ لَکَ عَبْرَتُهٗ وذَلَّ لَکَ جِسْمُهٗ وَرَغِمَ لَکَ اَنْفُهٗ اَنْ لَّاتَجْعَلْنِیْ بِدُعَائِکَ شَقِیّاً وَکُنْ لِیْ رَئُوْفًا رَحِیْمًا یَا خَیْرَالْمَسْئُوْلِیْنَ وَیَاخَیْرَالْمُعْطِیْنَ﴾

"یا اللہ تو مجھے میری جگہ پر دیکھ رہا ہے اور میرا کلام سن رہا ہے، میری پیدا و پنہاں کو خوب جانتا ہے میری کوئی بات بھی تجھ سے پوشیدہ نہیں، میں تو کانپنے والا، ڈرنے والا ہوں، میں اپنی کمزوری کا اقرار و اعتراف کرتا ہوں میں تو فریادی اور پناہ کا خواہاں ہوں، تجھ سے مسکین بن کر سوال کرتا ہوں گنہگار ذلیل کی طرح تیرے سامنے چلا رہا ہوں، نابینا خوفزدہ کی طرح مدد کی پکار کرتا ہوں میری پکار اس شخص کی سی ہے، جس کی گردن نیچی ہو جس کی آنکھوں سے آنسو رواں ہوں، جسم جھک گیا ہو اور ناک زمین پر رگڑ رہا ہو، اے معبود مجھے محروم نہ رکھنا، میرے ساتھ رافت اور رحم کا برتاؤ کرنا، اے مالک تو سب سے بڑھ کر فریادرس ہے تو سب سے بڑھ کر جود و عطا کرنیوالا ہے۔"

اللہ اکبر! یہ معرفت کا وہ سبق ہے کہ اگر کوئی اہل ایمان دل اور زبان کے اس عجز و بیان کے ساتھ بارگاہ منان میں حاضر ہو تو ضروری ہے کہ رحمت اس کی دستگیری فرمائے

،محبت اس کی شمع راہ بنے ،اخلاص وصداقت اسے خاک سے اٹھا کر کرسی قبول وعزت پر بٹھلائے۔

۱۲. وَالزُّهدُ حِرُفَتِيُ (زہد میرا پیشہ ہے) حرفت،اس صنعت یا وجہ کسب کو کہتے ہیں جسے انسان اپنے گزارہ کا ذریعہ بنائے ،زہد اصل لغت میں عدم رغبت کو کہتے ہیں سورہ یوسفؑ میں ہے:﴿و کانو افیه من الزاهدین﴾ ''قافلہ والوں کو یوسفؑ کے پاس رکھنے کی رغبت نہ تھی۔'' اصطلاح شرعیہ میں دنیا اور مال ومتاعِ دنیا سے رغبت نہ رکھنے کو زہد کہتے ہیں۔بعض نے کہاہے،زہد یہ ہے کہ نہ موجود پر اعتماد ہواور نہ مفقود پر تاسف ہو۔

امام المحد ثین احمد بن حنبلؒ فرماتے ہیں،زہد کی تین اقسام ہیں۔

۱......ترک حرام،یہ عوام کا زہد ہے۔

۲......حلال میں سے زائد شے کو چھوڑ دینا،یہ خواص کا زہد ہے۔

۳......ہر ایک ایسی شے کا ترک کر دینا جو توجہ اِلی اللہ سے روکنے والی ہو،یہ عارفین کا زہد ہے۔ چنانچہ حدیث کے ہر دو الفاظ پر غور کیجئے۔حرفہ تو اس طریقہ کو کہتے ہیں جسے انسان اپنی معاش کے لیے لازم ٹھہرائے اور یہاں نبی ﷺ نے ''زہد'' ہی کو اپنا حرفہ بتلایا،تو اس کے معنی یہ ہوگئے کہ اپنی توجہ کو ان سب اشیاء جملہ اسباب اور وسائل سے جو ماسویٰ اللہ کی طرف لے جانے والے ہیں،ہٹا کر پورے اہتمام اور پوری ہمت سے اللہ ہی کی طرف توجہ کر لی جائے وسائل اور وسائط کو ہیچ پوچ سمجھ لیا جائے وہ اعتماد جو پروردگار پر ہے،سامان حاضرہ کو موجب طمانیت نہیں بنا سکتا اور اسی سامان کا فقدان قلب میں کوئی تشویش نہیں پیدا کر سکتا۔ یہ زہد کی بلند ترین صورت ہے اور اس زہد پر یہ اعتراض بھی عائد نہیں ہو سکتا کہ زہد تو اکتسابی ذرائع کا مانع ہے یا زہد تو اصول تمدن کی مخالفت کا نام ہے۔

۱۳. و.الْيَقِيُنُ قُوُتِيُ (یقین میری روزی ہے) واضح ہو کہ کتاب حمید میں یقین اور اہل یقین کا بیان آیات متعددہ میں ہوا ہے ﴿والذین یؤمنون بما انزل الیک وما انزل من قبلک وبالاٰخرہ ھم یوقنون ،اولٰئک علیٰ ھدی من ربھم

واولئک هم المفلحون﴾ ''جولوگ ایمان رکھتے ہیں اس پر جوتجھ پر اتارا گیا، نیز اس پر جوتجھ سے پہلے نازل کیا گیا اور وہ آخرت پر بھی یقین رکھتے ہیں، یہی وہ لوگ ہیں جو ہدایت ربانی پر ہیں اور یہی ہیں جوفلاح پانے والے ہیں۔

آیات بالا پر غور کیجئے کہ ہدایت اور فلاح کو یقین ہی کا ثمرہ بتلایا گیا ہے ﴿**وجعلنا منهم ائمة يهدون بامرنا لما صبروا وكانوا باياتنايوقنون﴾** ''ہم نے انہی میں سے امام بنائے جو ہمارے حکم سے ہدایت کرتے تھے کیونکہ انہوں نے صبر کیا تھا اور ہماری آیات پر یقین رکھتے تھے۔''

آیت بالا میں امامت فی الدین کے منصب کو صبر اور یقین کے اتحاد کا نتیجہ فرمایا گیا ہے: ﴿**وفی الارض أيات للموقين وفی انفسكم﴾** ''یقین والوں کے لیے زمین میں اور خود ان کے نفس کے اندر نشانیاں موجود ہیں۔''

آیت بالا میں بتایا گیا ہے کہ آیات ربانی کا مشاہدہ اور اعلامات سبحانی کا معائنہ اور پھر اس مشاہدہ ومعائنہ سے نفع کا حاصل کرنا اہل یقین ہی کے لیے حاصل ہے۔

الغرض جو درجہ روح کا جسم انسانی میں ہے وہی درجہ یقین کا پیکر ایمانی میں ہے، یقین ہی اعمال قلب کی روح ہے، یقین ہی حقیقت صدیقیت ہے، علماء میں اختلاف ہے کہ یقین کسبی ہے یا وہبی ہے، ہمارے نزدیک بلحاظ اسباب تو کسبی ہے اور بہ لحاظ اصلیت وہبی ہے۔ سہل تستریؒ فرماتے ہیں کہ مکاشفہ سے ابتدا ہوتی ہے، اور پھر انسان معائنہ ومشاہدہ کے مدارج کو طے کرتا ہوا یقین تک پہنچ جاتا ہے۔ ذوالنون مصریؒ فرماتے ہیں کہ یقین کی علامات تین ہیں۔

۱...... لوگوں سے میل جول کم ہو۔

۲...... کسی کے عطیہ پر مدح نہ کرے۔

۳...... کسی کے نہ دینے پر اس کی مذمت نہ کرے۔

انہی کا ارشاد یہ بھی ہے، یقین کی حقیقت یہ ہے کہ ہر شے میں نظر الی اللہ ہو، ہر

معاملہ میں رجوع الی اللہ ہو، ہر حالت میں استعانت باللہ ہو۔

واضح ہو کہ اگر مراتب یقین کی تفصیل کی جائے تو وہ تین ہیں: مرتبہ اولی میں اوامر ونواہی، علم معاد، علم الاسماء والصفات داخل ہیں اور جب بندہ کو ان علوم کی حقانیت وصدق پر وثوق کلی ہو جاتا ہے تو اس مرتبہ کو حاصل کر لیتا ہے، مرتبہ ثانیہ میں استدلال کی ضرورت نہیں رہتی، دلیل فضول سمجھی جاتی ہے اور سماعت کا مقام رویت حاصل کر لیتی ہے، اس کو عین الیقین کہتے ہیں۔ مرتبہ ثالثہ میں خود آفتاب حقیقت نور بیز ہوتا ہے، کلفت یقین جاتی رہتی ہے، حقانیت اپنے کمال کے ساتھ جلوہ گر ہوتی ہے، اسے حق الیقین کہتے ہیں اور یہ درجہ صرف انبیاءؑ کا ہے انہی کی چشمِ ظاہر بین کے سامنے جملہ اسرار وخفایا منکشف ہوتے ہیں اور انہی پر علوم معاد کا ظہور ایسا ہوتا ہے، جیسے دوسروں کے لیے مادی اشیاء کا شہود۔ اب یہ غور کیجئے، کہ حدیث زیر شرح میں نبی ﷺ نے یقین کو اپنی غذا فرمایا ہے، یہ ظاہر ہے کہ غذا ہی پر جسم کا نشو ونما ہے اور غذا ہی سے جسم کی پرورش ہوتی ہے۔ یقین کو غذا بتلانا ظاہر کر رہا ہے کہ حضورؐ اسبابِ مادیات سے کس قدر دور تھے، حضورؐ کی قوت یقین کا اندازہ کرنے کے لیے صحابہ کی قوت یقینیہ کا اندازہ کیجئے۔

ایک صحابی جنگ احد میں خوشہ انگور ہاتھ میں لیے ہوئے انگور کھا رہے تھے عزم یہ تھا کہ انگور کھا کر اور طاقت جسمانی بڑھا کہ شریک معرکہ ہوں گے، انہوں نے نبی ﷺ کو فرماتے سنا کہ شہادت کا ثمر جنت علیا ہے یہ سن کر انہوں نے انگوروں کی طرف دیکھا، پھر کہا کہ ان کے ختم کرنے میں تو دیر لگے گی، میں جنت کے لیے اتنی دیر کیوں کروں، یہ کہہ کر انگور پھینک دیے اور رزمگاہ میں پہنچے اور جوہر شجاعت دکھلاتے ہوئے بزم گاہ رضوان کو جا سدھارے۔

نقیب محمدی عبداللہ بن رواحہ انصاری کا حال بھی انہی سے ملتا ہوا ہے دشمن پر حملہ پر حملہ کر رہے تھے کہ ان کا چچرا بھائی یخنی لے آیا، کہا یہ تھوڑی سی پی لو، طاقت پا کر زیادہ لڑسکو گے پیالہ ہاتھ میں لیا دو تین گھونٹ لے کر برتن پھینک دیا کہ مجھے اپنے احباب سے جلد تر ملاقات کرنا ہے۔ سچ ہے کہ یقین شکوک واوہام کے حجاب کو چاک کر دیتا ہے، اس وقت

چہرہ حقیقت بے نقاب ہوجاتا ہے ،روایت ایمانی کا درجہ بصارت عینی سے بالا تر پہنچ جاتا ہے،اور ایسا دیدہ ور شخص مغیبات کو مشاہدات سمجھتا ہوا حقائق اصلیہ اور معارف روحانیہ کو حاصل کرلیتا ہے۔

۱۴ .وَالصِّدْقُ شَفِيْعِیْ (صدق میرا ساتھی ہے)

جب ایک شخص کے ساتھ اس کو اغراض ومقاصد میں متفق ومتحد ہوکر دوسرا شخص شامل ہوجاتا ہے تو وہ پہلے شخص کا شفیع کہلاتا ہے،لغت میں شفیع بمعنی جفت آتا ہے، کتاب حمید میں ہے ﴿والشفع والوتر﴾ صدق، ہر شے کی اصلیت اور کمال کو کہتے ہیں، الفاظ ذیل پر غور کیجئے:۔

۱......عزم صادق،اسی ارادہ کو کہیں گے جو تام وقوی ہو۔

۲......محبت صادق،اسی محبت کو کہیں گے جو کامل واصلی ہو۔

۳......خبر صادق،وہی اطلاع ہے جس میں اصلیت کے سب اجزا کامل وقوی ہوں،قرآن مجید میں صدق کے کئی مقامات کا ذکر فرمایا گیا ہے۔نبی ﷺ کو یہ دعا تلقین فرمائی گئی ہے ﴿رب ادخلنی مدخل صدق واخرجنی مخرج صدق واجعل لی من لدنک سلطانا نصیرا﴾ ”اے رب! مجھے خوبی کے ساتھ پہنچائیو اور مجھ کو خوبی کے ساتھ لے جائیو اور مجھ کو اپنے پاس سے ایسا غلبہ دیجیو جس کے ساتھ نصرت ہو۔“

اس دعا میں مدخل صدق اور مخرج صدق کا سوال سکھلایا گیا ہے۔مدخل صدق سے مراد بندہ کی وہ توجہ ہے ،جو اللہ کے لیے اللہ کی جانب اور احکام الٰہی کی جانب بندہ کیا کرتا ہے،اس توجہ میں شائبہ ریب وشک نہیں ہوتا،اس کی ترقیات کی کوئی انتہا نہیں ہوتی، نبی ﷺ کا داخلہ مدینۃ المنورہ بھی اسی مدخل صدق میں داخل ہے،جس کی برکات وانوار لاانتہاء ہیں۔مخرج صدق سے مراد بندہ کی وہ عزیمت ہے جو ہوا وہوس اور اقتضائے طبع ونفس سے منہ موڑ کر اور امور خاکی سے دامان دل کو جھاڑ پچھوڑ کر سب سے الگ ہوجاتا ہے۔ کوئی حجاب ،کوئی رسم،کوئی امید منفعت،کوئی خوف وضرر بندہ کو اس خروج صدق

سے روک نہیں سکتا۔ نبی ﷺ کا مکہ چھوڑ دینا، وطن سے دوری، تعلقات سے بے تعلقی، راہ ہجرت کی بادیہ پیمائی اسی مخرج صدق میں داخل ہے۔ اور ارشادِ پاک ہے: ﴿وبشر الذین اٰمنوا ان لھم قدم صدق عند ربھم﴾ ''اور جو ایمان لے آئے ان کو بشارت سنائیے کہ ان کے رب کے پاس ان کو پورا مرتبہ ملے گا۔''

آیت بالا میں قدم صدق کے وجود کی اطلاع اور بشارت دی گئی ہے۔ قدم صدق سے مراد وہ اعمال صالحہ اور افعال حسنہ ہیں، جو فرمان پذیر بندہ نے اپنی حیات فانی میں ادا کیے اور قبر میں جانے سے پیشتر بارگاہ رب العزت میں بھیج دیے گئے۔ تقدیم اعمال تو مومن و کافر مطیع و فاسق سب ہی کی طرف سے ہوتی ہے مگر قدم صدق کا اطلاق سب مومن ہی کے اعمال پر ہوتا ہے۔

سیدنا حضرت ابراہیمؑ کی دعا میں ہے: ﴿واجعل لی لسان صدق فی الاٰخرین﴾ ''اور میرا ذکر آئندہ آنے والوں میں جاری رکھ۔'' یہاں لسان صدق کی دعا فرمائی ہے لسان صدق سے مراد ثناء حسن ہے، یہ اس بندہ کے لیے بہ طور جزائے حسن عطا ہوتی ہے جس کے افعال و اعمال اور اقوال اللہ تبارک وتعالیٰ کے ہاں معیار صدق پر پورے اترتے ہیں۔

۱۵۔ وَالطَّاعَةُ حَسَبِیْ (طاعت کرنا میری عزت ہے) طوع (جس سے طاعت بنا ہے) کے معنی انقیاد امر اور اتباع حکم ہیں، جب کہ مطیع اس حکم کی تعمیل پورے پورے انشراح صدر اور نشاط قلب سے کر رہا ہو۔ حسب، وہ بزرگی جو مال یا دین یا صفات حسنہ اور اخلاق فاضلہ یا سخاوجود کی وجہ سے حاصل ہو۔

حدیث بالا میں صنعت تضاد موجود ہے، یعنی عام طور پر لوگ ان اشیاء کو باعث بزرگی و برتری سمجھا کرتے ہیں جس میں اوروں پر تفوّق پایا جاتا ہو۔ لیکن نبی ﷺ نے بندگی وفرماں برداری کو اپنے لیے باعث برتری و تفوق قرار دیا ہے۔ بیشک یہ ایک ایسی خصوصیت ہے کہ انبیاءؑ کے گوہر گرامی میں عموماً اور امام الانبیاء سرور عالم کے عنصر پاک میں خصوصاً اس کا

ظہور اور نور نظر آتا ہے۔

صلح حدیبیہ میں کفار نے ایک شرط یہ بھی کی تھی کہ جو شخص قریش میں سے مسلمان ہوکر مسلمانوں سے جا ملے گا، اسے قریش کے پاس واپس کردیا جائے گا، مگر جو شخص مسلمانوں میں سے نکل کر کفار میں جا ملے گا وہ مسلمانوں کو واپس نہ دیا جائے گا۔

شرط مذکور اپنے ظاہری الفاظ میں ذلت آمیز نظر آتی ہے، لہٰذا عمر فاروقؓ، اسید بن حضیرؓ، سعد بن عبادہ اور سہیلؓ بن حنیف جیسے غیرت مندان اسلام نے جو شبانہ روز "اعز الاسلام و المسلمین" کا ورد رکھتے تھے۔اس شرط کی حمیت مسلمین اور عزت اسلام کے منافی سمجھا۔جب انہوں نے اس بارے میں حضورؐ سے اپنی رائے کا اظہار کیا تو حضورؐ نے نہ ان کے دلائل کی تردید کی اور نہ ان کے اقوال کی تضعیف، بلکہ زبان عالی سے یہ فرمایا: ﴿انی رسول اللّٰہ ولست اعصیہ وھو ناصری﴾ "میں اللہ کا رسول ہوں میں اس کے حکم کے خلاف کچھ نہیں کرسکتا، وہی میرا مددگار بھی ہے۔"

اس سے صاف روشن ہوگیا کہ نبی ﷺ کس قدر زیادہ طاعت وانقیاد الٰہی کے پابند تھے کہ حمیت وحمایت ظاہری اور وقار عزت عینی، نو مسلموں کی جنبہ داری یا مرتدین کی تعزیر کے مسلمہ اصول بھی حضور ﷺ کو ذوق اطاعت اور کمال انقیاد سے الگ نہ کرسکتے تھے۔

اللہ تعالیٰ نے بھی اس حسنِ عمل کا بدل اسی جنس عمل کی صورت میں حضور ﷺ کو ارزانی فرمایا، اور حضور ﷺ کی اطاعت کو جملہ عالم وعالمیان پر فرض عین ٹھہرایا، فرمایا: ﴿من یطع الرسول فقد اطاع اللّٰہ﴾ "جس نے محمد رسول اللہ کی اطاعت کی اس نے اللہ کی بھی اطاعت کی۔" اور فرمایا ﴿ان تطیعوہ تھتدوا﴾ "اے لوگو! اگر تم رسول کی اطاعت کرو گے تو ہدایت پالو گے۔"

١٦. وَالْجِهَادُ خُلُقِیْ (جہاد میری خصلت ہے) جہاد، پوری کوشش سے کوئی کام کرنا، محنت، طاقت اور توجہ کو کسی کام میں لگا دینا خلق، طبیعت، جبلت، پیدائشی خصلت۔ جہاد شرعیہ کی دو اقسام ہیں: جہاد بالمال جہاد بالنفس، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: ﴿وتجاھدون

فی سبیل اللّٰہ باموالکم وانفسکم﴾ ''اللہ کی راہ میں مالوں کے ساتھ اور جانوں کے ساتھ جہاد کرو۔'' مال کی قربانی بھی سخت دشوار ہے، اور ایثار جانی بھی سخت مشکل، بہت لوگ جان کے بچاؤ میں مال کی پروانہیں کرتے اور اکثر ایسے ہیں جو مال کے لیے جان کو بھی ہلاکت میں ڈال دینا آسان سمجھتے ہیں، جہاں مال اور جان دونوں کے نثار کرنے کا سوال ہو، وہاں پورا اترنا اللہ تعالیٰ کے محض بندوں ہی کا کام ہے، بساوقات یہی مال وجان انسان کو اس کے فرائض ذاتی وقومی اور واجبات اخلاقی ودینی کے ادا کرنے میں سخت حائل ہوجایا کرتے ہیں لیکن راہ خدا کے فدائی ہر شے کو اپنے مولیٰ کی رضا پر قربان کردیتے ہیں، قرآن مجید کی ایک آیت میں فرمایا گیا ہے: ﴿وجاھدوا فی اللّٰہ حق جھادہ﴾ ''اللہ کے بارے میں جہاد کرو جیسا کہ جہاد کرنے کا حق ہے۔''

اس جہاد سے مراد علم الٰہی کی تحصیل، رضائے ربانی کا حصول، تقرب سبحانی کا شوق، مدارج وحی کا ارتقاء مراد ہے اور کچھ شک نہیں کہ اس جہاد میں صرف طاقت اور اخلاص توجہ بمعنی لغوی اور ایمان وعمل صالحہ بمعنے شرعی بہمہ وجوہ درکار ہیں۔ جہاد کے معنی اعدائے دین کو تحت میں لانا، اعلائے کلمۃ اللہ کے لیے وسائل مالی وجانی کو مجتمع کردینا بھی ہیں۔

نبی اکرم ﷺ کی سیرت پاک پر نگاہ ڈالیے کہ جہاد کی ان جملہ اقسام میں حضور ﷺ جملہ افراد امت سے کس قدر بڑھے ہوئے تھے۔ حضور ﷺ کا عزم وارادہ اور نیت وتمنا، حضور کا آرام وقیام اسی جہاد فی اللہ کے لیے تھا، وہ آسودگی وآرمیدگی جو خاصہ اہل حکومت ہے۔ وہ دہن وضعف جو لاحق احوال امراء ہے۔ وہ کسل وجمود جو محبوب مترفہین ہے، ان میں سے کسی کا بھی کوئی اثر ذات گرامی پر نہ تھا، جدوجہد، سعی وطلب، ارتقاء اور ارتفاع، سوز وگداز، حزن وشوق حضور کے خدام دربار تھے، اور اسی اسوۂ عالیہ کا فیضان تھا کہ صحابہ کرام خویش وتبار سے، زن واولاد سے جدا، ضیاع وزرع سے دور، آرام وآسائش سے نفور ہوکر ہمہ تن، ہمہ دل جہاد فی اللہ میں مشغول تھے، اسی صفت عالیہ کے تحت میں انہوں نے وطن کو خیرباد کہا اور زیست دنیوی کو حیات دنیا قرار دیا، وطن سے نکلے اور تمام دنیا کو ہمت

بلند، عزم راسخ، طلب صادق، سعی موفور کی ایسی تعلیم دے گئے کہ مشرق سے مغرب تک ﴿کلمة اللّٰه هی العلیا﴾ کا آوازہ بلند ہوگیا۔

اسی نمونہ کا نتیجہ تھا کہ لوگوں نے دنیا کا دارالعمل ہونا سمجھ لیا۔ انفاس کا پاس ہونے لگا، حیات ارضی کے بعد حیات روحی کا نظارہ آنکھ کے سامنے ہوگیا۔ اسی تعلیم کا نتیجہ تھا کہ مدت قلیل میں فوائد کثیرہ، فتوحات عظیمہ، غنائم وافرہ، نتائج عالیہ حاصل ہوگئے۔ کاش! مسلمان اسی علم وعمل کو مال زندگی سمجھیں اور سعی وطلب کو اپنی جبلت وفطرت بنالیں اور وہ بھی دنیا کی زندہ اقوام میں زندہ کہلانے کا لقب حاصل کرسکیں۔

نہیں نہیں، دنیا میں آج زندہ اقوام کہلانے والی قوموں کا مطمع نظر بہت پست ہے، اہل ایمان کو اپنی نیت وفعل اور عزم وعمل کے لحاظ سے اپنی ہمت کو بہت بلند رکھنا ضروری ہے تاکہ انہیں انبیاء وصدیقین اور شہداء کی معیت حاصل ہوجائے اور سعادت دارین کا تاج جسے تاج خلافت بھی کہا جاتا ہے ان کے سر پر رکھا جائے۔

17۔ وَقُرَّةُ عَیْنِیْ فِی الصَّلٰوۃِ (میری آنکھوں کی ٹھنڈک نماز میں ہے) حج عمر میں ایک دفعہ ہے ادائے زکوٰۃ کے لیے سال میں ایک دن کا مقرر کرلینا کافی ہے صومِ رمضان گیارہ ماہ کے بعد آتے ہیں۔ مگر نماز ایک دن میں پانچ دفعہ پڑھنا فرض ہے، سات برس کے بچے کو نماز پر لگانے اور دس برس کے بچے کو ترک نماز پر تادیب کرنے کا حکم ہے، سفر ہو یا مرض، مفلسی ہو یا امیری، اسیری ہو یا آزادی، نوکری پر ہو یا گھر پر فرض نماز کسی وقت اور کسی جگہ ساقط نہیں ہوتی، جب تک ہوش وحواس درست ہیں، نماز کی فرضیت قائم رہتی ہے، اعمال میں نماز سب سے پہلے فرض ہوتی اور سب سے اخیر تک فرض رہتی ہے، نماز ہی کی بابت سب سے پہلے سوال بروز محشر ہوگا۔

عمادِ دین نماز ہے، شوکت اسلام نماز ہے، اسلام کا خیمہ اسی چوب پر استادہ ہوتا ہے، مسجدوں کی تعمیر، اذانوں کا اعلان، خطیب اور پیش اماموں کا تقرر، سب کچھ نماز کے لیے ہے، حفاظ قرآن کی عزت، محراب مسجد سے آشکار ہوتی ہے، اور علمائے دین کی فضیلت منبر

مسجد سے نمودار ہے۔نماز ہی اجتماع و تنظیم کی سبق آموز ہے، اور نماز ہی پابندی اوقات کا خوگر بنانے والی ہے، نماز ہی مختلف المزاج افراد کو واحد مرکز پر لاتی ہے، اور نماز ہی قوم کے پسند کردہ امیر کی اطاعت کا عملی سبق پڑھاتی ہے۔

نماز بندہ کو بدن، لباس اور مقام کو پاک و پاکیزہ اور صاف و مجلیٰ رکھنے کا ذریعہ ہے، نماز ہی سحر خیزی سکھلاتی ہے، اور نماز ہی بیہودہ تھیٹروں، تماشاؤں میں انسان کی صحت اور روپیہ اور وقت کی حفاظت کرتی ہے، نماز ہی دل میں ایک ایسی کشش پیدا کر دیتی ہے، جس سے دل کا تعلق رب العالمین کی حضوری سے ہو جاتا ہے۔ نماز ہی ہر انسان کو دربارِ الٰہی میں حاضر ہوسکنے کا اعزاز عطا کرتی ہے اور نماز ہی انسان اور رب میں سرگوشی و ہم کلامی کا رز کھول دیتی ہے، نماز ہی کمال عبودیت ہے اور نماز ہی تکمیل انسانیت، نماز ہی اخلاق حسنہ کی ہادی ہے اور نماز ہی عادات سیۂ کی سپر ہے، نماز ہی مغفرت و رحمت ہے اور نماز ہی برہان ہے، نماز ہی سے رب العالمین کے عالم گیر علم وقدرت کا یقین مستحکم ہوتا ہے اور نماز ہی سے فرزندان اسلام کی عالمگیر اخوت کا سلسلہ پائدار رہتا ہے، نماز ہی سے احسانیات کے مراتب طے ہوتے ہیں، اور نماز ہی سے تجلیات حضور کی اشاعت نور ہوتی ہے، جس دین میں نماز نہیں وہ دین، دین ہی نہیں، مومنین کے لیے نماز کو معراج فرمایا گیا ہے، اور حالت سجدہ کو بندہ کا بارگاہ سبحانی سے قریب تر ہونا بتلایا گیا ہے۔ بزرگان دین سمجھتے تھے کہ چنچل من صرف نماز ہی میں سکینہ یاب ہوتا ہے اور ہر وقت سوچنے والا دماغ صرف نماز ہی میں انابت الی اللہ کا مزہ پاتا ہے، نماز ہی ہے جس کا اثر انسان کے جسم اور دل اور دماغ اور نفس روح اور سر اور اخفیٰ پر یکساں پڑتا ہے اور نماز ہی ہے جو بہ حالت ارتعاب انسان کو ملکوتی صفات بنا دیتی ہے۔

جملہ ادیان پر جو فضیلت اسلام کو ہے ازاں جملہ یہ ایک بڑی دلیل ہے کہ اسلام ہی بندہ کو پانچ وقت اللہ کے حضور میں لے جاتا اور بے واسطہ دیگر براہ راست عرض معروض کا موقع عطا کرتا ہے، جب نماز کی یہ برکات عامۃ المسلمین کے لیے ہیں۔ تو کچھ شک نہیں رہ

جاتا کہ نبی ﷺ کی نماز اپنی نورانیت میں سارے جہان کی نمازوں سے اعلیٰ و برتر تھی۔ایک مذنب ذلیل، خائب وخاسر کی عبادت کو ایک مصطفیٰ و مجتبیٰ سید الوریٰ، حبیب رب العلیٰ کی نماز کے ساتھ کیا مناسبت ومشابہت ہو سکتی ہے۔البتہ حدیث پاک سے اس قدر مستنبط ہوا کہ نبی ﷺ کے کلمہ خوانوں کو اپنی آنکھوں کی ٹھنڈک نماز ہی کو بنانا چاہیئے، جیسا کہ حضورؐ رسالت مآب نے نماز کو قرۃ العین فرمایا ہے، **صلی اللہ علیہ و الہ و اصحابہ وسلم**

(بحوالہ معمولی رد و بدل کے ساتھ رحمۃ للعلمین جلد سوم)

یَا رَبِّ صَلِّ وَسَلِّمْ دَائِمًا اَبَدًا عَلٰی حَبِیْبِکَ خَیْرِ الْخَلْقِ کُلِّھِم

خصوصیت نمبر ۵۶

رسولِ اکرم ﷺ کی جان مبارک کی اللہ تعالیٰ نے خود قسم اٹھائی ہے

قابلِ احترام قارئین! رسولِ اکرم ﷺ کی امتیازی خصوصیات میں سے یہ چھپن نمبر خصوصیت ہے، جس کا عنوان ہے "رسولِ اکرم ﷺ کی جان مبارک کی اللہ تعالیٰ نے خود قسم اٹھائی ہے" بے شک دیگر خصوصیات کی طرح یہ بھی آپ ﷺ کی ایک عظیم خصوصیت ہے، جبکہ دیگر انبیاء کرام کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے ایسی قسم نہیں اٹھائی، تو معلوم ہوا کہ یہ بھی صرف اور صرف ہمارے نبی ﷺ کا خاصہ ہے، جیسا کہ آنے والے اوراق میں قرآن وحدیث کی روشنی میں ہم نے آپ ﷺ کی اس خصوصیت کو تفصیل سے بیان کیا ہے، دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہم سب کو اپنے نبی ﷺ سے سچی محبت کرنے اور آپ ﷺ کی سنتوں کو اپنانے کی توفیق عطا فرمائے، آمین یارب العالمین۔ لیجئے اب اس خصوصیت کی تفصیل ملاحظہ فرمائیے:۔

چھپن نمبر خصوصیت کی وضاحت قرآن واحادیث کی روشنی میں

رسولِ اکرم ﷺ کو اللہ تعالیٰ نے اپنی تمام مخلوقات پر فضیلت عطا فرمائی ہے، آپ ﷺ سے زیادہ اکرام واحترام کسی کو بارگاہِ رب العزت میں حاصل نہیں، ایک تو یہ کہ صرف اور صرف آپ ﷺ کے ذکر کو بلند کیا گیا اور دوسری طرف حق تعالیٰ نے آپ ﷺ کی جان کی قسم کھائی ہے چنانچہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿لعمرک انهم لفی سکرتهم یعمهون﴾ (سورۃ حجر) "اے نبی ﷺ! آپ کی جان کی قسم وہ اپنی مستی میں مدہوش تھے۔"

یہ قسم اس تاریخی لمحے اور منظر کی توثیق کے لئے کھائی ہے، جب حضرت لوط علیہ السلام کی قوم والے ان کے مہمانوں کو اپنی ہوس کا نشانہ بنانا چاہتے تھے، اور حضرت لوط علیہ السلام ان سے کہہ رہے تھے کہ: "لوگو! مجھے رسوانہ کرو۔" یہ عذاب سے پہلے کی ساعت تھی اور

پھر سورج نکلتے نکلتے سخت آواز کے دھماکے نے ان کو آلیا اور اللہ تعالیٰ نے اس بستی کو تہس نہس کر کے رکھ دیا۔ اس واقعے کی صحت اور شدت کے اظہار کے لئے رب العزت نے اپنے رسول ﷺ کی زندگی کی قسم کھائی ہے۔

بیہقی نے دلائل النبوۃ میں اور ابونعیم اور ابن مردویہ وغیرہ نے حضرت عبداللہ ابن عباس سے روایت کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تمام مخلوقات وکائنات میں کسی کو محمد مصطفیٰ ﷺ سے زیادہ عزت ومرتبہ عطا نہیں فرمایا۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے کسی پیغمبر یا فرشتے کی حیات پر کوئی قسم نہیں کھائی اور اس آیت میں رسول کریم ﷺ کی عمر وحیات کی قسم کھائی ہے جو آنحضرت ﷺ کا انتہائی اعزاز واکرام ہے۔ (بحوالہ معارف القرآن)

مناسب ہوگا کہ اس موقع پر قرآن حکیم کی قسموں پر مختصر گفتگو کی جائے۔ قرآن حکیم کی قسمیں قرآنی مطالعے کا ایک مستقل عنوان اور باب ہیں۔ اس موضوع پر حافظ ابن قیمؒ کی تالیف التبیان فی اقسام القرآن نہایت اہمیت رکھتی ہے۔ علامہ جلال الدین سیوطیؒ نے بھی اپنی تالیف الاتقان فی علوم القرآن کی نوع ۶۷ میں قرآن کریم کی قسموں پر کلام کیا ہے۔

قسم سے خبر کی تحقیق اور تو کید مقصود ہوتی ہے، ''و'' حرف قسمیہ ہے، لیکن خبر سے بھی قسم کی ادائیگی ہوسکتی ہے۔ مثلاً ﴿واللہ یشھد ان المنافقین لکاذبون﴾ (سورۃ یوسف)

''اور اللہ شہادت دیتا ہے کہ بیشک منافقین جھوٹے ہیں۔'' اللہ رب العزت نے یوں اس پیرائے میں اپنے قسم کھائی ہے۔

تحقیق وتو کید کے علاوہ قسم، محاورۂ اہل عرب کا اہم حصہ تھی، اور قرآن حکیم محاورہ عرب کی بے مثال مثال ہے۔

ہمارے لئے اللہ کے سوا کسی مخلوق کی قسم کھانا منع ہے۔ ہمارا شاہد اور گواہ وہی ہے جو ہر جگہ حاضر وناظر ہے اور کائنات کی ہر چیز خواہ ابھی وقوع پذیر بھی نہ ہوئی ہو اس کے دائرہ عمل میں شامل ہے، لیکن اللہ تعالیٰ کو زیب دیتا ہے کہ وہ اپنی ذات عالیہ کے علاوہ اپنی مخلوق کو بھی اپنے قول کی شہادت کے طور پر پیش کرے۔ قرآن حکیم میں اللہ تعالیٰ نے سات

مقامات پر اپنی ذات کی قسم کھائی ہے۔

قرآن عظیم میں ارض وسماوات، فرشتوں، مقاماتِ مقدسہ، ستاروں، سورج کی چڑھتی ہوئی روشنی، رات (اور اس کی نشانیوں) کی قسم کھائی گئی ہے اور ان چیزوں کی قسم جو اللہ تعالیٰ کی عظیم قدرت اور اقتدار کی مظہر ہیں۔ مخلوقات کی قسموں میں ایسے مقامات بھی ہیں جہاں مضاف کو حذف کر دیا گیا ہے۔ ''تین'' اور ''زیتون'' کی قسموں میں رب محذوف ہے۔ ''ورب التین'' اور ''رب الزیتون'' یہ بات بدیہی اور بہت واضح ہے۔ فاعل کے بغیر مفعول کا وجود ممکن نہیں۔

قرآن حکیم کی قسموں کا ان مضامین وموضوعات سے گہرا رشتہ ہے جو قسم کے بعد پیش کیے گئے ہیں۔ جس چیز کی قسم کھائی گئی ہے وہ اس مضمون کی صداقت پر شہادت دیتی ہے۔ کہیں کہیں کئی قسمیں ایک ساتھ آ گئی ہیں، مثلاً سورۂ الشمس کی پہلی سات آیتوں میں سات قسمیں ہیں:۔ ا......سورج کی اور دھوپ چڑھنے کی۔ ۲......چاند کی قسم جب وہ سورج کے پیچھے آئے۔ ۳......دن کی قسم۔ ۴......رات کی تاریکی کی قسم ۵......آسمان کی اور اس کی تخلیق کی قسم۔ ۶......زمین کی اور اس کے بچھائے جانے کی قسم۔ ۷......انسانی نفس اور اس کی درستگی کی قسم۔

جن چیزوں کی قسم کھائی گئی ان کے تضاد اور پھیلاؤ سے انسان کے بامراد اور کامگار اور نامراد ہونے کی حقیقت اور مسائل ابھر کر سامنے آ گئے۔ اپنے نفس کو سنوارنے والا منزل تک پہنچ گیا، اور نفس کو خاک میں ملانے والا خسران میں مبتلا ہوا۔ تقویٰ اور فجور کی راہیں کھلی ہوئی ہیں اور انسان کو ان میں سے کسی ایک کو چننے کا اختیار عطا کیا گیا ہے۔

قرآن مجید کی قسمیں اللہ تعالیٰ کے دین اور راہ ہدایت، انسانی تقدیر اور مسائل کائنات پر حاوی ہیں اور ہمارے دل اور ذہن کو نیکی کی حقیقت اور ہماری حقیقت پر مطلع کرتی ہیں۔

قرآن حکیم کی قسموں کے تمام پہلوؤں کا مطالعہ ہمارا موضوع نہیں، اور ویسے بھی

اس کتاب عظیم کی تمام حکمتوں کو کون سمیٹ سکتا ہے۔ یہ حکمتیں تو آہستہ آہستہ گردشِ ماہ و سال کے ساتھ ابھر کر ہمارے سامنے آ رہی ہیں، لیکن ایک پہلو پر گفتگو کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے اور وہ یہ ہے کہ قرآن حکیم کی بہت سے قسمیں رسول رب العالمین کے رتبے اور ان کی رسالت کی صداقت پر اللہ تعالیٰ کی شہادت کا درجہ رکھتی ہیں۔

سورۂ النجم مکی سورۃ ہے جس میں ذکر معراج بھی ہے۔ مکی دور کی آیات میں اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول ﷺ اور اپنے حبیب ﷺ کی خاص طور پر دل دہی کی ہے اور حرف تسلی سے نوازا ہے، عام الحزن کے بعد آپ ﷺ کو معراج جیسی عظمت اور تحفہ عطا ہوا، سورۂ النجم کی ابتدائی چار آیتوں میں صاحبِ معراج ﷺ کے علوئے مرتبہ کا ذکر ہے، اور ستارے کو اس پر گواہ بنایا گیا ہے۔ ﴿والنجم اذا ھویٰ o ما ضل صاحبکم وما غویٰ o وما ینطق عن الھویٰ o ان ھو الا وحی یوحیٰ o﴾ (سورۃ نجم)

''قسم ہے ستارے کی جب وہ غروب ہوا، تمہارا رفیق نہ بھٹکا نہ بہکا ہے، وہ نفس کی خواہش سے نہیں بولتا، یہ تو وحی ہے جو اس پر نازل کی جاتی ہے۔''

ستاروں کو انسانی تاریخ میں رہنمائی کے لئے استعمال کیا گیا اور مخصوص حالات میں ستارے آج بھی قافلوں کی رہنمائی کرتے ہیں، بالخصوص ریگستانی علاقوں میں جہاں رات کو سفر کیا جاتا ہے، اور جدید آلاتِ رہنمائی موجود نہ ہوں۔

یہاں ستارے کے غروب ہونے یا غروب شدہ ستارے کی قسم کھائی جا رہی ہے، یعنی اندھیرا غائب ہو چکا ہے اور کائنات کی ہر چیز روشن طور پر سامنے ہے یہ روشنی اس بات کی شاہد ہے کہ تمہارے رفیق (محمد ﷺ) ہر اختیاری اور غیر اختیاری بہکاوے اور بھٹکنے سے محفوظ ہیں۔ ستارے کے سفر اور آفتابِ نبوت ﷺ کی زندگی اور سفرِ نبوت میں یہ بات بھی مشترک ہے کہ: ''جس طرح آسمان کے ستارے طلوع سے لے کر غروب تک ایک مقرر رفتار سے متعین راستے پر چلے جاتے ہیں، کبھی ادھر ادھر ہٹنے کا نام نہیں لیتے، آفتاب نبوت ﷺ بھی اللہ کے مقرر کئے ہوئے راستے پر برابر چلے جاتے ہیں۔ ممکن نہیں کہ ایک قدم ادھر

یا ادھر پڑ جائے۔ ایسا ہوتو ان کی بعثت سے جو غرض متعلق ہے وہ حاصل نہ ہو، انبیاء علیہم السلام آسمانِ نبوت کے ستارے ہیں جن کی روشنی اور رفتار سے دنیا کو رہنمائی ملتی ہے اور جس طرح تمام ستاروں کے غائب ہونے کے بعد آفتابِ درخشاں طلوع ہوتا ہے۔ ایسے ہی تمام انبیاء کرامؑ کی تشریف آوری کے بعد آفتابِ محمدی ﷺ مطلع عرب سے طلوع ہوا، پس اگر قدرت نے ان ظاہری ستاروں کا نظام اس قدر محکم بنایا ہے کہ اس میں کسی طرح کے تزلزل اور اختلال کی گنجائش نہیں تو ظاہر ہے کہ ان باطنی ستاروں اور روحانی آفتاب و ماہتاب کا انتظام کس قدر مضبوط و محکم ہونا چاہئے، جن سے ایک عالم کی ہدایت وسعادت وابستہ ہے۔ (تفسیر عثمانی)

سورۃ البلد کا آغاز مکہ معظّمہ کی قسم سے ہوتا ہے اور دوسری آیت میں نبیٔ اکرم ﷺ سے تخاطب ہے اور اس طرح بلد الامین اور رسول الامین کا رشتہ ابھر کر سامنے آجاتا ہے۔

﴿لاقسم بھذا البلد o و انت حل بھٰذا البلد o﴾ ''قسم کھاتا ہوں میں اس شہر کی، اور تجھ پر قید نہیں رہے گی اس شہر میں۔''

اللہ تعالیٰ نے اس شہر یعنی مکہ کی قسم کھائی ہے۔ مکہ مکرمہ جس کے آغوش میں کعبۃ اللہ ہے، دنیا میں اللہ کا پہلا گھر، اگلی آیت میں رسول اللہ ﷺ سے خطاب ہے، ان دونوں آیات کے معنوی ربط سے یہ مفہوم بھی ابھرتا ہے کہ مکہ معظّمہ کا ایک شرف یہ بھی ہے کہ اس میں رسولِ امین ﷺ کا قیام ہے۔ انت حل بھٰذا البلد میں یہ مفہوم موجود ہے۔ ان الفاظ کا دوسرا مفہوم یہ سامنے آیا ہے کہ جس حرم میں جانور کا شکار نہیں کیا جاتا اور جس کی حرمت کا مشرکینِ قریش اتنا خیال کرتے ہیں وہاں ہر ظلم وستم آپ ﷺ اور آپ ﷺ کے رفقا کے لئے حلال کر لیا گیا ہے اور تیسرا مفہوم ایک عظیم پیشن گوئی ہے، فتح مکہ کی خبر اور بشارت، اس اعتبار سے دوسری آیت کا مفہوم ہوگا کہ عنقریب یہ شہر کفر کی بیخ کنی کے لئے آپ ﷺ کے لئے حلال کر دیا جائے گا۔ فتح مکہ کے موقع پر ایک دن کے لئے احکام حرم رسول اللہ ﷺ کے لئے معطل کر دیئے گئے تھے۔ اگر چہ فتح مکہ اس اعتبار سے ایک تاریخ معجزہ ہے کہ آپ ﷺ نے اپنے تمام دشمنوں کے لئے یہ اعلان فرما دیا تھا کہ: ''لاتثریب علیکم الیوم'' لیکن دو ایک

افراد جن کے جرائم ناقابل معافی تھے فتح مکہ کے موقع پر قتل کئے گئے۔

سورۂ یٰسین میں قرآن حکیم کی قسم رسالت محمدیہ ﷺ کی توکید واثبات کے لئے کھائی گئی ہے چنانچہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿یٰسٓ o والقرآن الحکیم o انک لمن المرسلین o علیٰ صراط مستقیم o﴾ (سورۂ یٰسین)

''یٰسین۔ قسم ہے قرآن حکیم کی کہ تم یقیناً رسولوں میں سے ہو (اور) سیدھے راستے پر ہو۔'' سورۂ یٰسین مکی ہے۔ یہ مکی عہد کے اس دور اور مرحلے کی سورۃ ہے، جب نبی اکرم ﷺ قوت اور پامردی سے قریش اور اہل مکہ کو ان کی روش حیات کے نتائج سے ڈرا رہے تھے۔ یٰسین کو اس کی حیات بخش تعلیم اور انداز کی وجہ سے سید المرسلین ﷺ نے قرآن کا دل قرار دیا، اور اس کی حیات بخشی کے پہلو پر غور فرمائیے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ: ''سورۂ یٰسین اپنے مرنے والوں پر پڑھا کرو۔'' اس کی مصلحت یہ ہے کہ موت کے تجربے سے مومن اس یقین کے ساتھ گزر سکے کہ موت جنت اور حیات ابدی کا دروازہ ہے۔

''سورۂ یٰسین'' کی یہ چار ابتدائی آیات اور ان میں قرآن حکیم کی قسم، سرورِ دوعالم ﷺ کے مرتبہ بلند کی ایک اور شہادت ہے۔ قرآن حکیم کے حروفِ مقطعات کے بارے میں ہمارا عقیدہ ہے کہ ان کا مفہوم اللہ تعالیٰ کے علم میں ہے، لیکن ''یٰسین'' کے بارے میں صحابہ کرامؓ تابعین اور بعض ممتاز مفسرینِ قرآن حکیم کا قول ہے کہ ''یٰسین'' کے معانی ہیں ''یا انسان''، بعض کے نزدیک یہ ''یا سیّد'' کا مخفف ہے۔ اور ان دونوں مفاہیم میں سے آپ کسی کو قبول کریں، دونوں صورتوں میں یہ خطاب نبی اکرم ﷺ سے ہے، کیونکہ آپ ﷺ ہی انسانوں کے عظیم ترین نمائندہ ہیں، اور آپ ﷺ ہی اولادِ آدم کے سید ہیں۔ ''یٰسین'' کے یہ معانی حضرت ابن عباس، عکرمہ، ضحاک، حسن بصری، ابن جبیر وغیرہ سے منقول ہیں۔ (تفسیر روح المعانی)

اس خطاب کے بعد قرآن حکیم کی قسم رب العزت نے کھائی اور حضور ﷺ سے خطاب کے پردے میں اہل عرب اور قیامت تک کے انسانوں کو یہ بات بتائی گئی کہ محمد ﷺ رسولوں میں سے ہیں اور صراطِ مستقیم پر ہیں۔ وہ جس راستے کی دعوت دے رہے ہیں وہی

انسانوں کے لئے سیدھا راستہ ہے۔

قرآن کریم کے لئے یہاں حکیم کی صفت کا استعمال بھی رسول اللہ ﷺ کی صداقت کے اظہار کے لئے ہے، قریش اور اہل مکہ کو (ان کے بعد سارے انسانوں کو) ان کا رب یہ بتا رہا ہے کہ قرآن حکیم کی حکیمانہ تعلیمات اور اس کی حیات بخش وحیات ساز تصورات محمد ﷺ کے نبی برحق ہونے کا ثبوت ہیں۔ یہ وہ کلام ہے جس کے بارے میں منکرین حق کو دعوت دی گئی کہ اس کی مثل ایک ہی سورۃ لے آؤ۔ اور ایک سورت تو بڑی بات ہے ایک آیت ہی لے آؤ۔ اور سب نے اپنے آپ کو عاجز پایا۔

فخر زمین وزمن ﷺ کے ذکرِ گرامی اور مرتبہ عالی کو سورۂ الم نشرح کی آیت **ورفعنالک ذکرک** میں بھی بیان کیا گیا ہے۔ مفسرین اور قرآن حکیم کے معنوی ربط پر ذکر رکھنے والے سورۂ الضحیٰ اور سورۂ الم نشرح کو توام سورتیں قرار دیتے ہیں۔ قرآنی قسموں میں حضور ﷺ کے مرتبہ، نبوت اور صداقت کے اس مختصر بیان کو ہم سورۃ الضحیٰ پر ختم کریں گے، انشاءاللہ۔

سورۂ الضحیٰ نبوت محمدی ﷺ کی ابتدائی عہد کی سورہ ہے۔ اس عہد کی سورتوں میں توحید، آخرت اور ایمانیات کا ذکر ہے یا آپ ﷺ سے محبت الٰہی کا وہ اظہار ہے جو کارِ نبوت کی گراں باری کو آسان اور سہل بنانے کے لئے ضروری تھا۔ ابتدائے نبوت میں مختصر وقفوں کے لئے سلسلۂ وحی ایک بار سے زیادہ مرتبہ منقطع ہوا۔ سلسلۂ وحی کے آغاز کے کچھ عرصے بعد ہی وحی کا سلسلہ بند ہوا جسے زمانہ فترتِ وحی کہتے ہیں۔ وحی کا تجربہ ایک عظیم تجربہ تھا۔ وحی الٰہی کے بوجھ کو صرف رسول کے اعصاب اور ان کا قلب ہی سہار سکتا ہے، ورنہ اس بوجھ سے تو پہاڑ بھی ریزہ ریزہ ہو جائیں۔ بعد کے دور میں جب نبی کریم ﷺ کے لئے نزول وحی، معمول کا تجربہ بن گیا تھا، وحی کے نازل ہوتے وقت اگر آپ ﷺ کسی اونٹنی پر سوار ہوتے تو وحی کے بوجھ سے اونٹنی اپنے پیٹ کو زمین سے لگا دیتی اور بیٹھ جاتی۔

اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ مختصر عرصوں کے لئے وحی کے سلسلہ کو روک دیتے۔ یہ وقفہ اتنا

ہی ناگزیر اور فطری تھا۔ جیسے دن کی روشنی اور ہنگاموں کے بعد رات کی تاریکی اور سکون جو انسان کو نیند کی دولت عطا کر سکے، اسی لئے اس سورۃ کا آغاز دن کی روشنی اور رات کے سکون کی قسموں سے ہوا ہے۔ ﴿والضُّحیٰ o وَالَّیْلِ اِذَا سَجیٰ﴾ (سورۃ والضحیٰ)

قسم ہے دھوپ چڑھتے وقت کی (روزِ روشن کی) اور رات کی جب چھا جائے۔ اور ان دونوں قسموں کے بعد اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول اور حبیب محمد ﷺ کو تسلی سے نواز، آپ ﷺ کو اپنے لطف و کرم سے یقین دلایا کہ وہ آپ ﷺ سے ناراض نہیں اور نہ اس نے آپ کو چھوڑا ہے۔ یہ تو محض تمہید ہے، اس کے بعد رب ذوالجلال نے بشارت دی کہ آنے والا دور بہتر ہوگا اور وہ اپنے رسول ﷺ کو اتنا کچھ عطا کرے گا کہ آپ ﷺ کا دل خوش ہو جائے گا۔ ﴿ماودعک ربک وما قلیٰ o وللاٰخرۃ خیر لک من الاولیٰ﴾ ''تمارے رب نے تم کو نہیں چھوڑا اور نہ وہ ناراض ہوا۔ اور آنے والا دور (آخرۃ) پچھلے دور (اولیٰ) سے بہتر ہے۔''

رسول کا تکیہ اور سہارا اس کا رب ہوتا ہے۔ وہ اس کے پیغام ہدایت کو انسانوں تک پہنچانے کے لئے ساری دنیا کی مخالفت اور دشمنی مول لیتا ہے۔ وہ غیر اللہ کی خوشنودی اور ناراضگی کے خیال سے بالاتر ہوتا ہے۔ رب راضی تو جہاں راضی۔ رضائے رب انعام رسول ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی خوشنودی کے اظہار کے ساتھ ساتھ یہ نوید دی کہ آخرت، اولیٰ سے بہتر ہے۔ اس آیت کا بنیادی اور پہلا مفہوم وہ حقیقت ہے جو ہر رسول کے پیغام کا بنیادی حصہ رہی ہے۔ آخرت اور آنے والی دائمی زندگی یقیناً اس دنیا اور اس کی عارضی زندگی سے بہتر ہے۔ یہ دنیا تو آخرت کی کھیتی ہے۔ لیکن اس سورۃ کے سیاق و سباق، پس منظر اور موضوع کے پیش نظر یہ بات ایک بدیہی حقیقت کی طرح ابھرتی ہے کہ یہاں آخرت اور اولیٰ کے معانی میں پچھلا اور موجودہ دور اور آنے والا دور شامل ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول ﷺ کو مژدہ سنایا کہ ان آزمائشوں اور قریش کی ایذا رسانی اور ان کے طنز و استہزا سے غمگین نہ ہوں۔ یہ کون ہیں یہ کہنے والے کہ تمہارے رب نے تمہیں چھوڑ دیا۔ ہم تمہیں یہ

بشارت دیتے ہیں کہ ہر آنے والا مرحلہ اور دور، پچھلے مرحلے اور دور سے بہتر ہوگا۔ غم کے بادل چھٹ جائیں گے اور حقیقی مسرتیں تمہاری اور اہل ایمان کی زندگی کے مطالع پر چھائیں گی اور اللہ کا ابر رحمت، مسلمانوں کی زندگی کو سرسبز وشاداب کردے گا، مخالفتیں دم توڑ جائیں گی، دنیا تمہارے پیغام کو قبول کرلے گی، اور بات اس دنیا تک محدود نہ رہے گی بلکہ آنے والی دنیا اور زندگی تو تمہارے اور اہل ایمان کے لئے اللہ کی خوشنودی قائم رہنے والا اظہار اور اعلان ہوگی۔

ہر بشارت، ہر خوش خبری اور ہر سعادت اس سعادت میں سمٹ آئی ہے کہ تمہارے لئے آنے والا زمانہ پچھلے زمانے سے بہتر ہوگا۔ اور اللہ سے زیادہ صادق القول کون ہوسکتا ہے۔ اور مستقبل کی ان بشارتوں کی بنیاد حضور ﷺ کی زندگی کی ان تبدیلیوں کو بنایا گیا ہے جو قریش مکہ کے سامنے تھیں۔ قریش جانتے تھے کہ پیدائش سے پہلے ہی آپ ﷺ کے والد کا انتقال ہوگیا تھا، لیکن آپ ﷺ کو اس طرح پرورش اور شفقت کے سائبانوں کے نیچے رکھا گیا کہ جس کی مثال کسی یتیم کی زندگی میں نہیں ملے گی۔ چھ سال کی عمر تک ام النبی حضرت آمنہ کی آغوش مہر وعطا میں آپ ﷺ نے سانس لی۔ ان کی وفات کے بعد آپ ﷺ کے دادا حضرت عبدالمطلب آپ کی زندگی پر سایہ گستر رہے، وہی عبدالمطلب جو رب کعبہ پر اٹوٹ یقین رکھتے تھے۔ وہ ابرہہ کے لشکر والوں سے اپنے اونٹ واپس مانگنے گئے تھے، اور کعبے کے بارے میں پورے یقین کے ساتھ کہا تھا کہ اس کی حفاظت اس کا رب کرے گا۔ حضور ﷺ کی پیدائش سے پہلے ہی وہ اس بات پر یقین رکھتے تھے کہ بطن آمنہ میں پرورش پانے والا بچہ جب اس دنیا میں آئے گا تو زندگی کے ورق پر اپنا نشان ثبت کردے گا۔ ان کی وفات کے بعد وہ اللہ کی ان طاقتوں میں شامل ہوگئے جن کا کام نبی آخر الزماں ﷺ کی حفاظت کرنا تھا۔

اور پھر اہل مکہ نے یہ بھی تو دیکھا تھا کہ بت پرستی، فسق وفجور، عیش وعشرت اور ظلم کی چھائی ہوئی فضا میں پلنے والا یہ نونہال (ﷺ) اگرچہ معاشرے کی ہر گمراہی سے محفوظ رہا، لیکن اسے اپنی منزل کی خبر نہ تھی۔ اسے اپنی منزل تو عہد شباب کے نقطہ عروج پر ملی جب حیرانی اور

تلاش کو اللہ تعالیٰ نے اپنی وحی کے ذریعے ایمان، رب شناسی، کائنات فہمی اور انسان سازی کی اس دولت میں بدل دیا جسے نبوت کہتے ہیں۔

اہل مکہ نے یہ بھی دیکھا تھا کہ اپنی عالی نسبی کے باوجود آپ ﷺ کے دامن میں دولت دنیا نہ تھی۔ پھر رب جلیل نے آپ کو رزق کریم سے نوازا۔ اللہ تعالیٰ نے پہلے تو آپ ﷺ کو مکہ کی سب سے باثروت خاتون کا تجارتی نمائندہ اور شریک تجارت بنایا اور پھر اس خاتون کی عائلی زندگی وجود محمدی ﷺ کے نور سے روشن ہوگئی اور وہ آپ ﷺ کی شریک حیات بن گئیں۔ ایسی شریک حیات جس نے سب سے پہلے اسلام قبول کیا، جس کا گھر پہلا دارالاسلام بنا، جس گھر کی فضاؤں میں علی المرتضیٰ کی پرورش ہوئی، اور جہاں زید بن حارثہ تکریم آدم وآدمیت کا نشان بنے، اور محبت نبی کے عظیم نشانوں اور علامتوں میں سے ایک قرار پائے۔ یہ سارا پس منظر اور بشارت عظمیٰ چار آیتوں میں سمٹ آئی ہے۔

﴿ولسوف یعطیک ربک فترضٰی ٥ الم یجدک یتیماً فاٰوٰی ٥ ووجدک ضآلا فھدٰی ٥ ووجدک عآئلاً فاغنٰی ٥﴾

"اور عنقریب آپ کا رب آپ کو اتنا دے گا کہ آپ خوش ہو جائیں گے، کیا ہم نے تمہیں یتیم نہیں پایا اور پھر (عزت کا) ٹھکانا دیا اور ہم نے تمہیں متلاشی (اور حق کے لئے سرگرداں) نہیں پایا اور پھر راہ دکھائی، اور ہم نے آپ کو نادار پایا آپ کو غنی کر دیا۔"

سورۂ ضحیٰ، سورۂ الم نشرح، سورۂ کوثر، سورۂ محمد، سورۂ فتح، قرآن حکیم کی کئی سورتوں اور بہت سے مقامات کی طرح رفع ذکر محمد ہے۔

(بحوالہ جستہ جستہ از مقام محمد قرآن کے آئینے میں)

خصوصیت نمبر ۵۷

رسولِ اکرم ﷺ کے لئے مالِ غنیمت حلال کر دیا گیا

قابل احترم قارئین! رسولِ اکرم ﷺ کی امتیازی خصوصیات میں سے یہ ستاون نمبر خصوصیت ہے، جسکا عنوان ہے ''رسولِ اکرم ﷺ کے لئے مالِ غنیمت حلال کر دیا گیا'' جیسا کہ آنے والے اوراق میں اس خصوصیت کی وضاحت کی جارہی ہے، لیکن اس وضاحت سے پہلے گزشتہ خصوصیات کی طرح یہاں بھی بتا تا چلوں، کیونکہ میری زندگی کا یہی سب سے بڑا سرمایا ہے کہ بحمد اللہ دیگر خصوصیات کی طرح اس خصوصیت کو بھی میں نے ریاض الجنۃ میں بیٹھ کر روضہ رسول ﷺ کے سائے میں ترتیب دیا ہے کیونکہ میرا ایمان ہے کہ روضہ رسول ﷺ کے سائے میں بیٹھ کر روضہ اقدس میں آرام فرمانے والے عظیم پیغمبر اور ہم سب کے پیارے آقا ﷺ کی خصوصیت کو لکھنا اور ترتیب دینا بہت بڑی سعادت ہے، میری دلی دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ بار بار مجھے مدینہ بلائے اور پھر اپنے محبوب ﷺ کی محبوب مسجد اور پھر پیارے روضہ کے سامنے بٹھا کر آقا ﷺ کی سیرت کے ہر ہر گوشے کو لکھنے کی توفیق عطا فرمائے آمین۔

بہر حال محترم قارئین! جیسا کہ عنوان سے ظاہر ہے کہ ہمارے نبی ﷺ کے لئے اللہ تعالیٰ نے مالِ غنیمت کو حلال کر دیا، جبکہ دیگر انبیاء کرامؑ اور ان کی امتوں کے لئے مالِ غنیمت حلال نہیں ہوتا تھا، چنانچہ جیسا کہ خود زبانِ اقدس سے آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ میرے لئے مالِ غنیمت حلال کر دیا گیا اور دیگر انبیاء کو یہ خصوصیت نہیں ملی، مزید تفصیل کے لئے آنے والے صفحات کا مطالعہ فرمائیے، جسے قرآن وحدیث کی روشنی میں مرتب کیا گیا ہے امید ہے کہ انشاء اللہ اس خصوصیت کا مطالعہ بھی فائدے سے خالی نہیں، دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہم سب کو حضور ﷺ سے سچی محبت کرنے کی توفیق عطا فرمائے، آمین یارب العالمین۔ لیجئے

اب اس خصوصیت کی تفصیل ملاحظہ فرمائیے:۔

ستاون نمبر خصوصیت کی وضاحت قرآن واحادیث کی روشنی میں

رسولِ اقدس ﷺ کا ارشاد پاک ہے کہ میرے لئے یعنی میری امت کے لئے تمام مال غنیمت حلال کیا گیا ہے، جبکہ مجھ سے پہلے جو نبی گزرے ہیں ان میں جن کو جہاد کا حکم دیا گیا وہ تمام مال غنیمت دوسروں کو دے دیتے تھے، اور اپنے اوپر اس کو حرام رکھتے وہ سب مال کو جمع کر لیتے تھے، یہاں غنیمت میں حیوانات کے علاوہ سب چیزیں مراد ہیں جیسے کھانے پینے کی چیزیں اور دوسرا مال ومتاع، کیونکہ جہاں تک حیوانات کا تعلق ہے جو مال غنیمت میں آئے ہوں وہ لڑنے والوں کی ہی ملکیت ہوتے ہیں، انبیاء کے لئے ان میں کوئی بھی چیز مال غنیمت کی حیثیت سے لینی جائز نہیں ہے، کتاب وفا میں اسی طرح ہے، بعض روایتوں میں یہ ہے کہ آپ ﷺ کی امت پر مال غنیمت حلال کیا گیا ہے جبکہ اس سے پہلے کسی امت پر غنیمت کا مال حلال نہیں تھا۔

چنانچہ ایک روایت ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ پچھلے نبی جب مال غنیمت سے پانچواں حصہ نکالتے تو آسمان سے ایک سفید رنگ کی آگ آیا کرتی تھی، اور اس مال کو کھالیا کرتی تھی اگر اس میں کوئی خیانت نہ ہوئی ہو، لیکن مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں اس مال کو اپنی امت کے غریب لوگوں میں تقسیم کروں (یعنی پانچویں حصے کو)۔

پچھلی امتوں پر مال غنیمت حلال نہیں تھا بلکہ یہ آنحضرت ﷺ کی امت پر حلال کیا گیا ہے۔ مشکوٰۃ کی حدیث ہے جسے حضرت ابو ہریرہؓ نے نقل کیا ہے کہ ''ہم سے پہلے کسی پر بھی مال غنیمت حلال نہیں تھا۔ کہ ہم پر یہ اللہ تعالیٰ کا فضل ہے کہ اس نے ہمارے ضعف اور کمزوری کو دیکھ کر غنیمت کے مال کو ہمارے لئے جائز فرمادیا ہے۔''

پچھلی امتوں میں یہ دستور تھا کہ غنیمت کا مال اکٹھا کرتے اور اس کو جنگل میں لیجا کر رکھ دیتے، اگر اس مال غنیمت میں سے کسی نے کوئی خیانت اور بددیانتی نہیں کی ہے تو آسمان

سے آگ اترتی اور اس مال کو کھالیتی جس سے وہ سمجھ لیتے کہ ان کا جہاد قبول ہو گیا ہے۔
چنانچہ حضرت یوشع ابن نونؑ کا واقعہ حدیث میں آیا ہے جسے ابو ہریرہؓ نے آنحضرت ﷺ سے نقل کیا ہے یہ حدیث مشکوٰۃ میں ہے۔ جس کا کچھ حصہ یہاں نقل کیا جا رہا ہے:

''حضرت یوشع ابن نون نے ایک بستی جنگ کے ذریعہ فتح کی، اس کے بعد انہوں نے غنیمت کا مال جمع کر کے ایک جگہ رکھ دیا آگ آئی مگر اس نے اس مال کو نہیں کھایا، حضرت یوشع نے یہ ماجرا دیکھ کر ساتھیوں سے فرمایا۔ تم لوگوں میں سے کسی نے یقیناً خیانت اور بددیانتی کی ہے (یعنی اس مال سے کچھ چھپالیا ہے) لہٰذا اب یہ ضروری ہے کہ ہر قبیلے کا ایک ایک آدمی میرے ہاتھ پر بیعت کرے، چنانچہ بیعت شروع ہوئی تو ایک شخص کا ہاتھ حضرت یوشع کے ہاتھ پر رکھتے ہی چپک کر رہ گیا، حضرت یوشع نے فرمایا: ''تمہارے قبیلے میں سے کسی نے بددیانتی کی ہے'' آخر اس قبیلے کے لوگ ایک گائے کا سر لائے جو سونے کا بنا ہوا تھا اور جسے انہوں نے چھپالیا تھا اس کو انہوں نے جیسے ہی باقی مال کے ساتھ رکھا فوراً آگ آئی اور اس سارے مال کو کھا گئی۔ یہاں یہ بات بھی واضح رہنی چاہئے کہ مال غنیمت اس مال کو کہتے ہیں جو غیر مسلموں سے جنگ کے نتیجہ میں فتح کے بعد جنگ کے دشمن کے کیمپ سے حاصل ہوتا ہے۔ (بحوالہ سیرتِ حلبیہ جلد اول)

جیسا کہ عرض کیا گیا کہ حضرت موسیٰ و حضرت یوشع بن نون کو فتوحات میں جس قدر مغانم حاصل ہوتے تھے ان کو نذرِ آتش کر دیا جاتا تھا، تورات میں جانوروں تک کو جلا دینے اور بستیوں میں آگ لگا دینے کا ذکر ملتا ہے۔

نبی اکرم ﷺ کے غزوات میں سب سے پہلے غزوہ بدر میں غنیمت حاصل ہوئی، مال غنیمت جمع بھی ہوا، اور تقسیم بھی کیا گیا، لیکن پھر بھی لشکر میں ایسے لوگ موجود تھے جو شریعت موسوی کی نظیر پر مال غنیمت کا لینا خطرناک امر سمجھتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے انہی کے اطمینان کے لیے یہ آیت نازل فرمائی ﴿لو لا کتاب من اللہ سبق لمسکم فی ما اخذ تم عذاب عظیم ،فکلوا مما غنمتم حلالا طیبا﴾

"اگر اللہ کی طرف سے پہلے کتاب میں ایسا نہ ہوتا تب جو کچھ تم نے وصول کیا ہے اس کے لیے تم پر بڑا عذاب ہوتا اب تو غنیمت کو حلال طیب سمجھو اور کھاؤ۔"

دوسری جگہ ہے: ﴿وعدکم اللّٰہ مغانم کثیرۃ تاخذونھا فعجل لکم ھذہ وکف ایدی الناس عنکم ولتکون اٰیۃ للمؤمنین ویھدیکم صراطا مستقیما واخری لم تقدروا علیھا قداحاط اللّٰہ بھا وکان اللّٰہ علی کل شیءٍ قدیرا﴾ "اللہ نے تم سے مغانم کثیرہ کا وعدہ کیا جن کو تم حاصل کرو گے، لہذا یہ تو تم کو جلد ہی دے دی (خیبر) اور دشمنوں کے ہاتھوں کو تم سے روک دیا ہے تاکہ مومنین کے لیے یہ ایک نشان ہو اور تم کو اللہ صراط مستقیم پر چلائے گا اور بھی مغانمبہت ہیں تم کو ان پر قدرت نہیں مگر اللہ نے ان پر احاطہ کر رکھا ہے اور اللہ ہر شے پر قدرت والا ہے۔"

یہ مغانم کثیرہ ہی ہیں جو سلطنت ہائے ایران اور روما پر فتوحات حاصل کرنے میں مسلمانوں کو حاصل ہوئیں چونکہ یہ وعدہ مومنین کو مخاطب فرما کر کیا گیا تھا، اس لیے اس وعدہ کا ایفاء بھی خلافت راشدہ کے وقت میں ہوا، جب کہ سرور کائنات ﷺ عالم بقا کو سدھار گئے تھے۔ واضح ہو کہ یہ ایک وعدہ نہ تھا، بلکہ مومنین سے تین وعدے کیے گئے تھے، دوسرا وعدہ یہ تھا کہ دشمن کے ہاتھ تم سے کوتاہ رہیں گے، اس وعدہ کے مطابق خلافت راشدہ کے وقت میں کوئی دشمن اسلامی فوجوں پر غالب نہیں آسکا تھا۔

تیسرا وعدہ برایت صراط مستقیم کا تھا اور وہ بھی اپنی ظاہری و باطنی برکات کے ساتھ اسی طرح پورا ہوا جس طرح پہلے دو وعدے۔ اس آیت سے مجاہدین عہد خلافت راشدہ کی بڑی فضیلت ثابت ہوتی ہے۔ (بحوالہ رحمۃ اللعالمین جلد سوم)

يَا رَبِّ صَلِّ وَسَلِّمْ دَائِمًا اَبَدًا عَلٰی حَبِيْبِکَ خَيْرِ الْخَلْقِ کُلِّهِمِ

خصوصیت نمبر ۵۸

رسولِ اکرم ﷺ کو اللہ تعالیٰ نے اپنا ایک بڑا احسان قرار دیا

قابلِ احترم قارئین! رسولِ اکرم ﷺ کی امتیازی خصوصیات میں سے یہ اٹھاون نمبر خصوصیت ہے، جسکا عنوان ہے ''رسولِ اکرم ﷺ کو اللہ تعالیٰ نے اپنا ایک بڑا احسان قرار دیا'' جیسا کہ آنے والے اوراق میں اس خصوصیت کی وضاحت کی جارہی ہے، لیکن اس وضاحت سے پہلے گزشتہ خصوصیات کی طرح یہاں بھی بتادیا جائے تو بہتر ہے کہ بحمد اللہ دیگر خصوصیات کی طرح اس خصوصیت کو بھی میں نے ریاض الجنۃ میں بیٹھ کر روضہ رسول ﷺ کے سائے میں ترتیب دیا ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنی بارگاہ میں مقبول ومنظور فرمائے آمین۔

بہر حال محترم قارئین! ذیل میں آنے والی خصوصیت بھی آپ ﷺ کی ایک عظیم خصوصیت ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہمارے نبی ﷺ کو اپنا ایک بڑا احسان قرار دیا جیسا کہ قرآن میں ارشاد فرمایا جس کا مفہوم ہے کہ ''بے شک اللہ تعالیٰ نے مؤمنوں پر احسان فرمایا جو انہیں میں سے ان میں رسول مبعوث فرمایا۔'' (سورۃ ال عمران) جبکہ پہلے انبیاء کرام میں سے کسی بھی نبی یا رسول سے متعلق اللہ تعالیٰ نے یوں نہیں فرمایا کہ اس نبی یا رسول کو بھیج کر ہم نے تم پر احسان کردیا، صرف اور صرف آپ ﷺ ہی سے متعلق فرمایا، بے شک یہ صرف اور صرف آپ ﷺ ہی کی خصوصیت ہے، آنے والے صفحات کے ذیل میں آپ ﷺ کی اسی خصوصیت کی وضاحت کی جارہی ہے، جسے ہم نے ''مقام محمدؐ قرآن کے آئینے میں'' نامی کتاب سے چیدہ چیدہ نقل کیا ہے، امید ہے کہ موضوع کی مناسبت سے انشاء اللہ اس کا مطالعہ بھی فائدے سے خالی نہیں ہوگا، جسکے مطالعے سے انشاء اللہ معلومات میں بھی اضافہ ہوگا، لیجئے ملاحظہ فرمایئے، اللہ تعالیٰ ہم سب کو اپنے نبی ﷺ سے سچی محبت کرنے کی توفیق عطا فرمائے آمین۔

اٹھاون نمبر خصوصیت کی وضاحت قرآن واحادیث کی روشنی میں

انسان بلکہ تمام مخلوقات کا وجود اللہ کی رحمت کا نتیجہ ہے۔ ہمارے رب کی ربوبیت اور رحمت کا ذکر سب سے پہلے کیا گیا۔ یہی اللہ جو رحمت اور رحیم ہے۔ دنیا سے عقبیٰ تک ہر ایک کے لئے اس کی رحمتوں کا سلسلہ پھیلا ہوا ہے۔ اس کی ربوبیت بھی اس کی رحمت کا اظہار تمام ہے۔ وہ ہر مرحلے پر ہماری ہر ضرورت کو پورا کرتا ہے اور یوں ہماری صلاحتیں اپنی تکمیل کو پہنچتی ہیں۔ ہماری کمیوں کو دور کر کے وہ ہماری بشریت کی تکمیل کرتا ہے۔ یہ اس کی رحمت ہے۔ اور اللہ کی نعمتوں نے ہماری اور کائنات کی زندگی کو متنوع مالا مال اور ہمہ جہت بنا دیا ہے۔ سر بلندی، خوش حالی، سکونِ قلب، کائنات کا حسن، اعتدال اور توازن یہ سب اللہ کی نعمتیں ہیں جو ہمیں بلا طلب ملی ہیں اور دینے والے نے ان کی نشان دہی تو کی ہے مگر احسان نہیں جتایا ہے۔ نشان دہی بھی اس لئے فرمائی ہے کہ ہماری فکر میں اتنی سکت نہیں ہے کہ ہم ان نعمتوں کا احاطہ کرسکیں۔ احاطہ تو بڑی بات ہے ہمیں ان کے بارے میں سوچنے کی توفیق نہیں ہوتی، کیونکہ یہ نعمتیں بہت عام ہیں اور ان کے حصول کے لئے ہمیں کوئی جدوجہد نہیں کرنی پڑتی۔ سورج کی روشنی، زمین کی قوتِ نمو، ہوا، پانی۔ ہم میں سے کون ان نعمتوں کا پوری طرح ادراک کرسکتا ہے؟...... ہماری معاشرتی زندگی کا ہر خوشگوار پہلو اس کی نعمت ہے۔ ایمان کی دولت اس کی نعمت ہے، خوشی، خوف الٰہی، جہاد اور اس سے حاصل ہونے والا مالِ غنیمت، اللہ کی ہدایت، اقوامِ عالم میں ہمارے امت وسط ہونا، معرفت الٰہی، رسول اللہ ﷺ کے رتبے کا کسی حد تک ادراک۔ یہ سب اللہ کی نعمتیں ہیں۔ اس پھیلی ہوئی کائنات کی بہت مختلف اور بظاہر کوئی باہمی تعلق نہ رکھنے والی چیزوں کا ہم نے ذکر کیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اللہ ان سب کے درمیان تعلق اور ربط پیدا کرتا ہے۔

اللہ کی نعمتیں اتنی ہیں کہ کثرت کی وجہ سے ہمیں یاد نہیں آتیں۔ سورۂ رحمٰن کے آئینے میں ربِ جلیل کی نعمتوں کا عکس ہمارے پردۂ ذہن پر منعکس ہوتا ہے۔ قرآن کا عطیہ، آسمان

کی بلندیاں، میزان عدل اور توازنِ تخلیق۔ زمین کا ہمارے لئے بچھایا جانا۔ اس کے میوے، انسان، پھول اور ان کی خوشبوئیں۔ تم اللہ کی کس کس نعمت کو جھٹلاؤ گے۔ یہ سورہٗ رحمٰن کی ابتدائی ۱۳ آیتوں کا خلاصہ ہے۔ اللہ کی نعمتوں کو قرآن کے صفحات اور اپنی زندگی میں دیکھنا شروع کیجئے تو زندگی تمام ہو جائے گی۔ اور نعمتوں کا احاطہ نہ ہو سکے گا۔

اللہ تعالیٰ کی نعمتیں اس کی رحمت کا اظہار ہیں۔ اس کے کئی اسمائے حسنٰی یعنی صفاتی نام، رحمت، رحم اور انعام کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ باسط، رزاق، لطیف۔

اللہ نے یہ سب کچھ دیا اور کہیں اپنا احسان نہیں جتایا کیونکہ احسان جتانا اس کی شان کریمی کے شایان نہیں۔ اور احسان جتانا تو عباد الرحمٰن کی شان کے مطابق نہیں قرآن میں کتنی جگہ اس کی مذمت کی گئی ہے۔

سورۃ المدثر میں ارشاد ہوتا ہے: ﴿وَلَا تَمنُنْ تَستكثِرُ﴾ ''اور زیادہ حاصل کرنے کے لئے احسان نہ کرو۔''

یہ بات کار نبوت کے سلسلے میں نبی کریم ﷺ سے کہی جا رہی ہے۔ یہ ہدایات ربانی میں سے ایک ہدایت ہے جو نبی ﷺ کو دی گئیں۔ اپنے رب کی بڑائی کا اعلان کرو، پاکیزگی کا بلند ترین معیار پیش کرو۔ یہ دراصل قریش مکہ اور انسانوں کو نبوت کے فرائض سے آگاہ کرنے کے لئے ہے۔ ورنہ ہر نبی اپنے فرائض کسی اجر کی خواہش اور تمنا کے بغیر انجام دیتا ہے اور ہادیٔ اعظم ﷺ کا سینہ تو دردِ انسانیت کا خزینہ تھا۔

''مَن'' کا مادہ م ن ن ہے۔ اس کے مادے کے کئی الفاظ اردو میں مستعمل ہیں۔۔ ممنون، ممنونیت، منت وغیرہ۔

مَنَّ اللہ کا وہ احسان ہے۔ جو کسی منصوبہ بندی، کسی محنت اور مشقت کے بغیر انسان کو حاصل ہو جائے۔ اللہ کے ایسے کتنے ہی احسانات انسان پر ہیں۔ اس کی وحی ''من'' ہے جو ہم کو غلط فیصلوں، غلط طرز حیات، انسان کش نظریات سے بچاتی ہے۔ آزادی اللہ کا احسان ہے۔

اللہ کے احسان کا احاطہ ناممکن ہے اور اس کے یہ سارے احسانات ہماری زندگی کے لئے ضروری ہیں، اور ہمیں زندگی دینے والے نے کہیں احسان نہیں جتایا۔ ہاں صرف ایک احسان کا تذکرہ فرمایا۔ اس رسول کو بھیجنے کا احسان، جو مومنوں پر اللہ کی آیات کی تلاوت کرتا ہے، اور ان کی حکمت سکھاتا ہے۔ آیات الٰہی، تزکیہ، کتاب اور حکمت کے بغیر زندگی سراسر خسارہ تھی۔

چنانچہ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد گرامی ہے: ﴿لَقَدْ مَنَّ اللهُ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ اِذْبَعَثَ فِيهِم رَسُولاً مِّن أنفُسِهِم يَتلُوا عَلَيهِم ايٰتِه ويُزَكِّيهِم ويُعَلِّمُهُمُ الكِتابَ والحِكمَةِ وإنْ كَانُوا مِن قَبلُ لَفِي ضَلٰلٍ مُّبِينٍ .﴾ (سورۂ آل عمران)

"بے شک اللہ نے مومنوں پر احسان فرمایا جو انہیں میں سے ان میں رسول مبعوث فرمایا جو ان پر اس کی آیات کی تلاوت کرتا ہے، ان کا تزکیہ کرتا ہے (انہیں پاک کرتا ہے) انہیں کتاب وحکمت کی تعلیم دیتا ہے، اگر چہ وہ اس سے قبل صریح گمراہی میں تھے۔"

اس آیت سے نبوت کے فرائض کے ساتھ ساتھ سرور کائنات، صاحب کوثر ﷺ کی ذات اور ان کے کمالات کے کتنے پہلو منور ہو جاتے ہیں۔ ﴿رَسُولاً مِّن أنفُسِهِم﴾ "انہیں میں سے ایک رسول۔"

رسول اللہ ﷺ جن لوگوں کے پاس اللہ کا پیغام لے کر آئے تھے وہ انہیں کے ساتھی، شناسا، ہم قوم، ہم شہر تھے، ان کے سامنے آپ کی ساری زندگی تھی، وہ ان ﷺ کی امانت اور صداقت کے شاہد تھے۔ ان سے بہتر اس حقیقت کو کوئی نہیں جانتا تھا۔ یہ اہل مکہ پر اللہ کا احسان تھا کہ اس نے انہیں مرتبۂ آدم سے آشنا کرنے کے لئے انہیں میں سے صادق اور امین کا انتخاب کیا۔ وہ جو ان کے درمیان رہتا تھا، وہ جس سے ہر بات آسانی سے کی جاسکتی تھی۔ جس کی جاں سوزی گداز قلب، شفقت، ہمدردی، اور بے غرضی کا وہ ہر آن مشاہدہ کرتے تھے، جو ان کے درمیان بیٹھتا اور گفتگو کرتا تو بلا کسی امتیاز کے۔

رسول اللہ ﷺ ان کے درمیان بیٹھتے، اور بڑے فطری انداز میں ان کو اللہ کی باتیں

سناتے، آپ ﷺ کی گفتگو سے، آپ ﷺ کی خاموشی سے، آپ ﷺ کے اندازِ تبسم اور اسلوب تکلم سے، آپ کی قربت سے اہل مکہ اور قریش کی زندگی اور قلب بدلنے لگتے۔ جو ایمان لائے ان کے دلوں کی صیقل ہوگئی۔ ان کا ایک ایک لمحہ رضائے الٰہی کے مطابق بسر ہونے لگا۔ ان کا ذہن ایسا بنتا گیا کہ عقیدے کے تمام عقدے اور عمل کے تمام پہلو ان پر واضح ہوتے گئے اور اگر کبھی کوئی ذہنی الجھن پیدا ہوتی تو آپ ﷺ کی پرحکمت تشریحات اور حکیمانہ طرزِ عمل اس کو دور کر دیتا۔

اور اہل مکہ وقریش کو اللہ تعالیٰ نے اپنے اس احسان کو یاد دلایا ہے جو محمد عربی ﷺ کی صورت میں انہیں عطا کیا گیا تھا۔

آپ نے خدا کی توفیق واعانت سے عمل وعلم کے ان اعلیٰ مراتب پر اس درمندہ قوم کو فائز کیا جو صدیوں سے انتہائی جہل وحیرت اور صریح گمراہی میں غرق تھی۔ آپ کی چند روزہ تعلیم وصحبت سے وہ ساری دنیا کے لئے ہادی ومعلم بن گئی۔ (تفسیر عثمانی)

اور یہ قرآنی خطاب قیام قیامت تک ہر مسلمان سے ہے۔ صفحات قرآن سے آج تک اس صادق وامین کی آواز ابھر رہی ہے۔ فداہ امی وابی۔ ان کا اخلاق اور اسوۂ حسنہ آج بھی ہمارے لئے تزکیہ نفس کا راستہ ہے۔ کتب احادیث میں ان کے الفاظ آج بھی ہمیں کتاب اللہ کے حقیقی مفاہیم کی تعلیم دے رہے ہیں، اور ہمارے لئے دبستانِ حکمت ہیں۔

کتاب، احادیث اور اسوۂ رسول ﷺ نشاناتِ راہ ہیں اور ہماری فلاح وفوز کا نسخہ۔

(بحوالہ جستہ جستہ از مقام محمد قرآن کے آئینے میں)

ذیل میں اب حضرت مولانا مفتی محمود الحسن گنگوہیؒ کے خطبات سے حضرت کی ایک تقریر پیش کی جارہی ہے، جس میں حضرت نے اپنے انداز میں آپ ﷺ کی ذات کے سب سے بڑے احسان ہونے کا بتلایا ہے، کہ کس طرح اللہ تعالیٰ نے حضور ﷺ کو ہمارے لئے احسان عظیم بنایا، یاد رہے کہ یہ تحریر نہیں بلکہ تقریر ہے، اس لئے پڑھتے وقت تقریر کے اسلوب ہی کو ملحوظ رکھا جائے، کیوں کہ حضرت مولانا مفتی محمود الحسن گنگوہیؒ ایک بزرگ

شخصیت ہیں ان کی زبان سے نکلنے والے الفاظ کا اپنا ایک نور ہے اس لئے ہم نے مناسب سمجھا کہ اسے من وعن نقل کر دیا جائے، البتہ آخر میں کچھ وضاحت کے طور پر کچھ تفصیل بھی پیش کردی گئی ہے، لیجئے اب ہمارے موضوع کی مناسبت سے حضرتؒ کی تقریر ملاحظہ فرمایئے، اللہ تعالیٰ ہم سب کو عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے آمین یارب العالمین۔

ارشاد باری تعالیٰ ہے: "لقد منَّ اللهُ عَلَى المُؤمِنِينَ اِذبَعَثَ فِيهِم رَسُولاً مِّن اَنفُسِهِمْ ......الخ"

اللہ جل جلالہٗ وعم نوالہ نے اس آیت شریفہ میں اپنے ایک بڑے احسان کا ذکر کیا ہے۔فرمایا کہ اللہ نے بہت بڑا احسان کیا مؤمنین پر ایمان لانے والوں پر بڑا احسان کیا کہ ان میں رسول بھیجا جو انہی میں سے ہے، انہی کی قسم میں سے ہے۔انہی کی نوع میں سے، یہ بہت بڑا احسان ہے۔

اللہ تعالیٰ کے بے شمار احسانات ہیں، ہمیں پیدا کیا کتنا بڑا احسان ہے، نہ پیدا کرتا تو ہمارا کیا زور تھا؟ پیدا کیا تو انسان بنایا، اگر انسان نہ بناتے جانور بنا دیتے تو ہمارا کیا کچھ زور تھا؟......گدھے بھی تو اسی کے پیدا کئے ہوئے ہیں کتے بھی اسی کے پیدا کئے ہوئے ہیں۔ سانپ بچھو بھی اسی نے پیدا کئے ہیں۔اگر خدا ہمیں انسان نہ بناتا، سانپ بچھو بناتا تو ہمارا کوئی زور تھا اس پر؟......تو کیا ہوتا؟...... جو دیکھتا وہی مارنے کو دوڑتا، گدھا بناتا، بیل ہاتھی بناتا تو کیا ہوتا؟...... یہ سب بھی تو اسی کے پیدا کئے ہوئے ہیں۔اس نے ہمیں انسان بنایا، کتنا بڑا احسان کیا، پھر انسانوں میں بھی کتنے انسان ایسے ہیں جو بُرے بے شمار عوارض میں مبتلا ہیں، پریشانیوں میں مبتلا ہیں، کسی کی آنکھ نہیں، کسی کا کان نہیں، کسی کی ٹانگ ٹوٹی ہوئی ہے، کسی کے معدے میں درد ہے، کسی کی کمر میں درد ہے، قسم قسم کی بیماریوں میں مبتلا، اللہ تعالیٰ نے ان ساری بیماریوں سے محفوظ فرمایا، کتنا بڑا احسان کیا، اور کتنے ہی انسان ایسے ہیں جو اپنے ہاتھ سے بت بناتے ہیں، اس کی پوجا پاٹ کرتے ہیں اس کو خدا، معبود اور حاجت روا سمجھتے ہیں، مالک الملک سے بہت دور جا پڑے ہیں، جانتے ہی نہیں اپنے پیدا کرنے والے

کو، اپنے خالق کو اور اپنے رازق کو پہچانتے نہیں، کتنے لوگ ایسے ہیں کہ نام تو ان کا مسلمان ہے لیکن کبھی مسجد میں نہیں آتے، کبھی قرآن نہیں پڑھتے، کبھی سر نہیں جھکاتے خدا کے سامنے، کبھی کلمہ نہیں پڑھتے، جانتے نہیں، تو اللہ نے کتنا بڑا احسان فرمایا، کہ اپنے گھر میں آنے کی اجازت دی، مسجد میں آنے کی، اگر مہر لگا دیں دلوں پر تو کوئی آسکتا ہے؟...... ہرگز نہیں آسکتا۔

ایک صاحب بابو، ان کے ساتھ ملازم، ملازم نماز کا بہت پابند، کہیں ساتھ لئے جا رہے ہیں، چلتے چلتے بازار سے کچھ سامان سودا خریدا، ادھر اذان ہوگئی، ملازم نے کہا حضور میں تو جا رہا ہوں میرے آقا نے میرے مولا نے مجھے بلایا ہے، اس نے کہا تیرا آقا تو میں ہوں تجھے کس نے بلایا؟...... اس نے کہا نہیں ایک دوسرا آقا ہے جو ہم سب کا آقا ہے، اس نے بلایا ہے، اذان ہوگئی، مسجد میں جانے کے لئے حکم ہے، چنانچہ وہ باہر بیٹھ گئے اور ملازم مسجد کے اندر آگیا، ملازم نے نماز پڑھی، کچھ تسبیح وظیفہ پڑھنے لگا، دیر ہوگئی نہیں گیا، وہ صاحب آئے، آواز دی ارے آتا نہیں کیا ہوگیا؟...... ملازم نے کہا جانے نہیں دیتا، اس نے کہا ارے کون نہیں جانے دیتا وہاں کون ہے؟...... دیکھا ادھر ادھر کوئی وہاں بیٹھا نہیں ہے، پھر کون جانے نہیں دیتا؟...... ملازم نے کہا وہی جو آپ کو اندر آنے نہیں دیتا۔ جو آپ کو اندر مسجد میں آنے نہیں دیتے وہ مجھ کو مسجد سے باہر جانے نہیں دیتے۔

اللہ میاں کی طرف سے کتنا بڑا احسان ہے کہ اپنے دربار میں اس نے آنے کی اجازت دے دی، دنیا میں کسی کلکٹر سے کسی ڈپٹی سے کسی بڑے آدمی سے ملنا چاہو تو کتنی دیر لگتی ہے، اس کے یہاں درخواست بھیجو، ملازمین سے بات کرو، ٹیلی فون پر بات کرو، وقت بتاؤ اپنا مقصد بتاؤ، کیوں آئے ہو یہ بتانا پڑے گا، پھر بھی الجھن ہے اجازت ملے یا نہ ملے۔ اللہ میاں کے یہاں کچھ نہیں، کوئی درخواست نہیں دیتا، کسی کی سفارش نہیں، آؤ وہ اعزاز واکرام سے بلاتے ہیں، اجازت ہے، آؤ آؤ، اس لئے اللہ تعالیٰ کے احسان تو بہت ہیں بے شمار ہیں، قرآن پاک اللہ نے نازل فرمایا، کتنا بڑا احسان ہے، ایک ایک حرف پر دس دس

نیکیوں کا ثواب ملتا ہے، ایک ایک سورۃ عالی، ایسا کہ ثواب بہت بڑا، قل ھو اللہ شریف ایک مرتبہ پڑھنے پر ایک تہائی قرآن شریف کا ثواب ملتا ہے، یٰسین شریف ایک مرتبہ پڑھنے پر دس مرتبہ قرآن شریف پڑھنے کا ثواب ملتا ہے، ایسی ایسی نعمتیں اس نے دے رکھی ہیں، نماز کی دولت عطا ہوئی حضور ﷺ کی بدولت عطا ہوئی، پانچ وقت حاضری کی توفیق ملی، اور اللہ تعالیٰ قدردانی سے بلاتے ہیں، حدیث شریف میں آتا ہے کہ جب آدمی گھر سے وضو کر کے مسجد کے لئے نکلتا ہے تو ایک ایک قدم پر ایک ایک نیکی ملتی ہے، ایک ایک گناہ معاف ہوتا ہے، ایک قدم پر ایک درجہ بلند ہوتا ہے، کتنا بڑا احسان ہے کتنا بڑا اکرام ہے، کتنا بڑا اعزاز ہے، وہیں سے اعزاز شروع ہوتا ہے، اپنے گھر آنے والے کے لئے، یہ احسانات ہیں اللہ تعالیٰ کے، ان پر شکر ادا کرنا چاہئے ۔ جیسی بڑی نعمت ہوتی ہے ویسا اس کا بڑا شکر ہوتا ہے، حق تعالیٰ نے نبی کریم ﷺ کو ہماری ہدایت کے لئے بھیجا، بہت بڑا انعام ہے، قرآن پاک حضور ﷺ کی بدولت ملا، روزہ حضور ﷺ کی بدولت ملا، زکوٰۃ کا حکم حضور ﷺ کی بدولت ملا، حج حضور ﷺ کی بدولت ملا، کتنے بڑے احسانات ہے، پانچ وقت سارے محلے والے جمع ہوتے ہیں، ایک دوسرے کو سلام کرتے ہیں، اس کی خیریت پوچھتے ہیں، اگر کوئی شخص نہیں آیا تو تحقیق کرتے ہیں کہ کیا بات ہے، خیریت پوچھتے ہیں طبیعت تو اچھی ہے، کہیں باہر تو نہیں گیا، کوئی عارضہ تو پیش نہیں آیا، ایک ہمدردی یہی ہے، جو نماز کے ذریعہ لوگوں کے دلوں میں پیدا ہوتی ہے، ہفتے میں ایک روز جمعہ کے دن ساری بستی کے لوگ جمع ہوتے ہیں، تو ایک دوسرے کو دیکھ کر خوش ہوتے ہیں، ایک دوسرے کو دیکھ کر اپنا محسن سمجھتے ہیں، اپنا ہمدرد اور خیر خواہ سمجھتے ہیں، کتنی بڑی ہمت اور قوت دلوں کے اندر پیدا ہوتی ہے نماز کی بدولت ۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿لقد مَنَّ اللهُ علىَ المُؤمِنينَ﴾

جو لوگ عربی سے واقفیت رکھتے ہیں، وہ جانتے ہیں کہ "ل" تاکید کے لئے آتا ہے، "قد"، تحقیق کے لئے آتا ہے، بالتحقیق بالیقین اللہ تعالیٰ نے بہت بڑا احسان فرمایا، احسان تو سب کے لئے ہے جناب رسولِ اکرم ﷺ کی ذاتِ عالیہ، ذاتِ مبارکہ اور ذاتِ مقدسہ سب

سان ہے، آسمانوں کے لئے بھی، زمینوں کے لئے بھی، فرشتوں کے لئے بھی، جنات کے لئے بھی، حیوانات کے لئے بھی بشر کے لئے بھی، سب کے لئے رحمت ونعمت ہے، جنابِ رسولِ اکرم ﷺ کی ذاتِ مقدسہ۔ لیکن فائدہ اٹھانے کے لئے مؤمن ہونا شرط ہے، جولوگ جنابِ رسولِ اکرم ﷺ پر ایمان لاتے ہیں، وہ فائدہ اٹھاتے ہیں، یہ احسان خاص طور پر مؤمنوں کے لئے ہے، ایمان لانے والوں کے لئے ہے۔ جیسا بڑا احسان ہوتا ہے، ویسا ہی بڑا اس کا حق بھی ہوتا ہے۔

جنابِ رسولِ اکرم ﷺ کے حقوق بے شمار ہیں ان کو اگر سمویا جائے تو تین قسم میں سمویا جاسکتا ہے:۔

(ا) پہلا حق ہے محبت کا، جنابِ رسولِ اکرم ﷺ کی ذاتِ مقدسہ سے محبت ہونی چاہئے، خود حدیث پاک میں آتا ہے: ﴿لا یُؤمِنُ أحدُ کُم حتیٰ اَکُونَ اَحَبَّ اِلَیہِ مِن والِدہٖ و وَلَدِہٖ والنَّاسِ اَجمَعِین﴾

''تم میں سے کوئی شخص مؤمن کہلانے کا حق نہیں رکھتا، مومن کہلانے کا مستحق ہی نہیں ہے جب تک کہ میری محبت اس کے دل میں اس کے ماں باپ سے اس کی اولاد سے، سب انسانوں سے زیادہ نہ ہوجائے۔''

لہٰذا پہلا حق محبت کا ہے، جنابِ رسولِ اکرم ﷺ کی ذاتِ مقدسہ سے محبت ہونی چاہئے، ہر مسلمان کے قلب میں محبت ہونی چاہئے، محبت جو ہوتی ہے آدمی کو اپنے گھر سے بھی محبت ہوتی ہے، اپنی دکان سے، اپنے عہدے سے، اپنی اولاد سے، اپنے مال سے، لیکن جنابِ رسولِ اکرم ﷺ کی جو محبت ہے، وہ سب محبتوں سے بالاتر اور اعلیٰ ہونی چاہئے، اس کا اندازہ ہوتا ہے مقابلے کے وقت، ایک کی محبت کا تقاضا کچھ اور، جنابِ رسولِ اکرم ﷺ کی محبت کا تقاضا اور، تو آدمی کس کی محبت کو اختیار کرتا ہے، جنابِ رسولِ اکرم ﷺ کی محبت کو یا کسی اور کی محبت کو، اس کو دیکھنے کی ضرورت ہے، اس کے لئے تلاش کرنے کی ضرورت ہے، صحابہ کرامؓ کا حال۔ صحابہ کرامؓ نے جنابِ رسولِ اکرم ﷺ سے کس طرح محبت کی ہے، اور کیسے

کیسے مقابلے کے وقت کیا کیا نوبت آئی؟......

اسلام کا سب سے پہلا جہاد غزوہ بدر کہلاتا ہے، قصہ طویل ہے، اس میں تھوڑا سا ٹکڑا یہاں نقل کرتا ہوں، قرآن پاک میں بھی غزوہ بدر کا تذکرہ آیا ہے، احادیث میں تشریح سے آیا ہے، جب غزوہ بدر ہوا ادھر سے چلے جنابِ رسولِ اکرم ﷺ، کثرت سے مسلمان پیادہ تھے، ایک ایک اونٹ پر تین تین آدمی باری باری سوار ہوتے تھے، ایک دو گھوڑے تھے، ایک دو تلواریں تھیں، باقی کسی کے پاس تلوار نہیں، گھوڑا بھی نہیں تھا، وہاں پہنچ کر پہلا کام کیا جنابِ رسولِ اکرم ﷺ نے کہ اللہ کے سامنے نماز پڑھ کر دعا کی، کہ یا اللہ اتنے برسوں کے بعد یہ مسلمان تیار ہوئے ہیں، ایمان لائے ہیں، ۳۱۳ تھے مسلمان، کل صحابہ کرامؓ ۳۱۳ آدمی ایمان لائے ہیں مدتوں کی محنت کے بعد، بڑی مشقتوں سے بڑی مصیبتوں سے، اگر آج یہ قتل ہوئے تو کل تیرا نام لینے والا کوئی نہیں رہے گا، اس پر حضرت ابو بکر صدیقؓ نے عرض کیا بس بس حضور ﷺ دعا قبول ہوگئی، ایک چھپر ڈال دیا تھا کہ جنابِ رسولِ اکرم ﷺ اس چھپر میں رہیں، اگر کسی کو کوئی ضرورت پیش آئے، کوئی بات کہنی ہو اس چھپر تک آجائے، پہچاننے کے لئے چھپر ڈال دیا گیا، تلاش نہ کرنا پڑے، ادھر ادھر کہاں ہیں جنابِ رسولِ اکرم ﷺ، بلکہ چھپر کو دیکھ کر یہاں آجائے، اور پہرے کے لئے حفاظت کے طور پر، حضرت ابو بکر صدیقؓ تجویز تھے، کہ حضور کے پاس رہیں گے، اگر پچاس قدم کے فاصلے پر بھی کوئی شخص جنابِ رسولِ اکرم ﷺ کی طرف نظر اٹھا کر دیکھتا تو حضرت ابو بکرؓ تلوار لئے ہوئے شیر کی طرح اس پر جھپٹتے تھے، جنابِ رسولِ اکرم ﷺ کی حفاظت کے لئے۔ قدرت کی بات اس جہاد میں حضرت ابو بکرؓ تو ادھر تھے، اور ان کے بیٹے حضرت عبدالرحمٰن بن ابی بکر مشرکین کے ساتھ کافروں کے ساتھ تھے، وہ اس وقت ایمان نہیں لائے تھے، اللہ نے مسلمانوں کو فتح دی، ستّر مشرکین قتل ہوئے اور ستّر گرفتار ہو کر قیدی بنا لئے گئے، اللہ نے وہ دن دکھایا کہ حضرت عبداللہ بن ابی بکرؓ بھی ایمان لائے، ایک دن اپنے والد سے کہنے لگے کہ بدر کی لڑائی میں آپ ایک موقع پر آئے تھے، نشانے پر آئے تھے، میں چاہتا تو آپ کو قتل کر دیتا، لیکن باپ ہونے کا

خیال کیا کہ آپ میرے باپ بھی ہیں، حضرت ابو بکرؓ نے کیا جواب دیا، جانتے ہو؟...... انہوں نے جواب دیا کہ تم نے باپ ہونے کا خیال کیا، لیکن اگر تو میرے نشانے پر آجاتا تو میں تجھے زندہ نہ چھوڑتا، میں خیال نہ کرتا کہ تو میرا بیٹا ہے، میں تجھے فوراً قتل کر دیتا، تیری مجال حضور ﷺ کے مقابلے میں تلوار لے آئے، یہاں سے اندازہ لگانے کی ضرورت ہے کہ حضرت ابو بکرؓ کے دل میں حضور ﷺ کی محبت اپنے بیٹے سے زیادہ تھی، ایسے مقابلے کے وقت پتہ چلتا ہے کہ کس کی بات صحیح ہے کسی کی نہیں۔

حضرت ابوسفیانؓ کی بیٹی حضرت ام حبیبہؓ حضور ﷺ کی زوجہ مطہرہ ان کے پاس ان کے باپ ابوسفیانؓ آئے، ابوسفیان اس وقت تک مسلمان نہیں ہوئے تھے، انہوں نے دیکھا کہ جب باپ آئے ہوئے ہیں تو جو بستر بچھا ہوا تھا جلدی سے لپیٹ کر الگ رکھ دیا، باپ نے پوچھا یہ کیا، دنیا کا دستور یہ ہے کہ جب باپ جاتا ہے بیٹی کے پاس تو بیٹی اس کے لئے بستر بچھا دیتی ہے، تو نے بچھا بچھایا بستر اٹھا کے رکھ دیا، انہوں نے بتایا، یہ بستر نبی کریم ﷺ کا ہے، تم نجس ہو، کافر ہو، مشرک ہو، ایمان نہیں لائے ہو، اس قابل نہیں کہ حضور ﷺ کے بستر پر بیٹھ سکو، معلوم ہوا کہ حضور ﷺ کی محبت زیادہ تھی باپ کی محبت سے۔

صحابہ کرام کے بہت سے واقعات ہیں، ساری زندگی بھری ہے، اسی طریقے پر کہ ان حضرات کے یہاں محبت حضور ﷺ کی زیادہ تھی، اور اسی سے پتہ چلتا ہے کہ حضور ﷺ کا ایک حق ہے محبت کرنا، لیکن اتنا یاد رہے کہ خالی محبت بغیر عقیدت کے بغیر اطاعت کے خالی محبت کا دم بھرنا نجات کے لئے کافی نہیں۔

دوسرا حق ہے عقیدت کا، عقیدت کے کیا معنیٰ؟...... یہ یقین کرلیں اور یہ فیصلہ کرلیں کہ حضرت نبی اکرم ﷺ جو دین لے کر آئے جو کتاب لے کر آئے، جو احکام لے کر آئے وہ سب حق ہیں، وہ سب سچے ہیں، ایسے سچے کہ ان کو اختیار کئے بغیر نجات نہیں، نجات حضور ﷺ کے ارشاد کی تعمیل میں ہے، یہ یقین رکھنا، یہ عقیدت رکھنا یہ دوسرا حق ہے حضور ﷺ کا، چنانچہ چالیس سال کی زندگی حضور اکرم ﷺ کی ایسی تھی مکہ مکرمہ کی کہ سب لوگ

آپ سے محبت کرتے تھے، مرد بھی اور عورت بھی، آپ کو امین کہتے تھے سچے بہت سچے امانت دار، لوگ آپ ﷺ کے پاس اپنی امانتیں رکھتے تھے، آپ ﷺ کو سچا مانتے تھے سبھی محبت کرتے تھے، لیکن ہوا کیا؟...... جب اللہ تبارک وتعالیٰ نے آیت نازل فرمائی: ﴿وَاَنْذِرْ عَشِيْرَتَكَ الْاَقْرَبِيْنَ﴾ ''کہ آپ ﷺ اپنے خاندان کے لوگوں کو اللہ کے عذاب سے ڈرائیے، اللہ کے احکام کی دعوت دیجئے۔''

یعنی نبوت کا آپ نے اظہار فرمایا، آپ ﷺ کے ساتھ یہ عقیدت رکھنا کہ آپ کی ہر بات میں نجات ہے، آپ بالکل سچے ہیں، آپ ﷺ نے کوہِ صفا پر کھڑے ہو کر آواز دی سب کے سب گھبرا گئے، یہ کیسی آواز ہے، اس سے پہلے تو کسی نے اس طرح تو پکارا نہیں تھا اور آواز سارے مکہ میں پھیل گئی، ایک تو وہاں آبادی اور بڑے بڑے محلات اور مکانات تو اس زمانے میں تھے نہیں، اس لئے جو آواز اللہ کے حکم سے دی گئی تھی، اس کو کون روک سکتا تھا، کون رکاوٹ بن سکتا تھا؟...... کوئی رکاوٹ نہیں تھی، چنانچہ سب لوگ دوڑ کر آئے، یہ کیا قصہ پیش آیا ہے، کیوں ایسے پکارا جا رہا ہے، اور جو خود نہیں آ سکا کسی مشغولی کی وجہ سے دوسرے آدمی کو بھیجا کہ دیکھو کیا معاملہ ہے، تحقیق کرو، جب وہ سارے جمع ہو گئے تو حضور ﷺ نے پہلے تو امتحان لیا، فرمایا اگر میں یہ کہوں تم کو کہ پہاڑ کے پاس دشمن کا لشکر ٹھہرا ہوا ہے جو صبح ہوتے ہی تم پر حملہ کر دے گا، تم رات سے ہی اپنے بچاؤ کا انتظام کر لو، کیا تم مجھے سچا مانو گے؟...... یہ پوچھا، سب نے کہا: ''ماجربنا علیک الکذب'' آپ (ﷺ) کے متعلق غلط بیانی کا کبھی کوئی تجربہ نہ ہوا، آپ نے آج تک جو بات فرمائی، سچ فرمائی، ہم ضرور مانیں گے، تسلیم کریں گے، اس کا مطلب یہ ہے کہ ہم اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں، کوئی دشمن کا لشکر تو موجود نہیں، لیکن جب آپ (ﷺ) فرماتے ہیں تو ہم اپنی آنکھوں کو جھٹلا دیں گے، اور آپ (ﷺ) کی باتوں کو مانیں گے، تب آپ ﷺ نے فرمایا: میں خدا کا بھیجا ہوا رسول ہوں، آپ لوگوں کی طرف آیا ہوں، خدا کے عذاب سے ڈرو، مرنے کے بعد دوبارہ پھر زندہ ہونا ہے، اور ذرّے ذرّے کا حساب ہوگا وہاں پر، اس مجمع میں اس مجلس میں جو شخص سب سے زیادہ

دعویٰ محبت کرنے کا دم بھرنے والا تھا، جو حضور ﷺ کا چچا تھا اس کا نام تھا ابولہب، اس نے سب سے پہلے حضور ﷺ کی مخالفت کی، محبت تو وہ کرتا تھا لیکن اس عقیدت کے لئے تیار نہیں ہوا، کہ آپ کو رسول جانے، جو بات آپ ﷺ اللہ کی طرف سے پہنچائے ہیں اس کو تسلیم کریں، وہاں سے الگ ہوا، اس نے سخت لفظ کہے حضور ﷺ کی شان میں، حق تعالیٰ نے اس کے جواب میں سورۂ تبت یدا نازل کی، اس کو جہنمی دوزخی فرمایا، ابولہب کو اس ساری محبت کے باوجود محبت کیسی تھی کہ حضور ﷺ کے والد تھے عبداللہ، ان کے گھر میں جب حضور ﷺ کی ولادت ہوئی، حضور ﷺ پیدا ہوئے، ابولہب کی ایک باندی تھی ثوبیہ اس نے آکر ابولہب کو خوشی خوشی اطلاع کی کہ تمہارے گھر بھتیجہ پیدا ہوا ہے، ابولہب نے خوشی میں آکر اسی وقت اس کو آزاد کر دیا تھا، بعد میں کتنی محبت تھی، کیسی خوشی کی بات سنا دی، خدا جانے کتنی دفعہ کندھے پہ اٹھایا ہوگا، گود میں بٹھایا ہوگا بھتیجے کو محبت کی وجہ سے، یہ ساری محبت بیکار گئی، اس واسطے کہ عقیدت نہیں تھی، عقیدت کیا تھی؟...... حضور ﷺ کو سچا مانیں۔

محبت تو یہ ہے لیکن بنیادی چیز حضور ﷺ کو سچا رسول ماننا اور یہ فیصلہ کر لینا جو کچھ حضور ﷺ فرمائیں گے ہم اس کے ماتحت رہیں گے، یہ عقیدت ہے سچا تو سبھی مانتے تھے۔

حضرت سعدؓ مدینہ طیبہ میں انصار کے سردار تھے اپنے قبیلے کے، ان کا معمول تھا جب مکہ آتے تو امیہ بن خلف کے یہاں ٹھہرتے اور اس کے ساتھ تعلقات تھے، امیہ بن خلف جب مدینہ طیبہ آتا حضرت سعدؓ کے یہاں ٹھہرتا، جب یہاں سے ہجرت کا قصہ پیش آیا صحابہ کرامؓ مدینہ طیبہ میں ٹھہرے، ایک مرتبہ حضرت سعد آئے اور آکر اپنے معمول اور طرز کے مطابق امیہ بن خلف کے پاس ٹھہرے، امیہ سے کہا میرا جی چاہتا ہے طواف کرنے کو، کونسا وقت مناسب ہے، اس نے کہا دن چڑھے مناسب ہے، دن چڑھے گئے طواف کرنے کو وہاں ابوجہل بھی تھا، ابوجہل نے کہا امیہ سے، یہ تیرے ساتھ کون ہے، اس نے کہا یہ سعد ہے، ابوجہل نے کہا جو لوگ ہمارے باغی تھے مخالف تھے ان کو تم نے اپنے یہاں پناہ دی، اپنے یہاں ٹھہرایا اور مزے سے طواف کرتے ہو، یعنی حضور ﷺ اور صحابہؓ کو تم لوگوں نے

ٹھکانا دیا، اپنے یہاں ٹھہرایا یہ ہمارے دشمن ہیں، ہم نے ان کو نکالا ہے، اور آج تم ہمارے علاقے میں طواف کرتے ہو خوشی خوشی، اس پر حضرت سعدؓ نے کہا: دیکھ اگر تو نے مجھے طواف کرنے سے روکا تو میں تیرا شام کا راستہ روکوں گا۔

دستور یہ تھا کہ قریش مکہ کے رہنے والے ملک شام جایا کرتے تھے، ایک سفر تو وہ کرتے تھے یمن کا اور ایک سفر کرتے تھے شام کا، قرآن پاک میں بھی اس کا ذکر ہے: ﴿لِايلٰفِ قُرَيشٍ اِلٰفِهِم رِحلَةَ الشِّتَآءِ وَالصَّيفِ﴾ ''چونکہ قریش خوگر ہوئے ہیں (یعنی) جاڑے اور گرمی کے سفر کے خوگر ہو گئے ہیں۔''

ایک جگہ جاتے تھے سردی کے زمانے میں اور ایک جگہ جاتے تھے گرمی کے زمانے میں اور سارے سال کی ضروریات وہاں سے خرید لاتے تھے مکے والوں کے لئے اور جتنے ڈاکو تھے وہ قریش کے قافلے کو کچھ نہیں کہتے تھے، شام جانے کا راستہ مدینہ طیبہ کے قریب تھا، حضرت سعد نے کہا، اگر تو نے مجھے طواف کرنے سے روکا تو میں تمہارا ملک شام جانے کا جو راستہ ہے مدینہ طیبہ میں تمہارا وہ راستہ روکوں گا۔ شام نہیں جا سکے گا، امیہ نے کہا سعدؓ سے زور سے نہ بول ابوجہل کے سامنے یہ قوم کا بڑا آدمی ہے، یہاں کا سردار ہے، انہوں نے اسے بھی ڈانٹا میں نے سنا ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا کہ تجھے قتل کریں گے، اب امیہ نے کہا مجھے؟...... سعدؓ نے کہا ہاں، کہاں مکے میں کہ کہیں اور؟...... کہا یہ نہیں بتایا کہاں، بس حضور ﷺ کی فرمائی ہوئی بات اس کے دل میں ایسی بیٹھ گئی کہ بالکل غمگین ہو گیا۔ پھر جا کر اپنی بیوی سے گھر میں کہا کہ سعد نے ایسا کہا، چنانچہ میں مکہ سے نکلوں گا ہی نہیں، مکے میں ہی بیٹھوں گا، اس واسطے کہ مکہ پر ان لوگوں کا اتنا تسلط تھا قبضہ تھا کہ سمجھتے تھے کہ حضور ﷺ یہاں آ ہی نہیں سکتے، قتل کی نوبت آئے گی تو باہر ہی آئے گی، میں باہر جاؤں گا ہی نہیں، یہ بیوی سے بھی کہہ دیا پھر جب بدر کا قصہ پیش آیا، ابوجہل لوگوں سے کہتا ہے، چلو بدر، چلو بدر، تو امیہ سے بھی کہا، امیہ نے کہا میں نہیں جاؤں گا، سعدؓ نے کہا حضور ﷺ تمہیں قتل کریں گے، ابوجہل نے پٹی پڑھائی، اگر تو نے انکار کیا تو اور لوگ بھی بیٹھ جائیں گے، چل تھوڑی دور پھر چپکے

سے واپس آجانا، اس نے کہا اچھی بات ہے، بیوی سے کہا ذرا سامان تیار کرنا میں جا رہا ہوں، اس نے کہا یاد نہیں رہا تمہارے دوست سعدؓ نے کیا کہا تھا، کہا مجھے یاد ہے، لیکن میں زیادہ دور نہیں جاؤں گا، جلدی واپس آؤں گا۔ گیا، چلتا رہا چلتا رہا یہاں تک کہ بدر پہنچا اور اللہ نے وہاں قتل کرایا اس کے جی کے اندر غیر اختیاری طور پر ایسی بات بیٹھ گئی کہ حضور ﷺ نے جو بات فرمائی وہ ہو کے رہے گی، لیکن ایمان اس کا نام نہیں، ایمان اس کا نام ہے اپنے اختیار سے اپنے آپ کو پیش کر دینا اور طے کر دینا کہ میری زندگی حضور ﷺ کے حکم کے ماتحت گزرے گی، اس فیصلے کا نام ایمان ہے جو اپنے اختیار سے ہوتا ہے۔

دوسرا حق کیا ہے؟...... عقیدت کا۔ عقیدت کا حاصل یہ ہے کہ آپ ﷺ کو سچا رسول ماننے اور یقین کے ساتھ جانے کہ نجات اسی میں ہے، حضور ﷺ کی اتباع میں نجات ہے، اور یہ طے کر کے فیصلہ کرے کہ میری زندگی حضور ﷺ کے حکم کے ماتحت گزرے گی، جو کچھ ارشاد فرمائیں گے وہ کروں گا۔ یہ عقیدت ہونا ضروری ہے یہ تو دوسرا حق ہوا۔

اور تیسرا حق ہے اطاعت کا، محبت بھی ہو عقیدت بھی ہو اور اطاعت نہ ہو، اس کی مذمت آئی ہے، حضور ﷺ نے اپنی سب سے زیادہ چہیتی اور لاڈلی بیٹی حضرت فاطمہؓ کو فرمایا اس گھمنڈ میں نہ رہنا کہ میں پیغمبر کی بیٹی ہوں بخشی جاؤں گی، وہاں اپنا عمل کام آئے گا۔ دنیا میں پیسے روپے کی ضرورت ہو تو مجھ سے لے لے لیکن عمل کرو، اپنا عمل کام آئے گا، ظاہر ہے کہ حضرت فاطمہؓ کو حضور ﷺ سے محبت تھی، ایسی محبت تھی جس کو بیان نہیں کر سکتے اتنی محبت تھی، ایک مرتبہ حضرت فاطمہؓ حاضر ہوئیں خدمت اقدس میں، حضور ﷺ نے فرمایا کیسے آنا ہوا، فاطمہؓ نے عرض کیا کہ حضرت (ﷺ) آج میں نے روٹی پکائی تھی، میرا جی نہ مانا کہ آپ (ﷺ) کے بغیر خود کھاؤں، اس لئے آپ (ﷺ) کے واسطے لے آئی، جب حضور ﷺ حضرت فاطمہؓ کو دیکھتے تھے، تو ان کو گلے لگا لیتے، لپٹا لیتے، سینے سے لگا لیتے، پیار کرتے ان کو، بڑی محبت فرماتے، فرمایا اہل جنت بیویوں کی فاطمہؓ سردار ہے، فاطمہ سیدہ ہے، جنت میں جنتی عورتیں جائیں گی، سب کی سردار حضرت فاطمہؓ ہیں، تو حضرت فاطمہؓ کو حضور ﷺ سے محبت

بھی زیادہ تھی، عقیدت بھی، جانتی تھیں کہ سچے رسول ہیں، ایمان لائیں سبھی کچھ تھا، ان کو بھی فرمایا کہ بغیر اطاعت سے کام نہیں چلے گا۔

حضور ﷺ کی پھوپھی کو حضور ﷺ نے فرمایا کہ تم دیکھو اس خیال میں نہ رہنا کہ پیغمبر (ﷺ) کی پھوپھی ہوں، بخشی جاؤں گی، اپنے اعمال کام آئیں گے، اس رشتہ داری کی بنا پر کوئی نہیں بخشا جائے گا۔ اگر رشتہ داری کی بنا پر کوئی بخشا جاتا تو حضرت نوحؑ کے بیٹے بخشے جاتے، حضرت ابراہیمؑ کے والد کی بخشش ہوتی کہ وہ پیغمبر کے باپ تھے، اگر بخشش ہوتی تو حضرت لوطؑ کی بیوی کی بخشش ہوتی کہ وہ پیغمبر کی بیوی تھیں لیکن نہیں ایسا نہیں۔ ﴿لَیْسَ لِلاِنسانِ اِلَّا مَاسَعیٰ﴾ (النجم) ''انسان کو (ایمان کے بارے میں) صرف اپنی ہی کمائی ملے گی۔'' (بیان القرآن)

جو آدمی خود ایمان لایا اس کا ایمان اس کے لئے ذریعہ نجات ہے، اور اگر اسکے خاندان کے دوسرے لوگ ایمان لائیں وہ ذریعہ نجات نہیں، کوئی شخص یوں سوچے کہ میں بڑے گھرانے کا آدمی ہوں، بخشا جاؤں گا، اس کو سوچنا چاہیئے کہ جب حضور ﷺ نے اپنی بیٹی کو فرمایا، تو پھر اوروں کے لئے کیا گنجائش ہے؟...... سوچنا چاہیئے کہ کوئی شخص کہے کہ میں بادشاہ کا لڑکا ہوں، ہاں بادشاہ کا بیٹا ہے لیکن خود اپنا عمل بھی ہونا چاہیئے، اگر اپنے پاس کچھ نہیں تو بادشاہ کون سی گدی پر بٹھادے گا اس لئے اطاعت کی ضرورت ہے۔

حدیث میں میں آتا ہے کہ حضور ﷺ تشریف لائے منبر پر، آپ ﷺ نے فرمایا: ﴿یا اَیُّھَا النَّاسُ اِجلِسُوا﴾ ''اے لوگو! بیٹھ جاؤ۔'' جو جہاں تھے وہیں بیٹھ گئے، یہ نہیں سوچا کہ میں پہلی صف میں بیٹھوں، دوسری صف میں بیٹھوں، جس کے کانوں میں یہ آواز آئی وہ وہاں پر ہی بیٹھ گیا، یہ تھی اطاعت، حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ اس وقت مسجد سے باہر تھے مسجد کے اندر نہیں آسکے ان تک یہ آواز پہنچ گئی، باہر ہی بیٹھ گئے، جب حضور ﷺ نے ان کو دیکھا تو فرمایا ابن مسعود اندر آجاؤ، تو وہ آگئے، انہوں نے یہ نہیں سوچا کہ حضور ﷺ نے فرمایا بیٹھ جاؤ، مسجد کے اندر بیٹھنے کو کہا، یا میں مسجد کے اندر جا کے بیٹھوں گا، یہ نہیں سوچا۔ سوچتے کیسے ان

حضرات کو ہر وقت موت کا تصور غالب رہتا تھا، اگر یہ سوچتے کہ اندر چل کر بیٹھوں گا، کیا خبر تھی کہ اندر پہنچنے سے پہلے پہلے موت آجائے، گردن پکڑ لے، کل قیامت میں سوال ہوگا ہمارے رسول ﷺ کی آواز تمہارے کانوں میں پڑی بیٹھ جاؤ، تم بیٹھے کیوں نہیں؟...... کیا انہوں نے کہا تھا کہ اندر آکے بیٹھ جاؤ، اسلئے فوراً حکم کی تعمیل کرنا ان حضرات کا کام تھا، اور موت کا تصور ان حضرات کو ایسا تھا۔

ایک مرتبہ حضور ﷺ کا گذر ہوا، حضرت عبداللہ بن عمرؓ اپنی دیوار کو لیپ رہے تھے، ان کی والدہ بھی لیپ رہی تھیں، حضور ﷺ نے پوچھا کیا کر رہے ہو، عرض کیا حضرت دیوار لیپ رہے ہیں پرانی ہوگئی ہے، گر جانے کا اندیشہ ہے، اس لئے لیپ رہے ہیں تاکہ کچھ روز کھڑی رہے دیوار، فرمایا کہ موت اس سے قریب ہے، دیوار کے متعلق تو تم اندازہ لگا رہے ہو اتنی دیر تک کھڑی رہے گی، لیکن موت اس سے قریب ہے، موت نہیں دیکھتی، جلدی سے جلدی بھی آجاتی ہے۔ آپ ﷺ کا فرمان سنا اور فوراً بنی بنائی دیوار گرادی۔ اسی طرح ایک اور واقعہ ہے کہ:

ایک مرتبہ اونٹ پر سوار تھی صحابہ کرام کی جماعت، حضور ﷺ بھی موجود، تشریف لے جارہے ہیں، سرخ چادریں یمنی اونٹوں پر پڑی ہوئی ہیں اور ایک عجیب منظر تھا خوشنما، حضور ﷺ نے کہا کہ میں دیکھ رہا ہوں کہ تم لوگوں کی طبیعتیں سرخی کی طرف مائل ہوتی جارہی ہیں، بس فوراً سے کود ے، اونٹوں سے چادروں کو پھاڑ پھاڑ کر ختم کیا، جو چیز آقائے نامدار ﷺ کو ناپسند ہو اس کو رکھنے کے لئے تیار نہیں، یہ تھا اطاعت کا مادہ۔

حضرت عمر فاروقؓ ایک جبہ پہن کر خدمت اقدس میں حاضر ہوئے، ریشمی جبہ تھا، حضرت نے فرمایا ریشم تو مرد کے لئے ناجائز ہے، اٹھے جبے کو اتارا، سامنے تندور تھا روٹی پکانے کا، جاکے تندور میں ڈالا جبے کو آگ میں، دوسرے وقت حاضر ہوئے، حضور ﷺ نے فرمایا اس جبے کا کیا ہوا؟...... عرض کیا حضرت (ﷺ) میں نے اس کو جلا دیا، حضور ﷺ نے فرمایا کیوں تمہارے لئے ہی تو ناجائز تھا، بچیوں کے لئے کپڑے بنوا دیتے، ان کے لئے

درست تھا، لیکن بھائی جس شخص کے دل میں حضور ﷺ کی محبت جمی ہوئی ہے ہر چیز کی محبت پر غالب ہے، جب وہ دیکھتا ہے کہ حضور ﷺ کو یہ لباس ناپسند ہے، وہ تو یہ سوچتا ہی نہیں کہ کسی اور کام آسکتا ہے کہ نہیں، وہ تو یہ سمجھے گا کہ وہ چیز آگ میں جلانے کے قابل ہے جو حضور ﷺ کو ناپسند ہے۔ حضور ﷺ کی اطاعت کا داعیہ یہاں تک تھا کہ حضرت علیؓ اونٹ پر سوار ہوئے سفر میں جانے کے لئے، آپؓ نے چند کلمات پڑھے "**سبحان الله الحمدلله لااله الا الله اکبر**" اونٹ کو چچی ماری اور ہنسے، کسی نے پوچھا یہ کیوں کیا؟...... فرمایا کہ حضور ﷺ کو میں نے دیکھا اسی طرح اونٹ پر سوار تھے، اسی طرح یہ کلمات پڑھے، اسی طرح اونٹ کو چچی ماری اور ہنسے، اتنی اتنی باتوں پر حضور ﷺ کا اتباع کرتے تھے۔

حضرت عبداللہ بن عمرؓ مدینہ طیبہ اور مکہ مکرمہ کے راستے میں سفر کرتے ہوئے ایک جگہ اونٹ سے اترے اور ایک درخت کے نیچے ذرا دیر لیٹے، آرام کیا اور اس کے بعد سوار ہوئے چل دیئے کسی نے پوچھا کہ ایسا کیوں کیا؟...... فرمایا میں نے دیکھا ہے کہ حضور ﷺ نے اسی جگہ اتنی دیر آرام فرمایا ہے، ایک جگہ اترے اپنے اونٹ سے، اونٹ کو بٹھایا، خود بھی بیٹھ گئے جیسے آدمی پیشاب کرنے کے لئے بیٹھتا ہے، پیشاب تو نہیں کیا بس بیٹھ گئے پیشاب کرنے کی ہیئت بنائی، کسی نے پوچھا یہ کیا بات ہے؟...... کہا کہ اس جگہ پر حضور ﷺ نے پیشاب کیا تھا، یعنی جو چیزیں حضور ﷺ نے عبادت کے طور پر نہیں کی تھی، اپنی ضرورت کے لئے نہیں کیں، ان میں بھی یہ لوگ اتباع کرتے تھے۔ حضرت حذیفہؓ سے کسی نے پوچھا کہ حضور ﷺ دن رات میں کیا کرتے تھے؟...... تو انہوں نے کہا کہ صبح اٹھو اور آجاؤ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کے پاس، اور دیکھتے رہو جس طرح یہ وضو کرتے ہیں سمجھ لو اسی طرح حضور اقدس ﷺ وضو فرماتے تھے، جس طرح یہ نماز پڑھتے ہیں، نماز میں قیام، رکوع، سجدہ اور قعدہ کرتے ہیں، سمجھ لو حضور اقدس اسی طرح سے کرتے تھے، جس طرح چلتے ہیں سمجھ لو کہ حضور ﷺ اسی طرح چلتے تھے، جس طرح کسی کے سلام کا جواب دے کر مصافحہ کرتے ہیں، جس طرح یہ بیٹھتے ہیں، کسی کے سوال کا جواب دیتے ہیں اسی طرح غرضیکہ ہر چیز میں انہوں نے

اپنے آپ کو حضور ﷺ کے رنگ میں رنگ لیا تھا، ڈھال لیا تھا۔

یہ ہے حضور ﷺ کا حق، اللہ تعالیٰ نے حضور ﷺ کو نمونہ بنا کر بھیجا ہے اس دنیا میں، اور کہا کہ ہم کو ایسی زندگی چاہئیے جیسے ہمارے رسول ﷺ کی، آج ہم اپنے گھروں میں بیٹھ کر، مجلس میں بیٹھ کر چاہے محبت کے دعوے کریں کہ ہم کو حضور اقدس ﷺ کے ساتھ بہت محبت ہے، لیکن دیکھنا چاہئیے کہ اس محبت کا اثر ہمارے دلوں پر کتنا ہے؟...... تو ہم اپنے گھر میں اپنی مجلس میں بیٹھ کر حضور اقدس ﷺ کے ساتھ بہت محبت ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں لیکن کیا ہماری صورت حضور اکرم ﷺ کی صورت کے مطابق ہے، حدیث شریف میں ہے کہ ایک شخص آیا جس کی داڑھی منڈی ہوئی تھی، حضور ﷺ نے اپنا چہرہ مبارک پھیر لیا، وہ ادھر آیا حضور ﷺ نے ادھر منہ پھیر لیا، معلوم کیا کہ کیا بات ہے کہ تمہاری داڑھی منڈی ہوئی ہے، تو حضور ﷺ نے جس شخص کا چہرہ دیکھنا پسند نہیں فرمایا اور ناخوش ہو کر چہرہ مبارک پھیر لیا، آج ہمارا جو حال ہے ہمارے دل میں کبھی خیال بھی آتا ہے اس کا کہ حضور ﷺ کو ناپسند تھا داڑھی منڈانا، حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا: ﴿اِعفُوا اللُّحیٰ (اور) اَرخُوا اللُّحیٰ﴾ ''داڑھی بڑھاؤ، داڑھی لٹکاؤ۔''

حضور اکرم ﷺ کا تو یہ حکم ہے اور ہم کٹا کٹا کے منڈا منڈا کے اسے ختم کر دیں، یہ محبت کا تقاضا نہیں، یہ عقیدت کا تقاضا نہیں، یہ اطاعت کا تقاضا نہیں، لہٰذا بغیر عقیدت اور اطاعت کے جو شخص محبت کا دعویٰ کرتا ہے اس کا دعویٰ کب قابل قبول ہے؟...... قابل قبول نہیں اس کا دعویٰ، نبی اکرم ﷺ کی احادیث بے شمار بھری ہیں، ہر چیز کے متعلق ہدایات موجود ہیں حتیٰ کہ جو لوگ زیادہ عبادت کریں ایسی جو حضور اکرم ﷺ نے نہیں کی، حضور اکرم ﷺ سے ثابت نہیں، اس کو بھی پسند نہیں فرمایا۔

تین شخص آئے حضور اکرم ﷺ کے مکان پر، اور پوچھا کہ حضور ﷺ رات بھر کیا عمل کرتے ہیں، دن بھر کیا کرتے ہیں؟...... بتلایا کہ رات میں یہ عمل کرتے ہیں، دن میں یہ عمل کرتے ہیں، ان تینوں نے آپس میں یہ معاملہ طے کر لیا، ایک نے کہا کہ میں ہمیشہ روزہ

رکھوں گا، کبھی بے روزہ نہیں رہوں گا، ایک نے کہا میں ساری رات نماز پڑھوں گا بالکل نہیں لیٹوں گا، بالکل نہیں سوؤں گا، ایک نے کہا میں شادی نہیں کروں گا، عورتوں کے پاس نہیں جاؤں گا، حضور ﷺ کو اس کی اطلاع ملی، حضور اکرم ﷺ نے سب کو بلا کر فرمایا: میں تم سب سے زیادہ اللہ سے ڈرنے والا ہوں، تم سے زیادہ تقویٰ مجھ کو حاصل ہے، لیکن میں رات میں سوتا بھی ہوں نماز بھی پڑھتا ہوں، ایسا نہیں کہ ساری رات جاگوں بلکہ رات میں کچھ حصہ سوتا ہوں، کچھ نماز پڑھتا ہوں، میں روزہ بھی رکھتا ہوں، افطار بھی کرتا ہوں، ایسا نہیں کہ ہمیشہ روزہ رکھوں، عام طور پر معمول تھا پیر کو اور جمعرات کو حضور ﷺ روزہ رکھتے تھے اور فرمایا کہ پیر اور جمعرات کے روز بندے کے اعمال اللہ تعالیٰ کے دربار میں پیش کئے جاتے ہیں، اور گناہ گار لوگوں کو معاف فرماتے ہیں، میں چاہتا ہوں کہ میرے نامۂ اعمال ایسے حالات میں پیش ہوں کہ میں روزہ دار ہوں، اور فرمایا کہ میں شادی بھی کرتا ہوں۔

﴿فَمَن رَغِبَ عَن سُنَّتِي فَلَيسَ مِنِّي﴾ ''جو شخص میری سنت سے اعراض کرے وہ مجھ میں سے نہیں۔''

یعنی اگر ساری رات جاگنا، ساری رات عبادت کرنا اور پھر نکاح نہ کرنا، اگر ان چیزوں کو کوئی اختیار کرتا تو وہ قابل قبول نہیں، تو جو چیزیں گناہ کی ہیں تو وہ گناہ ہیں ہی، جو چیزیں طاعت اور عبادت ہوں مگر حضور ﷺ کی منشا کے مطابق نہ ہوں وہ بھی اللہ کے یہاں مقبول نہیں، مقبول وہ چیزیں ہیں جو حضور ﷺ کے طریقے پر ہوں، حضور ﷺ جس طرح نماز میں قیام کرتے ہیں وہ مقبول، جس طرح رکوع کرتے تھے وہ مقبول، جس طرح سجدہ کرتے تھے وہ مقبول، جس طرح قرآن پاک پڑھتے، لباس پہنتے وہ مقبول، جیسی صورت مبارکہ وہ مقبول، اور جو چیزیں حضور اکرم ﷺ کے طریقہ کے خلاف ہوں وہ اللہ کے یہاں مقبول نہیں۔

اس لئے حضور ﷺ جیسا بڑا نبی، بڑا انعام ہم کو ملا، اس کے مطابق شکر ادا کرنے کی ضرورت ہے اور شکر ادا کرنے کے لئے یہ تین چیزیں ضروری ہیں جو ہم نے بیان کی، کہ محبت

اعلیٰ درجہ کی ہو، عقیدت اعلیٰ درجہ کی ہو کہ اپنی آنکھوں سے دیکھ کر کسی بات پر یقین نہیں، اپنے اعمال پر یقین نہیں، حضور ﷺ کے ارشاد پر یقین ہے، تیسری چیز اطاعت، حضور ﷺ کی بجا آوری، حضور ﷺ کے طریقہ پر زندگی گزارنا، یہ تین حق ہیں، اگر ان تین حقوق کو ادا کیا تو اللہ کے یہاں مقبول، اگر ادا نہیں کیا تو اللہ کے یہاں مقبول نہیں، دنیا میں بھی بڑی عزت، آخرت میں بھی بڑی عزت اطاعت سے ہی ہے، صحابہ کرامؓ میں کیا بات تھی؟...... یہی بات تھی کہ ہر ایک ان میں سے اطاعت کرتے تھے، کہ ہر کام حضور ﷺ کے طریقے پر ہو، حضور ﷺ کی اطاعت میں ہو، حضور ﷺ کے اتباع میں ہو، اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے ان کو اعلیٰ اور اشرف بنایا، باکمال بنایا، انبیاءؑ کے بعد صحابہ کرامؓ کا درجہ ہے، صحابہ کرامؓ میں سے چھوٹے سے چھوٹے صحابی ہوں یا بڑے سے بڑے۔ صحابہ کرمؓ میں بھی فرق ہے کوئی باپ تھے، کوئی بیٹے، کوئی دادا کوئی استاذ تھے، کوئی شاگرد، کچھ خدمت اقدس میں زیادہ حاضر ہوئے کچھ کم ہوئے۔ یہ صحیح ہے، لیکن ہمارے لئے سب کے سب سارے صحابہؓ واجب التعظیم ہیں، اور کسی کی شان میں کسی گستاخی، کسی بے ادبی کا کوئی حق نہیں پہنچتا، اللہ تبارک وتعالیٰ نے جو کچھ ان کے دلوں میں ڈالا، جو کچھ طریقہ انہوں نے اختیار کیا ہم کو وہ اختیار کرنے کی ضرورت ہے۔ اللہ تعالیٰ عمل کی توفیق عطا فرمائے، لکھنے والوں کو بھی اور پڑھنے والوں کو بھی، آمین یارب العالمین۔ (بحوالہ خطباتِ محمود جلدِ سوم از افادات مولانا مفتی محمود الحسن گنگوہیؒ)

بہر حال خلاصہ یہ ہوا کہ انسان پر اللہ تعالیٰ کے بے شمار انعامات واحسانات ہیں، ان تمام انعامات میں ایک انعام اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں پر ایسا فرمایا جو سب سے بڑا انعام تھا، اور جس کی وجہ سے تمام انعامات کی تکمیل ہوگئی، تمام انعامات مکمل ہوگئے، تمام انعامات ٹھکانے لگ گئے، وہ انعام اگر نہ ہوتا تو باقی سارے انعامات ادھورے رہ جاتے، اس ایک انعام کی وجہ سے تمام انعامات مکمل ہوگئے۔

میرے پیارے اور انتہائی قابلِ احترام قارئین! وہ ایک انعام ہے سرکارِ دوعالم ﷺ کو بھیج کر ہمیں ہدایت کی دولت سے مالا مال کرنا، یہ ایک انعام ہے جس نے سارے

انعامات کو مکمل کر دیا، اگر سرکار دو عالم تشریف نہ لاتے، اور ہمیں ہدایت نہ ملتی تو باقی سارے انعامات ادھورے رہ جاتے، ہم ان سے صرف دنیا کی چند روزہ زندگی میں تو فائدہ اٹھا سکتے، مگر مرنے کے بعد وہ ہمارے کام کے نہیں تھے، بلکہ وہی انعامات ہماری بربادی اور تباہی کا سبب بن جاتے، اس بات پر آپ جتنا بھی غور کرتے جائیں گے، انشاء اللہ آپ پر حقیقت کھلتی جائے گی۔

اللہ تعالیٰ کے جتنے انعامات تھے، ان کے استعمال کا طریقہ سرکار دو عالم ﷺ نے بتایا کہ اللہ تعالیٰ کی ان نعمتوں کو اس طرح استعمال کرو گے، جس طرح میں بتا رہا ہوں، تو یہ نعمتیں دنیا میں جس طرح تمہارے کام آرہی ہیں اسی طرح آخرت میں بھی مرنے کے بعد بھی تمہارے کام آئیں گی اور تم ان سے فائدہ اٹھا سکو گے، اور اگر تم نے ان کو غلط طریقے سے استعمال کیا، اپنی مرضی اور اپنی چاہت سے استعمال کیا، میرے بتلائے ہوئے طریقے کے مطابق استعمال نہ کیا، تو ان نعمتوں سے صرف دنیا کی چند روز زندگی میں فائدہ اٹھا سکو گے، مرنے کے بعد یہی نعمتیں تمہاری تباہی اور بربادی کا سبب بن جائیں گی۔

آپ سوچیں اور غور کریں، یہ آنکھیں اللہ تعالیٰ کی بہت بڑی نعمت ہیں، ان کے استعمال کا طریقہ سرکار دو عالم ﷺ نے آکر بتایا ان آنکھوں کو اللہ تعالیٰ کا قرآن دیکھنے کے لئے استعمال کرو، تو ایک ایک حرف پر ثواب کے انبار جمع کرتے رہو گے جو تمہارے لئے ذخیرہ آخرت بنے گا، انہی آنکھوں سے والدین کے چہرے پر رحمت اور شفقت کی نگاہ ڈالنے کے لئے استعمال کرو گے، تو ایک ایک نگاہ پر حج مقبول کا ثواب پاؤ گے۔ صحابہؓ نے عرض کیا اللہ تعالیٰ کے پیغمبر! اگر ایک دن میں کوئی سو مرتبہ بھی نگاہ ڈالے تب بھی حج مقبول کا ثواب ملے گا؟...... آپ ﷺ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ کی رحمت اس سے بھی وسیع ہے۔

اگر یہی آنکھیں تم نامحرم عورتوں کو دیکھنے میں استعمال کرو گے، یا ٹی، وی اور وی، سی، آر کے نظاروں سے لطف اندوز ہونے کے لئے استعمال کرتے رہو گے، تو مرنے کے بعد تمہاری یہی آنکھیں تمہاری بربادی اور تباہی کا سبب بن جائیں گی۔

اسی طرح کان اللہ تعالیٰ کی بہت بڑی نعمت ہیں، ان کے استعمال کا طریقہ آپ ﷺ نے بتایا ان کانوں کو اللہ تعالیٰ کا قرآن سننے میں دین کی باتیں سننے میں استعمال کرو گے تو آخرت کے لئے ثواب کے انبار لگا لو گے، اور اگر ان کانوں کو گانا سننے کے لئے استعمال کرو گے، غیر محرم کی باتیں سننے کے لئے استعمال کرو گے، یہی کان مرنے کے بعد تمہاری تباہی اور بربادی کا سبب بن جائیں گے اور ان میں پگلا ہوا سیسہ ڈالا جائے گا۔

اسی طرح زبان اللہ تعالیٰ کی بہت بڑی نعمت ہے اس کے استعمال کا طریقہ بھی سرکار دو عالم ﷺ نے آ کر بتایا کہ اگر اس زبان کو صحیح استعمال کرو گے قرآن پاک کی تلاوت میں درود شریف پڑھنے میں استعمال کرو گے تو آخرت کا اتنا بڑا ذخیرہ ثواب کا جمع کر لو گے جس کا تم تصور بھی نہیں کر سکتے اسی زبان کو "سبحان اللہ الحمد للہ" کہنے میں استعمال کرو گے، تو جنت میں تمہارے نام کے اتنے بڑے بڑے درخت لگ جائیں گے، جن کے سائے کو تیز رفتار گھوڑے پر سوار ہو کر سو سال میں بھی طے نہیں کیا جا سکتا۔

سرکار دو عالم ﷺ نے فرمایا: جنت میں جانے کے بعد جنتیوں کو کسی بات پر اور کسی کام پر افسوس نہیں ہوگا، مگر دنیا میں جو وقت ان کا اللہ تعالیٰ کی یاد اور اللہ تعالیٰ کے ذکر سے غفلت میں گزرا ہوگا، اس وقت پر افسوس ہوگا، جب دیکھیں گے کہ ایک مرتبہ الحمد للہ اور ایک مرتبہ سبحان اللہ کہنے پر اتنا بڑا ثواب مل رہا ہے، تو افسوس کریں گے کہ دنیا میں ہم نے اپنے فلاں وقت کو کیوں ضائع کیا کاش اس وقت میں بھی اگر اللہ تعالیٰ کو یاد کرتے تو آج اجر و ثواب اور زیادہ مل جاتا۔ بعض بزرگ ایسے گذرے ہیں جو روٹی کھانے کے بجائے ستو پھانک کر گذارہ کیا کرتے تھے، پوچھنے پر وجہ ارشاد فرمائی کہ روٹی کھانے اور لقمہ چبانے میں بہت زیادہ وقت ضائع ہو جاتا ہے، اتنی دیر میں تو بہت زیادہ تعداد میں اللہ تعالیٰ کا ذکر کیا جا سکتا ہے، اس لئے ہم ستو پھانک کر گذارہ کر لیتے ہیں، تا کہ ہمارا وقت ضائع ہونے سے بچ جائے۔

افسوس اور صد افسوس، ایک ہم ہیں جن کے پاس دنیا کی سب سے زیادہ فضول اور

بے قیمت چیز ہے تو وقت ہے، جس کو پانی کی طرح بہا رہے ہیں اور ضائع کر رہے ہیں دوستوں کے ساتھ گپ شپ لگانے میں، ٹی وی دیکھنے میں، کرکٹ میچ دیکھنے میں سننے میں، غیبت کرنے میں ہر طرح وقت کو برباد کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔

بہر حال بات دوسری طرف نکل گئی، خلاصہ یہ ہے کہ زبان اللہ تعالیٰ اور اللہ تعالیٰ کے پیغمبر ﷺ کے بتائے ہوئے طریقے کے مطابق استعمال کی، تو جس طرح تم دنیا میں اس سے فائدہ اٹھا رہے ہو پھر بھی اس سے فائدہ اٹھاتے رہو گے، اور اگر خدانخواستہ صورت دوسری ہے، تم نے یہ زبان گانا گانے میں جھوٹ بولنے میں غیبت کرنے میں، بہتان لگانے میں، دھوکہ اور فریب دینے میں، طعنہ دینے میں، گالی دینے میں، فحش باتیں کرنے میں استعمال کی تو یہی زبان تمہاری بربادی کا سبب بن جائے گی۔

سرکار دو عالم ﷺ نے فرمایا جہنم میں جانے والے اکثر لوگ اپنے زبانوں کی کاٹ کی وجہ سے جائیں گے، اور آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: جو آدمی اپنی دو چیزوں کی حفاظت کی ضمانت دے میں اس کو جنت کی ضمانت دیتا ہوں، ایک وہ چیز جو اس کے دو جبڑوں کے درمیان ہے، یعنی زبان۔ اور دوسری وہ چیز جو اس کی دونوں ٹانگوں کے درمیان ہے یعنی شرم گاہ اسی طرح سوچتے جائیں بات کھلتی جائے گی، مال اور اولاد کی نعمتیں ہیں، ان کو اگر سرکار دو عالم ﷺ کے بتلائے ہوئے طریقہ کے مطابق استعمال کیا جائے تو یہ مال دنیا میں بھی کام آئے گا اور مرنے کے بعد بھی کام آئے گا صدقہ جاریہ بنا کر قیامت تک اس کا ثواب حاصل کیا جا سکتا ہے، اور اگر ان کو غلط طریقے سے استعمال کیا گیا، تو پھر مرنے کے بعد یہی مال اور اولاد انسان کی تباہی کا سبب بن جائیں گے۔ ''علی ھذا القیاس'' سرکار دو عالم ﷺ کی بعثت اللہ تعالیٰ کا سب سے بڑا انعام تھا، جس کی وجہ سے تمام انعامات کی تکمیل ہو گئی اور تمام انعامات مکمل ہو گئے، ٹھکانے لگ گئے۔

اس لئے اللہ پاک نے ارشاد فرمایا: ﴿لَقَد مَنَّ اللہُ عَلَی المُؤمِنِینَ اِذ بَعَثَ فِیھِم رَسُولًا مِّن اَنفُسِھِم﴾

پھر آپ ﷺ کی بعثت اللہ تعالیٰ کا جتنا بڑا احسان وانعام تھا اس انعام کا شکر بھی اتنا ہی زیادہ ہونا چاہئیے شکر ادا کرنے کی علماء نے تین صورتیں بتائی ہیں پہلی صورت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ہر نعمت کا قلبی شکر ادا کرنا چاہئیے، دوسری صورت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی نعمت کا لسانی یعنی زبانی شکر ادا کیا جائے، "**الحمدللہ الحمدللہ**" کہا جائے، تیسری صورت یہ ہے کہ اس نعمت کا عملی شکر ادا کیا جائے، اور اس نعمت سے اس مقصد کو ادا کرنے کی کوشش کی جائے۔

مثلاً آنکھیں اللہ پاک نے دی ہیں، ان کا شکر دل سے بھی ادا کیا جائے اور زبان سے بھی اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کیا جائے، اور عمل سے بھی شکر ادا کیا جائے، یہ آنکھیں جس مقصد کے لئے عطا کی گئیں ہیں اس مقصد میں ان کو استعمال کیا جائے، قرآن پاک کی تلاوت میں، رزق حلال کمانے میں والدین کی زیارت کے لئے، بہن بھائیوں اور بچوں کے اوپر شفقت کی نگاہ ڈالنے کے لئے، اسی طرح اور جتنے کام جائز اور درست ہیں، ان کو پورا کرنے کے لئے آنکھوں کو استعمال کیا جائے، تو یہ عملی شکر ہوگا لیکن ایک آدمی زبان سے تو "**الحمد للہ الحمدللہ**" کہتا رہتا ہے مگر سارا دن غیر محرم عورتوں کو دیکھتا ہے، ٹی وی، وی سی آر کے نظاروں سے لطف اندوز ہوتا رہتا ہے، تو وہ ٹی وی دیکھنے کے دوران بے شک تسبیح ہاتھ میں لے کر "**الحمدللہ**" کا ورد کیوں نہ کرتا رہے، اس کا یہ "الحمدللہ" کہنا شکر ادا نہیں سمجھا جائے گا، آنکھیں جس مقصد کے لئے اللہ تعالیٰ نے دی تھیں اس مقصد میں ان کو استعمال نہیں کیا تو یہ اس کی ناشکری ہے۔

اسی طرح کان، دل، دماغ، زبان، اور پورا بدن، اور مال اور اولاد اور دنیا کی ہر نعمتوں کا کامل شکر تب ہی ہوگا، جب دل میں بھی شکر ادا کیا جائے اور زبان سے بھی شکر ادا کیا جائے، اور عملی شکر بھی ادا کیا جائے، کہ جس مقصد کے لئے یہ ساری نعمتیں اللہ پاک نے دی ہیں اس مقصد کے لئے ان کو استعمال کر کے اسی مقصد کو پورا کیا جائے۔

تو سرکار دوعالم ﷺ کی بعثت اللہ تعالیٰ کا سب سے بڑا انعام تھا، تو اس انعام کا قلبی شکر بھی ادا بھی کیا جائے اور لسانی شکر بھی ادا کیا جائے اور عملی شکر بھی ادا کیا جائے کہ جس

مقصد کے لئے اللہ پاک نے آپ ﷺ کو مبعوث فرمایا، اس مقصد کو پورا کیا جائے، اور جس کام کے لئے اللہ پاک نے آپ ﷺ کو مبعوث فرمایا، اس کام کو پورا کیا جائے، اور جس کام کے لئے آپ ﷺ کو بھیجا گیا تھا، وہ کام کیا جائے اور وہ مقصد یہ ہے کہ اپنی چوبیس گھنٹے کی زندگی کو، اپنی رفتار کو، اپنے گفتگو کو، اپنے کردار کو، اپنی شکل وصورت کو، اپنی وضع قطع اور اپنے لباس، اپنے اٹھنے بیٹھنے کو، اپنے چلنے پھرنے کو، اپنی شادی اور غمی کو، اپنی ساری چیزوں کو آپ ﷺ کی سنت کے مطابق بنایا جائے، اور اس کی کوشش کی جائے۔ اسی میں ہم سب کی کامیابی اور فلاح ہے دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہم سب کو حضور ﷺ کی تمام تعلیمات پر دل وجان سے عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے آمین یارب العالمین۔

يَا رَبِّ صَلِّ وَسَلِّمْ دَائِمًا اَبَدًا عَلٰى حَبِيْبِکَ خَيْرِ الْخَلْقِ كُلِّهِم

خصوصیت نمبر ۵۹

رسولِ اکرم ﷺ کا نام آپ ﷺ کے کمالات کا آئینہ دار ہے

قابل احترام قارئین! رسولِ اکرم ﷺ کی امتیازی خصوصیات میں سے یہ انسٹھ نمبر خصوصیت ہے، جسکا عنوان ہے ''رسولِ اکرم ﷺ کا نام آپؐ کے کمالات کا آئینہ دار ہے'' آج جمعرات کا دن ہے فجر کی نماز سے فراغت کے بعد روضہ رسول ﷺ کے سامنے بیٹھا ہوں اور رسولِ اکرم ﷺ کی اس خصوصیت کو ترتیب دے رہا ہوں، لیکن کھلے دل کے ساتھ اقرار ہے کہ اس میں میرا کوئی کمال نہیں بے شک یہ اللہ ہی کا فضل ہے کہ اس ذاتِ باری تعالیٰ نے مجھ جیسے گناہ گار اور حقیر انسان کو یہ سعادت عطا فرمائی کہ میں صاحبِ خصوصیت ﷺ کے روضہ مبارک کے سائے تلے بیٹھ کر ان کی خصوصیت کو ترتیب دے رہا ہوں، اس پر میں اپنے اللہ کا جتنا شکر ادا کروں کم ہے، اور امید بھی یہی ہے کہ جس اللہ تبارک وتعالیٰ نے اتنی توفیق عطا فرمائی، وہی اللہ انشاء اللہ میری اس کاوش کو مقبول ومنظور بھی فرمائے گا، اور روز قیامت میری یہی کاوش میری نجات کا باعث ہوگی، انشاء اللہ۔

بہر حال محترم قارئین! دیگر خصوصیات کی طرح یہ بھی ایک عظیم خصوصیت ہے جو کہ آپ ﷺ کے نام سے متعلق ہے کہ ہمارے نبی ﷺ کو نام ہی اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایسا عظیم عطا ہوا ہے کہ جو ہمارے پیارے نبی ﷺ کے کمالات کا آئینہ دار ہے، جبکہ دیگر انبیاء کے ناموں میں یہ خصوصیت نہیں پائی جاتی جیسا کہ مزید تفصیل آپ آنے والے صفحات میں ملاحظہ فرمائیں گے، جہاں ہم نے مکمل وضاحت کے ساتھ آپ ﷺ کے نام کی خصوصیت کو بیان کیا ہے، اگر چہ پچھلی جلدوں میں بھی اس موضوع پر کچھ تفصیل آ گئی ہے لیکن چونکہ آپ کا نام ایسا عظیم نام ہے کہ جو خود اپنے اندر بہت سی خصوصیات رکھتا ہے بلکہ آپ ﷺ کے صرف

نام کی ہی خصوصیت پر ایک مکمل کتاب بن سکتی ہے انشاء اللہ، چنانچہ اسی لئے ہماری اس مکمل کتاب میں مختلف مواقع پر آپ ﷺ کے ناموں کی خصوصیات کو واضح کیا گیا ہے، انشاء اللہ آپ کے ناموں سے متعلق خصوصیات پڑھ کر ہمارے ایمان میں اضافہ ہوگا، دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہمیں اپنے پیارے نبی ﷺ سے سچی اور کامل محبت کرنے کی توفیق عطا فرمائے آمین یارب العالمین، لیجئے اب اس خصوصیت کی تفصیل ملاحظہ فرمایئے:۔

انسٹھ نمبر خصوصیت کی وضاحت قرآن واحادیث کی روشنی میں

واضح ہو کہ انبیاء علیہم السلام میں سے کسی بھی نبی کا ایسا نام نہیں پایا جاتا جو اپنے مسمی (نام والے) کے کمالات نبوت کا آئینہ دار ہو۔ مثلاً

آدم علیہ السلام کے معنی گندم گوں ہیں۔ ابوالبشر کا یہ نام ان کی جسمانی رنگت کو ظاہر کرتا ہے۔

ابراہیم علیہ السلام کے معنی ہیں بڑے گروہ کا باپ۔ یہودی، عیسائی اور مسلمان، تینوں قومیں آپ کے ماننے والوں میں سے ہیں۔

اسماعیل علیہ السلام کے معنی ہیں اے اللہ میری فریاد سن۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اللہ جل شانہ سے اولاد صالح کے لیے دعا کی تھی۔ آپ علیہ السلام کی دعا کے جواب میں حضرت اسماعیل علیہ السلام پیدا ہوئے۔

اسحاق علیہ السلام کے معنی ہیں ہنسنے والا۔ آپ علیہ السلام ہشاش بشاش چہرے والے تھے۔

یعقوب علیہ السلام کے معنی ہیں پیچھے آنے والا۔ یہ اپنے بھائی عیسو کے ساتھ جڑواں پیدا ہوئے۔

موسیٰ علیہ السلام کے معنی ہیں پانی سے نکلا ہوا۔ جب ان کا صندوق پانی میں سے نکالا گیا تب یہ نام رکھا گیا۔

یحییٰ علیہ السلام کے معنی ہیں عمر دراز۔ بوڑھے ماں باپ کی بہترین آرزوؤں کا ترجمان۔

یوسف علیہ السلام کے معنی ہیں زیادہ کیا گیا۔ آپ علیہ السلام حسن و جمال میں لاثانی تھے۔

عیسیٰ علیہ السلام کے معنی ہیں سرخ رنگ۔ چہرہ گلگوں کی وجہ سے یہ نام تجویز ہوا۔

جیسا کہ ہم نے اوپر وضاحت کی عام طور سے اشخاص کے نام اور اوصاف باہم کوئی نسبت نہیں رکھتے، شاذ و نادر اتفاقی حیثیت سے تناسب بھی مل جاتا ہے، لیکن ایسا کبھی نہیں ہوا کہ کسی انسان کا وہ نام رکھا گیا ہو جو اس کی تمام زندگی کا آئینہ اور اس کی حیات کی تفصیل ہو۔ انبیاء کرام علیہم السلام کے اوپر دیئے گئے ان تمام ناموں اور ان کے معنوں پر غور کریں۔ ان میں سے ایک بھی اپنے مسمی (نام والے) کی عظمت روحانی یا نبوت کی طرف ذرا سا بھی اشارہ نہیں کرتا۔ مگر ہمارے حضور ﷺ نے دونوں اسماء ذاتی کی شان ہی نرالی ہے۔

احمد ﷺ اور محمد ﷺ کے الفاظ اتنے پیارے اور اتنے حسین ہیں کہ ان کے سنتے ہی ہر نگاہ فرط تعظیم اور فرط ادب سے جھک جاتی ہے، ہر سر خم ہو جاتا ہے، اور زبان پر درود وسلام کے زمزمے جاری ہو جاتے ہیں۔ لیکن کم لوگ یہ جانتے ہیں کہ ان الفاظ کے معنی ومفہوم بھی ان کے ظاہری حسن و جمال کی طرح حسین اور دل آویز ہیں۔ صرف نام کے لغوی معنوں سے نام والے (مسمّٰی) کی عظمت و برتری کا اظہار ہو رہا ہے۔ محمد ﷺ حمد سے مبالغہ کا صیغہ ہے۔ جس کا عام اور سادہ ترجمہ ہے "وہ ذات جس کی تعریف کی گئی"، یعنی محمد ﷺ وہی وہ مقدس ہستی ہیں جن کی تعریف وتوصیف زمین وآسمان کی تمام مخلوق نے کی ہے۔ اور احمد ﷺ کے معنی ہیں: "سب سے زیادہ تعریف کرنے والا" یعنی احمد ﷺ ہی وہ مقدس ہستی ہے جنہوں نے مخلوق میں سب سے بڑھ کر اللہ جل شانہ کی حمد وستائش کی۔

رسول اللہ ﷺ کے ان دونوں ناموں کا اصل مادہ ایک ہی ہے۔ ح، م، د، یعنی حمد (اللہ تعالیٰ کی تعریف وتوصیف اور عظمت کا ذکر) اور یہ عجیب بات ہے کہ یہی آپ ﷺ کی

ساری زندگی کا مقصد اور مشن قرار پایا یعنی حمد۔ کسی شخص کے نام سے اس کی زندگی کے مشن کا اظہار ایک بہت ہی نادر الوقوع بات ہے۔ ظاہر ہے جن لوگوں نے آپ ﷺ کی ولادت پر آپ ﷺ کے یہ دونوں نام رکھے ان کے وہم وگمان میں بھی نہ ہوگا کہ چالیس سال بعد یہ نومولود کیا دعویٰ کرنے والا ہے۔ سورۃ الحمد بھی جسے قرآن مجید کا دیباچہ کہنا چاہیے، درحقیقت پورے قرآن کا اور اس پیغام کا خلاصہ ہے جو آپ ﷺ نے دنیا کو پہنچایا۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ آپ ﷺ کے یہ دونوں نام قدرت الٰہیہ کی طرف سے خود آیت عظیم ہیں، ایک معجزہ ہیں کہ ان کا مسمیٰ (نام والا) ضرور امام الانبیاء اور تمام کائنات ومافیہا کا سرتاج ہے۔

(رحمۃ اللعالمین جلد سوم)

یہ وہ خصوصیت ہے جس سے باقی انبیاء کرام علیہم السلام کے اسمائے گرامی ساکت وخاموش ہیں۔ ایک حدیث شریف ہے کہ: زمین پر میرا نام محمد ﷺ اور آسمان پر احمد ﷺ ہے۔ یعنی یہ کہ اللہ اور اس کے فرشتے آپ ﷺ کو احمد ﷺ کے نام سے جانتے ہیں جب کہ زمین والوں کے لیے آپ کا نام محمد ﷺ ہے۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ درحقیقت عالم ارواح میں آپ کا نام احمد ﷺ تھا۔ صوفیہ کرام کا متفقہ عقیدہ ہے کہ احمد ﷺ اور محمد ﷺ ایک ہی ہستی کی دو جدا جدا حقیقتیں ہیں۔ حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ: ''احمد ﷺ رسول اللہ کا پہلا نام ہے، آپ ﷺ آسمان والوں میں اسی نام سے معروف ہیں۔ آپ ﷺ کے اس نام مبارک کو اللہ جل مجدہ کا خاص تقرب حاصل ہے اور یہ آپ ﷺ کے دوسرے نام (محمد ﷺ) سے ایک منزل زیادہ اللہ جل مجدہ کے نزدیک اور قریب ہے۔'' (مکتوبات ربانی)

جیسا کہ ہم نے پہلے ذکر کیا احمد ﷺ اور محمد ﷺ کا اصل مادہ حمد (ح، م، د) ہے۔ حمد سے محمد ﷺ اسی طرح بنایا گیا ہے۔ جیسے علم سے معلم (امام بن ابن قیم، جلاء الافہام)

(ارباب تصوف کا کہنا ہے کہ محمد اللہ جل مجدہ کے نام احد سے مشتق ہے) حمد کے معنی تعریف کرنے اور ثناء بیان کرنے کے ہیں، خواہ یہ تعریف کسی ظاہری خوبی مثلاً ظاہری حسن وجمال کی وجہ سے کی جائے یا کسی باطنی وصف مثلاً کسی ہنرمندی یا کسی فن میں مہارت

کی بنا پر۔ حمد اصل میں کسی کے اخلاق حمیدہ اور اوصاف پسندیدہ اور کمالات اصلیہ اور فضائل حقیقیہ اور محاسن واقعیہ کو محبت اور عظمت کے ساتھ بیان کرنے کو کہتے ہیں۔

لفظ محمد تحمید سے مشتق ہے جو باب تفعیل کا مصدر ہے۔ جس کو وضع ہی مبالغہ اور تکرار کے لیے کیا گیا ہے۔ (مولانا ادریس کاندھلوی ''سیرۃ المصطفیٰ۔ جلد اول)

لہٰذا لفظ محمد کے جو تحمید کا اسم مفعول ہے معنی ہوں گے وہ قابل تعریف ہستی جس کے واقعی اور اصلی کمالات اور محاسن کو محبت اور عظمت کے ساتھ کثرت سے بار بار بیان کیا جائے۔ دوسرے الفاظ میں تحمید حمد سے زیادہ بلیغ ہے۔ یعنی محمد وہ ہے جس کی اچھی خصلتیں بہت ہوں۔ قاموس میں ہے کہ تحمید کے معنی ہیں اللہ جل شانہ کی بار بار تعریف وتوصیف (حمد) کرنا۔ اور محمد کو اسی سے مشتق کیا (نکالا) گیا ہے۔ گویا کہ وہ بار بار حمد (تعریف) کئے گئے۔ لہٰذا محمد کے (جو تحمید کا اسم مفعول ہے) یہ معنی ہوں گے کہ وہ قابل تعریف ذات جس کے واقعی اور اصلی کمالات اور محاسن کو محبت اور عظمت کے ساتھ کثرت سے بار بار بیان کیا جائے۔ جس کی بار بار تعریف کی جائے، چونکہ سرور کائنات ﷺ کی تعریف بار بار اور ہر بار نئے مدائح ومناقب سے ہو رہی ہے اور ہوتی رہے گی، اس لئے آپ ﷺ کا نام نامی اسم گرامی محمد (ﷺ) رکھا گیا۔

ہمارے حضور احمد ﷺ بھی ہیں، احمد کے معنی ہیں حمد (تعریف) کرنے والا۔ قواعد کی رو سے یہ لفظ محمود یا حمید کا اسم تفضیل ہے، بمعنی زیادہ یا سب سے زیادہ قابلِ تعریف اور یا حامد کا، جس کا احتمال کم ہے، بمعنی اللہ جل مجدہ کی زیادہ یا سب سے زیادہ تعریف کرنے والے۔

(کتاب الشفاء، حقوق المصطفیٰ)

بعض کے نزدیک احمد اسم مفعول کے معنی میں ہے اور بعض کے نزدیک اسم فاعل کے معنی میں۔ اگر اسم مفعول کے معنی لئے جائیں تو احمد کے معنی ہوں گے۔ ''سب سے زیادہ تعریف''، تو بیشک مخلوق میں سے کوئی بھی آپ ﷺ سے زیادہ قابل تعریف نہیں ہے اور نہ ہی آپ ﷺ سے بڑھ کر کوئی سراہا گیا ہے۔ اور اگر اسم فاعل کے معنی میں لیا جائے تو احمد کے معنی

ہوں گے کہ مخلوق میں اللہ جل شانہ کی سب سے زیادہ حمد وستائش کرنے والا۔ یہ بھی نہایت درست اور صحیح ہے، دنیا میں آپ ﷺ اور آپ کی امت نے اللہ جل شانہ کی وہ حمد وثنا کی جو کسی نے آج تک نہیں کی۔ اسی وجہ سے انبیاء سابقین نے آپ ﷺ کے وجود باوجود کی بشارت لفظ احمد ﷺ کے ساتھ اور آپ ﷺ کی امت کی شہادت حمادین کے لقب سے دی۔

احمد ﷺ وہ ہیں جنہوں نے اپنے خالق، اپنے مالک کی حمد وثناء سب سے بڑھ کر اور سب سے زیادہ عرصہ کی ہے۔ آپ ﷺ باعث تخلیق کائنات ہیں اور اپنے تخلیق نور اور روح محمدی ﷺ کی پیدائش کے وقت ہی سے اس کی حمد وثناء کرنے والے ہیں، اور اپنے رازق، اپنے ہادی اپنے معطی کی تعریف وتکریم اور حمد ونعت کا ایک معیار قائم کرنے والے ہیں۔

آپ کے یہ دونوں اسم مبارک بانگ دہل اعلان کر رہے ہیں کہ تاجدار مدینہ، سرور سینہ ﷺ کے اوصاف، محاسن، مناقب ومحامد، فضائل وخصائل وشمائل اتنے کثیر ہیں جن کی نہ کوئی حد ہے نہ نہایت، یہ احصار وشمار کے پیمانوں سے بہت ہی وراء ہیں۔ دفتروں کے دفتر ختم ہو گئے، عمریں انتہا کو پہنچ گئیں۔ لیکن تاجدار کائنات ﷺ کے ایک وصف کی بھی توضیح کامل، تشریح اکمل نہ ہو سکی۔

شمار کرنے چلیں اس کی خوبیوں کا اگر
تو ساتھ چھوڑ دیں تھک کے نیل، سنکھ، پدم

شیخ عبدالحق محدث دہلوی مدارج النبوت میں لکھتے ہیں کہ: آپ ﷺ کے دونوں اسمائے مبارک یعنی محمد ﷺ اور احمد ﷺ حقیقت میں ایک اسم ہے جو حمد سے مشتق اور مبالغہ کے معنی میں مقید ہے۔ پہلا نام باعتبار کیفیت ہے جب کہ دوسرا نام باعتبار کمیت ہے، آپ ﷺ حق تعالیٰ کی حمد، افضل محامد سے کرتے ہیں اور دنیا وآخرت میں کثرت محامد سے آپ ﷺ کی حمد وستائش کی گئی۔ آپ ﷺ احمد الحامدین (حمد کرنے والوں میں سب سے زیادہ حمد کرنے والے) اور احمد المحمودین (حمد کرنے والوں میں سب سے زیادہ تعریف کئے

گئے) وافضل من حمد (جو بھی حمد کرے ان سب سے برتر حمد کرنے والے) ہیں۔

آپ ﷺ نے اللہ کی اتنی حمد اور تعریف کی کہ آپ احمد ﷺ ہو گئے اور اللہ تعالیٰ نے آپ علیہ الصلوٰۃ والسلام کی اتنی حمد اور تعریف کی کہ آپ محمد ﷺ ہو گئے۔

محمد ﷺ کے معنی ہیں جس کی حمد (تعریف) خود اللہ تعالیٰ کرے۔ قرآن کریم نے جا بجا نبی کریم ﷺ کی تعریف آئی ہے۔ احمد ﷺ کے معنی ہیں۔ اللہ جل شانہ کی حمد (تعریف) کرنے والا۔

احادیث شریفہ میں ہزاروں جگہ اللہ تعالیٰ کی تعریف وتوصیف آئی ہے۔ محمد اور احمد کے معنی میں الگ الگ فرق یہ ہے کہ محمد وہ ہے جس کی حمد ونعت (تعریف) سب زمین اور آسمان والوں نے سب سے بڑھ کر کی ہو۔ اور احمد وہ ہے جس نے رب السموٰاتِ والارضِ کی حمد وثناء (تعریف) سارے اہل الارض والسمٰوات سے بڑھ کر کی ہو محمد ﷺ وہ جو رب العزت کے اسم ذات اور اسمائے صفات کا ذکر کثرت سے کرے اور احمد ﷺ وہ جو ہر نام کے معنی اور مطلب پر غور کرے۔ یعنی حمد (تعریف) کی مقدار کا تعلق "محمد" ﷺ سے ہے اور معیار کا تعلق "احمد" ﷺ سے۔ اس بناء پر محمد ﷺ واحمد ﷺ میں فرق یہ رہے گا کہ محمد ﷺ وہ ہے جس کی تعریف اپنے اوصاف جمیلہ کی وجہ سے سب سے زیادہ کی جائے اور احمد ﷺ وہ ہے جس کی تعریف سب سے بہتر اور عمدہ ہو۔

دونوں ناموں کا خلاصہ یہ ہے کہ آپ ﷺ اپنے خلق وخصائل کی وجہ سے اس کے مستحق ہیں کہ آپ ﷺ کی سب سے زیادہ سب سے کامل تعریف کی جائے۔ اس تحقیق کے بعد ان دونوں کے مفہوموں کے لحاظ سے سطح عالم پر نظر ڈالئے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ یہ اسماء جتنی حقیت اور جتنی صداقت کے ساتھ آپ ﷺ کی ذات مبارک پر چسپاں ہیں اتنے کسی اور پر نہیں، خالق سے مخلوق تک، انبیاء سے لے کر جن اور فرشتوں تک، حیوانات سے لے کر جمادات تک، غرض ہر ذی روح اور غیر ذی روح سب ہی نے آپ ﷺ کی تعریفیں کی ہیں۔ اور آج بھی اربوں انسانوں کی زبانیں دن میں نہ معلوم کتنی بار آپ ﷺ کی تعریف کے

لیے متحرک رہتی ہیں۔ اس لیے محمد ﷺ اور احمد ﷺ نام کی مستحق جتنی کہ آپ ﷺ کی ذات ہے اتنی کسی اور کی نہیں ہوسکتی، اگر احمد ﷺ کو اسم فاعل کے معنی میں لیجئے تو بھی اس اسم مبارک کی سب سے زیادہ مستحق آپ ﷺ ہی کی ذات پاک ہے، کیوں کہ جس قدر اللہ کی تعریف آپ ﷺ نے کی ہے، اتنی کسی بشر نے نہیں کی اور اسی طرح آپ ﷺ نے اپنی امت کو بھی موقع بہ موقع اللہ جل مجدہ کی اتنی حمد سکھلائی کہ کتب مقدسہ میں اس امت کا لقب ہی حمادون پڑ گیا یعنی کہ اللہ عز اسمہ کی بہت زیادہ تعریف کرنے والی امت۔

قاضی عیاض اور حافظ سہیلیؒ لکھتے ہیں کہ محمد ﷺ اس کو کہا جائے گا جس کی بار بار تعریف کی جائے اور احمد ﷺ وہ ہے جو سب سے زیادہ تعریف کرنے والا ہے۔ آنحضرت ﷺ کے یہ دونوں اسماء واقع کے مطابق ہیں۔ یعنی آپ احمد ﷺ بھی ہیں اور محمد ﷺ بھی، یعنی وجود کے حساب سے بھی پہلے آپ احمد ﷺ ہیں اور بعد میں محمد ﷺ بلکہ احمد ﷺ ہونے کی وجہ سے ہی آپ محمد ﷺ ہوئے، آپ ﷺ نے پہلے اللہ عز اسمہ کی تعریف کی اس لیے آپ پہلے احمد ﷺ ہوئے۔ نبوت سے سرفرازی کے بعد پھر مخلوق نے آپ ﷺ کی تعریف کی اس لئے بعد میں آپ محمد ﷺ ہوگئے۔ محشر میں بھی پہلے آپ ﷺ اللہ جل شانہ کی تعریف کریں گے اس لیے احمد ﷺ پہلے ہوں گے۔ پھر شفاعت کے بعد مخلوق آپ ﷺ کی تعریف کرے گی اس لیے بعد میں محمد ﷺ ہوں گے۔ غرض ازل سے ابد تک کی تاریخ بتاتی ہے کہ شان احمدی ﷺ شان محمدی ﷺ پر مقدم ہے، اسی وجہ سے کتب سابقہ میں آپ ﷺ کی بشارت اسم احمد ﷺ سے مذکور ہے اور جب آپ ﷺ عالم وجود میں تشریف لے آئے تو محمد ﷺ کے نام سے پکارے گئے۔ (بحوالہ اسماء النبی شیخ حضرت مولانا بدر عالم صاحب مہاجر مدنی)

شیخ اکبرؒ یہاں ایک اور عجیب نکتہ لکھ گئے ہیں، وہ فرماتے ہیں کہ حمد ہمیشہ آخر میں ہوتی ہے۔ مثلاً جب ہم کھا پی کر فارغ ہو لیتے ہیں تو اللہ جل شانہ کی حمد کرتے ہیں۔ جب کام ختم ہو جاتا ہے تو حمد کرتے ہیں، جب سفر ختم کر کے واپس آتے ہیں تو حمد کرتے ہیں، اسی طرح جب دنیا کا طویل وعریض سفر ختم کر کے جنت میں داخل ہوں گے تو اللہ جل شانہ کی حمد

کریں گے، اسی دستور کے مطابق مناسب تھا کہ جب سلسلہ رسالت ختم ہو تو یہاں بھی آخر میں اللہ جل شانہ کی حمد ہو۔ اس لیے جو نبی سب سے آخر میں آئے ان کا نام محمد ﷺ رکھا گیا۔

تخلیق کے عمل سے پہلے سوائے اللہ جل شانہ کی ذات کے اور کچھ موجود نہ تھا، نہ مکان تھا نہ مکین، نہ روح تھی نہ مادہ، نہ وقت تھا نہ زمانہ، نہ عالم تھا نہ جہاں، نہ حالت تھی نہ کیفیت، نہ سمت تھی نہ جہت، بس اللہ تھا اور کچھ بھی نہ تھا، پھر کیا ہوا؟ پھر اس نے چاہا کہ اپنی خالقیت کا مظاہرہ کرے، اس کے ارادہ فرماتے ہی تخلیق عمل میں آگئی اور عدم کو ظہور مل گیا، اس نے کن فرمایا اور نیست کو ہست کی صورت مل گئی۔ بیشک بشریت کی ابتداء سرکار سیدنا آدم علیٰ نبینا علیہ الصلوٰۃ والسلام سے ہوئی مگر سرورِ کائنات، فخرِ موجودات، خلاصہ کائنات، احمد مجتبیٰ محمد مصطفیٰ کی تخلیق سیدنا آدمؑ سے بہت پہلے کی ہے۔ جیسا کہ اس کتاب کی پہلی جلد میں آپ تفصیل پڑھ چکے ہیں۔

ہمارے آقا و سردار کا نام محمد ﷺ کب رکھا گیا؟ اس سلسلے میں بہت سی روایتیں ملتی ہیں، گو تمام راوی اس بات پر متفق ہیں کہ آپ ﷺ کا یہ نام حضرت آدمؑ کی پیدائش سے بہت پہلے رکھا گیا، لیکن اس میں اختلاف ہے کہ کتنا پہلے، ان روایات کے مطابق آپ ﷺ کا یہ نام تخلیق آدمؑ سے کم سے کم دو ہزار سال پہلے اور زیادہ سے زیادہ نو لاکھ سال پہلے رکھا گیا، لیکن محدثین نے ایک ایسی حدیث شریف کا ذکر بھی کیا ہے جس سے آپ ﷺ کی ذات بابرکت کا نو لاکھ سال سے بھی پہلے موجود ہونا ثابت ہوتا ہے۔

مشہور و معروف صحابی حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ سرور کائنات ﷺ نے ایک بار حضرت جبرئیل امینؑ سے پوچھا کہ تمہاری عمر کتنی ہے؟ جبرئیلؑ نے جواب دیا کہ میں بہت زیادہ تفصیل سے اپنی عمر کا اندازہ نہیں لگا سکتا البتہ اتنا جانتا ہوں کہ چوتھے حجاب میں ایک ستارہ تھا۔ وہ ستارہ ہر ستر ہزار برس بعد ایک مرتبہ طلوع ہوتا تھا، میں نے اس ستارے کو بہتر ہزار بار طلوع ہوتا دیکھا ہے، یہ سن کر حضور ﷺ نے فرمایا کہ "اے جبرئیل مجھے اپنے رب کریم جل جلالہ کی عزت کی قسم، وہ ستارہ میں ہی تھا"۔ (سیرت حلبیہ جلد اول و تفسیر روح البیان جلد اول)

حساب کے عام قاعدہ کی رو سے اگر ہم ستر ہزار کو بہتر ہزار سے ضرب دیں تو حاصل جواب آئے گا۔ پانچ ارب چالیس کروڑ سال۔ اللہ نے قرآن شریف میں اپنے ایک دن کو ہمارے ایک ہزار سال کے برابر قرار دیا ہے۔ (سورۃ الحج) اگر اس حدیث مبارکہ میں حضرت جبرئیلؑ کے بتائے ہوئے سالوں کو اس تناسب سے حساب لگائیں تو نور محمدی (ﷺ) کی تخلیق اس وقت ہوئی جہاں تک ہمارا کوئی حساب، کوئی گنتی، کوئی عدد نہیں پہنچ سکتا۔

اس حدیث شریف سے پتہ چلتا ہے کہ سید الابرار، نبی آخر الزماں ﷺ کا نام محمد اس وقت رکھا گیا جب کچھ نہ تھا، نہ آسمان تھا نہ زمین تھی، نہ عرش تھا نہ کرسی تھی، نہ جہنم تھی نہ جنت تھی، نہ قلم تھا نہ لوح تھی، نہ سورج تھا نہ روشنی تھی، نہ چاند تھا نہ چاندنی تھی، نہ ستارے تھے نہ ان کی چمک تھی، نہ دن تھا نہ رات تھی، نہ صبح تھی نہ شام تھی، نہ فضا تھی نہ ہوا تھی، نہ ابر تھا نہ گھٹا تھی، نہ زمانہ تھا نہ مکان تھا، نہ حسن تھا نہ جمال تھا، نہ گل تھے نہ بوٹے تھے، نہ شجر تھے نہ حجر تھے، نہ گرمی تھی نہ سردی تھی، نہ نسیم تھی نہ شمیم تھی، نہ بہار تھی نہ خزاں تھی، نہ بلبل تھی نہ چہک تھی، نہ سبزہ تھا نہ مہک تھا، نہ ڈالی تھی نہ لچک تھی نہ ہیرے تھے، نہ جواہر نہ زر تھے نہ خزینے، نہ دولت تھی نہ دفینے نہ بحر تھے نہ سفینے، نہ دریا تھا نہ کنارہ نہ موج تھی نہ حباب، نہ صحرا تھا نہ گلشن، نہ ہوا تھی نہ خاک، نہ پانی تھا نہ آگ، نہ طفلی تھی نہ شباب، نہ نشیب تھا نہ فراز، نہ ثریٰ تھا نہ ثریا، نہ جبرئیلؑ تھے نہ میکائل، نہ اسرافیل تھے نہ عزرائیل، نہ ملائکہ تھے نہ کروبیں، نہ عقل تھی نہ حواس، نہ آدم تھے نہ آدمیت، نہ انسان تھے نہ انسانیت، نہ حیوان تھے نہ حیوانیت نہ یہ چہل پہل تھی نہ یہ ریل پیل، نہ دیوانگی تھی نہ شعور، نہ ہجر تھا نہ وصال، نہ اقرار تھا نہ انکار، نہ آہ تھی نہ فریاد، نہ رونا تھا نہ ہنسنا، نہ جاگنا تھا نہ سونا، نہ جذبہ تھا نہ احساس نہ جوانی تھی، نہ بڑھاپا، نہ ہوش تھا نہ خرد، غرض یہ کچھ بھی نہ تھا سب سے پہلے اللہ جل جلالہ نے آپ ﷺ کے نور کو پیدا فرما کر آپ ﷺ کا نام محمد ﷺ رکھا یہ تابندہ ستارہ کیا چمکا گویا زندگی میں بہار آ گئی، سلسلہ چل نکلا، چراغ سے چراغ جلنے لگے، دیکھتے ہی دیکھتے کائنات وجود میں آ گئی اور سارا جہاں جگمگانے لگا۔

صاحب قاموس مجدالدین فیروز آبادی لکھتے ہیں کہ ''منجملہ دیگر کمالات نبوت اور معجزات رسالت کے ایک معجزہ گرامی رسول کریم ﷺ کا نام نامی اسم گرامی محمد ﷺ بھی ہے، وہ لکھتے ہیں کہ محمد ﷺ وہ ہیں جن کی تعریف کا سلسلہ کبھی ختم نہ ہو، تعریف کے بعد تعریف اور توصیف پر توصیف ہوتی رہے، زمانہ جوں جوں آگے بڑھتا جاتا ہے اور انسان اپنی سعی اور کوشش کے مطابق جس قدر ترقی کرتا جاتا ہے۔ محض اعتقاداً نہیں بلکہ واقعتاً رسول عربی ﷺ کے کمالات پر سے پردہ اٹھتا جاتا ہے، یورپ کے علما اور فضلاء کی اکثریت جیسے جیسے تاریخ اسلام کے ماتحت اپنا مطالعہ جس قدر گہرا کرتی جاتی ہے انہیں اسی راہ کی طرف آنا پڑتا ہے اور زبان اعتراف کھولنی پڑتی ہے کہ بلاشبہ رسول عربی ﷺ کے قانون، دنیا کی ضرورتوں کے کفیل اور آپ ﷺ کی زندگی عالم انسانی کے لیے ایک بہترین نمونہ ہے۔

اہل ایشیاء کا رجحان طبعی جتنا روحانیت اور سادگی کی طرف بڑھ رہا ہے، اسی قدر وہ سرکار دوعالم ﷺ کے قریب تر ہوتے جارہے ہیں۔ یہ دنیا کا واحد معجزہ ہے کہ چودہ سو برس سے بھی پہلے سے نام مبارک ان آنے والے حالات کا پتہ دے رہا ہے، کہ مستقبل میں دنیا کی عمر جتنی دراز ہوگی، اسے کمالات نبوت محمدی ﷺ کے اعتراف کے علاوہ اور کوئی چارہ نہ ہوگا۔ (تفسیر روح البیان، جلد ہفتم)

صاحب المفردات ابوالقاسم حسین بن الفضل راغب اصفہانی لکھتے ہیں کہ: ''مختصر لفظوں میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ لفظ محمد کے معنی مجموعہ خوبی کے ہیں۔ قدرت نے ہر چیز کو پیدا کرنے کے لیے ایک معیار مقرر کیا ہے، مخلوقات کی ہر نوع و ہر قسم کا ایک درجہ کمال ہے کہ جس کے آگے اس کے قدم نہیں بڑھتے حیوانات، نباتات اور جمادات تک میں اس کے ثبوت مل سکتے ہیں، صورتیں ایک ہیں، شکلیں متحد ہیں، اوصاف مختلف ہیں، لیکن ان مختلف اوصاف کی ایک انتہا ہے جسے جنس اعلیٰ سے تعبیر کیا جاتا ہے کہ جس کے آگے کوئی درجہ نہیں۔ ہر نوع میں جنس اعلیٰ کو جس پر اوصاف، جامعیت کے ساتھ جا کر ختم ہوتے ہیں ہم مقصود فطرت اور نقطہ تخلیق کہہ سکتے ہیں۔

آج انسان کی شکل وشباہت اس کے اعضاء وجوارح، اس کا ڈھانچہ، جسمانی ساخت غرضیکہ سب چیزیں ٹھیک وہی ہیں جو دنیا کے پہلے انسان کی تھیں، لیکن دماغی کیفیتوں کا حال ان سے جداگانہ ہے، ان میں برابر ارتقاء اور اختلاف جاری ہے، اب اگر غور کیا جائے تو ارتقائے دماغی کی آخری سرحد اگر کوئی ہے تو وہ ذات قدسی صفات آقائے نامدار رسول عربی ﷺ کی ہے۔ (مفردات، السیرۃ الحلبیہ، جلد اول)

یَا رَبِّ صَلِّ وَسَلِّمْ دَائِمًا اَبَدًا عَلٰی حَبِیْبِکَ خَیْرِ الْخَلْقِ کُلِّهِم

خصوصیت نمبر ۶۰

رسولِ اکرم ﷺ کی امت کو اللہ تعالیٰ نے خصوصی فضیلتوں سے نوازا

قابل احترام قارئین! رسولِ اکرم ﷺ کی امتیازی خصوصیات میں سے یہ ساٹھویں خصوصیت ہے، جسکا عنوان ہے ''رسولِ اکرم ﷺ کی امت کو اللہ تعالیٰ نے خصوصی فضیلتوں سے نوازا'' بے شک یہ اللہ ہی کا فضل ہے کہ اس ذاتِ باری تعالیٰ نے مجھ جیسے گناہ گار اور حقیر انسان کو یہ سعادت عطا فرمائی کہ میں صاحبِ خصوصیت ﷺ کے روضہ مبارک کے سائے تلے بیٹھ کر ان کی خصوصیت کو ترتیب دے رہا ہوں، اس پر میں اپنے اللہ تعالیٰ کا جتنا شکر ادا کروں کم ہے، اور امید بھی یہی ہے کہ جس اللہ تبارک وتعالیٰ نے اتنی توفیق عطا فرمائی وہی اللہ انشاء اللہ میری اس کاوش کو مقبول ومنظور بھی فرمائے گا، اور روز قیامت میری یہی کاوش میری نجات کا باعث ہوگی، انشاء اللہ۔

بہر حال محترم قارئین! آپ ﷺ کی یہ بھی ایک عظیم خصوصیت ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضور ﷺ کو وہ عظیم امت عطا کی کہ جس امت کو خصوصی فضیلتوں سے نوازا گیا تو بے شک دیگر تمام انبیاء کو ملنی والی امتوں میں سے یہ آخری امت سب سے افضل امت ہے۔ جیسا کہ اس امت کی خصوصی فضیلتوں کی تفصیل آپ آنے والے صفحات میں ملاحظہ فرمائیں گے جسے ہم نے احادیث کی روشنی میں ترتیب دیا ہے، امید ہے کہ انشاء اللہ اس خصوصیت کے مطالعے سے ہمارے دل میں حضور ﷺ کی محبت میں اضافہ ہوگا، دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہم سب کو اپنے نبی ﷺ کی تمام تعلیمات پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے آمین یارب العٰلمین۔

لیجئے اس خصوصیت کی تفصیل ملاحظہ فرمائیے:۔

ساٹھ نمبر خصوصیت کی وضاحت احادیث کی روشنی میں

رسول اکرم ﷺ کی امت سے مراد وہ امت محمد یہ ﷺ ہے، یعنی وہ جماعت یا وہ گروہ جو اجابت اور متابعت دونوں کا جامع ہے۔ جس نے حضرت محمد ﷺ کو اللہ تعالیٰ کا نبی اور رسول بھی مانا اور آپ ﷺ کی اتباع و پیروی بھی کی چنانچہ اس جماعت کو ''فرقہ ناجیہ'' (نجات یافتہ گروہ سے تعبیر کیا جاتا ہے) پس ''تنقیح'' میں لکھا ہے کہ مبتداع (یعنی وہ شخص کہ جو بدعت نکالے اور بدعت اختیار کرے) علی الاطلاق امت میں سے نہیں ہے اور جیسا کہ ''توضیح'' میں ہے، علی الاطلاق امت میں سے اہل سنت والجماعت ہیں اور وہ لوگ ہیں جن کے دین پر چلنے کا راستہ رسول اللہ ﷺ اور رسول خدا کے صحابہؓ کا راستہ کے مطابق ہے اور صاحب تلویح نے لکھا ہے کہ مبتداع کو علی الاطلاق امت میں سے خارج اس لئے کہا جاتا ہے کہ اگرچہ وہ اہل قبلہ میں ہوں مگر وہ ''امت دعوت'' ہی کے حکم میں ہوں گے جیسا کہ کفار ''امت دعوت'' ہیں ان کا شمار ''امت اجابت'' میں نہیں ہوگا۔

دوسری تمام امتوں اور ملتوں کے مقابلے میں اس امت کے فضائل و مناقب اور اس کے اجر و ثواب کی کثرت حد حصر سے خارج اور حیطہ بیان سے باہر ہے۔ بلاشبہ یہ امت رسول ﷺ تمام دوسری امتوں سے افضل اور برتر ہے، اس امت کی افضلیت و برتری کو ثابت کرنے کے لئے قرآن کریم میں خالقِ کائنات عز و جل کا یہ ارشاد کافی ہے۔ كُنتُم خَيرَ اُمةٍ اُخرِجَتْ لِلنَّاس ''(اے امت محمد) تم لوگ سب سے اچھی امت ہو جس کو لوگوں کی بھلائی کی (ہدایت اور رہنمائی) کے لئے ظاہر کیا گیا ہے۔''

وَكَذَالِكَ جَعلنكُم اُمَّةً وَّسَطاً لِّتكُونُوا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ .

''اور اسی لئے ہم نے تم کو (امت محمد یہ) ایسی امت بنایا ہے جو (ہر پہلو سے) نہایت اعتدال پر ہے تاکہ تم (مخالف) مقابلے میں گواہ ہو۔''

اور اس امت کی تعریف میں خود یہی ایک بات سب سے بھاری ہے کہ وہ محمد ﷺ کی

امت ہے، جو خاتم النبین، سید المرسلین اور افضل الخلائق ہیں اور یہ کہ تمام انبیاء اور رسولوں نے آرزو کی کہ کاش وہ محمد ﷺ کا زمانہ پاتے اور آپ ﷺ کی امت کا ایک فرد ہونے کا شرف حاصل کرتے، اس کے علاوہ اس کے خصائص وکمالات اور کرامات وفضائل میں ایسی چیزیں ثابت ہو چکی ہیں جو پچھلی امتوں میں سے کسی بھی امت کے لئے ثابت نہیں ہیں۔

حضرت ابن عمرؓ رسول کریم ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے (ہم مسلمانوں کو مخاطب کر کے) فرمایا: دوسری امتوں کے لوگوں کے مقابلے میں تمہارا عرصہ حیات اتنا ہے جتنا کہ (سارے دن کے مقابلے میں) نماز عصر کے بعد سے غروب آفتاب تک کا درمیانی وقت، علاوہ ازیں (اللہ رب العزت کے ساتھ) تمہارا معاملہ اور یہود ونصاریٰ کا معاملہ ایسا ہی ہے جیسے کہ کوئی شخص اجرت پر کام کرنے کے لئے کچھ مزدوروں کو طلب کرے اور ان سے کہے کہ کوئی ہے جو دوپہر تک میرا کام کرے اور میں (اتنے عرصے کام کرنے کی اجرت کے طور پر) ہر شخص کو ایک ایک قیراط دوں گا۔ چنانچہ اس اجرت کو منظور کر کے) یہود نے دوپہر تک ایک ایک قیراط پر کام کیا، پھر اس شخص نے کہا کوئی ہے جو دوپہر سے عصر تک میرا کام کرے اور میں ہر شخص کو ایک ایک قیراط دوں گا۔ چنانچہ یہود کے بعد حضرت عیسیٰ کے ماننے والے لوگوں نے یعنی) نصاریٰ نے دوپہر سے عصر کے وقت ایک ایک قیراط پر کام کیا، اور پھر اس شخص نے کہا کوئی ہے جو عصر سے غروب آفتاب تک میرا کام کرے اور میں ہر شخص کو دو دو قیراط دوں گا (اس کے بعد آنحضرت ﷺ نے ہم مسلمانوں کو مخاطب کر کے فرمایا) جان لو (اس مثال میں) تم ہی وہ لوگ ہو جو عصر کی نماز سے غروب آفتاب تک کام کرنے والے ہیں، یاد رکھو تمہارا اجر دوگنا ہے اور اسی وجہ سے (کہ تمہارے کام کی مدت تو کم ہے لیکن مستحق دوگنے اجر کے قرار پائے ہو) یہود ونصاریٰ بھڑک اٹھے اور بولے کہ عمل کے اعتبار سے تو ہم بہت بڑھے ہوئے ہیں لیکن اجر وثواب میں ہمارا حصہ بہت کم ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کو جواب دیا! کیا میں نے تمہارے ساتھ کچھ ظلم کیا ہے یعنی میں نے تمہاری اجرت مقرر کی تھی اور تمہیں جو کچھ دینے کا وعدہ کیا تھا کہ اس میں کچھ کمی کی

ہے، یہود و نصاریٰ نے کہا! نہیں (ہمارے حق میں تو کچھ کم نہیں کیا لیکن تیری طرف سے یہ تفاوت اور تفریق کیسی ہے؟) پروردگار نے فرمایا، حقیقت یہ ہے کہ یہ زیادہ اجر دینا میرا فضل و احسان ہے میں جس کو چاہوں زیادہ دوں (میں فاعل مختار ہوں جو چاہتا ہوں کرتا ہوں)''

(بخاری)

تشریح......اس حدیث میں ایک اجل کا لفظ آیا ہے چنانچہ اجل کسی چیز کی مدت متعینہ کو کہتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے لِتَبلُغُو اَجَلاً مُسمًّی اور کبھی اس لفظ (اجل کا اطلاق انسان کی موت پر کیا جاتا ہے، چنانچہ کہا جاتا ہے دنا اَجلہ اس شخص کی موت قریب آ گئی۔ یہ ملا علی قاریؒ نے طیبیؒ کے حوالے سے لکھا ہے اور اس کے بعد کہتے ہیں، اس کا مطلب یہ ہے کہ ''اجل'' کے لفظ سے کبھی تو اس پوری مدت کو تعبیر کیا جاتا ہے جو عمر کے لئے متعین ہوتی ہے خواہ وہ معلق ہو یا نہ ہو) جیسا کہ اللہ کے اس ارشاد ثُمَّ قضٰی أجلً مُسمًّی عِندَہٗ میں یہ لفظ استعمال ہوا ہے، اور کبھی اس لفظ کا اطلاق مدت عمر کے خاتمے اور زندگی کے آخری لمحہ پر ہوتا ہے جیسا کہ حق تعالیٰ کے ارشاد اِذَا جآءَ اَجَلُھُم لایَستأخِرُونَ ساعۃً وَّلا یَستَقدِمُون میں اس لفظ کے یہی معنیٰ مراد ہیں پس یہاں حدیث کے الفاظ انما اجلکم فی اجل من خلامن الا مم الخ میں لفظ ''اجل'' کے پہلے معنی مراد ہیں یعنی پورا عرصہ حیات پوری مدت عمر اس روشنی میں حدیث گرامی کے ان الفاظ کی وضاحت یہ ہوگی کہ! اے مسلمانو پچھلی امتوں کے لوگوں کی لمبی عمروں کے مقابلے میں تمہاری کم عمروں کا تناسب وہی ہے جو دن کے آغاز سے نماز عصر تک کے وقت کے مقابلے میں عصر کے بعد مغرب تک کے وقت کا ہے، لیکن اس کے باوجود تمہارے اجر و ثواب کی مقدار زیادہ متعین ہے جب کہ ان لمبی لمبی عمروں والوں کے لئے اجر و ثواب کی مقدار کم رکھی گئی ہے، یہ تمہارا شرف و اعزاز ہے کہ تمہارے عمل کا عرصہ کم ہے مگر اجر و ثواب کہیں زیادہ۔

''قیراط'' ایک وزن کو کہتے ہیں جو درہم کے بارہویں حصہ یا دینار کے بیسویں حصہ کے برابر ہوتا ہے۔ ''یہود نے دوپہر تک ایک ایک قراط پر کام کیا'' یعنی موسیٰؑ کو ماننے والے

اوران کی اتباع کرنے والوں نے اپنی اپنی لمبی عمروں میں کم ثواب پر زیادہ عمل کیا، اور اسی طرح وہ ان مزدوروں کے مشابہ ہوئے جنہوں نے صبح سے دو پہر تک ایک ایک قیراط پر کام کیا ہو۔ اسی طرح حضرت عیسیٰؑ کے ماننے والوں اوران کی اتباع کرنے والوں کا زمانہ آیا توانہوں نے بھی اپنے عرصہ حیات میں کم ثواب پر زیادہ عمل کیا، اور اسی طرح وہ ان مزدوروں کے مشابہ ہوئے جنہوں نے دو پہر کے بعد سے عصر تک ایک ایک قیراط پر کام کیا ہو۔

''یادرکھوتمہارا اجر دوگنا ہے'' یعنی یہود ونصاریٰ کے ساتھ تو یہ معاملہ تھا کہ وہ جتنا کرتے تھے اسی کے برابر اجر وثواب کے مستحق ہوتے تھے۔ لیکن تمہارا اعزاز یہ ہے کہ ان کی نسبت تم کو دوگنا اجر وثواب ملتا ہے گویا حدیث کا یہ مضمون اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد سے ماخوذ ہے کہ: يٰاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَاٰمِنُوْا بِرَسُوْلِهٖ يُؤْتِكُمْ كِفْلَيْنِ مِنْ رَّحْمَتِهٖ. ''اے (عیسیٰؑ پر) ایمان رکھنے والو! تم اللہ سے ڈرو اور اس کے رسول (ﷺ) پر ایمان لاؤ۔ اللہ اپنی رحمت سے تمہیں دگنا ثواب دے گا۔''

پس اس امت کے لوگوں نے نہ صرف یہ کہ اپنے نبی کو مانا اور اس کی تصدیق کی بلکہ پچھلے نبیوں اور رسولوں پر بھی ایمان لائے اور ان کی تصدیق کی لہٰذا دوگنے اجر اور دوہرے ثواب کے مستحق ہوئے۔

''لیکن اجر وثواب میں ہمارا حصہ بہت کم ہے'' یہود ونصاریٰ کی اس بات کو زیادہ وضاحت کے ساتھ یوں ادا کیا جا سکتا ہے کہ: یہ کیا ہے کہ محمد ﷺ کی امت کا کام کم، اس کے اعمال قلیل، لیکن اس کا اجر بہت اس کا ثواب زیادہ، اس امت کے مقابلے میں ہمارا کام کہیں زیادہ ہمارے اعمال بہت کثیر، مگر ہمارا اجر کہیں کم اور ہمارا ثواب بہت قلیل؟ یہاں دونوں احتمال ہیں، یہ یہود ونصاریٰ یا تو قیامت کے دن کہیں گے جب وہ امت محمدیہ ؐ کو اجر وثواب کے اعتبار سے اپنے مقابلے میں کہیں زیادہ آگے پائیں گے، یا اس طرح کی بات انہوں نے اس وقت کہی ہوگی جب ان کو اپنے اپنے زمانہ میں اپنی آسمانی کتابوں کے

ذریعہ اور اپنے رسولوں کی زبانی اس امت محمدیہ کے ایسے فضائل و خصائص معلوم ہوئے ہوں گے۔ بہر صورت اس حدیث میں اس بات کی دلیل ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو بھی ثواب ملتا ہے وہ نہ عبادات واعمال میں رنج وتعب اٹھانے کے اعتبار سے ملتا ہے اور نہ استحقاق کی جہت سے، کیونکہ بندہ اپنے مولیٰ کے نزدیک اس وجہ سے ثواب کا مستحق نہیں ہوتا کہ اس نے کوئی عبادت کی ہے، کوئی کارگزاری دکھائی ہے، بلکہ وہ اپنے محض فضل واحسان کی جہت سے بندہ کو ثواب سے نوازتا ہے اور مولیٰ کو اس کا پورا اختیار ہے کہ بندوں میں سے جس کو چاہے زیادہ سے زیادہ ثواب عطا فرمائے فَاِنَّهٗ یَفعَلُ مَا یَشآءُ و یَحکُمُ مَایُرِیدُ.

واضح ہو کہ حدیث میں مذکور ''یہودی ونصاری'' سے مراد وہ یہود ونصاریٰ ہیں جنہوں نے اپنے اپنے زمانے میں (رسول کو مانا) اس پر ایمان لائے، اس کی لائی ہوئی کتاب اور شریعت کی پیروی کی اور آخر دم تک اپنے اپنے دین حق پر قائم رہے۔ رہی ان یہود ونصاریٰ کی بات جنہوں نے اپنے دین حق سے انحراف کیا، اپنے رسول اور اپنی کتاب کا انکار کیا، ان کا یہاں کوئی ذکر نہیں ہے کیونکہ وہ تو سرے سے ثواب ہی سے محروم رہے علاوہ ازیں یہ نکتہ ذہن میں رہنا چاہیئے کہ نصاریٰ جو حضرت عیسیٰؑ اور انجیل مقدس پر ایمان رکھتے ہیں، باوجود یہ کہ حضرت موسیٰؑ اور توریت پر ایمان لائے تھے لیکن انکو یہود کی بہ نسبت زیادہ ثواب نہیں ملا، جو صرف اپنے ہی رسول اور اپنی ہی کتاب یعنی حضرت موسیٰؑ اور توریت پر ایمان لائے تھے۔

ایک اور بات اس حدیث سے حنفی علماء نے عصر کے وقت کے بارہ میں حضرت امام ابوحنیفہؒ کے قول کو اور مضبوط بنانے کے لئے استدلال کیا ہے، حضرت امام ابوحنیفہؒ کا قول یہ ہے کہ عصر کا وقت جب شروع ہوتا ہے کہ ہر شے کا سایہ اس کے دو مثل یعنی دوگنا ہو جائے۔ چنانچہ ان حنفی علماء کا کہنا ہے کہ نصاریٰ کے عرصۂ عمل کا اس امت کے عرصۂ عمل سے زیادہ ہونا اسی صورت میں سمجھا جاسکتا ہے جب کہ حدیث میں مذکورہ مثال کے مطابق انکے کام (عمل) کی مدت دوپہر کے بعد سے ہر شے کا سایہ دو مثل یعنی دوگنا ہو جانے تک رہے۔

''اور حضرت ابوہریرہؓ راوی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: حقیقت تو یہ ہے کہ میری

امت میں مجھ سے نہایت شدید اور نہایت اچھی محبت رکھنے والے وہ لوگ ہیں جو میری وفات کے بعد پیدا ہوں گے ان میں سے کوئی تو یہ آرزو کرے گا کہ کاش وہ مجھے دیکھ لے، اپنے اہل عیال اور اپنا مال واثاثہ سب کچھ مجھ پر قربان کردے" (مسلم)

تشریح......یعنی میرے تئیں محبت اس کو اس آرزو میں مبتلا رکھے گی کہ اگر میری زیارت اور میرے دیدار کا موقع اس کو نصیب ہو جائے تو وہ مجھ تک پہنچے اور اپنے اہل وعیال، اپنا گھر بار اپنا مال واثاثہ سب کچھ مجھ پر فدا کردے، واضح ہو کہ اس حدیث سے اور اس جیسی دوسری حدیثوں سے بظاہر یہ مفہوم نکلتا ہے کہ صحابہ اکرام رضوان اللہ علیہم اجمین کے بعد ہوسکتا ہے کہ بعض لوگ ایسے اس امت میں پیدا ہوں جو فضیلت میں صحابہ کرام کے برابر ہوں یا ان سے افضل ہوں چنانچہ محدثین میں سے ایک مشہور شخصیت علامہ ابن عبدالبرؒ کا رجحان اسی طرف ہے اور انہوں نے اسی طرح کی حدیث سے استدلال کیا ہے۔ اس کا ذکر ابن حجر مکی کی صواعق محرقہ میں موجود ہے، لیکن جمہور علماء کا اجماع واتفاق اسی پر ہے کہ امت کے افضل ترین افراد صحابہ کرام ہی ہیں کوئی بھی غیر صحابی خواہ دین وشریعت و معرفت، ولادیت وبزرگی اور تقویٰ وتقدس میں کتنا ہی اونچا مقام کیوں نہ رکھتا ہو، صحابی کی منزل اور اس کے مقام کو نہیں پہنچ سکتا، ان جمہور علماء نے ان احادیث کے بارے میں کہ جن سے ابن عبدالبرؒ نے استدلال کیا ہے کہا ہے کہ ان حدیث کے ذریعہ زیادہ سے زیادہ جو بات ثابت کی جاسکتی ہے وہ کسی غیر صحابہ کی کسی ایک گوشے سے جزوی فضیلت ہے لیکن جہاں تک کلی فضیلت کا تعلق ہے، کہ جو کثرت ثواب سے عبارت ہے تو وہ صرف صحابہ کے لئے ہے۔ ان علماء نے یہ بھی کہا ہے کہ اس گفتگو میں صحابہؓ سے مراد وہ خاص الخاص صحابہ ہیں جن کو انحضرت ﷺ کی صحبت ومعیت میں طویل عرصے تک رہنے کا شرف حاصل ہوا ہو، جنہوں نے آنحضرت ﷺ سے بہت زیادہ اکتساب علم وفیض کیا ہو، اور جو آنحضرت ﷺ کے ساتھ غزوات میں شریک ہوئے ہوں، رہے وہ عام العوام صحابہؓ جن کو ایک آدھ ہی مرتبہ زیارت نبوی ﷺ کا موقع ملا ہو اور بعض تو ایسے بھی ہیں جن کو پوری عمر میں بس ایک ہی مرتبہ

چہرہ اقدس کا دیدار نصیب ہوا تو ان کا مسئلہ محل توقف وتردد اور محل نظر ہے، لیکن حق یہ کہ آنحضرت ﷺ کی صحابیت کا وہ شرف وفضل جو کسی بھی صحابی کو کسی بھی غیر صحابی سے افضل وبرتر مقام عطا کرتا ہے، ہر صحابی کو حاصل ہے۔ اگر چہ کسی صحابی کو صرف ایک ہی بار آنحضرت ﷺ کے چہرے اقدس کے دیدار کا موقع ملا ہو اس فضل وشرف میں تو کوئی بھی کسی صحابی کا ہمسر شریک نہیں ہوسکتا، ہاں علمی وعملی فضیلت میں گفتگو کا دائرہ وسیع ہوسکتا ہے لیکن اس جہت سے بھی زیادہ بحث کی بجائے یہی کہنا اولیٰ ہے کہ صحابہ پوری امت میں علی الاطلاق افضل واشرف ہیں۔

''اور حضرت معاویہؓ کہتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا کہ: میری امت میں ہمیشہ ایک گروہ ایسا رہے گا جو اللہ کے حکم پر قائم ہوگا۔ اس گروہ (کے دینی وجماعتی نظم اور معاملات کو) نہ وہ شخص نقصان پہنچا سکے گا جو اس کی تائید واعانت کر چکا ہو، اور نہ وہ شخص ضرر پہنچائے گا جو (موافقت کی بجائے) اس کی مخالفت پر کمر بستہ ہوگیا ہو، یہاں تک کہ اللہ کا حکم آن پہنچے گا اور وہ اپنے اسی راستے پر یعنی احکام خداوندی اطاعت اور دین کی خدمت واعانت پر قائم ہوں گے۔ (بخاری ومسلم)

تشریح...... ''اللہ کے حکم پر قائم ہوگا''، یعنی اس گروہ کی اعتقادی اور عملی زندگی پوری عمارت ودینی فرایض اور شرعی احکام پر استوار ہوگی جو کتاب اللہ کو یاد کرنے حدیث کا علم حاصل کرنے کتاب وسنت سے استنباط کرنے، فی سبیل اللہ جہاد کرنے مخلوق خدا کی خیر خواہی میں لگے رہنے اور جتنے فرض کفایہ ہیں سب کے تئیں اپنی ذمہ داری نبھانے سے عبارت ہے اور جس کی طرف اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد اشارہ کرتا ہے: وَلْتَكُن مِّنكُمْ أُمَّةٌ يَدْعُونَ إِلَى الْخَيْرِ وَيَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنكَرِ ''اور تم میں (ہمیشہ) ایک جماعت ایسی ہونا ضرور ہے جو (دوسروں کو بھی) خیر کی طرف بلایا کرے، اور نیک کاموں کے کرنے کو کہا کرے اور برے کاموں سے روکا کریں۔

بہر حال اس حدیث سے واضح ہوا کہ روئے زمین ایسے صلحاء اور پاکیزہ نفس لوگوں

سے کبھی خالی نہیں رہے گی جو احکام خداوندی کی پیروی میں ثابت قدم رہتے ہیں، اللہ تعالیٰ نے جن چیزوں سے منع کیا ہے ان سے دور رہتے ہیں، دین وشریعت پر ہر حالت میں عمل کرتے اور بہر صورت اسلام کی بقاء وسر بلندی کے لئے سرگرم رہتے ہیں، خواہ مدد واعانت کرنے والے ان کی مدد واعانت کریں یا مخالفت پر لوگ ان کی مخالف وبرائی کریں۔

حَتّٰی یَاْتِیَ اَمرُ اللهِ (یہاں تک کہ اللہ کا حکم آن پہنچے گا) میں (امر اللہ) (اللہ کے حکم) سے موت اور انقضائے عہد مراد ہے تاہم ایک شارح نے اس سے "قیامت" مراد لی ہے لیکن اس قول پر اس حدیث کی روشنی میں یہ اشکال واقع ہوتا ہے جس میں فرمایا گیا ہے لا تَقُومُ السَّاعَةُ حتّٰی لایَکُونَ فِی الأرضِ مَنْ یَقُولُ اللهُ (روئے زمین پر جب تک ایک بھی اللہ کا نام لیوا موجود رہے گا قیامت نہیں آئے گی) اسی طرح قائمم بامر اللہ (اللہ کے حکم پر قائم ہوگا) کے معنی ایک شارح نے اللہ کے دین پر سختی سے عمل کرنا لکھے ہیں، نیز بعض حضرات نے لکھا ہے کہ حدیث میں مذکورہ "گروہ" سے مراد اہل علم کی وہ جماعت ہے جو ہر زمانہ میں حدیث کی تعلیم اور دینی علوم کی تدریس واشاعت کے ذریعہ سنت کی ترویج اور دین کی تجدید وتبلیغ کا فریضہ سرانجام دیتی رہے گی اور ایک شارح کہتے ہیں، "گروہ" سے مراد وہ لوگ ہیں جو ہمیشہ اور ہر حالت میں اسلام پر قائم رہے گے۔ ایک اور شارح لکھتے ہیں، ہوسکتا ہے اس حدیث کا مطلب یہ ہو کہ روئے زمین سے اہل اسلام کی شوکت وعظمت کبھی فناہ نہیں ہوگی۔ اگر روئے زمین کے کسی علاقے اور کسی خطہ میں اسلام اور مسلمانوں کو ضعف واضمحلال لاحق ہوگا تو کسی دوسرے علاقہ اور خطہ میں اسلام کا بول بالا اور مسلمانوں کو شوکت وعظمت حاصل رہے گی جو علاء کلمۃ اللہ اور اسلام کا پرچم سر بلند کرنے میں مستعدی سے لگے ہوں گے اور اکثر اقوال کا خلاصہ یہ ہے کہ گروہ سے مراد غازیان اسلام کی جماعت ہے جس کا کام دشمنان دین اسلام سے جہاد کر کے دین کو مضبوط وسر بلند کرنا ہے اور پھر یہی جماعت آخر زمانہ میں اسلامی سرحدوں کی حفاظت ونگہبانی کرے گی۔ بعض روایتوں میں وھم بالشام کے الفاظ بھی آئے ہیں یعنی اس گروہ کا مستقر ملک شام ہوگا اور بعض روایتوں میں یہ

الفاظ بھی ہیں **حتی یقاتل اخرھم مسیحُ الدَّجّال** (یہاں تک کہ وہ اس گروہ کے آخری افراد دجال کو قتل کریں گے) گویا یہ روایتیں اس بات پر دلالت کرتی ہیں کہ "گروہ" سے مراد غازیان اسلام ہی کی جماعت ہے لیکن حدیث کے ظاہری مفہوم سے جو بات ثابت ہوتی ہے وہ یہی ہے کہ عمومی طور پر ہر وہ جماعت اور ہر وہ طبقہ مراد ہے جو اللہ کے سچے دین پر قائم ہو اور اللہ کے دین کی خدمت واشاعت میں اور اسلام کی سربلندی کیلئے کسی بھی صورت سے مصروفِ عمل ہو۔ (بحوالہ مظاہر حق جلد پنجم)

یَا رَبِّ صَلِّ وَسَلِّمْ دَائِمًا اَبَدًا   عَلٰی حَبِیْبِکَ خَیْرِ الْخَلْقِ کُلِّھِم

خصوصیت نمبر ۶۱

رسولِ اکرم ﷺ قیامت کے دن سب سے پہلے اٹھیں گے

قابل احترام قارئین! رسولِ اکرم ﷺ کی امتیازی خصوصیات میں سے یہ اکسٹھویں خصوصیت ہے، جسکا عنوان ہے ''رسولِ اکرم ﷺ قیامت کے دن سب سے پہلے اٹھیں گے'' جیسا کہ آنے والے اوراق میں اس خصوصیت کی وضاحت کی جارہی ہے، بیشک ذیل میں آنے والی خصوصیت بھی آپ ﷺ کی ایک عظیم خصوصیت ہے کہ آپ ﷺ قیامت کے دن سب سے پہلے اٹھیں گے جبکہ دیگر انبیاءؑ اوران کی امتیں بعد میں اٹھیں گی، تو معلوم ہوا کہ جس طرح اللہ تعالیٰ نے حضرت محمد ﷺ کو دنیا میں خصوصیات سے نوازا آخرت میں بھی اسی طرح عظیم خصوصیات سے نوازے جائیں گے، بے شک یہ اللہ رب العٰلمین کی اپنے آخری نبی ﷺ سے خاص محبت وقرب کی عمدہ علامت ہے، آنے والے اوراق میں احادیث کی روشنی میں ہم نے اس خصوصیت کو ترتیب دیا ہے، انشاء اللہ اس کے مطالعے سے معلومات میں بھی اضافہ ہوگا اور ایمان کو بھی جلا ملے گی، دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہم سب کو عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے آمین یارب العٰلمین۔ لیجئے اب اس خصوصیت کی تفصیل ملاحظہ فرمائیں:۔

اکسٹھ نمبر خصوصیت کی وضاحت احادیث کی روشنی میں

صحیح بخاری میں ہے کہ کچھ عرصہ بعد ایک بڑی آگ جنوب کی طرف سے نمودار ہوگی اور لوگوں کی طرف بڑھنے لگے گی، جس سے لوگ بے تحاشہ بھاگیں گے آگ ان کا پیچھا کرے گی جب لوگ دو پہر کو تھک جائیں گے اور اپنی عاجزی کا اظہار کریں گے تو آگ بھی ٹھہر جائے گی اور آدمی بھی آرام کرلیں گے۔

صبح ہوتے ہی آگ پھر پیچھا کرے گی۔ انسان اس سے بھاگیں گے اس طرح

کرتے کرتے وہ ملک شام تک پہنچ جائیں گے اس کے بعد آگ واپس لوٹ کر غائب ہوجائے گی۔

اس کے بعد قیامت قائم ہونے کی پہلی نشانی یہ ہوگی کہ لوگ تین چار سال تک غفلت میں پڑے رہیں گے، اور دنیاوی نعمتیں، دولت اور شہوت رانی بکثرت ہوجائے گی کہ جمعہ کے دل جو محرم کی دسویں تاریخ بھی ہوگی صبح ہوتے ہی لوگ اپنے اپنے کاموں میں مشغول ہوں گے کہ اچانک ایک باریک لمبی آواز سنائی دے گی۔ یہی صور کا پھونکنا ہوگا۔ ہر طرف کے لوگوں کو یکساں سنائی دے گی اور لوگ حیران ہوں گے کہ یہ کیسی آواز ہے؟...... آہستہ آہستہ یہ آواز بجلی کی کڑک کی طرح سخت اور اونچی ہوجائے گی۔ انسان بے قرار ہوجائیں گے۔ جب آواز میں پوری سختی ہوجائے گی تو لوگ ہیبت کی وجہ سے مرنے شروع ہوجائیں گے۔ زمین میں زلزلہ آئے گا۔

قرآن کریم میں ہے:۔﴿ اِذَا زُلْزِلَتِ الْاَرْضُ زِلْزَالَها. ﴾ (پارہ عمّ) "اس زلزلے کے ڈر سے لوگ گھروں کو چھوڑ کر میدانوں میں بھاگ کھڑے ہوں گے۔"

اور وحشی جانور خائف ہوکر لوگوں کی طرف بڑھیں گے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:﴿وَاِذَا الْوُحُوْشُ حُشِرَتْ﴾ (پارہ عمّ) "جس وقت وحشی جانور جانوروں کے ساتھ اکٹھے کئے جائیں گے۔" (ترجمہ شاہ رفیع الدینؒ)

زمین جا بجا شق ہوگی، ارشاد ہے:﴿وَتَنْشَقُّ الْاَرْضُ. ﴾ (القرآن) "سمندر ابل کر قرب وجوار کی بستیوں میں جا گریں گے۔" ارشاد گرامی ہے:﴿وَاِذَا الْبِحَارُ فُجِّرَتْ. ﴾ "اور جب دریا بہ چلیں۔" (ترجمہ شاہ عبدالقادر) آگ بجھ جائے گی بلند و بالا پہاڑ ٹکڑے ٹکڑے ہوکر تیز ہوا کے چلنے سے ریت کی طرح اڑ جائیں گے۔﴿وَاِذَا الْجِبَالُ نُسِفَتْ﴾ (پارہ عمّ) "اور جب پہاڑ اڑا دیئے جائیں۔"

گرد و غبار کے اڑنے اور آندھیوں کے آنے کی وجہ سے پوری دنیا تاریخ لگ رہی ہوگی اور وہ آواز صور سخت ہوجائے گی حتی کہ اس کے ہولناک ہونے پر آسمان پھٹ جائیں

گے۔ستارے ٹوٹ ٹوٹ کر ریزہ ریزہ ہو جائیں گے۔

پھر ایک وقت تک ذات واحد ہی رہے گی۔ پھر ایک مدت کے بعد از سر نو پیدائش کا سلسلہ جاری کرے گا لیکن یہ کتنی مدت کے بعد ہوگا اسے اس کے علاوہ کوئی بھی نہیں جانتا ہے۔آسمان زمین اور فرشتوں کو پیدا کرے گا۔جب سب آدمی مر جائیں گے تو ملک الموت شیاطین کی روح قبض کرنے کی طرف متوجہ ہوں گے، یہ ملعون چاروں طرف دوڑتا پھرے گا ،مگر فرشتے اسے آگ کے گرزوں سے لوٹا دیں گے اور اس کی روح قبض کر لیں گے۔سکرات موت کی جتنی تکلیفیں پوری انسانیت کو پہنچی ہیں ان سب تکلیفوں کی مقدار اس اکیلے کو ملے گی۔ مسلسل چھ ماہ تک صور پھونکا جاتا رہے گا اس صور کے پھونکنے کے بعد نہ آسمان رہے گا نہ ستارے رہیں گے، نہ پہاڑ رہیں گے نہ سمندر نہ کوئی چیز (الغرض) ہر چیز نیست و نابود ہو جائے گی۔فرشتے بھی مر جائیں گے، مگر آٹھ چیزیں فنا نہ ہوں گی۔

اول عرش، دوم کرسی، سوم لوح، چہارم قلم، پنجم جنت، ششم صور، ہفتم دوزخ، ہشتم روحیں، لیکن روح کو بھی بے خودی ضرور ہوگی، بعضوں کا قول ہے کہ یہ آٹھ چیزیں بھی تھوڑی دیر کے لیے معدوم ہو جائیں گی، حاصل کلام یہ کہ جب اللہ تعالیٰ کی ذات کے علاوہ کوئی نہ رہے گا تو اللہ تعالیٰ فرمائے گا۔لِمَنِ المُلکُ الیَوم؟ ''کہاں ہیں حکومتوں کے دعویدار اور بادشاہ''؟ کس کے لئے ہے آج کی سلطنت؟...... پھر خود ہی ارشاد فرمائیں گے۔ لِلّٰہِ الوَاحِدِ القَهَّار۔خدائے یکتا و قہار کے لیے ہے۔

روایات میں آتا ہے کہ قیامت کے دن زمین ایسی ہوگی کہ اس میں عمارتوں درختوں اور پہاڑوں اور سمندروں وغیرہ کا نشان تک نہ ہوگا، اس کے بعد اللہ تعالیٰ جس جس مقام پر سے لوگوں کو چاہے گا وہیں سے زندہ کرے گا۔(زندہ کرنے کا طریقہ یہ ہوگا کہ) پہلے ان کی ریڑھ کی ہڈی کو پیدا کرے گا۔ (بخاری و مسلم)

اور ان کے دیگر اجزاء جسمانی کو اس ہڈی کے متصل رکھ دے گا، ریڑھ کی ہڈی اس ہڈی کو کہتے ہیں جس سے تمام جسم کی پیدائش شروع ہوتی ہے۔تمام اجزاء جسمانی کو (اس

ہڈی کے ساتھ) ترتیب دے کر گوشت پوست چڑھا کر جو صورت مناسب ہو گی عطا فرمائیں گے۔ جسمانی قالب کی تیاری کے بعد تمام روحیں صور میں داخل کر کے حضرت اسرفیل علیہ السلام کو حکم فرمائیں گے کہ ان کو پوری طاقت سے پھونک دیں اور خداوند تعالیٰ فرمائیں گے! "قسم ہے میری عزت وجلال کی! کوئی روح بھی اپنے ڈھانچے کے علاوہ کہیں نہ جائے (حکم الٰہی سن کر تمام) روحیں اس طرح اپنے اپنے جسموں میں آجائیں گی جس طرح پرندے اپنے اپنے گھونسلوں میں چلے جاتے ہیں"۔

صور اسرافیل میں روحوں کی تعداد کے مطابق سوراخ ہیں۔ جن میں سے روحیں پھونکنے پر پرندوں کی طرح نکل کر اپنے اپنے ڈھانچوں میں داخل ہو جائیں گی اور ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ان کا تعلق جسموں کے ساتھ قائم ہو جائے گا اور سب کے سب زندہ ہو جائیں گے۔ اس کے بعد پھر صور پھونکا جائے گا۔ جس کی وجہ سے زمین پھٹ کر لوگوں کو باہر نکال دے گی، لوگ گرتے پڑتے صور (کی آواز) کی طرف دوڑیں گے۔ یہ صور بیت المقدس کے اس مقام پر پھونکا جائے گا جہاں صخرہ معلق ہے بدنوں میں روحوں کی آمد اور دوسرے صور کے پھونکنے میں چالیس سال کا عرصہ لگ جائے گا۔ (بخاری)

قبروں سے لوگ اسی شکل میں پیدا ہوں گے جس طرح ماں کے پیٹ سے پیدا ہوئے تھے یعنی ننگے بدن بے ختنہ اور بغیر داڑھی ہوں گے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: كَمَا بَدَأْنَا اَوَّلَ خَلْقٍ نُّعِيدُهٗ. "جیسا کہ ہم نے اس خلقت کو اول مرتبہ پیدا کیا ہے اسی طرح دوبارہ بھی پیدا کریں گے۔ (القرآن)

صحیح بخاری و مسلم میں ہے کہ لوگ ننگے بدن ہوں گے ان کا ختنہ نہ ہوا ہو گا۔ داڑھیاں نہ ہوں گی صرف سر کے بال اور منہ میں دانت ہوں گے۔ سب چھوٹے بڑے، گونگے بہرے لنگڑے اور کمزور سب کے سب درست اعضاء والے ہوں گے۔

سب سے پہلے زمین میں سے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم اُٹھیں گے آپ کے بعد حضرت عیسیٰ علیہ السلام پھر جگہ جگہ سے انبیاء علیہم السلام، صدیقین، شہداء وصالحین اٹھیں

گے۔ان کے بعد مؤمنین، پھر فاسقین، پھر کفار، تھوڑی تھوڑی دیر بعد یکے بعد دیگرے بر آمد ہوں گے۔ (صحیح مسلم)

حضرت ابوبکر و عمر آنحضرت ﷺ اور حضرت عیسیٰ کے درمیان ہوں گے۔آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اُمت آپ کے پاس اور دوسرے نبیوں کی اُمتیں اپنے اپنے نبیوں کے پاس جمع ہو جائیں گی خوف اور دہشت کی وجہ سے سب کی آنکھیں آسمان پر لگی ہوں گی۔کوئی شخص کسی کی شرم گاہ کو نہیں دیکھے گا،اگر دیکھے گا تو بچوں کی طرح دل میں شہوت سے خالی ہو گا۔ (صحیح بخاری و مسلم و ترمذی)

صحیح مسلم میں ہے کہ جب لوگ اپنے اپنے مقام پر کھڑے ہوں گے تو سورج اس قدر قریب کر دیا جائے گا کہ گویا بس ایک میل پر ہے،آسمان کی طرف چمکنے والی بجلیاں اور خوفناک آوازیں سنائی دیں گی۔سورج کی گرمی کی وجہ سے تمام کے بدنوں سے پسینہ جاری ہو جائے گا،پیغمبروں اور نیک بخت مومنوں کے تو صرف تلوے تر ہوں گے عام مومنین کے ٹخنے پنڈلی، گھٹنے، زانو، کمر، سینہ اور گردن تک اعمال کے مطابق پسینہ چڑھ جائے گا۔کفار منہ اور کانوں سے پسینہ میں غرق ہو جائیں گے اور اس سے ان کو سخت تکلیف ہوگی، بھوک پیاس کی وجہ سے لوگ لاچار مٹی کھانے لگیں گے اور پیاس بجھانے کی غرض سے حوض کوثر کی طرف جائیں گے،دوسرے نبیوں کو بھی حوض دیئے جائیں گے لیکن وہ اپنی لذت اور وسعت میں (آپ ﷺ کے حوض کوثر سے) کم ہوں گے۔سورج کی گرمی کے علاوہ بھی کئی ہولناک مناظر ہوں گے ایک ہزار سال تک لوگ انہی مصائب و مشکلات میں مبتلا ہوں گے اور سات گروہ وہ ہوں گے جن کو اللہ تبارک وتعالیٰ اپنے سائے میں جگہ نصیب فرمائیں گے،تمام روایات سے ثابت ہے کہ اللہ تعالیٰ کے عرش کا سایہ حاصل کرنے والے لوگ چالیس فرقوں پر مشتمل ہوں گے۔ (بحوالہ چیدہ چیدہ از آثار قیامت اور فتنہ دجال)

قیامت کے دن حضور ﷺ عرش الٰہی کے دائیں جانب کھڑے ہوں گے

و عن ابی هُرَیرةَ عن النبی صلی اللّٰہ علیه وسلم قال فاکسیٰ حُلَّةً مِن حُلَلِ الجَنَّةِ ثُمَّ اَقومُ عَن یَمِینِ العَرشِ لَیسَ اَحَدٌ مِّنَ الخَلائِقِ یقُومُ ذٰلِکَ المَقامَ غَیرِی رواهُ التِّرمِذی وفی رِوَایَةِ جامعِ الاُصولِ عنهُ اَنَا اوَّلُ مَن تَنشَقُّ عَنهُ الأرضُ فاکسیٰ.

ترجمہ:...... ''حضرت ابوہریرہؓ نبی کریم ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا (قیامت کے دن) مجھے جنت کے جوڑوں میں سے ایک جوڑا پہنایا جائے گا اور پھر میں عرش کے دائیں جانب کھڑا ہوں گا، جہاں میرے سوامخلوق میں سے کوئی اور کھڑا نہیں ہوگا۔'' اور جامع الاصول کی روایت میں، جو حضرت ابوہریرہؓ ہی سے منقول ہے، یوں ہے کہ (آپ ﷺ نے فرمایا) سب سے پہلے میری قبر شق ہوگی اور میں باہر آؤں گا، پھر مجھے ایک جنتی جوڑا پہنایا جائے گا۔ (بحوالہ مشکوۃ شریف)

یَا رَبِّ صَلِّ وَسَلِّمْ دَائِمًا اَبَدًا   عَلٰی حَبِیْبِکَ خَیْرِ الْخَلْقِ کُلِّهِمِ

خصوصیت نمبر ۶۲

رسولِ اکرم ﷺ کے ظہور سے متعلق بتوں کے پیٹ سے صدائیں بلند ہوئیں

قابلِ احترام قارئین! رسولِ اکرم ﷺ کی امتیازی خصوصیات میں سے یہ باسٹھویں خصوصیت پیش کی جارہی ہے جس کا عنوان ہے ''رسولِ اکرم ﷺ کے ظہور سے متعلق بتوں کے پیٹ سے صدائیں بلند ہوئیں'' الحمدللہ اس خصوصیت کو ترتیب دینے کے لئے بھی اللہ تعالیٰ نے روضہ رسول ﷺ کے قریب ریاض الجنۃ میں بیٹھنے کی توفیق دی بے شک یہ اسی کا فضل ہے ورنہ لوگوں کے اژدھام کی وجہ سے دو نفل کے لئے جگہ ملنا مشکل ہوتی ہے چہ جائیکہ ایسی جگہ کا مل جانا کہ جہاں بیٹھ کر کئی گھنٹوں تک لکھا جا سکے، بہر حال اس پر میں اپنے اللہ کا صد بار شکر ادا کرتا ہوں کہ جس ذات نے ریاض الجنۃ میں بٹھا کر اپنے محبوب ﷺ کی خصوصیت سے متعلق کام کرنے کی توفیق عطا فرمائی، اور مزید اسی اللہ تعالیٰ کی ذات سے قوی امید ہے کہ وہ میری اس ٹوٹی پھوٹی کاوش کو مقبول و منظور بھی فرمائے گا انشاء اللہ، اور جب قیامت کا دن ہوگا، لوگوں میں نفسا نفسی ہوگی، تو انشاء اللہ آج ریاض الجنۃ میں روضہ رسول ﷺ کے سائے تلے بیٹھ کر آقا ﷺ کی خصوصیت کو ترتیب دینے کی وجہ سے آقا ﷺ کی شفاعت نصیب ہوگی اور انشاء اللہ اللہ کے فضل سے ضرور ہوگی، دعا ہے کہ یارب اپنی بارگاہ میں اسے قبول فرما، آمین یارب العالمین۔

بہر حال محترم قارئین! آنے والے اوراق میں آپ رسول اکرم ﷺ کی اس عظیم خصوصیت کو ملاحظہ فرمائیں گے جس کے ذیل میں ہم نے کچھ واقعات ترتیب دیئے ہیں کہ جن سے یہ ثابت ہوگا کہ واقعتاً آپ ﷺ کے ظہور سے متعلق بتوں کے پیٹ سے بھی

صدائیں بلند ہوئیں، یعنی بتوں نے آپ ﷺ کی رسالت کی گواہی دی، امید ہے کہ انشاءاللہ اس خصوصیت کے مطالعے سے ہمارے دل میں حضور ﷺ کی عقیدت میں اضافہ ہوگا، دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہم سب کو آپ ﷺ سے سچی محبت کرنے اور آپ ﷺ کی صحیح صحیح قدر دانی کی توفیق عطا فرمائے آمین یارب العٰلمین۔

باسٹھ نمبر خصوصیت کی وضاحت احادیث کی روشنی میں

آپ ﷺ کے ظہور کے متعلق بتوں کے اندر سے آوازیں سنائی دینے کے جو واقعات پیش آئے وہ بھی بے شمار ہیں ان میں ہی سے ایک عباس بن مرداس کا واقعہ ہے۔ عباس کہتے ہیں کہ مرداس سلمی کا ایک مخصوص بت تھا جس کی وہ عبادت کیا کرتا تھا۔ اس بت کا نام ضمار تھا۔ جب مرادس کا وقت آخر ہوا تو اس نے عباس یعنی اپنے بیٹے سے کہا۔ ”بیٹے! ضمار کی عبادت کرتے رہنا اس لئے کہ یہی تمہیں فائدہ پہنچاتا ہے اور یہی نقصان پہنچاتا ہے۔

(چنانچہ عباس اپنے باپ کے مرنے کے بعد ضمار کی پوجا کرنے لگے) ایک روز جبکہ ضمار کے پاس عبادت کرنے گئے تو اچانک انہیں اس بت کے پیٹ سے کسی پکارنے والے کی آواز آئی جو یہ کہہ رہا تھا۔

من للقبال من سلیم کلها　　اودی ضمار وعاش اهل المسجد

ترجمہ...... بنی سلیم کے قبیلوں کا محافظ اب کون ہوگا کہ ضمار کے پوجنے والے ہلاک ہوگئے اور مسجد کو آباد کرنے والوں نے زندگی پالی۔

ان الذی ورث النبوة والهدی　　بعد ابن مریم من قریش مهتد

ترجمہ...... حضرت عیسیٰ بن مریم کے بعد قریش میں سے ایک شخص ہدایت کا سر چشمہ اور وارث بن کر آیا ہے۔

اودی ضمار و کان یعبد مدة　　قبل الکتاب الی النبی محمد

ترجمہ...... اب وہ ضمار ہلاک اور ختم ہو چکا ہے جس کو محمد ﷺ کے اوپر کتاب یعنی

قرآن نازل ہونے سے پہلے ایک زمانے تک پوجا جاتا رہا۔

چنانچہ اس کے بعد ہی عباس نے ضمار بت کو جلا کر تباہ کر دیا اور خود آنحضرت ﷺ کی خدمت میں پہنچ کر آپ سے آملے۔

عباس ابن مرداس کے متعلق ایک روایت اس طرح ہے کہ ایک روز دوپہر کے وقت وہ اپنے اونٹوں کے گلے کے ساتھ تھے کہ اچانک انہیں ایک سوار نظر آیا جو ایک سفید رنگ کی اونٹنی پر سوار تھا اور سفید ہی لباس پہنے ہوئے تھا۔ اس سوار نے عباس سے کہا۔ ''اے عباس! کیا تم نہیں دیکھتے کہ آسمان اپنی حفاظت سے رک گیا، خوں ریزی نے خود اپنے آپ کو ہی پھونک ڈالا اور گھوڑوں نے اپنے کھر توڑ ڈالے وہ ہستی جس پر نیکی اور پرہیز گاری اتری ہے قصواء اونٹنی کی مالک ہے''

(مراد ہیں آنحضرت ﷺ کیونکہ آپ کی اونٹنی کا نام قصواء تھا) غرض عباس کہتے ہیں کہ میں یہ بات سن کر کچھ ڈر سا گیا اور فوراً اپنے بت کے پاس آیا جس کا نام ضمار تھا۔ ہم اس بت کی عبادت کیا کرتے تھے میں اس بت کے گرد گھوما اور پھر میں نے برکت کے لئے اس پر ہاتھ پھیرا ہی تھا کہ اچانک اس کے پیٹ میں سے ایک پکارنے والے کی آواز آئی جو یہ کہہ رہا تھا۔

قل للقبا ل من قریش کلها ہلک الضمار وفاز اهل المسجد

ترجمہ:..... قریش کے تمام قبیلوں سے بتلا دو کہ ضمار بت ہلاک ہو گیا اور مسجدوں کو آباد کرنے والے کامیاب ہو گئے۔

ہلک الضمار و کان یعبد مدة قبل الصلاة علی النبی محمد

ضمار ہلاک ہو گیا جو آنحضرت ﷺ پر درود بھیجے جانے سے پہلے ایک مدت تک پوجا جاتا رہا تھا۔

ان الذی ورث النبوة والهدیٰ بعد ابن مریم من قریش مهتد

وہ محمد ﷺ ہیں جو عیسیٰ ابن مریم کے بعد قریش میں سے نبوت اور ہدایت کے وارث

بن کر ظاہر ہوئے ہیں۔

عباس ابن مرداس کہتے ہیں (یہ آواز سننے کے بعد) میں اپنی قوم بنی حارثہ کے لوگوں کے ساتھ آنحضرت ﷺ کی خدمت میں پہنچنے کے لئے مدینہ کو روانہ ہو گیا۔ جب میں مسجد نبوی میں داخل ہوا اور آنحضرت ﷺ نے مجھے دیکھا تو آپ مسکرائے اور فرمایا۔ "اے عباس! تم اسلام کی طرف کیسے جھکے"؟ میں نے آپ ﷺ کو پوار واقعہ سنایا تو آپ نے فرمایا کہ تو نے سچ کہا۔ اس کے بعد میں اپنی قوم کے لوگوں کے ساتھ مسلمان ہو گیا۔

اسی طرح مازن ابن غضوبہ کا واقعہ ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ میں عمان کے قریب ایک گاؤں میں ایک بت کا پجاری اور خادم تھا۔ اس گاؤں کو سائل یا سمال کہا جاتا تھا اور بت کا نام باور تھا۔ ایک قول یہ ہے کہ اُس کا نام باحر تھا۔ غرض ایک روز ہم نے اس بت کے سامنے ایک جانور کی قربانی پیش کی۔ یہ قربانی یا تو عام قربانی تھی (جو مشرکین اپنے بتوں کو پیش کرتے تھے)اور یا جیسا کہ ایک قول یہ بھی ہے کہ یہ قربانی ایک خصوصی قربانی تھی جو صرف رجب کے مہینے میں کسی خاص مقصد کے لئے پیش کی جایا کرتی تھی۔ غرض جیسے ہی ہم نے وہ قربانی پیش کی اسی وقت ہمیں اس بت کے پیٹ میں سے ایک آواز آئی جس کے الفاظ یہ تھے۔ "اے مازن! سن اور خوش ہو جا، بھلائی ظاہر ہو گئی اور برائی مٹ گئی۔ مضر کی اولاد میں سے ایک نبی کا ظہور ہو گیا جو اللہ تعالیٰ کا دین لے کر آئے ہیں۔ اس لئے پتھر کے ان تراشوں کو چھوڑ دے اور جہنم کی آگ سے محفوظ ہو جا۔"

مازن کہتے ہیں کہ میں اس آواز کو سن کر گھبرا گیا اور دل میں سوچنے لگا کہ یہ تو بڑا عجیب معاملہ ہے۔ کچھ دن کے بعد ایک مرتبہ پھر میں نے اس بت کے لئے ایک جانور کی قربانی پیش کی۔ اسی وقت مجھ پر بت کے اندر سے آواز آتی ہوئی یہ آواز سنائی دی۔ **اقبل الی اقبل تسمع مالا تجهل هذا نبی مرسل** میری طرف دیکھو میری طرف۔ اور وہ بات سنو جس سے غفلت نہیں برتنی چاہئے۔ کہ یہ خدا کی طرف سے بھیجے ہوئے نبی ہیں ۔ **جاء بحق منزل امن به کی تعدل عن حر نا تشعل** اور آسمان سے ایک سچائی لے

کرآئے ہیں۔ان پر ایمان لاؤتا کہ تم۔بھڑکتی ہوئی آگ سے بچ جاؤ۔**وقودھا بالجندل** جس جلتی ہوئی آگ کا ایندھن جندل ہے۔

یہ آواز سن کر میں نے دل میں کہا کہ یہ تو بڑا عجیب معاملہ ہے لیکن بے شک یہ کوئی نیکی اور خیر ہے جو میرے نصیب میں آنے والی ہے۔

اس کے بعد مازن کہتے ہیں کہ اسی طرح کچھ وقت گزرا تھا کہ ایک دن حجاز کا رہنے والا ایک شخص ہمارے پاس یہاں آیا۔ ہم نے اس سے پوچھا" تمہارے یہاں کے کیا حالات اور خبریں ہیں"؟ اس نے کہا" وہاں ایک شخص ظاہر ہوا ہے جس کا نام احمد ہے جو شخص بھی اس سے ملتا ہے وہ اس سے کہتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف بلانے والے کی آواز پر لبیک کہو"۔ میں نے یہ سن کر کہا" یہی وہ وہ خبر ہے جو میں نے (بت کے اندر سے آنے والی آواز سے) سنی ہے"

چنانچہ اس کے بعد میں اس بت کے پاس آیا میں نے اس کو توڑ کر ریزہ ریزہ کرڈالا۔ پھر میں اپنی سواری پر سوار ہو کر چلا اور آنحضرت ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ میرے دل میں اسلام کے لئے گنجائش اور اشتیاق پیدا ہو گیا تھا چنانچہ میں مسلمان ہوا اور میں نے یہ شعر کہے۔

کسر ت بادر اجذا و کان لنا ربا نطیف به ضلا بضلال

ترجمہ......میں نے بادر نامی بت کو توڑ کر ٹکرے ٹکڑے کرڈالا جو کبھی ہمارا معبود تھا اور ہم اپنی گمراہی کی وجہ سے اس کے گرد گھوما کرتے تھے۔

بالھا شمی ھذا نا من ضلالتنا ولم یکن دینه شیئاً علی بالی

ایک ہاشمی شخص کے ذریعہ ہم نے اپنی گمراہیوں سے ہدایت پالی ہے حالانکہ اس سے پہلے اس کے دین کی میرے دل میں کوئی قدر و قیمت نہیں تھی۔

یا راکبا بلغن عمرا و اخوتھا انی لما قال ربی بادر قالی

اے سوار تو یہ بات عمر اور اس کے بھائیوں کو پہنچا دینا کہ میں اپنے رب کے حکم پر

بادر سے شدید نفرت رکھتا ہوں۔

یہاں عمرو اور اس کے بھائیوں سے مراد بنی خطامہ ہیں جو قبیلہ طے کی ایک شاخ تھی مگر کتاب سد الغابہ میں (جہاں مازن کی اس روایت کا ذکر ہے وہاں) یہ شعر ذکر نہیں کئے گئے ہیں۔

غرض مازن کہتے ہیں کہ مسلمان ہونے کے بعد میں نے آنحضرت ﷺ سے عرض کیا۔"یارسول اللہ ﷺ میں عیش ونشاط، شراب و کباب اور بدکار عورتوں کے ساتھ شب بسری کا رسیا اور ان حرکتوں میں ڈوبا ہوا ہوں۔ یہاں بدکار عورتوں کے لئے ھلوک کا لفظ استعمال کیا گیا ہے جس کا مطلب فاجرہ عورتیں ہیں جو خود سے مردوں کی طرف جھکتی ہیں اور ہم بستری کے وقت بے حیائی کے ساتھ عشوہ طرازیاں کرتی ہیں۔ ھلوک کے ایک معنی ساقطہ کے بھی کئے جاتے ہیں یعنی ایسی عورتیں جو شہوت پرست اور جنس زدہ ہوتی ہیں۔

(غرض مازن نے آپ سے مزید عرض کیا کہ۔ ساتھ ہی میری دوسری عرض یہ ہے کہ) ہم پر عرصہ سے خشک سالی اور قحط مسلط ہے جس کے نتیجے میں مال ودولت بھی ختم ہو گیا اور ڈھور ڈنگر اور اولاد بھی تباہ ہو رہی ہے (میری تیسری عرض یہ ہے کہ) میرے کوئی لڑکا نہیں ہے اس لئے آپ میرے واسطے اللہ تعالیٰ سے دعا فرمائیں کہ میری یہ کمزوریاں اور برائیاں دور ہو جائیں ہمیں بارش وسیرابی حاصل ہو اور یہ کہ اللہ تعالیٰ مجھے ایک بچہ عنایت فرمادے"

میری یہ درخواست سن کر آنحضرت ﷺ نے میرے لئے دعا کرتے ہوئے یہ فرمایا۔

"اے اللہ! اس کا عیش وعشرت قرآن پاک کی تلاوت میں پیدا فرمادے۔ اس کی حرام کاری میں دلچسپی کو حلال کاموں میں پیدا فرمادے۔ شراب سے رغبت کو میٹھے پانی میں پیدا فرمادے جسمیں کوئی گناہ اور برائی نہیں ہے۔ اور زنا سے دلچسپی کو پاکدامنی میں بدل دے اس کو بارش اور سیرابی سے نواز دے اور اس کو بچہ عطا فرما۔"

مازن کہتے ہیں کہ (آنحضرت ﷺ کی اس دعا کی برکت سے) اللہ تعالیٰ نے میری کمزوریاں اور بدکرداریاں دور فرمادیں۔ جلد ہی مجھے قرآن پاک کا کچھ حصہ یاد ہو گیا۔ کئی حج

کر لئے۔عمان یعنی ان کا گاؤں اوراس کے آس پاس کے دوسرے علاقے سرسبز وشاداب ہو گئے۔(پاکدامنی میسر آئی کہ) میں نے چار آزاد شریف عورتوں سے نکاح کئے اور حق تعالیٰ نے مجھےاولاد کی دولت سے مالا مال کیا۔یہاں تک کہ پھر میں یہ شعر پڑھا کرتا تھا۔

اِلیکَ رسولَ اللہ جنت مطیَّتی تجوب القیافی من عمان الی المرج

ترجمہ......یارسول اللہ میری سواری آپ کی طرف عمان سے مرج تک صحراؤں کو طے کرتی ہوئی ذوق وشوق کے ساتھ آئی ہے۔

تشفع لی یاخیر من وطئ الحصا فیغرلی ذنبی وارجع با لفلج

تا کہ آپ اے کنکریوں کوروندنے والوں میں بہترین شخص میری سفارش کریں اور پھر میں مغفرت اور کامیابی کے ساتھ لوٹوں۔

الیٰ معشر خالفت فی اللہ دینهم ولا رایهم رای ولا شر جهم شرجی

ایک ایسے قبیلے کی طرف جن کے دین کی میں نے اللہ تعالیٰ کے لئے مخالفت کی ہے اوراب ان کی اور میری نہ رائے ایک ہےاور نہ طریقہ ایک ہے۔

وکنت امرء بالعهر والخمر مولعا شبابی حتی ازن الجسم بالنهج

میں جوانی میں بے انتہا شرابی اورعیاش آدمی تھا یہاں تک کہ جوانی اسی میں گزری اوراب بوڑھا ہو گیا۔

فبد لنی بالخمر خوفا و خشیة وبا نعهرا احصا نا محصن لی فرجی

اب اللہ تعالیٰ نے شراب کے بدلے میں تو مجھے اپنا خوف عطا فرمایااور زنا کاری کے بدلے میں پاک دامنی عطا فرمائی۔ جس سے میری شرم گاہ محفوظ ہو گئی۔

فا صبحت همی فی الجهاد و نیتی فی، اللّٰماصولی وللّٰما حجی

اب میری نیت اور خواہشات صرف اللہ کے راستے میں جہاد کے لئے ہیں اسی طرح میرے روزے اور میرا حج اللہ کے لئے ہے۔

مازن کہتے ہیں کہ(مسلمان ہو جانے کے بعد) جب میں اپنی قوم کے پاس واپس

آیا تو ان لوگوں نے مجھے بہت لعنت ملامت کی اور مجھ سے نفرت کرنے لگے، انہوں نے اپنے شاعروں سے کہہ کر میری ہجواور برائی میں شعر لکھوائے۔ میں نے خود سے کہا اگر میں بھی جواب میں ان کی ہجواور برائیاں کرنے لگوں تو ایسا ہی ہے جیسے میں خود اپنے آپ کو ہی برا بھلا کہنے لگوں۔

آخر میں ان لوگوں سے الگ تھلگ ہو کر ایک مسجد (عبادت گاہ) میں رہنے لگا جہاں ہر وقت عبادت کیا کرتا تھا۔ یہ مسجد ایسی تھی جو مظلوم شخص بھی اس میں آ کر تین دن عبادت کر کے اپنے دشمن اور ظالم کے خلاف دعا مانگ لیتا تھا تو اس کی دعا قبول ہو جاتی تھی۔ اسی طرح کوئی بیمار یا کوڑھی اگر یہاں آ کر دعا مانگ لیتا تھا تو فوراً اس کو شفا اور صحت حاصل ہو جاتی تھی۔

غرض کچھ ہی عرصے کے بعد (میری خاموشی اور یکسوئی دیکھ کر) میری قوم کے لوگ اپنے کئے پر شرمندہ ہوئے اور میرے پاس آ کر انہوں نے درخواست کی کہ میں واپس بستی میں چل کر سب کے ساتھ رہوں۔ ساتھ ہی وہ سب لوگ مسلمان ہو گئے۔

(بحوالہ سیرت حلبیہ ج ۱)

يَا رَبِّ صَلِّ وَسَلِّمْ دَائِمًا اَبَدًا عَلٰى حَبِيْبِكَ خَيْرِ الْخَلْقِ كُلِّهِم

خصوصیت نمبر ۶۳

رسولِ اکرم ﷺ کے ہاتھ پر ہونے والی بیعت کو اللہ نے اپنی بیعت قرار دیا

قابل احترام قارئین! رسولِ اکرم ﷺ کی امتیازی خصوصیات میں سے یہ تریسٹھویں خصوصیت پیش کی جا رہی ہے، جس کا عنوان ہے "رسولِ اکرم ﷺ کے ہاتھ پر ہونے والی بیعت کو اللہ نے اپنی بیعت قرار دیا" الحمدللہ اس خصوصیت کو ترتیب دینے کے لئے بھی اللہ تعالیٰ نے روضہ رسول ﷺ کے قریب ریاض الجنۃ میں بیٹھنے کی توفیق دی، بے شک یہ اسی کا فضل ہے، بیشک اس پر میں اپنے اللہ کا صد بار شکر ادا کرتا ہوں کہ جس ذات نے ریاض الجنۃ میں بٹھا کر اپنے محبوب ﷺ کی خصوصیت سے متعلق کام کرنے کی توفیق عطا فرمائی، اور مزید اسی اللہ تعالیٰ کی ذات سے قوی امید ہے کہ وہ میری اس ٹوٹی پھوٹی کاوش کو مقبول و منظور بھی فرمائے گا انشاءاللہ۔

بہرحال محترم قارئین! یہ خصوصیت بھی آپ ﷺ کی ایک عظیم خصوصیت ہے کہ آپ ﷺ کے ہاتھ پر ہونے والی بیعت کو اللہ تعالیٰ نے اپنی بیعت قرار دیا، جبکہ دیگر انبیاءؑ سے متعلق اس طرح کی خصوصیت روایات میں نہیں ملتی، کہ آپ کی طرح کسی اور نبی کے ہاتھ پر ہونے والی بیعت کو اللہ تعالیٰ نے اپنی بیعت قرار دیا ہو، جیسا کہ آنے والے صفحات میں آپ ملاحظہ فرمائیں کہ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے خود فرمایا کہ جو لوگ آپ سے بیعت کرتے ہیں (حقیقتاً) وہ تو اللہ تعالیٰ سے بیعت کرتے ہیں، اللہ کا ہاتھ ان کے ہاتھوں کے اوپر ہے، تو معلوم ہوا کہ اس خصوصیت کا مظہر صرف اور صرف آپ ﷺ ہی کی ذات ہے، دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہم سب کو اپنے پیارے نبی ﷺ کی صحیح صحیح قدردانی کی توفیق عطا فرمائے آمین یارب

العٰلمین۔ لیجئے محترم قارئین اب اس خصوصیت کی تفصیل ملاحظہ فرمائیے:۔

تریسٹھ نمبر خصوصیت کی وضاحت قرآن واحادیث کی روشنی میں

ارشاد باری تعالیٰ ہے کہ اِنَّ الَّذِینَ یُبَایِعُونَکَ اِنَّمَا یُبَایِعُونَ اللہَ یَدُاللہِ فَوقَ اَیدِیھِم ۔ ترجمہ: جولوگ تجھ سے بیعت کرتے ہیں، وہ تو اللہ سے بیعت کرتے ہیں، اللہ کا ہاتھ ان کے ہاتھوں کے اوپر ہے۔ مبایعت بیع سے ہے، لغت میں بیع مطلقہ بمعنی مبادلہ ہے شرعاً اخذ ثمن اوراعطائے مثمن کو جب کہ بہ تراضی جانبین ہو، بیع کہتے ہیں۔ بیع بمعنی شراء اور شراء بمعنی بیع بھی مستعمل ہے۔ یہ جانبین کی حالت کے لحاظ سے ہے۔ الغرض مبایعت میں جانبین کو کچھ دینا اور کچھ لینا ضروری ہے۔ بیعت، اصطلاح میں اس عہدو پیان کو کہتے ہیں جو اطاعت امام کے متعلق انسان اپنے نفس پر عائد کرلیتا ہے۔ وفائے عہد کا التزام بھی اسی لفظ کے اندر شامل ہے۔

جس بیعت کا آیت بالا میں ذکر ہے وہ بہ مقام حدیبیہ درخت سمراء کے تحت میں ہوئی تھی۔

قرآن پاک میں ہے: لَقَد رَضِیَ اللہُ عَنِ المُؤمِنِینَ اِذ یُبَایِعُونَکَ تَحتَ الشَّجَرَۃِ اللہ ان سب مومنوں سے راضی ہوگیا جو شجرہ کے نیچے رسول اللہ سے بیعت کررہے تھے۔

اس بیعت کی ضرورت وحقیقت یہ تھی کہ نبی کریم ﷺ نے سیدنا عثمان غنیؓ کومکہ کے لئے اپنا سفیر بنا کر روانہ کیا۔ ان کی معیت میں دس صحابہ بھی بھیجے گئے۔ ان کے پہنچ جانے کے ایک دوروز بعد حضور ﷺ تک ایک اُڑتی سی خبر پہنچی کہ قریش نے حضور ﷺ کے سفیر عثمان غنیؓ کو قید اوران کے ہمرائیوں کو قتل کردیا ہے۔ یہ ایسا واقعہ تھا کہ اگراس کی صداقت ہوجاتی تو حرمت سفارت اوراحترام سفر کے لئے جنگ کرنا اخلاقاً وشرعاً ضروری تھا۔ اس وقت جولوگ حضور ﷺ کے ساتھ آئے ہوئے تھے وہ صرف ادائے عمرہ وطواف کی نیت سے آئے تھے۔

ان کے علم میں اس امر کا احتمال بھی نہ تھا کہ کسی جنگ سے سابقہ پڑے جائے گا اور مہاجرین کو خود اپنے خویش وتبار اور قرابت داروں کے منہ پر تلوار چلانی ہوگی۔ لہٰذا یہ بیعت لینی پڑی۔

جابرؓ کی روایت (متفق علیہ) سے ثابت ہے کہ اس وقت ان بیعت کرنے والوں کی تعداد چودہ سو تھی۔ نبی کریم ﷺ درخت کے سائے میں نور افروز تھے۔ بیعت لینے کے لئے دست مبارک پھیلا ہوا تھا۔ عمر فاروقؓ نے اپنے ہاتھ کو حضور ﷺ کے ہاتھ کا سہارا بنایا ہوا تھا کہ بدن مبارک کو تھکان نہ ہو۔ لوگ آتے تھے اور یکے بعد دیگرے بیعت کرتے ہوئے چلے جاتے تھے۔ سلمہ بن اکوع سلمیؓ کا بیان ہے کہ انہوں نے بیعت علی الموت کی تھی۔ اور جابر بن عبداللہ کا بیان ہے کہ انہوں نے عدم فرار کی بیعت کی تھی۔ ہر دو روایت کی تطبیق سے مستنبط ہوا کہ الفاظ بیعت کو خود بیعت کنندہ کے پسند اور اختیار پر رکھا گیا تھا۔ بے شک حریت اسلام ایسی ہی حریت نفس کی معلم ہے۔ جس میں اجبار واکراہ کا شائبہ بھی نہ ہو۔

اس جم غفیر کے اندر صرف ایک شخص جد بن قیس اسلمی ایسا تھا جو اونٹ کی اوٹ میں جا چھپا تھا اور بیعت میں شامل نہ ہوا تھا۔ حریت اسلام کی یہ دوسری دلیل ہے کہ اس پر بھی کچھ سختی نہیں کی گئی۔ البتہ حضور ﷺ نے مبائعین کا شرف وجاہ ظاہر کرنے کے لیے یہ ضرور فرمایا :انتم خیر الارض آج تم روئے زمین کے جملہ موجود اشخاص سے بہتر ونیک تر ہو۔ اس بیعت کا ذکر کلام اللہ کی متعدد آیات میں ہے اور اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس واقعہ سے رضوان الٰہیہ تعلق مستحکم اور رابطہ قویم ہے۔ فرمایا: اِنَّ اللّٰہَ اشۡتَرٰی مِنَ الۡمُؤۡمِنِیۡنَ اَنۡفُسَہُمۡ وَاَمۡوَالَہُمۡ بِاَنَّ لَہُمُ الۡجَنَّۃَ اللہ نے مومنین کی جانوں کو خرید لیا ہے اس تبادلہ میں کہ جنت ان کی ہے۔ فرمایا: فَاسۡتَبۡشِرُوۡا بِبَیۡعِکُمُ الَّذِیۡ بَایَعۡتُمۡ بِہٖ . اپنی ایسی بیع پر تم کو پوری پوری خوشیاں منانی چاہئیں۔

ہم نے اس آیت کا ذکر خصوصیاتِ مصطفیٰ میں اس لیے کیا ہے کہ اس سے ایک نہایت ہی خاص فضل وشرف محمدیہ کو ثبوت حاصل ہوتا ہے۔ غور کیجئے نبی کریم ﷺ کے ہاتھ پر

بیعت کرنے والوں کو اللہ تعالیٰ نے مبایعین ذات قرار دیا ہے۔ اور یہ وہ شرف ہے جو کسی دوسرے نبی کو حاصل نہیں ہوا۔

آیت زیب عنوان یَدُ اللّٰہِ فَوقَ اَیدِیھِم کے الفاظ ہیں۔ امام فخر الدین رازی فرماتے ہیں لفظ ید پر دو جگہ میں یا تو بمعنی واحد مستعمل ہوا ہے یا الگ الگ معانی میں۔

الف: اگر یَدُ کے معنی ہر دو جگہ ایک ہی ہیں، تب معنی آیت یہ ہیں کہ احسان الٰہی تمہارے احسان سے برتر واعلیٰ ہے۔ دوسرے مقام پر اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: بَلِ اللّٰہُ یَمُنُّ عَلَیکُم اَن ھَدٰکُم لِلاِیمَانِ (حجرات) بلکہ اللہ تعالیٰ کا تم پر احسان ہے کہ تم کو ایمان کی ہدایت فرمائی۔

نیز یہ کہ رسول ﷺ کو جو نصرت و تائید منجانب اللہ حاصل ہے وہ اس تائید و نصرت سے بہت برتر واعلیٰ ہے جو حضور ﷺ کو منجانب صحابہؓ حاصل ہے۔ لفظ یـد بہ معنی غلبہ و نصرت وقوت زبان عرب میں بخوبی مستعمل ہے۔ محاورہ ہے کہ الیـد لـفلان اب فلاں شخص کا غلبہ ہے۔

ب: یَدُ کا استعمال الگ الگ معانی میں ہے تب ید اللہ کے معنی حفظ الٰہی ہیں اور اَیدِیھِم سے مراد مبائعین کے ساتھ ہوگی۔

اس کی تائید اسی سورہ مبارکہ میں تھوڑی دور آگے چل کر ان الفاظ پاک میں پائی جاتی ہے۔ فَعَلِمَ مَافِی قُلُوبِھِم فَاَنزَلَ السَّکِینَۃَ عَلَیھِم وَاَثَابَھُم فَتحاً قَرِیبًا ۔ وَمَغَانِمَ کَثِیرَۃً یَّاخُذُونَھَا ۔ اللہ تعالیٰ نے بیعت کرنے والوں کے دلوں کی اندرونی حالت کو جان لیا اور ان پر سکینہ اتارا ان کو فتح قریب عطا فرمائی اور وہ بڑی فتوحات بھی ان کے لئے خاص کر دیں جن کو وہ حاصل کریں گے۔

خلفائے راشدین اور اُن کے ماتحت عمال و گورنر و جرنیل و قائدینِ لشکر اور فاتحین کشور انہی بیعت لینے والوں میں تھے۔ حضرموت، عمان، عراق و فلسطین، شام، مصر، افریقہ، سوڈان، تیونس و الجزائر، مالٹا اور کریٹ، ایران و خراسان کی فتوحات و مغانم انہی خلفائے

راشدین اوران کے حکم برداروں کو حاصل ہوئی تھیں۔

ہاں، یہی وہ بزرگ ہیں جو مفہوم آیت اور اس بشارت عظمٰی کے مظہر ہیں۔ انہی کے دلوں کا امتحان لیا گیا اور انہی پر نزول سکینہ ہوا۔ وہ سکینہ جس کے نزول کا ذکر احوال موسیٰ میں بھی ہے۔

انہی کے ہاتھوں میں وہ طاقت تھی کہ کل دنیا کے ہاتھ ان کے سامنے پست تھے۔ کبھی کسی سلطنت کی قواعددان اور باقاعدہ مسلح افواج ان پر غالب نہ آسکیں **كَفَّ اَيْدِىَ النَّاسِ عَنكُم** کا ایک نظارہ یہ بھی تھا۔

صحابہ رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کے فضل وشرف۔ جاہ احتشام۔ دولت واقبال مادی اور رحمت وبرکات روحی کا سبب۔ ذریعہ کیا تھا۔ یہی بیعت نبوی۔ یہی اتباع محمدی یہی صدق واخلاق جو انہیں پیارے رسول ﷺ کی ذات اور تعلیم کے ساتھ تھا۔ لہٰذا وہ سب طفیلی تھے۔ ان خصوصیات کا اصل تعلق نبی کریم ﷺ ہی کی ذات مبارکہ سے ہے۔ اور نبی کریم ﷺ کا یہ شرف حضور ﷺ کے خصائص میں سے ہے۔ (بحوالہ رحمۃ للعلمین جلد سوم)

يَا رَبِّ صَلِّ وَسَلِّمْ دَائِمًا اَبَدًا عَلٰى حَبِيْبِكَ خَيْرِ الْخَلْقِ كُلِّهِم

خصوصیت نمبر ۶۴

رسولِ اکرم ﷺ کی امت کی ایک بڑی تعداد کا بغیر حساب کے جنت میں داخل ہوگا

قابل احترام قارئین! رسولِ اکرم ﷺ کی امتیازی خصوصیات میں سے یہ چونسٹھویں خصوصیت آپ کی خدمت میں پیش کی جارہی ہے، جسکا عنوان ہے ''رسولِ اکرم ﷺ کی امت کی ایک بڑی تعداد کا بغیر حساب کے جنت میں داخل ہوگا'' بحمد اللہ دیگر خصوصیات کی طرح اس خصوصیت کو ترتیب دیتے وقت بھی میں روضہ رسول ﷺ کے قریب یعنی روضہ کے سائے تلے بیٹھا ہوں، اور اس خصوصیت کو ترتیب دے رہا ہوں، اور دل سے بار بار یہی صدا آرہی ہے کہ یا اللہ آقا ﷺ کے مدینے میں بار بار آنے کی توفیق عطا فرما اور اخلاص سے آقا ﷺ کے دین کی خدمت کرنے کی توفیق عطا فرما، دل چاہتا ہے کہ روضہ رسول ﷺ کی جالیوں کو دیکھتا رہوں اور پھر دیکھتا ہی چلا جاؤں کہ دل کا سرور اسی میں چھپا ہے، دعا گو ہوں کہ یارب قدوس تیرے محبوب پیغمبر ﷺ کے مبارک روضہ پر بیٹھ کر تیرے محبوب ﷺ کی خصوصیت پر کام کرنے کی اس گناہ گار کی اس کاوش کو اپنی بارگاہ میں مقبول و منظور اور آخر میں نجات کا ذریعہ بنا، آمین۔

بہر حال محترم قارئین! آپ ﷺ کی منجملہ خصوصیات میں سے یہ بھی ایک عظیم خصوصیت ہے کہ آپ ﷺ کی برکت سے اللہ تعالیٰ قیامت کے دن آپ ﷺ کی امت کی ایک بڑی تعداد کا بغیر حساب کتاب کے جنت میں داخلہ فرمائیں گے، جبکہ دیگر انبیاءؑ کی امتوں کو یہ اعزاز نہیں دیا جائے گا تو معلوم ہوا کہ اس خصوصیت کا مظہر صرف اور صرف آپ ﷺ کی ذات ہے، جیسا کہ آنے والے صفحات میں احادیث کی روشنی میں آپ اس

خصوصیت کی تفصیل ملاحظہ فرمائیں گے انشاء اللہ، دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہم سب کو اپنے نبی ﷺ سے سچی محبت کرنے اور آپ ﷺ کی جملہ تعلیمات پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے آمین یارب العٰلمین۔ لیجئے اس خصوصیت کی تفصیل ملاحظہ فرمایئے:۔

چونسٹھ نمبر خصوصیت کی وضاحت احادیث کی روشنی میں

حضرت ابوہریرہؓ فرماتے ہیں کہ میں نے جناب رسول کریم ﷺ کو یہ ارشاد فرماتے ہوئے سنا کہ: میری امت میں سے ایک جماعت جنت میں داخل ہوگی یہ (تعداد میں) ستر ہزار ہونگے، ان کے چہرے چودھویں رات کے چاند کی طرح چمک رہے ہوں گے۔ حضرت عکاشہ بن محصنؓ جنہوں نے اپنے اوپر دھاریدار چادر لے رکھی تھی عرض کیا یارسول اللہ! اللہ سے دعا کریں کہ وہ مجھے ان حضرات میں شامل کردیں۔ تو آپ ﷺ نے دعا فرمائی کہ اے اللہ! اس کو ان حضرات میں شامل کردے۔ پھر انصار صحابہ میں سے ایک شخص کھڑا ہوا اس نے بھی عرض کیا یارسول اللہ! اللہ سے دعا کریں کہ وہ مجھے بھی ان میں شامل کردے۔ تو آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا عکاشہ تم سے سبقت کر گیا۔ (بخاری شریف)

اسی طرح حضرت سہل بن سعدؓ سے روایت ہے کہ جناب رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: میری امت میں سے ستر ہزار حضرات کا یا حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا یا سات لاکھ کا یہ جنت میں اس حالت میں داخل ہوں گے کہ ان کے ہر ایک نے ایک دوسرے کو پکڑ رکھا ہوگا یہاں تک ان کا پہلا شخص آخری شخص کے ساتھ جنت میں داخل ہوگا۔ ان کے چہرے چودہویں چاند کی طرح ہونگے۔

(یہ پہلا گروپ ہوگا جو بغیر حساب کتاب کے جنت میں داخل ہوگا) (بخاری شریف)

ابوامامہ باہلیؓ فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ سے سنا آپ ﷺ ارشاد فرمار ہے تھے کہ میرے رب نے میرے ساتھ وعدہ فرمایا ہے کہ میری امت میں سے ستر ہزار کو جنت میں داخل فرمائیں گے نہ تو ان کا حساب ہوگا نہ ان کو عذاب ہوگا (اور) ہر ہزار کے ساتھ

ستر ہزار اور اللہ تعالیٰ کی لپوں میں سے تین لپیں (مسلمانوں میں سے بغیر حساب کے اور بغیر سزا کے جنت میں جائیں گے)

فائدہ...... اللہ تعالیٰ کی لپوں کا کوئی مخلوق اندازہ نہیں کر سکتی لہٰذا اس حدیث سے کثرت سے امت محمدیہ کی بخشش کی خوشخبری ملتی ہے۔

حضرت انس بن مالکؓ فرماتے ہیں کہ جناب رسول کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ میری امت میں سے ستر ہزار (مسلمان مرد وعورتیں بغیر حساب وعذاب کے) جنت میں جائیں گے اور ان ستر ہزار میں سے ہر ایک کے ساتھ ستر ہزار (4900000000) لوگ اور بھی (بلاحساب وبلاعذاب جنت میں جائیں گے)۔ (مجمع الزوائد)

حضرت عبدالرحمٰن بن ابوبکر صدیقؓ سے روایت ہے کہ جناب رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا" میرے اللہ عزوجل نے میری امت میں سے ستر ہزار حضرات ایسے عطاء فرمائے ہیں جو بغیر حساب کے داخل ہوں گے۔ حضرت عمرؓ نے عرض کیا (یارسول اللہ) آپ نے اللہ تعالیٰ سے اس زائد کا مطالبہ نہیں کیا؟ آپ نے ارشاد فرمایا میں نے زائد کا مطالبہ کیا تھا تو اللہ تعالیٰ نے مجھے (ستر ہزار میں سے) ہر آدمی کے ساتھ ستر ہزار عطا فرمائے۔ حضرت عمرؓ نے عرض کیا کہ آپ نے اللہ تعالیٰ سے اس سے بھی زائد کا مطالبہ نہیں فرمایا؟ تو آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا مجھے اتنا عطا فرمایا ہے پھر آپ ﷺ نے اپنے دونوں بازو پھیلا دیئے۔ پھر فرمایا یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہوگا (ہشام کہتے ہیں) ہم نہیں جانتے کہ اس کی تعداد کتنی ہوگی۔ (مجمع الزوائد)

حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ جناب نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا میرے سامنے تمام امتوں کو پیش کیا گیا۔ پس میں نے ایک نبی کو دیکھا جس کے ساتھ ایک معمولی سی جماعت تھی، اور ایک نبی کو دیکھا جس کے ساتھ صرف ایک یا دو آدمی تھے، اور ایک نبی کو دیکھا جس کے ساتھ کوئی شخص (بھی ان کو ماننے والا) نہیں تھا۔ پھر اچانک میرے سامنے ایک بہت بڑی امت کو پیش کیا گیا میں نے گمان کیا کہ یہ میری امت ہے لیکن مجھے

کہا گیا کہ یہ موسیٰ علیہ السلام اور ان کی قوم ہے۔ آپ افق (آسمان وزمین کے ملنے والے طویل وعریض کنارے) کی طرف دیکھیں جب میں نے دیکھا تو وہ بہت ہی بڑی امت تھی پھر مجھے کہا گیا آپ دوسرے افق کی طرف بھی دیکھیں تو ادھر بھی بہت بڑی امت تھی مجھے فرمایا گیا کہ آپ کی امت یہ ہے۔ ان میں سے ستر ہزار وہ حضرات ہیں جو جنت میں بغیر حساب کئے اور عذاب دیئے داخل ہوں گے۔ پھر آپ ﷺ اٹھ کر گھر میں تشریف لے گئے ۔تو صحابہ کرام نے ان حضرات کے بارہ میں جو جنت میں بغیر حساب کئے اور عذاب دیئے داخل ہوں گے غور وفکر شروع کر دیا۔ ان میں سے کسی نے کہا شاید کہ یہ وہ حضرات ہوں جو رسول کریم ﷺ کی صحبت میں رہے اور کسی نے کہا کہ شاید یہ وہ حضرات ہوں گے جو اسلام کی حالت میں پیدا ہوئے اور اللہ تعالیٰ کے ساتھ (کسی کو) شریک نہیں ٹھہرایا ہوگا اس طرح سے صحابہ نے کئی چیزوں کو ذکر کیا۔ تو حضور ﷺ ان کے پاس تشریف لائے اور فرمایا تم کس گفتگو میں مشغول ہو؟ تو انہوں نے آپ ﷺ سے عرض کیا تو آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا یہ وہ لوگ ہوں گے جو (دنیا میں) نہ تو دم کرتے تھے اور نہ دم کرنے کو خود طلب کرتے تھے۔ اور نہ شگون پکڑتے تھے بلکہ اپنے پروردگار پر بھروسہ اور توکل کرتے تھے۔ (مسلم شریف)

فائدہ...... علامہ ابن قیم اور علامہ قرطبی نے دم کرنے پر بحث کی ہے اور حدیث سے ثابت کیا ہے کہ جائز دم اور جھاڑ پھونک کرنا کرانا درست ہے۔ (تذکرۃ القرطبی)

حضرت ابو امامہ باہلیؓ سے روایت ہے کہ جناب رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جب قیامت کا دن ہوگا تو لوگوں کی ایک جماعت کھڑی ہوگی جو آسمان وزمین کے کنارے کو (اپنی کثرت کی وجہ سے) بھر رہی ہوگی ان کی چمک دمک سورج کی طرح ہوگی۔ ندا ہوگی، نبی امی کہاں ہیں تو اس پر ہر نبی اٹھنے کے لئے متحرک ہوگا پھر کہا جائے گا یہ محمد اور ان کی امت ہے۔ پھر ایک اور جماعت اٹھے گی جو (آسمان وزمین کے) افق کو بھر رہی ہوگی ان کا نور آسمان کے ہر ستارے کی طرح ہوگا۔ کہا جائیگا نبی امی کہاں ہیں تو اس کے لئے ہر نبی اٹھنا چاہے گا۔ (مگر یہ بھی امت محمد یہ ہی ہوگی) پھر (اللہ تعالیٰ) دو لپیں بھریں گے اور کہا

جائے گا اے محمد! یہ ایک لپ تیرے لئے ہے اور اے محمد! یہ میری طرف سے تیرے لئے ہے (یعنی ان دو لپوں کو جن میں آنے والے افراد کی تعداد اللہ تعالیٰ جانتے ہیں بغیر حساب کے جنت میں داخل کر دیا جائے گا) پھر ترازوئے اعمال نصب کی جائے گی اور حساب شروع کیا جائے گا۔

حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ جناب رسول کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ

میری امت میں سے ستر ہزار بغیر حساب کے جنت میں داخل ہوں گے۔ حضرت ابو بکر صدیقؓ نے عرض کیا یا رسول اللہ ہمارے (اطمینان اور خوشخبری کے) لئے اور اضافہ فرمائیں۔ تو آپ ﷺ نے فرمایا اور اتنا مزید۔ تو حضرت عمرؓ نے عرض کیا اے ابو بکرؓ! اگر اللہ تعالیٰ نے چاہا تو حضور ﷺ کی امت کو ایک ہی لپ میں جنت میں داخل کر دیں گے۔ (تو حضور ﷺ نے فرمایا عمر نے سچ کہا)۔

حضرت انس بن مالکؓ سے روایت ہے کہ جناب رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا جب لوگ حساب کے لئے پیش ہوں گے اس وقت ایک جماعت اپنی تلواروں کو اپنی گردنوں پر رکھے ہوئے آئے گی جن سے خون کے قطرات گر رہے ہوں گے۔ یہ جنت کے دروازے پر رش کر دیں گے۔ کہا جائے گا یہ کون لوگ ہیں؟ کہا جائے گا یہ شہید ہیں جو (شہادت کے بعد) زندہ تھے رزق دیئے جاتے تھے۔ پھر پکارا جائے وہ شخص کھڑا ہو جس کا اجر اللہ تعالیٰ کے ذمہ ہو وہ جنت میں داخل ہو جائے۔ پھر تیسری مرتبہ پکارا جائے گا وہ شخص کھڑا ہو جس کا اجر اللہ تعالیٰ کے ذمہ ہو وہ جنت میں داخل ہو جائے (حضور ﷺ) ارشاد فرماتے ہیں (کہ اس اعلان سے) وہ لوگ جن کا اجر اللہ تعالیٰ کے ذمہ ہو گا وہ جنت میں داخل ہوں گے اور اتنے ہزار کھڑے ہوں گے اور جنت میں بغیر حساب کے داخل ہوں گے۔

جنت میں بغیر حساب جانے والوں کی صفات

حضرت ابو ہریرہؓ فرماتے ہیں کہ جناب رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ: تین قسم کے لوگ جنت میں بغیر حساب کے داخل ہوں گے۔ (۱) وہ شخص جس نے اپنا کپڑا دھویا

لیکن اس کو لگانے کے لئے اس کو خوشبو میسر نہ رہی۔ (۲) وہ شخص جس کے چولہا پر دو ہانڈیاں (ایک وقت میں) کبھی نہ چڑھی ہوں (۳) وہ شخص جس کو پانی کی دعوت دی گئی مگر اس سے یہ پوچھا نہ گیا کہ تم کونسا پانی (شربت، پانی) پسند کرتے ہو۔ حضرت ابن مسعودؓ فرماتے ہیں جس آدمی نے ویرانے میں (مسافروں وغیرہ کے لئے) کوئی کنواں کھودا اللہ تعالیٰ کی رضا کے لئے وہ بھی بغیر حساب کے جنت میں جائے گا۔

حضرت علی بن حسینؓ فرماتے ہیں "جب قیامت کا دن ہوگا ایک منادی ندا کرے گا تم میں سے فضیلت والے کون ہیں؟ تو انسانوں میں سے کچھ لوگ کھڑے ہوں گے ان سے کہا جائے گا جنت کی طرف چلو پھر ان کی ملاقات فرشتوں سے ہوگی تو وہ کہیں گے تم کہاں جا رہے ہو تو وہ حضرات کہیں گے جنت کی طرف، فرشتے پوچھیں گے حساب سے پہلے؟ وہ کہیں گے ہاں۔ وہ پوچھیں گے تم کون ہو؟ وہ کہیں گے ہم فضیلت والے ہیں۔ فرشتے کہیں گے تمہاری کون سی فضیلت ہے؟ وہ جواب دیں گے کہ جب ہمارے ساتھ جہالت کا برتاؤ کیا جاتا تھا ہم بردباری اختیار کرتے تھے، جب ہم پر ظلم کیا جاتا تھا ہم صبر کرتے تھے، جب ہمارے ساتھ کوئی برائی کی جاتی تو ہم معاف کر دیتے تھے۔ فرشتے کہیں گے تم جنت میں داخل ہو جاؤ نیک عمل کرنے والوں کے لئے بہترین اجر ہے۔ پھر ایک منادی ندا کرے گا اہل صبر کھڑے ہو جائیں تو انسانوں میں سے کچھ لوگ کھڑے ہوں گے یہ بہت کم ہوں گے ان کو حکم ہوگا جنت کی طرف چلے جاؤ تو ان کو بھی فرشتے ملیں گے اور ان سے ایسا ہی کہا جائے گا تو وہ کہیں گے ہم اہل صبر ہیں وہ پوچھیں گے تمہارا صبر کیا تھا؟ وہ کہیں گے ہم نے اللہ کی فرمانبرداری میں اپنے نفسوں کو (ان کی خواہشات سے) روکا اور ہم نے اللہ کی نافرمانیوں سے اس کو باز رکھا۔ وہ فرشتے کہیں گے تم بھی جنت میں داخل ہو جاؤ نیک عمل کرنے والوں کے لئے بہترین اجر ہے۔ حضور ﷺ فرماتے ہیں کہ پھر ایک منادی ندا کرے گا اب اللہ کے پڑوسی کھڑے ہو جائیں تو انسانوں میں سے کچھ لوگ کھڑے ہوں گے یہ بھی بہت کم ہوں گے ان کو بھی حکم ہوگا جنت کی طرف چلے جاؤ۔ تو ان کو بھی فرشتے ملیں گے اور ان کو بھی ویسا ہی

کہا جائے گا یہ کہیں گے کہ تم کس عمل سے اللہ تعالیٰ کے اس گھر میں پڑوسی بن گئے؟ وہ کہیں گے کہ ہم صرف اللہ تعالیٰ کی محبت میں ایک دوسرے (مسلمانوں) کی زیارت کرتے تھے اور اللہ ہی کی خاطر آپس میں مل کر بیٹھتے تھے اور اللہ ہی کے لئے ہم ایک دوسرے پر خرچ کرتے تھے۔ فرشتے کہیں گے تم بھی جنت میں داخل ہو جاؤ نیک عمل کرنے والوں کے لئے بہترین اجر ہے۔ (بحوالہ تذکرۃ القرطبی)

حضرت انسؓ فرماتے ہیں کہ جناب رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا "جب اللہ تعالیٰ پہلے اور پچھلے (انسانوں اور جنات) کو ایک میدان میں جمع کریں گے تو ایک منادی عرش کے نیچے سے ندا دے گا اللہ کی معرفت رکھنے والے کہاں ہیں۔ محسن کہاں ہیں؟ (جو عبادت کرتے وقت گویا کہ خدا کو دیکھتے تھے یا یہ یقین کرتے تھے کہ اللہ ہمیں دیکھ رہا ہے) فرمایا کہ لوگوں میں سے ایک جماعت اٹھے گی اور اللہ کے سامنے کھڑی ہو جائے گی۔ اللہ تعالیٰ فرمائیں گے حالانکہ وہ اس کو خوب جانتے ہوں گے تم کون ہو؟ عرض کریں گے ہم اہل معرفت ہیں آپ کے ساتھ ہم نے آپ کو پہچانا تھا اور آپ نے ہمیں اس لائق بنایا تھا۔ تو اللہ تعالیٰ فرمائیں گے تم نے سچ کہا پھر اللہ تعالیٰ فرمائیں گے تم پر کوئی سزا اور تکلیف نہیں تم میری رحمت کے ساتھ جنت میں داخل ہو جاؤ۔ پھر جناب رسول اللہ ﷺ مسکرا پڑے اور فرمایا اللہ تعالیٰ ان حضرات کو روز قیامت کی ہولناکیوں سے نجات عطا فرما دیں گے۔ (حوالہ بالا)

حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ جب قیامت کا دن ہوگا ایک منادی ندا کرے گا تم ابھی جان لو گے اصحاب الکرم (بزرگی اور شان والے) کون ہیں ہر حال میں اللہ تعالیٰ کی حمد و ثناء کرنے والے کھڑے ہو جائیں تو وہ کھڑے ہو جائیں گے اور ان کو جنت کی طرف روانہ کر دیا جائیگا۔ پھر دوسری مرتبہ ندا کی جائے گی تم آج عنقریب جان لو گے اصحاب الکرم کون ہیں کہ وہ لوگ کھڑے ہو جائیں جن کے پہلو (رات کے وقت) اپنے بستروں سے (عبادت کے لئے) الگ رہتے تھے جو اپنے رب کو خوف اور طمع کے ساتھ پکارا کرتے تھے اور جو کچھ ہم نے ان کو رزق دیا تھا اس سے خرچ کرتے تھے (زکوٰۃ اور صدقات کی شکل میں

)چنانچہ یہ حضرات کھڑے ہوں گے اوران کو بھی جنت کی طرف روانہ کر دیا جائیگا۔ پھر تیسری مرتبہ بھی ندا کی جائے گی تم آج عنقریب جان لو گے اصحاب الکرم کون ہیں کہ وہ لوگ اب کھڑے ہو جائیں جن کو اللہ تعالیٰ کے ذکر سے کوئی خرید و فروخت غافل نہیں کرتی تھی چنانچہ ان کو بھی جنت کی طرف روانہ کر دیا جائے گا۔ (حوالا بالا)

فائدہ...... یہ بھی روایت کیا گیا ہے کہ جب قیامت کا دن ہوگا منادی ندا کرے گا میرے وہ بندے کہاں ہیں جنہوں نے میری فرمانبرداری کی تھی اور غائبانہ طور پر میرے عہد کی حفاظت کرتے تھے تو وہ لوگ کھڑے ہو جائیں گے ان کے چہرے چودہویں کے چاند کی طرح یا خوب چمکدار ستارے کی طرح (روشن) ہوں گے یہ نور کی سواریوں پر سوار ہوں گے جن کی لگامیں سرخ یاقوت کی ہوں گی جوان کو لیکر تمام مخلوقات کے سامنے اڑتے پھریں گے حتی کے عرش الٰہی کے سامنے جا کر ٹھہر جائیں گے۔ تو ان کو اللہ تعالیٰ فرمائیں گے سلام ہو میرے ان بندوں پر جنہوں نے میری اطاعت کی اور غائبانہ طور پر میرے عہد کی حفاظت کی میں نے تم کو برگزیدہ کیا، میں نے تم سے محبت کی اور میں نے تم کو پسند کیا چلے جاؤ جنت میں بغیر حساب کے داخل ہو جاؤ تم پر آج کوئی خوف نہیں اور نہ تم غمزدہ ہوگے تو وہ پل صراط سے اچک لینے والی (تیز) بجلی کی طرح گذر جائیں گے پھر ان کے لئے جنت کے دروازے کھول دیئے جائیں گے۔ اس کے بعد باقی مخلوقات میدان حشر میں پڑی ہوئی ہوگی ان میں کا بعض بعض سے کہے گا اے قوم! فلاں بن فلاں کہاں ہے" جس وقت وہ ایک دوسرے سے پوچھ رہے ہوں گے تو ایک منادی ندا کرے گا اِنَّ أصحَابَ الجَنَّةِ اليَومَ فِي شُغُلٍ فَاكِهُو ن . الآية (بے شک جنت والے آج اپنے مشغلوں میں خوش دل ہیں)۔

(بحوالہ جستہ جستہ از جنت کے حسین مناظر)

يَا رَبِّ صَلِّ وَسَلِّمْ دَائِمًا اَبَدًا عَلٰى حَبِيْبِكَ خَيْرِ الْخَلْقِ كُلِّهِم

خصوصیت نمبر ۶۵

رسولِ اکرم ﷺ کی امت کو اللہ تعالیٰ نے اعتدال کی دولت عطا فرمائی

قابل احترام قارئین! رسولِ اکرم ﷺ کی امتیازی خصوصیات میں سے یہ پینسٹھویں خصوصیت آپ کی خدمت میں پیش کی جارہی ہے، جسکا عنوان ہے ''رسولِ اکرم ﷺ کی امت کو اللہ تعالیٰ نے اعتدال کی دولت عطا فرمائی'' بیشک آپ ﷺ کی امتیازی خصوصیات میں سے یہ بھی ایک عظیم خصوصیت ہے کہ آپ ﷺ کے صدقے اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کی امت کو اعتدال کی امت عطا فرمائی، جبکہ دیگر انبیاء کی امتیں اس عظیم صفت یعنی اعتدال کی صفت سے محروم ہیں، جیسا کہ قرآن وحدیث کی روشنی میں آنے والے صفحات میں آپ اس خصوصیت کی تفصیل کو ملاحظہ فرمائیں انشاء اللہ، امید ہے کہ انشاء اللہ اس کے مطالعے سے معلومات میں بھی اضافہ ہوگا اور ایمان میں بھی اضافہ ہوگا۔ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہم سب کو صفتِ اعتدال کے مطابق اپنی زندگی گزارنے کی توفیق عطا فرمائے آمین یارب العٰلمین۔

پینسٹھ نمبر خصوصیت کی وضاحت قرآن واحادیث کی روشنی میں

ارشاد خداوندی ہے: وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطاً لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْداً ترجمہ ''اور (اے متبعان محمد ﷺ) اسی طرح ہم نے تم کو ایسی ہی ایک جماعت بنادی ہے، جو (ہر پہلو سے) نہایت اعتدال پر ہے، تاکہ (دنیا میں شرف وامتیاز حاصل ہونے کے علاوہ آخرت میں بھی تمہارا بڑا اشرف ظاہر ہو کہ) تم ایک بڑے مقدمہ میں جس میں ایک فریق حضرات انبیاء علیہم السلام ہوں گے، اور فریق ثانی ان کی مخالف قومیں ہوں گی، ان مخالف لوگوں کے مقابلہ میں گواہ (تجویز) ہو اور (شرف بالائے شرف یہ ہوا کہ) تمہارے (قابل شہادت اور معتبر ہونے کے) لئے رسول اللہ

ﷺ گواہ ہوں (اوراس شہادت سے تمہاری شہادت معتبر ہونے کی تصدیق ہو،پھر تمہاری شہادت سے اس مقدمہ کا حضرات انبیاء علیہم السلام کے حق میں فیصلہ ہواور مخالفین مجرم قرار پا کر سزایاب ہوں،اوراس امر کا اعلیٰ درجہ کی عزت ہونا ظاہر ہے۔

امت محمدیہ ﷺ کا اعتدال اور لفظ وسطاً کی تشریح

امت محمدیہ کی تعریف میں امۃً وّسطاً فرمایا لفظ وسط کا معنی بہترین بھی کیا گیا ہے،اور عدول بھی کیا گیا ہے عدول،عدل کی جمع ہے عدل اس کو کہتے ہیں جو ثقہ ہو،منصف ہو اور اس کی گواہی معتبر ہو،اوصاف عالیہ سے متصف ہو خیر کی صفات کو جامع ہو برائیوں سے دور ہو،اور بعض حضرات نے اس کا معنی معتدل کا بھی لیا ہے،یعنی یہ امت ہر اعتبار سے اعتدال پر ہے اس کے اخلاق اور اعمال سب میں اعتدال ہے افراط اور تفریط سے بری ہے،نہ عبادات سے غفلت ہے نہ راہبوں کی طرح دنیا کو چھوڑ کر پہاڑوں میں رہنا ہے،ساری رات نماز پڑھنے کی اجازت نہیں دی گئی،نفس اور بیوی اور مہمان کے حقوق کی ادائیگی کی تعلیم دی گئی،روزانہ روزہ رکھنے سے منع فرمایا گیا،نہ فضول خرچی ہے نہ بخل بلکہ درمیانی راہ ہے جس کا نام جود ہے،اسی طرح نہ بزدلی نہ ضرورت سے زیادہ بہادری جس سے لوگوں پر ظلم ہو جائے بلکہ ان کے درمیان شجاعت ہے ظالم بھی نہیں اور مظلوم رہنے کو بھی تیار نہیں نہ عورتوں کو سردار بنایا گیا نہ ان کی مظلومیت روا رکھی گئی،نہ ہر فعل حلال قرار دیا گیا،نہ ہر چیز کا کھانا جائز کیا گیا،بلکہ حلال حرام کی تفصیلات بتائی گئیں،ضرر دینے والی اور خبیث چیزوں کے کھانے سے منع کر دیا گیا،جن سے اخلاق واجسام پر برا اثر پڑے،طیب اور حلال چیزوں کے کھانے کی اجازت دی گئی،انسانیت کو اونچا کیا گیا،بہیمیت سے بچایا گیا بربریت سے دور رکھا گیا،حد یہ ہے کہ دشمنوں کے ساتھ عین میدان جنگ کے موقع پر عمل کرنے کے لئے بھی ایسے احکام صادر فرمائے جن میں اعتدال ہی اعتدال ہے،بچوں اور عورتوں کو قتل کرنے سے منع کر دیا گیا،مثلہ کرنے یعنی دشمن کے ہاتھ پاؤں،ناک،کان کاٹنے سے منع

فرمایا، معاشی نظام میں زکوٰۃ فرض کی گئی، نفلی صدقات کا بھی حکم دیا گیا، میراث کے احکام جاری کیے گئے تا کہ دولت ایک جگہ سمٹ کر نہ رہ جائے، جان کا بدلہ قصاص مقرر کیا گیا لیکن خطا میں دیت رکھی گئی ہے، اور قصاص واجب ہونے کی صورت میں اولیاء مقتول کو یہ اختیار دیا گیا ہے کہ چاہیں تو قصاص لے لیں، چاہیں دیت لے لیں، حدیث اور فقہ کی کتابوں میں عام ابواب پر نظر کی جائے تو احکام میں سراسر اعتدال ہی نظر آتا ہے۔

اعتدال سے متعلق مزید تفسیر وتشریح

ترمذی میں بروایت ابوسعید خدریؓ آنحضرت ﷺ سے لفظ وسط کی تفسیر عدل سے کی گئی ہے، جو بہترین کے معنی میں آیا ہے (قرطبی) اس آیت میں امت محمدیہ علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کی ایک امتیازی فضیلت وخصوصیت کا ذکر ہے، کہ وہ ایک معتدل امت بنائی گئی اس میں یہ بتلایا گیا ہے کہ جس طرح ہم نے مسلمانوں کو وہ قبلہ عطا کیا، جو سب سے اشرف وافضل ہے اسی طرح ہم نے امت اسلامیہ کو ایک خاص امتیازی فضیلت یہ عطا کی ہے کہ اس کو ایک معتدل امت بنایا ہے جس کے نتیجہ میں ان کو میدان حشر میں یہ امتیاز حاصل ہوگا کہ سارے انبیاء علیہم السلام کی امتیں جب اپنے انبیاءؑ کی ہدایت وتبلیغ سے مکر جائیں گی، اور ان کو جھٹلا کر یہ کہیں گی کہ ہمارے پاس نہ کوئی کتاب آئی، نہ کسی نبی نے ہمیں کوئی ہدایت کی، اس وقت امت محمدیہ انبیاءؑ کی طرف سے گواہی میں پیش ہوگی اور یہ شہادت دے گی کہ انبیاءؑ نے ہر زمانے میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے لائی ہوئی ہدایت ان کو پہنچائیں، اور ان کو صحیح راستہ پر لانے کی مقدور بھر پوری کوشش کی، مدعیٰ علیہم امتیں امت محمدیہ کی گواہی پر یہ جرح کریں گی کہ اس امت محمدیہ کا تو ہمارے زمانے میں وجود بھی نہ تھا ، اس کو ہمارے معاملات کی کیا خبر، اس کی گواہی ہمارے مقابلہ میں کیسے قبول کی جاسکتی ہے۔

امت محمدیہ ﷺ اس جرح کا یہ جواب دے گی کہ بے شک ہم اس وقت موجود نہ تھے، مگر ان کے واقعات وحالات کی خبر ہمیں ایک صادق مصدوق رسول ﷺ نے اور اللہ کی

کتاب نے دی ہے، جس پر ہم ایمان لائے اوران کی خبر کو اپنے معائنہ سے زیادہ وقیع اور سچا جانتے ہیں، اس لئے ہم اپنی شہادت میں حق بجانب اور سچے ہیں، اس وقت رسول کریم ﷺ پیش ہوں گے، اوران گواہوں کا تزکیہ وتوثیق کریں گے کہ بیشک انہوں نے جو کچھ کہا ہے وہ صحیح ہے، اللہ کی کتاب اور میری تعلیم کے ذریعہ ان کو صحیح حالات معلوم ہوئے۔

محشر کے اس واقعہ کی تفصیل صحیح بخاری، ترمذی، نسائی، اور مسند احمد کی متعدد احادیث میں مجملاً ومفصلاً مذکور ہے۔ الغرض آیت مذکورہ میں امت محمدیہ ﷺ کی یہ اعلیٰ فضیلت وشرف کا راز یہ بتلایا گیا ہے کہ یہ امت معتدل امت بنائی گئی ہے، اس لئے یہاں چند باتیں قابل غور ہیں ملاحظہ فرمائیے۔

اعتدالِ امت کی حقیقت واہمیت اوراس کی کچھ تفصیل

اعتدال سے متعلق عمومی اعتبار سے تین سوال ذہن میں آتے ہیں کہ (۱) اعتدال کے معنی اور حقیقت کیا ہیں (۲) وصف اعتدال کی یہ اہمیت کیوں ہے کہ اس پر مدار فضیلت رکھا گیا (۳) اس امت محمدیہ ﷺ کے معتدل ہونے کا واقعات کی رو سے کیا ثبوت ہے، ترتیب واران تینوں سوالوں کا جواب یہ ہے۔

(۱) اعتدال کے لفظی معنی ہیں برابر ہونا، یہ لفظ عدل سے مشتق ہے، اس کے معنی بھی برابر کرنے کے ہیں۔

(۲) وصف اعتدال کی یہ اہمیت کہ اس کو انسانی شرف وفضیلت کا معیار قرار دیا گیا، ذرا تفصیل طلب ہے، اس کو پہلے ایک محسوس مثال سے دیکھئے، دنیا کے جتنے نئے اور پرانے طریقے جسمانی صحت وعلاج کے لئے جاری ہیں، طب یونانی، ویدک، ایلو پیتھک، ہومیو پیتھک وغیرہ سب کے سب اس پر متفق ہیں کہ بدن انسانی کی صحت اعتدالِ مزاج سے ہے، اور جہاں یہ اعتدال کسی جانب سے خلل پذیر ہووہی بدن انسانی کا مرض ہے، خصوصاً طب یونانی کا تو بنیادی اصول ہی مزاج کی پہچان پر موقوف ہے، انسان کا بدن چار خلط

خون، بلغم، صفراء سے مرکب اور انہی چاروں اخلاط سے پیدا شدہ چار کیفیات انسان کے بدن میں ضروری ہیں، گرمی، ٹھنڈک، خشکی، اور تری، جس وقت تک یہ چاروں کیفیات مزاج انسانی کے مناسب حدود کے اندر معتدل رہتی ہیں، وہ بدن انسانی کی صحت وتندرستی کہلاتی ہے اور جہاں ان میں سے کوئی کیفیت مزاج انسانی کی حد سے زیادہ ہوجائے یا گھٹ جائے وہی مرض ہے، اور اگر اس کی اصلاح وعلاج نہ کیا جائے، تو ایک حد میں پہنچ کر وہی موت کا پیام ہوجاتا ہے۔

اس محسوس مثال کے بعد اب روحانیت اور اخلاقیات کی طرف آیئے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ ان میں بھی اعتدال اور بے اعتدال کا یہی طریقہ جاری ہے، اس کے اعتدال کا نام روحانی صحت اور بے اعتدالی کا نام روحانی اور اخلاقی مرض ہے، اور اس مرض کا اگر علاج کر کے اعتدال پر نہ لایا جائے تو اس کا نتیجہ روحانی موت ہے، اور یہ بھی کسی صاحب بصیرت انسان پر مخفی نہیں کہ جوہر انسانیت جس کی وجہ سے انسان ساری مخلوقات کا حاکم اور مخدوم قرار دیا گیا ہے، وہ اس کا بدن یا بدن کے اجزاء واخلاط یا ان کی کیفیات حرارت و برودت نہیں، کیونکہ ان اجزاء وکیفیات میں تو دنیا کے سارے جانور بھی انسانیت کے ساتھ شریک بلکہ انسانیت سے زیادہ حصہ رکھنے والے ہیں۔

جوہر انسانیت جس کی وجہ سے انسان اشرف المخلوقات اور آقائے کائنات مانا گیا ہے، وہ اس کے گوشت پوست اور حرارت و برودت وغیرہ سے بالاتر کوئی چیز ہے، جو انسان میں کامل اور اکمل طور پر موجود ہے، دوسری مخلوقات کو اس کا وہ درجہ حاصل نہیں، اور اس کا معین کرلینا بھی کوئی باریک اور مشکل کام نہیں، کہ وہ انسان کا روحانی اور اخلاقی کمال ہے جس نے اس کو مخدوم کائنات بنایا ہے۔

اور جب یہ معلوم ہوگیا کہ انسان کا جوہر شرافت اور مدار فضیلت اس کے روحانی اور اخلاقی کمالات ہیں، اور یہ پہلے معلوم ہوچکا ہے کہ بدن انسانی کی طرح روح انسانی بھی اعتدال و بے اعتدال ہے، اسی طرح روح کی صحت روح اور اس کے اخلاق کا اعتدال

ہے، اس لئے انسان کامل کہلانے کا مستحق صرف وہی شخص ہوسکتا ہے جو جسمانی اعتدال کے ساتھ روحانی اور اخلاقی اعتدال بھی رکھتا ہو، یہ کمال تمام انبیاء علیہم السلام میں خصوصیت کے ساتھ عطا ہوتا ہے اور ہمارے نبی ﷺ کو انبیاء اکرام میں بھی سب سے زیادہ کمال حاصل تھا، اس لئے انسان کامل کے اولین مصداق آپ ﷺ ہی ہیں، اور جس طرح جسمانی علاج معالجہ کے لئے ہر زمانہ اور ہر جگہ ہر بستی میں طبیب اور ڈاکٹر اور دواؤں اور آلات کا ایک محکم نظام حق تعالیٰ نے قائم فرمایا ہے، اسی طرح روحانی علاج اور قوموں میں اخلاقی اعتدال پیدا کرنے کے لئے انبیاءؑ بھیجے گئے، ان کے ساتھ آسمانی ہدایات بھیجی گئیں، اور بقدر ضرورت مادی طاقتیں بھی عطا کی گئیں، جن کے ذریعہ وہ یہ قانون اعتدال دنیا میں نافذ کرسکیں، اسی مضمون کو قرآن کریم نے سورہ حدید میں اس طرح بیان فرمایا ہے: لَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَيِّنٰتِ وَاَنْزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتٰبَ وَالْمِيْزَانَ لِيَقُوْمَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ وَاَنْزَلْنَا الْحَدِيْدَ فِيْهِ بَاْسٌ شَدِيْدٌ وَّمَنَافِعُ لِلنَّاسِ. ''ہم نے بھیجے ہیں اپنے رسول نشانیاں دے کر اور اتاری ان کے ساتھ کتاب اور ترازو تاکہ لوگ عدل وانصاف پر قائم ہوجائیں اور ہم نے اتارا لوہا اس میں سخت لڑائی ہے اور لوگوں کے کام چلتے ہیں۔''

اس میں انبیاءؑ کے بھیجنے اور ان پر کتابیں نازل کرنے کی حکمت یہی بتلائی ہے کہ وہ ان کے ذریعہ لوگوں میں اخلاقی اور علمی اعتدال پیدا کریں، کتاب، اخلاق، اور روحانی اعتدال پیدا کرنے کے لئے نازل کی گئی، اور ترازو معاملات لین دین میں علمی اعتدال پیدا کرنے کے لئے، اور یہ بھی ممکن ہے کہ ترازو سے مراد ہر پیغمبر کی شریعت ہو، جس کے ذریعہ اعتدال حقیقی معلوم ہوتا ہے، اور عدل وانصاف قائم کیا جاسکتا ہے۔

اس تفصیل سے آپ نے یہ سمجھ لیا ہوگا کہ تمام انبیاءؑ کے بھیجنے اور ان پر کتابیں نازل کرنے کی اصلی غرض وحکمت یہی ہے کہ قوموں کو اخلاقی اور علمی اعتدال پر قائم کیا جائے، اور یہی قوموں کی صحت مندی اور تندرستی ہے۔

امت محمدیہ ﷺ میں ہر قسم کا اعتدال

اس بیان سے آپ نے یہ بھی معلوم کرلیا ہوگا کہ امت محمدیہ کی جو فضیلت آیت مذکورہ میں بتلائی گئی، وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا ، یعنی ہم نے تمہیں ایک معتدل امت بنایا ہے، یہ بولنے اور لکھنے میں تو ایک لفظ ہے لیکن حقیقت کے اعتبار سے کسی قوم یا شخص میں جتنے کمالات اس دنیا میں ہوسکتے ہیں ان سب کے لئے حاوی اور جامع ہے۔

اس میں امت محمدیہ کو امت وسط یعنی معتدل امت فرما کر یہ بتلا دیا کہ انسان کا جوہر شرافت وفضیلت ان میں بدرجہ کمال موجود ہے، اور جس غرض کے لئے آسمان وزمین کا سارا نظام ہے اور جس کے لئے انبیاً اور آسمانی کتابیں بھیجی گئی ہیں، یہ امت اس میں ساری امتوں سے ممتاز اور افضل ہے۔ قرآن کریم نے اس امت کے متعلق اس خاص وصف فضیلت کا بیان مختلف آیات میں مختلف عنوانات سے کیا ہے، سورہ اعراف کے آخر میں امت محمدیہ کے لئے ارشاد ہوا کہ: ''ان لوگوں میں جن کو ہم نے پیدا کیا ہے، ایک ایسی امت ہے جو سچی راہ بتلاتے ہیں اور اس کے موافق انصاف کرتے ہیں۔''

اس میں امت محمدیہ کے اعتدال روحانی واخلاقی کو واضح فرمایا ہے، کہ وہ اپنے ذاتی مفادات اور خواہشات کو چھوڑ کر آسمانی ہدایت کے مطابق خود بھی چلتے ہیں، اور دوسروں کو بھی چلانے کی کوشش کرتے ہیں، اور کسی معاملہ میں نزاع واختلاف ہوجائے تو اس کا فیصلہ بھی اسی لیے لاگو آسمانی قانون کے ذریعہ کرتے ہیں، جس میں کسی قوم یا شخص کے ناجائز مفاد کا کوئی خطرہ نہیں۔

اور سورہ آل عمران میں امت محمدیہ کے اسی اعتدالِ مزاج اور اعتدالِ روحانی کے آثار کو ان الفاظ میں بیان فرمایا گیا ہے جس کا مفہوم ہے کہ: ''تم سب امتوں میں بہتر ہو جو عالم میں بھیجی گئی، ۔۔۔ کرتے ہو اچھے کاموں کا اور منع کرتے ہو برے کاموں سے اور اللہ پر ایمان لاتے ہو۔''

یعنی جس طرح ان کو رسول ﷺ سب رسولوں میں افضل نصیب ہوئے، کتاب سب کتابوں میں جامع اور اکمل نصیب ہوئی، اسی طرح ان کو قوموں کا صحتمندانہ مزاج اور اعتدال بھی اس اعلی پیمانے پر نصیب ہوا، کہ وہ سب امتوں میں بہتر امت قرار پائی، اس پر علوم ومعارف کے دروازے کھول دیئے گئے ہیں، ایمان وعمل وتقویٰ کی تمام شاخیں ان کی قربانیوں سے سرسبز وشاداب ہوں گی، وہ کسی مخصوص ملک واقلیم میں محصور نہ ہوگی، بلکہ اس کا دائرۂ عمل سارے عالم اور انسانی زندگی کے سارے شعبوں کو محیط ہوگا، گویا اس کا وجود ہی اس لئے ہوگا کہ دوسروں کی خیر اخواہی کرے، اور جس طرح ممکن ہو انہیں جنت کے دروازوں پر لا کھڑا کردے، اخرجت للناس میں اس کی طرف اشارہ ہے، کہ یہ امت دوسروں کی خیر خواہی اور فائدہ کے لئے بنائی گئی ہے، اس کا فرض منصبی اور قومی نشان یہ ہے کہ لوگوں کو نیک کاموں کی ہدایت کرے، برے کاموں سے روکے۔

ایک حدیث میں رسول اللہ ﷺ کے ارشاد الدین النصیحة کا یہی مطلب ہے کہ دین اس کا نام ہے، کہ سب مسلمانوں کی خیر خواہی کرے، پھر برے کاموں میں کفر، شرک بدعات، رسوم قبیحہ، فسق وفجور اور ہر قسم کی بداخلاقی اور نامعقول باتیں شامل ہیں، ان سے روکنا بھی کئی طرح ہوگا، کبھی زبان سے کبھی ہاتھ سے، کبھی قلم سے کبھی تلوار سے، غرض ہر قسم کا جہاد اس میں داخل ہوگیا، یہ صفت جس قدر عموم واہتمام سے امت محمدیہ میں پائی گئی پہلی امتوں میں اس کی نظیر نہیں ملتی۔

۳۔ اب تیسری بات غور طلب یہ رہ گئی کہ اس امت کے توسط واعتدال کا واقعات سے ثبوت کیا ہے، اس کی تفصیل طویل اور تمام امتوں کے اعتقادات، اعمال واخلاق اور کارناموں کا موازنہ کرکے بتلانے پر موقوف ہے۔ اس میں سے چند چیزیں بطور مثال ذکر کی جاتی ہیں۔

اعتقادی اعتدال

سب سے پہلے اعتقادی اور نظری اعتدال کو لے لیجئے ،تو پچھلی امتوں میں ایک طرف تو یہ نظر آئے گا کہ اللہ کے رسولوں کو بیٹا بنالیا ،اور ان کی عبادت اور پرستش کرنے لگے،وَقَالَتِ الیَهُودُ عُزَیرُ نِ ابنُ اللہِ وَقَالَتِ النَّصارَی المَسِیحُ ابنُ اللہ،اور دوسری طرف انہی قوموں کے دوسرے افراد کا یہ عالم بھی مشاہدہ میں آئے گا کہ رسول کے مسلسل معجزات دیکھنے اور برتنے کے باوجود جب ان کا رسول ان کو کسی جنگ یا جہاد کی دعوت دیتا ہے تو وہ کہہ دیتے ہیں ﴿فَاذهَبْ اَنتَ وَرَبُّکَ فَقَاتِلاَ اِنَّا ھٰهُنَا قٰعِدُونَ﴾ ’’یعنی جایئے آپ اور آپ کا پروردگار وہی مخالفین سے قتال کریں،ہم تو یہاں بیٹھے ہیں۔‘‘

کہیں یہ بھی نظر آتا ہے کہ اپنے انبیاء کو خود ان کے ماننے والے طرح طرح کی ایذائیں پہنچاتے ہیں۔

بخلاف امت محمدیہ کے کہ وہ ہر قرن ہر زمانے میں ایک طرف تو اپنے رسول اللہ ﷺ سے وہ عشق ومحبت رکھتے ہیں کہ اس کے آگے اپنی جان ومال اور اولاد آبرو سب کو قربان کردیتے ہیں۔

سلام ان پر کہ جس کے نام لیوا ہر زمانے میں
بڑھا دیتے ہیں ٹکڑا سر فروشی کے فسانے میں

اور دوسری طرف یہ اعتدال کہ رسول کو رسول اور خدا کو خدا سمجھتے ہیں،رسول اللہ ﷺ کو باایں ہمہ کمالات وفضائل عبداللہ ورسولہ مانتے اور کہتے ہیں،وہ آپ کے مدائح ومناقب میں بھی یہ پیمانہ رکھتے ہیں،جو قصیدہ بردہ میں فرمایا۔

دع ما ادعته النصاری فی نبیهم   واحکم بما شئت مدحا فیه واحتکم

’’یعنی اس کلمہ کفر کو تو چھوڑ دو جو نصاریٰ نے اپنے نبی کے بارے میں کہہ دیا (کہ وہ معاذ اللہ خود خدا یا خدا کے بیٹے ہیں) اس کے سوا آپ کی مدح وثناء میں جو کچھ کہو وہ سب حق

صحیح ہے۔'' جس کا خلاصہ کسی نے ایک مصرع میں اس طرح بیان کردیا ۔

بعد از خدا بزرگ توئی قصہ مختصر

عمل اور عبادت میں اعتدال

اعتقاد کے بعد عمل اور عبادت کا نمبر ہے، اس میں ملاحظہ فرمایئے پچھلی امتوں میں ایک طرف تو یہ نظر آئے گا کہ اپنے شریعت کے احکام کو چند ٹکوں کے بدلے فروخت کیا جاتا ہے، رشوتیں لے کر آسمانی کتاب میں ترمیم کی جاتی ہے، یا غلط فتوے دیئے جاتے ہیں، اور طرح طرح کے حیلے بہانے کر کے شرعی احکام کو بدلا جاتا ہے، عبادت سے پیچھا چھڑایا جاتا ہے، اور دوسری طرف عبادت خانوں میں آپ کو ایسے لوگ بھی نظر آئیں گے جنہوں نے ترکِ دنیا کر کے رہبانیت اختیار کرلی، وہ خدا کی دی ہوئی حلال نعمتوں سے بھی اپنے آپ کو محروم رکھتے اور سختیاں جھیلنے ہی کو عبادت وثواب سمجھتے ہیں۔

امتِ محمدیہ ﷺ نے اس کے خلاف ایک طرف رہبانیت کو انسانیت پر ظلم قرار دیا، اور دوسری طرف احکامِ خدا اور رسول پر مر مٹنے کا جذبہ پیدا کیا، اور قیصر و کسریٰ کے تخت و تاج کے مالک بن کر دنیا کو دکھلا دیا کہ دیانت و سیاست میں یا دین و دنیا میں بیر نہیں، مذہب صرف مسجدوں یا خانقاہوں کے گوشوں کے لئے نہیں آیا بلکہ اس کی حکمرانی بازاروں اور دفتروں پر بھی ہے، اور وزارتوں اور امارتوں پر بھی، اس نے بادشاہی میں فقیری اور فقیری میں بادشاہی سکھلائی۔

معاشرتی اور تمدنی اعتدال

اس کے بعد معاشرت اور تمدن کو دیکھئے، تو پچھلی امتوں میں آپ ایک طرف یہ بے اعتدالی دیکھیں گے کہ انسانی حقوق کی کوئی پرواہ نہیں، حق ناحق کی کوئی بحث نہیں، اپنی اغراض کے خلاف جس کو دیکھا اس کو کچل ڈالنا، قتل کر دینا، لوٹ لینا سب سے بڑا کمال ہے، ایک رئیس کی چراگاہ میں کسی دوسرے کا اونٹ گھس گیا، اور وہاں کچھ نقصان کر دیا، تو عرب کی

مشہور جنگ حرب بسوس مسلسل سو۱۰۰ برس جاری رہی، ہزاروں انسانوں کا خون ہوا، عورتوں کو انسانی حقوق دینا تو کجا زندہ رہنے کی اجازت نہیں دی جاتی، کہیں بچپن ہی میں ان کو زندہ درگور کردینے کی رسم تھی، کہیں مُردہ شوہروں کے ساتھ ستھی کر کے جلا ڈالنے کا رواج تھا، اس کے بالمقابل دوسری طرف یہ بیہمانہ رحم دلی کہ کیڑے مکوڑے کی ہتھیا کو حرام سمجھیں، جانوروں کے ذبیحہ کو حرام قرار دیں، خدا کے حلال کئے ہوئے جانوروں کا گوشت و پوست سے نفع اٹھانے کو ظلم سمجھیں، امتِ محمدیہ ﷺ اور اس کی شریعت نے ان سب بے اعتدالیوں کا خاتمہ کیا، ایک طرف انسان کو انسان کے حقوق بتلائے، اور نہ صرف صلح و دوستی کے وقت بلکہ عین میدانِ جنگ میں مخالفین کے حقوق کی حفاظت سکھلائی، عورتوں کو مردوں کی طرح حقوق عطا فرمائے، اور دوسری طرف ہر چیز کی حد مقرر فرمائی، جس سے آگے بڑھنے اور پیچھے رہنے کو جرم قرار دیا، اور اپنے حقوق کے معاملہ میں درگزر اور عفو و چشم پوشی کا سبق سکھلایا، دوسروں کے حقوق کا پورا اہتمام کرنے کے آداب سکھلائے۔

اقتصادی اور مالی اعتدال

اس کے بعد دنیا کی ہر قوم و ملت میں سب سے اہم مسئلہ معاشیات اور اقتصادیات کا ہے، اس میں بھی دوسری قوموں اور امتوں میں طرح طرح کی بے اعتدالیاں نظر آئیں گی، ایک طرف نظام سرمایہ داری ہے، جس میں حلال و حرام کی قیود سے اور دوسرے لوگوں کی خوشحالی یا بدحالی سے آنکھیں بند کر کے زیادہ سے زیادہ دولت جمع کرلینا سب سے بڑی انسانی فضیلت سمجھی جاتی ہے، تو دوسری طرف شخصی اور انفرادی ملکیت ہی کو سرے سے جرم قرار دیا جاتا ہے، اور غور کرنے سے دونوں اقتصادی نظاموں کا حاصل مال و دولت کی پرستش اور اس کو مقصد زندگی سمجھنا اور اس کے لئے دوڑ دھوپ ہے۔

امت محمدیہ اور اس کی شریعت نے اس میں اعتدال کی عجیب و غریب صورت پیدا کی، کہ ایک طرف تو دولت کو مقصد زندگی بنانے سے منع فرمایا، اور انسانی عزت و شرافت یا

کسی منصب وعہدہ کا مدار اس پر نہیں رکھا، اور دوسری طرف تقسیم دولت کے ایسے پاکیزہ اصول مقرر کئے جن سے کوئی انسان ضروریات زندگی سے محروم نہ رہے، اور کوئی فرد ساری دولت کو نہ سمیٹ لے، قابل اشتراک چیزوں کو مشترک اور وقف عام رکھا مخصوص چیزوں میں انفرادی ملکیت کا مکمل احترام کیا، حلال مال کی فضیلت اس کے رکھنے اور استعمال کرنے کے صحیح طریقے بتلائے، اس کی تفصیل اس قدر طویل ہے کہ ایک مستقل بیان کو چاہتی ہے، اس وقت بطور مثال چند نمونے اعتدال اور بے اعتدالی کے پیش کرنے تھے، اس کے لئے اتنا ہی کافی ہے کہ جس سے آیت مذکورہ کا مضمون واضح ہوگیا، کہ امت محمدیہ کو ایک معتدل اور بہترین امت بنایا گیا ہے،

شہادت کے لئے عدل وثقہ ہونا شرط ہے

لِتَكُونُوا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ ،یعنی امت محمدیہ کو وسط اور عدل وثقہ اس لئے بنایا گیا کہ یہ شہادت دینے کے قابل ہوجائیں، اس سے معلوم ہوا کہ جو شخص عدل نہیں، وہ قابل شہادت نہیں، عدل کا ترجمہ ثقہ یعنی قابل اعتماد کیا جاتا ہے، اس کی پوری شرائط کتب فقہ میں مذکور ہیں۔

قرطبیؒ نے فرمایا کہ یہ آیت اجماع امت کے حجت ہونے پر ایک دلیل ہے کیونکہ جب اس امت کو اللہ تعالیٰ نے شہداء قرار دے کر دوسری امتوں کے بالمقابل ان کی بات کو حجت بنادیا، تو ثابت ہوا کہ اس امت کا اجماع حجت ہے، اور عمل اس پر واجب ہے، اس طرح کہ صحابہ کا اجماع تابعین پر اور تابعین کا اجماع تبع تابعین پر حجت ہے۔

اور تفسیر مظہری میں ہے کہ اس آیت سے ثابت ہوا کہ اس امت کے جو افعال واعمال متفق علیہ ہیں وہ سب محمود ومقبول ہیں، کیونکہ اگر سب کا اتفاق کسی خطا پر تسلیم کیا جائے تو پھر یہ کہنے کے کوئی معنی نہیں رہتے کہ یہ امت وسط اور عدل ہے۔

امام جصاصؒ نے فرمایا کہ اس آیت میں اس کی دلیل ہے کہ ہر زمانے کے

مسلمانوں کا اجماع معتبر ہے، اجماع کا حجت ہونا صرف قرن اول یا کسی خاص زمانے کے ساتھ مخصوص نہیں، کیونکہ آیت میں پوری امت کو خطاب ہے، اور امت رسول اللہ ﷺ کی صرف وہ نہ تھے جو اس زمانے میں موجود تھے، بلکہ قیامت تک آنے والی نسلیں جو مسلمان ہیں وہ سب آپ کی امت ہیں تو ہر زمانے کے مسلمان شہداء اللہ ہو گئے جن کا قول حجت ہے وہ سب کسی خطا اور غلط پر متفق نہیں ہو سکتے۔ (بحوالہ معارف القرآن جلد اول وانوار البیان)

وصف اعتدال سے متعلق مزید وضاحت

قرآن مجید وفرقان حمید کتاب اللہ ہونے کی حیثیت سے ساکنان ارض کے لئے سب سے بڑی کتاب ہے، اور ایک دستور حیات ہونے کی حیثیت سے ایک ایسی کتاب دستور ہے کہ اس کے بعد سچے انسان کو تلاش حقائق کے لئے پریشان ہونے کی ضرورت ہے نہ سرگرداں ہونے کی حاجت حق کے متلاشیوں کو قرآن حکیم میں ہر چیز مل جاتی ہے، زندگی کا کوئی شعبہ ایسا نہیں ہے کہ قرآن نے اس کے لئے رہنمائی نہ عطا کی ہو، کرہ زمین پر جن انسانوں نے قرآن کریم کی کرامت کو کتاب عظیم کی عظمت کو صحیفہ آسمانی کی رفعت کو سمجھا ہے اور قرآن مجید اور رضائے الٰہی کے سامنے سر تسلیم ورضا خم کیا ہے، سرفرازی اور سربلندی ان کی قسمت ہوئی ہے، اور آج بھی متعدد اقوام وملل نئے عنوانات کے ساتھ اس کتاب حیات سے روشنی اور نور حاصل کر کے درخشاں وتابندہ ہیں، اور جنہوں نے اس نور مسلسل کی تابندگی سے صرف نظر کیا ہے ان کی قسمت میں اقوام تابندہ کی بندگی لکھ دی گئی ہے، اور ضلالت اور غلامی ان کا مقدر بن گئی ہے، یہ قانون قدرت ہے اور اٹل قانون ہے جس میں کبھی کوئی تبدیلی نہیں ہوئی ہے، اور نہ اب ہوسکتی ہے اور نہ آئندہ تا قیام قیامت اس میں کوئی تبدیلی ہوگی۔

اس دنیا میں ایک پر مقصد زندگی گزارنے کے لئے قرآن مجید نے ہر شعبہ زندگی میں انسان کو رہنمائی عطا کی ہے اور جناب رسول اللہ ﷺ ایک نمونہ کامل واکمل کی حیثیت

سے کل کائنات بشری کے لیے بھیجے گئے،قرآن اور رسول انسان کو اشرف المخلوقات قرار دیتے ہیں اورانسان کے جسم وصحت کی حفاظت پر بڑی واضح ہدایات اورنہایت صریح احکامات عطا فرماتے ہیں۔اس وقت ہم قرآن حکیم کی ایک آیت پر غور کرتے ہیں:﴿ولاتسرفوا اِنَّہٗ لَایُحِبُّ المُسرِفِینَ﴾ ”یعنی بےاعتدالی نہ کرو،خدا بے اعتدالیاں کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔“

ضروریات وخواہشات کی تکمیل کے بارے میں قرآن مجید کی یہ ہدایت حفظ صحت کے سلسلے میں انتہائی ہمہ گیر اور جامع مفہوم کی حامل ہے،اس آیت کریمہ میں اعتدال پر انسان کو متوجہ کیا گیا ہے،اگر ہم غور کریں اور اپنی روزمرہ کی زندگی پر ایک امتحانی نظر ڈالیں ،اور اپنے اعمال وافعال کا ایک تنقیدی جائزہ لیں تو اس آیت قرآنی کا مفہوم سمجھنا ہمارے لئے ذرا بھی مشکل نہیں ہے۔

آپ کھانے پینے پر غور کیجئے،اگر لذیذ اور عمدہ کھانا سامنے آگیا ہے تو کتنے انسان ہیں کہ دامن احتیاط پکڑ کر راہ اعتدال پر چلتے ہیں؟اور کتنے انسان ہیں کہ جو اپنے معدے کی گنجائش کا اور اپنی قوت ہضم کا جائزہ لے کر کھانے سے اس وقت ہاتھ کھینچ لیتے ہیں کہ جب ابھی معدے میں کھانے کی گنجائش موجود ہو!

ہم سب خوب جانتے ہیں کہ انسان پر لذت غالب آجاتی ہے،اوراعتدال کا مفہوم اوجھل ہوجاتا ہے اور وہ اس حقیقت اور اس حدیث رسول ﷺ کو فراموش کردیتا ہے کہ ”المعدۃ بیت الداء“یعنی معدہ بیماریوں کا گھر ہے“اور پھر انسان نہ صرف بدہضمی کا شکار بن جاتا ہے، بلکہ اپنی صحت کے لئے خطرات مول لے لیتا ہے،اور اپنی عافیت تک سے صرف نظر کرلیتا ہے۔

پینے کا حال بھی کھانے سے مختلف نہیں ہے،انسان ذوق وشوق میں نہ جانے کیا کیا پی رہا ہے اور اسے اعتدال کا ذرا بھی پاس، ہے نہ لحاظ،ایک طرف اسا کا حال یہ ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے اس حکم کو بھول جاتا ہے کہ:﴿وکُلُوا مِمَّا رَزَقَکُمُ اللہُ حَلَالاً طَیِّباً﴾ ”یعنی حلال

اور پاک چیزیں کھاؤ۔"

اور دوسری طرف اس کی کیفیت فہم کا یہ عالم ہے کہ وہ ذرا بھی اس پر غور نہیں کرتا کہ وہ جو پی رہا ہے اور پینے کھانے پر خرچ کر رہا ہے، خود وہ اور اس کا ملک اس کا متحمل بھی ہے یا نہیں، ماکولات ومشروبات کی جو انواع واقسام کثیر زرِ مبادلہ خرچ کر کے ہم نے اپنے لیے فراہم کر لی ہیں، غور کرنے کی چیز یہ ہے کہ کیا وہ ہماری حقیقی ضرورتیں ہیں یا تکلفات محض؟ سمجھنے کی چیز یہ بھی ہے کہ ان کا فائدہ ہمارے جسم کو پہنچ رہا ہے یا وہ لوگ ان حقیقی فوائد سے متمتع ہو رہے ہیں جو ان کے موجد ہیں، اور ہمیں بھجوانے والے ہیں، اس صورت حال پر ذرا گہرائی کے ساتھ غور کیجئے اور دوبارہ اس پوری آیت پر غور کیجئے کہ ﴿كُلُوا وَاشْرَبُوا وَلَا تُسْرِفُوا﴾ "کھاؤ پیو مگر بے اعتدالی نہ کرو۔" کیوں کہ ﴿إِنَّهُ لَا يُحِبُّ الْمُسْرِفِينَ﴾ "خدا بے اعتدالیاں کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔"

کھانے پینے کے بارے میں ان کلماتِ چند سے صحیح بات سامنے آجاتی ہے کہ ہمیں اعتدال کو ہمیشہ ملحوظ رکھنا چاہئے، ہمیں زندہ رہنے کے لئے کھانا پینا چاہئے، نہ کہ کھانے پینے کے لئے زندہ رہنا، یہ نہ صرف ہماری صحت کے لئے ضروری ہے، بلکہ ہماری ملی اور ملکی عافیت کا تقاضا بھی یہی ہے کہ ہم حدود اعتدال سے باہر قدم نہ رکھیں اور اس حقیقت کو پوری طرح ذہن میں رکھ لیں کہ بھوک سے زیادہ کھانے والے کو اللہ تعالیٰ نے پسند نہیں فرمایا مشہور قول ہے: ﴿إِنَّ اللهَ يُبْغِضُ الْأَكْلَ فَوْقَ شَبْعِهِ﴾

ہادی برحق جناب محمد رسول اللہ ﷺ نے صحت کو عظیم نعمت قرار دیا ہے اور حفظ صحت کی ہدایت فرمائی ہے، اپنی صحت کی حفاظت انسان کا حق بھی ہے اور فرض بھی، صحت کی حفاظت انسان کی ذاتی ضرورت بھی ہے اور قومی اور ملی حاجت بھی ہے، ذاتی اس لئے ہے کہ اگر وہ بیمار ہے تو اپنے فرائض ادا نہیں کر سکتا اور اپنی صحت کو پر مسرت نہیں بنا سکتا ہے، کیوں کہ صحت ہی سب سے بڑی مسرت ہے، جو انسان نعمت صحت سے محروم ہو گیا سمجھ لینا چاہئے اور یقین کر لینا چاہئے کہ وہ ہر مسرت سے محروم ہو گیا۔

صحت، ملکی اور قومی ضرورت اس بنا پر ہے کہ قوم کے بیمار اور صحت سے محروم افراد ایک صحت مند قوم اور تندرست ملت نہیں بنا سکتے اور ایک ایسی قوم جو مجموعی طور پر بیمار اور نحیف ونزار ہو نہ صرف یہ کہ کرۂ ارض پر اپنی حقیقت کو تسلیم نہیں کرا سکتی، بلکہ اپنے وجود کو بھی باقی نہیں رکھ سکتی، زمانے کے تھپیڑے اسے خس وخاشاک کی طرح اڑا دیں گے۔

اگر مسلمان صحت مند نہیں ہے اور ملت اسلامیہ بیمار ہے تو باور کرنا چاہئیے کہ یہ سب سے بڑا عذاب ہے، اس کا صریحی مطلب یہ ہوگا کہ صحت منداور طاقت ور اقوام اپنی جسمانی طاقت اور اپنی صحت مند صلاحیت کی بنا پر اس پر غلبہ پالیں گی اور اعلاء کلمۃ الحق والی امت اپنے حقیقی فرائض کی ادائیگی سے محروم ہو جائے گی اور اس کی بیماری اسے افکار غیر تک قبول کرنے پر مجبور کر دے گی، اب ضرورت ہے کہ ہم اپنی صحت کو حقائق کے اس آئینے میں بھی دیکھیں اور من حیث القوم حفظ صحت پر توجہ کریں۔ ہم نے ابھی کہا کہ حفظ صحت آپ کا ذاتی معاملہ بھی ہے اور ایک فریضہ قومی بھی، آپ کی صحت اور صحت ملی لازم وملزوم ہیں، میں آپ کو اس طرف متوجہ کرنا چاہتا ہوں کہ ہماری ملت میں بے شمار افراد ایسے ہیں کہ جو اصول حفظ صحت کا مفہوم نہیں سمجھتے، ان کی اس لاعلمی نے ان کو اور ان کے گھر کو بیماریوں کی آماج گاہ بنا رکھا ہے۔ ضرورت ہے کہ آپ ان افراد ملت پر توجہ کریں اور صحت کی باتیں ان تک پہنچا دیں یہ ایک مقدس فریضہ ہے اور افراد ملت کو یہ مقدس فریضہ ضرور ادا کرنا چاہیے۔ مجھے اس وقت حضرت داؤد علیہ السلام کا ایک بڑا اچھا قول صحت یاد آیا ہے میں اسی پر اپنے اس خطاب کو ختم کرتا ہوں: ﴿اَلصِّحَّۃُ تَاجٌ عَلٰی رُءُوسِ الأَصِحَّاءِ لایَرَاہُ اِلَّا الْمَرْضٰی﴾ ''اس قول داؤد کا مطلب یہ ہے کہ صحت ایک ایسا تاج ہے جو صحت مندوں کے سر پر ہوتا ہے، مگر یہ صرف مریضوں کو نظر آتا ہے۔'' (بحوالہ نورستان از حکیم محمد سعید شہیدؒ)

اعتدال کا معنیٰ اور مطلب

اعتدال کا مطلب ہے نہ حد سے زیادہ اور نہ حد سے کم۔ اسی کو میانہ روی بھی کہا جاتا

ہے۔ داناؤں کا قول ہے کہ ہر کام میں بے اعتدالی کرنے سے نقصان کے سوا کچھ حاصل نہیں ہوتا۔ محسنِ انسانیت رسول اکرم ﷺ نے بھی اعتدال پر بے حد زور دیا اور فرمایا ہے کہ۔

"اے لوگو! اعتدال اختیار کرو۔ اللہ کسی کو تکلیف میں نہیں ڈالتا جب تک تم خود مشقت میں نہ پڑو۔ (یادرکھو) تمام کاموں میں اعتدال سب سے بہتر ہے"۔

درحقیقت اعتدال قدرت کا سچ اور پکا اصول ہے۔ دنیا کا تمام کارخانہ اسی پر قائم ہے کوئی کام خواہ دینی ہو یا دنیوی ایسا نہیں جس میں اعتدال کی ضرورت نہ ہو۔ انسان کو اطمینان کی زندگی اسی وقت نصیب ہوتی ہے جب وہ اعتدال پر کاربند ہو اور کبھی اعتدال کو ہاتھ سے نہ جانے دے۔ آج ہمارے معاشرے میں جتنی بھی خرابیاں دکھائی دیتی ہیں ان میں سے بیشتر کا سبب یہ ہے کہ لوگ اپنے کاموں میں بے اعتدالی سے کام لیتے ہیں حالانکہ ہمارا دعویٰ ہے کہ ہم ایک اسلامی معاشرے کے افراد ہیں۔ سچ پوچھئے تو یہ محض زبانی دعویٰ ہے۔ عملی زندگی میں ہم اس بات کو بالکل نظر انداز کر دیتے ہیں کہ اسلامی طرزِ معاشرت میں اعتدال بنیادی اصول کی حیثیت رکھتا ہے۔ یہاں تک کہ عبادت میں بھی اعتدال کی تلقین کی گئی ہے۔ متواتر روزے رکھنا یا ساری ساری رات عبادت میں مصروف رہنا اور نہ صرف اپنے گھر والوں سے بلکہ دنیا کے دوسرے کاموں سے بھی غافل ہو جانا اعتدال کا طریقہ نہیں ہے۔ اسی لئے اس کو ناپسندیدہ قرار دیا گیا ہے اسلام کا حکم تو یہ ہے کہ دین کو مشکل مت بناؤ۔ عبادت اسی حد تک درست ہے جب تک تمہارا دل اس میں لگا رہے۔ اتنی زیادہ عبادت نہ کرو کہ طبیعت اکتا جائے اور روحانی سکون ملنے کی بجائے وحشت ہونے لگے۔ دوسری طرف دنیا کے دھندوں میں اس قدر مشغول نہ ہو جاؤ کہ اللہ کی یاد سے غافل ہو جاؤ۔

سوچنے کی بات ہے کہ جب اللہ اپنی عبادت میں بے اعتدالی پسند نہیں کرتا تو اسے دنیاوی کاموں میں یہ کیسے پسند آسکتی ہے، لیکن آج ہم میں سے کتنے لوگ ہیں جو شادی بیاہ، بچوں کی پیدائش اور دوسرے رسوم ورواج پر اعتدال کے دائرے کے اندر رہتے ہیں۔ ہم تو ایسے موقعوں پر زیادہ خرچ کر کے لوگوں کی واہ واہ حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ اگر حکومت

ہمارے بھلے کی خاطر مہمانوں کی تعداد اور کھانوں پر پابندی لگاتی ہے تو ہم بے اعتدالی کرنے کے لئے چوری چھپے ایسے طریقے اختیار کر لیتے ہیں کہ اس پابندی کا مقصد ہی فوت ہو جاتا ہے۔ ایسی بے اعتدالیوں نے کئی گھرانوں کا سکھ وچین چھین لیا ہے اور وہ قرض اور افلاس کے چکر میں ایسے پھنستے ہیں کہ اس سے چھٹکارا پانا مشکل ہے۔ اگر اپنی چادر دیکھ کر پاؤں پھیلائے جائیں تو اس میں اپنا بھی فائدہ ہے اور قوم اور ملک کا بھی۔

مثلاً ورزش انسانی صحت کے لئے بہت مفید ہے لیکن جب حد سے بڑھ کر ورزش کی جائے یہاں تک کہ آدمی تھک کر چور ہو جائے تو یہی ورزش سخت نقصان دہ ثابت ہوتی ہے۔

اچھی اور متوازن غذا صحت بخش ہوتی ہے، لیکن خواہ کیسی عمدہ خوراک ہو، اگر اس کے استعمال میں اعتدال سے کام نہ لیں اور بار بار تھوڑے تھوڑے وقفہ کے بعد منہ چلاتے رہیں تو وہ فائدہ دینے کی بجائے زہر بن جاتی ہے۔ معدہ خراب ہو جاتا ہے اور آدمی طرح طرح کی بیماریوں میں مبتلا ہو جاتا ہے۔

مطالعہ بہت اچھی عادت ہے لیکن اس میں بھی بے اعتدالی سخت نقصان کا باعث ہوتی ہے۔ وقت بے وقت مطالعہ میں مصروف رہنے سے نہ صرف آنکھوں پر بوجھ پڑتا ہے بلکہ عام جسمانی صحت بھی خراب ہو جاتی ہے۔

بچوں سے پیار محبت بہت ضروری لیکن اس میں بھی آپ حد سے بڑھ گئے تو بچے بگڑ جائیں گے۔ گفتگو اور بول چال سے کسی انسان کی خوبیاں اور خامیاں ظاہر ہوتی ہے۔ منہ سے بات نکالنے میں احتیاط اور اعتدال سے کام نہ لیا جائے تو انسان دوسروں کی نظر سے گر جاتا ہے۔ اگر ایک شخص میں چھچھور پن ہے، وہ ڈینگیں مارتا ہے، دوسروں کی غیبت کرتا ہے، بے محل ہنستا ہے، بار بار بگڑتا ہے اور روٹھتا ہے تو وہ لوگوں میں ذلیل ہو جائے گا۔ اسی طرح اگر کوئی شخص حد سے زیادہ خاموش رہتا ہے یا حد سے زیادہ کم گو ہے تو یہی سمجھا جائے گا کہ وہ مغرور اور دوسروں کو حقیر سمجھتا ہے۔ آپس میں ہنسی مذاق کرنا برا نہیں، لیکن جب یہ حد سے بڑھ جائے اور تہذیب کے دائرے سے باہر ہو جائے تو لڑائی اور دشمنی کا سبب بن جاتا ہے۔

کنجوسی اور بخیلی ایک بری عادت ہے لیکن اپنی آمدنی سے بڑھ کر خرچ کرنا اس سے بھی زیادہ برا ہے۔ بعض لوگ خوراک اور پوشاک پر اپنی آمدنی سے بڑھ کر خرچ کرتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ہمیشہ تنگ دستی کا شکار رہتے ہیں۔ اگر کوشش کر کے سادہ خوراک کی عادت ڈالی جائے اور چٹخارے بازی سے پرہیز کیا جائے تو اس سے خرچ کافی کم ہو سکتا ہے اسی طرح پوشاک زیادہ قیمتی ہونے کے بجائے سادہ اور صاف ستھری ہو تو اس پر خرچ بھی کم آئے گا اور عزت میں بھی کوئی کمی نہیں آئے گی۔

مختصر یہ کہ اعتدال اور میانہ روی میں فائدہ ہی فائدہ ہے اور نقصان کا کوئی پہلو نہیں۔ اگر آج ہم اعتدال کو اپنی زندگی کا اصول بنالیں تو کوئی وجہ نہیں کہ ہمارے معاشرے کی بہت سی خرابیاں تھوڑی ہی مدت میں نیست و نابود نہ ہو جائیں۔ آیئے سچے دل سے عہد کریں کہ ہم کھانے پینے، خرچ کرنے، پڑھنے لکھنے، پہننے اوڑھنے، دوڑنے بھاگنے، ہنسنے بولنے، غرض ہر کام میں اعتدال اور میانہ روی سے کام لیں گے۔ اگر آپ نے یہ عہد پورا کیا تو آپ دیکھیں گے کہ اس سے صرف آپ ہی کا بھلا نہیں ہوگا بلکہ قوم اور ملک کو بھی بے انتہا فائدہ پہنچے گا۔

رسولِ اکرم ﷺ اور اعتدال کی اہمیت

میانہ روی یا اعتدال کا مطلب ہے کسی امر میں افراط و تفریط سے بچ کر درمیانی راستہ اختیار کرنا مثلاً اللہ تعالیٰ نے قرآن حکیم میں اپنے محبوب یا پسندیدہ بندوں کے جو اوصاف بیان کئے ہیں ان میں ایک وصف یہ ہے کہ وہ نہ فضول خرچی کرتے ہیں اور نہ بخل، ارشاد ہوا ہے۔ **والذین اذآ انفقوا لم یسرفوا ولم یقتروا و کان بین ذٰلک قواماً** (الفرقان)

"یعنی جو خرچ کرتے ہیں تو نہ فضول خرچی کرتے ہیں نہ بخل بلکہ ان کا خرچ دونوں انتہاؤں کے درمیان اعتدال پر قائم رہتا ہے"۔

سورۂ بنی اسرائیل میں فرمایا گیا ہے کہ۔ **ولا تجعل یدک مغلولة الیٰ**

عنقک ولا تبسطها کل البسط فتقعد ملوماً محسورًا ○ (آیت۔۲۹)

''یعنی نہ تو اپنا ہاتھ گردن سے باندھ رکھو اور نہ اسے بالکل ہی کھلا چھوڑ دو کہ ملامت زدہ اور عاجز بن کر رہ جاؤ''۔ مطلب یہ کہ بخیل بن کر نہ تو دولت کی گردش کو روکو اور نہ فضول خرچی میں مبتلا ہو کر تباہ و برباد ہو جاؤ۔

سورۂ لقمان میں ارشاد ہوا ہے کہ۔ **واقصد فی مشیک** ''یعنی اپنی چال میں میانہ روی اختیار کرو''۔ مطلب یہ کہ سیدھے سادھے معقول اور شریف آدمی کی سی چال چلو جس میں نہ کوئی اینٹھ اور اکڑ ہو اور نہ مریل پن اور نہ دکھاوے کا انکسار۔

عبادت میں اعتدال کا حکم اس طرح دیا گیا ہے۔

ولا تجھر بصلاتک ولا تخافت بھا وابتغ بین ذٰلک سبیلاً ○

''یعنی اور اپنی نماز نہ بہت زیادہ بلند آواز سے پڑھو اور نہ بہت ہلکی آواز سے'' ان دونوں کے درمیان اوسط درجے کا لہجہ اختیار کرو۔

فی الحقیقت اسلام میں میانہ روی یا اعتدال کو تمام امور میں بہترین روش قرار دیا گیا ہے۔ رسول اکرم ﷺ کو میانہ روی اختیار کرنے کی بہت تاکید فرمایا کرتے تھے۔ چند احادیث ملاحظہ ہوں۔

(۱)...... حضرت جابر بن عبداللہؓ سے روایت ہے کہ رسول اکرم ﷺ نے فرمایا ہے کہ اے لوگو! اعتدال اختیار کرو، اعتدال اختیار کرو، اعتدال اختیار کرو۔ اللہ کسی کو تکلیف میں نہیں ڈالتا جب تک تم خود مشقت میں نہ پڑو۔ (کنز العمال)

(۲)...... حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے روایت ہے کہ رسول اکرم ﷺ نے فرمایا کہ کسی شخص کو دین میں بصیرت زیادہ نہیں ہوتی۔ جب تک اس کے اعمال میں میانہ روی نہ آجائے۔ (مشکوٰۃ)

(۳)...... حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ رسول اکرم ﷺ نے فرمایا کہ کیا اچھا ہے اعتدال تمول میں، کیا اچھا ہے اعتدال فقر میں، کیا اچھا ہے اعتدال عبادت میں۔

(۴)......ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہؓ سے روایت ہے کہ رسول اکرم ﷺ نے فرمایا کہ لوگو! اسی قدر اعمال اختیار کرو، جس کی تم طاقت رکھتے ہو، اللہ تعالیٰ تم کو تکلیف میں نہیں ڈالتا جب تک تم خود تکلیف میں نہ پڑو۔ (کنزالعمال)

خود رسول اکرم ﷺ اپنے معمولات روز وشب میں جہاں تک ممکن تھا میانہ روی، اعتدال سے کام لیتے تھے۔ رات کو آپ ﷺ نے تین حصوں میں بانٹ رکھا تھا۔ ایک حصہ آپ ﷺ نے اپنے صحابہؓ یا دوسرے لوگوں سے مختلف امور کے سلسلے میں گفتگو اور ملاقاتوں کے لئے مختص کر رکھا تھا، ایک حصہ اہل وعیال کے حقوق کی ادائیگی کے لئے تھا اور ایک حصہ عبادت کے لئے وقف تھا۔ دن کے اوقات، تبلیغ حق اور دوسرے دینی ودنیوی معاملات کے نمٹانے میں صرف ہوتے تھے۔ مدنی زندگی میں رسول اکرم ﷺ کو ایک وسیع وعریض مملکت کے سربراہ کی حیثیت بھی حاصل ہوگئی تھی۔ یوں آپ ﷺ کی ذمہ داریوں میں بہت اضافہ ہو گیا تھا۔ کارِ نبوت بھی تھا اور امورِ مملکت بھی تھے لیکن آپ ﷺ نے دین اور دنیا کے تمام معاملات کو ایسے توازن اور خوش اسلوبی سے انجام دیا کہ چشمِ فلک نے اس سے پہلے کبھی کسی اور کو ایسا ہمہ گیر اور متوازن کردار ادا کرتے نہیں دیکھا تھا۔ ذرا چشم تصور وا کیجئے اور دیکھئے۔

ختم الانبیاء والمرسلین وفرمانروائے مملکت اسلامیہ عرب، مختلف ملکوں کے بادشاہوں قبائل کے سرداروں اور حاکموں کے نام فرمان لکھوا رہے ہیں، دوسرے ملکوں کے سفیروں اور مختلف قبیلوں اور قوموں کے وفود کو شرفِ باریابی بخش رہے ہیں۔ نظم مملکت کے لئے عمال کا تقرر فرما رہے ہیں، جنگ کے میدانوں میں فوج کی قیادت فرما رہے ہیں، بیماروں کے گھروں پر بہ نفس نفیس تشریف لے جا کر ان کی عیادت فرما رہے ہیں، اسی طرح وفات پا جانے والوں کے پسماندگان کے پاس جا کر تعزیت کر رہے ہیں، اہل ایمان کے جنازوں کے ساتھ جا رہے ہیں، غرباء، مساکین، بیواؤں، یتیموں اور حاجت مندوں کی اعانت فرما رہے ہیں۔ نمازوں میں صحابہ کی امامت فرما رہے ہیں، بازاروں میں یہ دیکھنے کے لئے گشت لگا رہے ہیں کہ کوئی دکاندار گاہکوں کو دھوکا تو نہیں دے رہا۔ غرض دین اور دنیا کے

معاملات یا حقوق اللہ اور حقوق العباد کی ادائیگی میں جو توازن اور اعتدال ہے وہ اپنی مثال آپ ہے۔

افراد امت کو میانہ روی اختیار کرنے اور شدت یا انتہا پسندی سے بچنے کی تلقین و ہدایت کا انداز کیا تھا، چند مثالیں ملاحظہ ہوں۔

جلیل القدر صحابی حضرت عثمان بن مظعون ؓ کو عبادت الٰہی سے بے حد شغف تھا، رات بھر نمازیں پڑھتے رہتے تھے اور مسلسل روزے رکھتے تھے یہاں تک کہ اہل وعیال کے حقوق وفرائض کی طرف سے بے نیاز ہو گئے تھے۔ رسول اکرم ﷺ کو ان کے اس طرز عمل کا علم ہوا تو ان کو بلا کر ان الفاظ میں نصیحت فرمائی۔ اے عثمانؓ! کیا میری ذات تمہارے لئے اسوۂ حسنہ نہیں؟ میں نماز بھی پڑھتا ہوں، روزے رکھتا ہوں، افطار بھی کرتا ہوں سوتا بھی ہوں، اپنی بیویوں سے بھی ملتا ہوں، عثمانؓ اللہ سے ڈرو، تمہاری بیوی کا بھی تم پر حق ہے، تمہارے مہمان اور تمہارے نفس کا بھی تم پر حق ہے۔ اس لئے تم روزہ بھی رکھو اور افطار بھی کرو، نماز بھی پڑھو اور سویا بھی کرو۔ حضرت عثمانؓ بن مظعون نے وعدہ کیا کہ رسول اکرم ﷺ کی ہدایت پر عمل کریں گے۔ (سیرۃ الصحابہ جلد۲)

حضرت عبداللہ بن عباس ؓ کا بیان ہے کہ ایک دفعہ رسول اکرم ﷺ کو خطبہ پڑھتے ہوئے ایک آدمی دھوپ میں کھڑا نظر آیا۔ آپ ﷺ نے لوگوں سے اس کا نام اور دھوپ میں کھڑا ہونے کا سبب پوچھا۔ لوگوں نے عرض کیا کہ اس شخص کو ابواسرائیلؓ کہتے ہیں۔ اس نے نذر مانی ہے کہ ہمیشہ دھوپ میں کھڑا رہا کرے گا، سایہ میں بھی نہیں جائے گا، اور نہ کسی سے کلام کرے اور روزہ رکھا کرے گا۔ رسول اکرم ﷺ نے (ابواسرائیلؓ کی انتہا پسندی کو ناپسند فرماتے ہوئے) فرمایا کہ اس سے کہہ دو کہ سایہ میں بیٹھے اور کلام بھی کرے البتہ اپنا روزہ پورا کرے۔ (صحیح بخاری)

مشہور صحابی حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاصؓ نے ایک مرتبہ ارادہ کیا اور لوگوں کے سامنے اس کا برملا اظہار کیا کہ وہ جب تک زندہ ہیں ہمیشہ روزہ رکھا کریں گے اور رات بھر

نماز پڑھتے رہا کریں گے۔ رسول اکرم ﷺ کو اس کی خبر ہوئی تو آپ ﷺ نے حضرت عبداللہؓ کو بھیجا اور ان سے فرمایا کہ اے عبداللہؓ! کیا تو نے ایسا اور ایسا کہا ہے؟ انہوں نے عرض کیا یارسول اللہ ﷺ! میرے ماں باپ آپ پر قربان ہوں، بے شک میں نے ایسا کہا ہے۔ رسول اکرم ﷺ نے فرمایا کہ، تجھے اس کی طاقت نہیں، تو روزہ بھی رکھا کر اور افطار بھی کیا کر، سویا بھی کر اور نماز بھی پڑھا کر اور ہر مہینے میں تین روزے رکھ لیا کر (ان کا اجر تجھے دس گناہ ملے گا) اور ایسا کرنا ہمیشہ روزہ رکھنے کی مثل ہے۔

حضرت عبداللہؓ نے عرض کیا یارسول اللہ ﷺ! مجھے اس سے زیادہ کی طاقت ہے۔

رسول اکرم ﷺ نے فرمایا کہ ایک دن روزہ رکھ اور دو دن افطار کیا کر۔

حضرت عبداللہؓ بولے یارسول اللہ ﷺ! مجھے اس سے بھی زیادہ طاقت ہے۔

رسول اکرم ﷺ نے فرمایا کہ (اچھا تو پھر) ایک دن روزہ رکھا کر اور ایک دن افطار کیا کر کہ یہ حضرت داؤد علیہ السلام کے روزے ہیں اور سب نفلی روزوں سے بہتر ہیں۔ اب بھی حضرت عبداللہؓ نے عرض کیا کہ میں اس سے بھی زیادہ کی طاقت رکھتا ہوں تو رسول اکرم ﷺ نے فرمایا کہ ان سے افضل کوئی (نفلی روزے) نہیں (بروایتِ دیگر حضرت داؤد علیہ السلام کے روزے اللہ تعالیٰ کو سب روزوں سے زیادہ محبوب ہیں)۔

حضرت عبداللہؓ جب بوڑھے ہو گئے تو اکثر فرمایا کرتے تھے کہ کاش میں رسول اللہ ﷺ کی (تین دن والی) رخصت قبول کر لیتا۔ (صحیحین)

رسول اکرم ﷺ کبھی کبھی رات کے پچھلے پہر خانۂ اقدس سے باہر نکلا کرتے تھے۔ یہ دیکھنے کے لئے کہ آپ کے صحابہؓ سوئے ہوئے ہیں یا عبادت میں مشغول ہیں۔ ایک دفعہ جب آپ نکلے تو دیکھا کہ حضرت ابوبکر صدیقؓ تہجد کی نماز پڑھ رہے ہیں اور نہایت دھیمی آواز میں قرآن حکیم کی تلاوت کر رہے ہیں۔ پھر آپ ﷺ آگے بڑھے تو حضرت عمر فاروقؓ کو بہت اونچی آواز میں قرآن پاک کی تلاوت کرتے دیکھا۔ دوسرے دن فجر کی نماز کے بعد رسول اکرم ﷺ نے حضرت ابوبکر صدیقؓ سے پوچھا کہ۔

''اے ابوبکرؓ! آپ تہجد کی نماز میں اتنی دھیمی آواز میں قرآن مجید کی تلاوت کیوں کر رہے تھے؟'' حضرت ابوبکرؓ نے عرض کیا کہ یارسول اللہ ﷺ! میں جس پاک ذات کا کلام پڑھ کر اس سے دعا مانگ رہا تھا، وہ میری دعا سن رہا تھا۔ (کہ وہ سمیع ہے) اس لئے میں نے اپنی آواز کو زیادہ اونچی کرنا مناسب نہ سمجھا۔

اب رسول اکرم ﷺ نے حضرت عمر فاروقؓ سے پوچھا کہ۔''اے عمرؓ! آپ اتنی بلند آواز میں قرآن مجید کی تلاوت کیوں کر رہے تھے؟'' انہوں نے جواب دیا کہ یارسول اللہ ﷺ! میں اس لئے اونچی آواز میں قرآن پڑھ رہا تھا کہ سوتوں کو جگاؤں اور شیطان کو بھگاؤں۔

پھر آپ ﷺ نے حضرت عمر فاروقؓ سے فرمایا کہ۔''اے عمرؓ! آپ اپنی آواز کو تھوڑا سا پست (کم) کر کے قرآن پڑھا کریں''۔ اس طرح رسول اکرم ﷺ نے یہ سبق دیا کہ ہر معاملے میں اعتدال (میانہ روی) بہترین روش ہے، جہاں تک ہو سکے میانہ روی (نہ بہت زیادہ نہ بہت کم) اختیار کرنی چاہیئے (سنن ابی داؤد وعن ابوقتادہؓ) (بحوالہ خلق خیر الخلائق)

اسلام میں اعتدال پسندی کی اہمیت

اسلام دین فطرت ہے، اس کے اصول، قوائد اور ضوابط انسانی فطرت اور انسان کے طبعی تقاضوں کے عین مطابق ہیں، یہ بنیادی طور پر اہم بات ہے کہ اسلام میں قانون سازی کا حق صرف اللہ تعالیٰ کو حاصل ہے، وہی تمام ہدایات اور احکام کا سرچشمہ ہے، انسانی فطرت کا صحیح علم صرف اسی کو حاصل ہے، کیوں کہ اس نے انسان کو اور اس کے فطری تقاضوں کو پیدا کیا ہے۔

ہزار سال کی تحقیق و تفتیش کے بعد بھی انسان نے اپنی فطرت کے بارے میں جو علم حاصل کیا، اس علم کو اللہ تعالیٰ کے علم سے کوئی نسبت نہیں ہو سکتی، بالفاظ دیگر انسان اپنی فطرت، اپنی ضرورت اور اپنے بارے میں خوب اور ناخوب کو صحیح طور پر نہیں سمجھتا، انسان کی

فطرت، اس کے طبعی تقاضوں اوراس کی اچھائی و برائی کو اگر کوئی ہستی صحیح طور پر سمجھتی ہے تو وہ اللہ تعالیٰ کی ذات ہے جس نے انسان کو پیدا کیا ہے، دوسرے درجے پر انسان کی فطرت کا علم انبیاء کو حاصل ہے جو دراصل اللہ تعالیٰ کا دیا ہوا علم ہے۔

انسان نے اپنے بارے میں جو کچھ سوچا، اپنے بارے میں جہاں جہاں نظام ہائے زندگی مرتب کیے، ان کی بنیادی خامی یہ تھی کہ وہ انسانی فطرت کے ناقص علم پر مبنی ہیں، انسانی فکر انسانی فطرت کے تقاضوں کو ٹھیک طور پر سمجھے بغیر پورا کرنے کی کوشش کرتا ہے، اور نتیجۃً بار بار ٹھوکریں کھاتا ہے۔

انسانی فکر کی دوسری بنیادی خامی یہ ہے کہ وہ صرف اپنے دور کے بارے میں سوچ سکتا ہے، انسانی فکر، وقتی اور ہنگامی تقاضوں پر مبنی ہوتا ہے۔

انسانی فکر کی تیسری بنیادی خامی یہ ہے کہ وہ بغاوت اور ردعمل پر مبنی ہوتا ہے...... انسانی تحریکوں کی تاریخ اٹھا کر دیکھئے، معلوم ہوگا کہ انسان ٹھنڈے دماغ سے سوچنے کے بجائے جذباتی انداز میں سوچنے کا عادی ہے، اس کی سوچ کا نوے فیصد حصہ غصے اور نفرت پر مبنی ہوتا ہے۔ انسانی فکر نے کبھی تحریک کی شکل اختیار نہیں کی، جب تک اس نے انسانوں کے ایک گروہ کو جذباتی انداز میں اپنے ساتھ نہ ملا لیا ہو۔

انسانی فکر کی ان تین بنیادی خامیوں کو مدنظر رکھیں تو صاف معلوم ہوجائے گا کہ انسان کے بنائے ہوئے نظامہائے زندگی، انسان کے بنائے ہوئے قاعدے وقوانین ہمیشہ اس کی صحیح فطرت سے ہٹے ہوئے ہوتے ہیں۔ انسانی قوانین کبھی اس انتہا کی طرف اور کبھی اس انتہا کی طرف مائل ہوتے ہیں، کبھی افراط اور کبھی تفریط، پنڈولیم کیم سوئی کی طرح ایک انتہا سے دوسری انتہا کی جانب حرکت، ہی حرکت، اور کبھی بھی درمیان میں رکنے کا نام نہیں، انسانی فکر کو کبھی درمیان کا راستہ اور اعتدال کی منزل نصیب نہیں ہوئی۔

اسلام چونکہ عین فطرت کے مطابق ہے، اس لئے انسانی فکر کی انتہا پسندیوں کے عین درمیان چلتا ہوا دکھائی دیتا ہے، زندگی کا کوئی پہلو ہو، سیاسی، سماجی یا معاشی اور زندگی کا

کوئی مرحلہ ہو، ہر قدم پر اسلام آپ کو بیشمار انتہا پسندوں کے عین درمیان میں اعتدال کی راہ اختیار کیے ہوئے نظر آئے گا۔

چند مثالوں سے یہ بات بالکل واضح ہو جائے گی:۔ معاشی زندگی میں انسان نے سرمایہ دارزہنیت سے سوچا اور لا محدود ملکیت کا نظریہ پیش کیا اور کئی سال تک ''لا محدود ملکیت'' کے دیو نے غریب انسان کا خون چوسا اور معاشی استحصال کا سلسلہ جاری رہا جب انسانیت سرمایہ دار کی لامحدود ملکیت سے پیدا کردہ معاشی استحصال سے بلبلا اٹھی تو اس نے لا محدود ملکیت کو انتہا پسندانہ کہکر مخالفت کرتے ہوئے نظریہ ملکیت تک کو ٹھکرا دیا۔ یعنی ایک انتہا سے دوسری انتہا کی طرف، اور نتائج وہی کے وہی! اب دیکھیے ان دونوں انتہا پسندانہ نظریوں کے عین درمیان میں اسلام کا نظریہ ملکیت نظر آئے گا جس میں نہ تو لامحدود ملکیت ہے اور نہ ہی سرے سے نظریہ ملکیت کی نفی ہے بلکہ محدود ملکیت کا تصور ہے جس میں دونوں انتہاؤں کی خامیاں محدود نہیں ہیں۔

ایسے ہی سیاسی زندگی میں بھی انسان ہزار ہا سال تک شخصی حکومت پھونکتا رہا، حد یہ ہے کہ ارسطو جیسا مفکر بھی جمہوریت کو بدترین حکومت قرار دیتا رہا، بعد میں انسانی فکر نے باغیانہ انگڑائی لی تو جمہوریت اور ایسی جمہوریت کے گن گائے جانے لگے، جس میں بندوں کو گنا کرتے ہیں تولا نہیں کرتے، اور ایسی جمہوریت جس میں کثرت رائے سے انسانیت کا قبیح ترین جرم بھی جائز قرار دیا جاتا ہے، ان دونوں انتہاؤں کے عین درمیان آپ کو اسلام کا سیاسی نظام نیم جمہوری اور نیم شخصی طرز کا نظر آتا ہے جس میں قانون سازی اور اقتدار اعلیٰ نہ کسی ایک انسان کو حاصل ہے اور نہ انسانوں کی کسی ان پڑھ جماعت کو، بلکہ یہ قانون سازی اور اقتدار اعلیٰ اللہ تعالیٰ کو حاصل ہے۔ اور خلافت کی نمائندگی کا حق انسانوں کی ایک تعلیم یافتہ اور متقی جماعت کو جسے شوریٰ کہتے ہیں، حاصل ہوتا ہے۔ تو اصل بات یہ ہے کہ اسلام کا راستہ ہی اعتدال کا راستہ ہے، یہی مطلب ہے حضور کے اس ارشاد کا کہ: ﴿خیر الامور اوسطھا﴾ ''بہترین کام وہی ہیں جو اعتدال پر ہوں۔'' انسان نے روح اور جسم کے

تقاضوں کے بارے میں جب بھی کوئی لائحہ عمل اختیار کیا اس میں عجیب انتہا پسندی کا مظاہرہ کیا، سالہا سال تک لوگ رہبانیت اختیار کر کے جنگلوں، پہاڑوں اور غاروں میں کوشش کرتے، تب بھی انہیں گیان دھیان نصیب نہیں ہوتا لیکن جن لوگوں کو گیان دھیان نصیب ہوتا، وہ خاندانی زندگی، اولاد، ہمسائیگی اور انسان کی دیگر اہم ضرورتوں سے یکسر محروم رہتے۔ دوسری انتہا یہ کہ جو لوگ دنیا دار ہوتے وہ خالص دنیا دار ہوتے اور اپنے آپ کو کسی روحانی ترقی کے قابل نہ سمجھتے۔ ان کا کام فقط یہ ہوسکتا تھا کہ وہ روحانی پیشواؤں کے آگے ہاتھ پھیلا دیں اور ان کی خدمت کر کے نجات حاصل کریں، بالفاظ دیگر انسانی نظاموں میں جو شخص دنیاداری کے لائق ہے وہ روحانیت کے لائق نہیں اور جو روحانی پیشوا بن سکتا ہے وہ بھری اور آباد دنیا کے اندر رہنے کے لائق نہیں۔ آپ دیکھیے کہ اسلام کا راستہ ان دونوں انتہاؤں کے درمیان بالکل اعتدال کا راستہ ہے، اسلام نے روزہ فرض قرار دے دیا، لیجئے روحانیت کا بہت بڑا حصہ حاصل کرنا ہر شخص کے لئے ضروری قرار پایا، ایک ماہ تک ایسی مشق کرائی جاتی ہے کہ عیش و آرام کی بہترین صورتیں یعنی کھانا پینا، سونا اور جنسی لذت حاصل کرنا، تینوں میں شدید کمی پیدا کر دی مگر اس کے ساتھ ساتھ ہر شخص کے لئے ضروری قرار دیا کہ وہ والدین، اہل و عیال، ہمسایوں اور دیگر تمام لوگوں کے حقوق اس بھری دینا کے اندر ادا کرے، یعنی دنیا داری اور روحانیت دونوں میں انتہائی حسین اعتدال کی صورت پیدا فرمادی۔ حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ: ﴿**لا رهبانية في الاسلام**﴾ ''کہ اسلام میں ترک دنیا جائز نہیں ہے۔'' اگر کوئی شخص مخلوقات سے کچھ دیر کے لئے منقطع ہو کر اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ ہونا چاہتا ہے تو وہ مسجد میں چلا آئے، اعتکاف اس کی بہترین صورت ہے۔ مزید برآں مسجد میں پانچ وقت کی نماز اور رات کا قیام بھی اسی مقصد کو پورا کرتے ہیں۔ تو اصل بات یہ ہے کہ اسلام کا راستہ ہی اعتدال کا راستہ ہے، یہی مطلب ہے حضور ﷺ کے اس ارشاد کا کہ: ﴿**خير الامور اوسطها**﴾ ''یعنی بہترین کام وہی ہیں جو اعتدال پر ہوں (بحوالہ خطبات حرم)

يَا رَبِّ صَلِّ وَسَلِّمْ دَائِمًا اَبَدًا عَلٰى حَبِيْبِكَ خَيْرِ الْخَلْقِ كُلِّهِمِ

خصوصیت نمبر ٦٦

رسولِ اکرم ﷺ کے ظہور سے متعلق فضاء میں بھی صدائیں بلند ہوئیں

قابل احترام قارئین! رسولِ اکرم ﷺ کی امتیازی خصوصیات میں سے یہ چھیاسٹھویں خصوصیت پیش کی جارہی ہے، جس کا عنوان ہے "رسولِ اکرم ﷺ کے ظہور سے متعلق فضاء میں بھی صدائیں بلند ہوئیں" الحمدللہ اس خصوصیت کو ترتیب دینے کے لئے بھی اللہ تعالیٰ نے روضہ رسول ﷺ کے قریب ریاض الجنۃ میں بیٹھنے کی توفیق دی، بے شک یہ اللہ ہی کا فضل ہے۔ اس پر میں اپنے اللہ کا صد بار شکر ادا کرتا ہوں کہ جس ذات نے ریاض الجنۃ میں بٹھا کر اپنے محبوب ﷺ کی خصوصیت سے متعلق کام کرنے کی توفیق عطا فرمائی۔

بہر حال محترم قارئین! ذیل میں آنے والی خصوصیت بھی آپ ﷺ کی عظیم خصوصیت ہے کہ ہمارے نبی ﷺ کو اللہ تعالیٰ نے اتنا عظیم بنایا کہ آپ ﷺ کے ظہور سے متعلق فضاء میں بھی صدائیں بلند ہوئیں، جیسا کہ آنے والے صفحات میں آپ اس کی تفصیل ملاحظہ فرمائیں گے، جیسے ہم نے احادیث کی روشنی میں ترتیب دیا ہے، امید ہے کہ انشاء اللہ اس خصوصیت مطالعے سے بھی آپ کے ایمان میں اضافہ ہوگا، دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہم سب کو اپنے پیارے نبی ﷺ کی صحیح صحیح قدر دانی کرنے کی اور آپ ﷺ کی جملہ تعلیمات پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے آمین یارب العٰلمین ۔ لیجئے اب اس خصوصیت کی تفصیل ملاحظہ فرمایئے:۔

چھیاسٹھ نمبر خصوصیت کی وضاحت احادیث کی روشنی میں

روایات میں آتا ہے کہ آپ ﷺ کے ظہور کے وقت ایسے واقعات بھی پیش آئے ہیں کہ اچانک فضا میں آوازیں سنائی دیں یعنی نہ تو کاہن نے کہیں اور نہ بتوں اور ذبح کئے

ہوئے جانوروں کے پیٹ سے ابھریں۔ چنانچہ ایسی روایتیں بھی بہت سی درست ہیں ان میں سے ایک یہ ہے کہ ایک مرتبہ کسی نے آنحضرت ﷺ سے عرض کیا۔ "یارسول اللہ! میں نے قس کی ایک بڑی عجیب بات دیکھی ہے۔ ایک دفعہ رات کے وقت میں اپنے ایک اونٹ کی تلاش میں جارہا تھا یہاں تک کہ رات ڈوبنے لگی اور صبح کا وقت قریب آگیا، اچانک مجھے ایک پکارنے والے کی آواز سنائی دی جو یہ کہہ رہا تھا۔

یا اَیھا الواقد فی اللیل الاحم قد بعث اللّٰہ نبیا بالحرم

ترجمہ......اے تاریک رات میں سونے والے اللہ تعالیٰ نے حرم میں ایک نبی ظاہر فرمایا ہے۔

من ھاشم اھل الوفاء والکرم یجلود جنات اللیالی والبھم

ترجمہ......جس کا تعلق اس قبیلہ بنی ہاشم سے ہے جو وفا اور کرم میں مشہور ہیں جو تاریکیوں کو دور کردے گا، یہ آواز سن کر میں نے اپنے چاروں طرف دیکھا مگر مجھے کوئی نظر نہیں آیا۔ تو میں نے جواب میں یہ شعر پڑھا۔

یا ایھا الھاقف فی راجی الظلم اھلاً وسھلاً بک من طیف الم

ترجمہ......:اے رات کے اندھیروں میں آواز دینے والے اس خبر پر تجھے خوش آمدید جو لیکر آیا ہے۔

بین ھداک اللّٰہ فی لحن الکلم من ذا الذی تدعو الیہ یغتم

ترجمہ......اللہ تعالیٰ تجھے ہدایت دے تو یہ بات بتا کہ وہ کیا چیز ہے جس کی طرف تو دعوت دیتا ہے۔ اسی وقت مجھے کھنکارنے اور گلا صاف کرنے کی آواز آئی اور کسی کہنے والے نے کہا۔ "نور ظاہر ہوگیا اور سینہ زوری کا دور ختم ہوگیا۔ اللہ تعالیٰ نے محمد ﷺ کو خوشی وسرور دے کر ظاہر فرمادیا جو شریف ومعزز خاندان سے ہیں، جو تاج یعنی عظمت واعزاز اور خود یعنی قوت وطاقت والے ہیں، سرخ وسفید چہرے والے ہیں، روشن پیشانی والے ہیں، گہری سیاہ آنکھوں والے ہیں۔ جن کا کلمہ اشھد ان لا الٰہ الا اللّٰہ ہے۔ یہ وہی محمد ﷺ ہیں جو

کالے اور گورے تمام انسانوں کی طرف بھیجے گئے ہیں اور عرب و عجم کی رہنمائی کے لیے ظاہر ہوئے ہیں۔" اس کے بعد اس غیبی آواز نے یہ شعر پڑھے۔

الحمد للّٰہ الذی. لم یخلق عبث. ارسل فینا احمدا خیر نبی قد بعث

ترجمہ......: تمام تعریفیں اس ذات باری کے لیے ہیں، جس نے مخلوق کو بیکار پیدا نہیں کیا، جس نے ہمارے درمیان احمد کو بھیجا، جو سب سے افضل و بہترین نبی بن کر ظاہر ہوئے ہیں۔

صلی علیہ اللّٰہ ما حج لہ رکب و حث

ترجمہ......اللہ تعالیٰ ان پر اپنی رحمت بھیجیں جب تک کہ سوار اور پیدل حج کرتے رہیں۔ اسی واقعہ کی طرف قصیدہ ہمزیہ کے شاعر نے اپنے شعر میں اشارہ کیا ہے۔

و تفنت بمدحہ الجن حتّٰی اطرب الانس منہ ذاک الفناء

ترجمہ: یعنی جنہوں نے آنحضرت ﷺ کے بہترین اوصاف اور خوبیوں کو ایک دل موہ لینے والے اور دلکش ترانے کی صورت میں ظاہر فرمایا وہ ترانہ اتنا دلکش تھا کہ اس نے اپنا نغمہ جنوں کے علاوہ دوسروں تک بھی پہنچایا یہاں تک کہ اس نغمے کا رس جنات کے ذریعہ جب انسان کے کان تک پہنچا تو اس نے اس کو بھی بے خود اور سرشار کر لیا۔ غرض اس کے بعد صبح ہو گئی، اچانک میں نے ایک بہترین اونٹ دیکھا جو مستی میں منہ سے جھاگ نکال رہا تھا میں نے جلدی سے بڑھ کر اس کی لگام پکڑ لی اور اس کے کوہان پر سوار ہو کر اسے ہنکا دیا۔ آخر چلتے چلتے جب وہ تھک گیا تو ایک سرسبز باغ میں جا کر بیٹھ گیا، اچانک میں نے دیکھا کہ ایک درخت کے سائے میں قس ابن ساعدہ ایادی بیٹھے ہوئے ہیں ان کے ہاتھ میں مسواک کی ایک لکڑی ہے جس سے وہ زمین کرید رہے ہیں اور یہ شعر پڑھ رہے ہیں۔

یانا عی الموت و الملحود فی حدث علیہم من بقایا بزھم خرق

ترجمہ: اے موت کی خبر دینے والے اور وہ لوگ جو قبروں میں محوِ آرام ہیں جن کے کفن بھی اب ریزہ ریزہ ہو چکے ہیں۔

وعهم فان لهميو ما يصاح به　　　فهم اذا انتبهوا من نومهم فرقوا

ترجمہ.....ان لوگوں کو یعنی ان مردوں کو ان کے حال پر چھوڑ دو اس لئے کہ ایک دن تو ان کو اٹھایا ہی جائے گا، اب اگر انہیں ان کی نیند سے جگایا گیا تو وہ ڈر جائیں گے کہ شاید حساب کا دن آ پہنچا۔

حتّٰی یعود و ابحال غیر حالهم　　　خلفاً جدیداً کما من قبله خلقوا

ترجمہ.....:ان کو ایک ایسی حالت پر پہنچا دیا گیا ہے جو ان کی پچھلی حالت کے خلاف ہے اور وہ ایک نئی زندگی میں پہنچ گئے جیسا کہ اس سے پہلے عدم سے وجود میں آئے تھے۔

منهم عراة و منهم فی ثیابهم　　　منها الجدید و منها المنهج الخلق

ترجمہ.....:اُن مُردوں میں سے بعض تو اپنے کفن کے گل جانے کے بعد برہنہ ہو گئے ہیں اور بعض ابھی کفن میں لپٹے ہوئے ہیں، بعض کے کفن ابھی نئے ہیں اور بعض کے بوسیدہ ہو چکے ہیں۔

راوی کہتے ہیں کہ یہ شعر سن کر میں قس کے قریب پہنچا اور ان کو سلام کیا، انہوں نے میرے سلام کا جواب دیا۔ اسی وقت میری نظر اٹھی تو میں نے دیکھا کہ وہاں ایک پانی کا چشمہ ہے، جس میں پانی کے بہنے کی دھیمی آواز آ رہی تھی، وہیں دو قبروں کے درمیان ایک مسجد تھی اور دو بہت بڑے اور خوفناک شیر کھڑے ہوئے تھے جو اس کو اپنی پناہ میں لئے ہوئے تھے اسی وقت ان دونوں شیروں میں سے ایک پانی پینے کے لئے چشمے کی طرف بڑھا تو دوسرے شیر نے بھی پانی پینے کے لئے اس کے پیچھے جانا چاہا، اسی وقت قس نے اس کے وہ چھڑی ماری جو ان کے ہاتھ میں تھی اور ڈانٹ کر اس سے کہا۔ ''واپس آ جا، تیرا برا ہو، پہلے آگے جانے والے کو سیراب ہونے دے۔'' دوسرا شیر فوراً لوٹ گیا اور پہلے جانے والے کے واپس آنے کے بعد گیا۔ آخر میں نے قس سے پوچھا! ''یہ دو قبریں کس کی ہیں''؟ قس نے کہا !''یہ میرے دو بھائیوں کی قبریں ہیں جو اسی جگہ میرے ساتھ اللہ تعالیٰ کی عبادت کیا کرتے

تھے، انہوں نے کبھی اللہ تعالیٰ کے ساتھ شرک نہیں کیا۔ ان میں سے ایک کا نام سمعون تھا اور دوسرے کا نام سمعان تھا، جن کے متعلق ہے کہ وہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے حواریوں میں سے تھے، آخر ایک دن ان دونوں کو موت نے آلیا۔ میں نے ان دونوں کی یہاں قبریں بنائیں اور اب میں خود ان دونوں قبروں کے درمیان رہتا ہوں تا کہ ایک دن میں بھی ان دونوں سے جاملوں۔"

"اس کے بعد پھر قس نے ان دونوں قبروں کی طرف دیکھا اور کچھ شعر پڑھے۔"

یہ سارا واقعہ سن کر رسول اللہ ﷺ نے اس راوی سے فرمایا! "اللہ تعالیٰ قس پر رحمت فرمائے، میں امید کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ اس کو (اس کی نیکی اور عبادت گزاری کی وجہ سے) قیامت میں ایک پوری امت کے برابر درجے میں اٹھائے گا۔" اصل یعنی کتاب عیون الاثر میں قس کے واقعے کی طرف اس شعر میں اشارہ کیا گیا ہے۔

و عنه اخبر قس قومه فلقد حلی مسامعهم من ذکره شنفا

ترجمہ...... قس نے اپنی قوم کے سامنے آنحضرت ﷺ کا تذکرہ کیا ہے جو اتنا دلچسپ تذکرہ تھا کہ سننے والے اس سے بہت لطف اندوز ہوئے۔

جب قس کی وفات ہوئی تو ان کو ان ہی دونوں کی قبروں کے پاس دفن کیا گیا، یہ تینوں قبریں اب ایک گاؤں میں ہیں جس کا نام روحین ہے، یہ گاؤں حلب کے دیہات میں سے ہے ان قبروں پر مقبرہ بنا دیا گیا ہے اور لوگ ان کی زیارت کے لئے وہاں جاتے ہیں، اس زیارت گاہ کی آمدنی کے لئے بہت سے اوقاف ہیں اور درگاہ پر بہت سے مجاور اور خادم رہتے ہیں۔ (بحوالہ سیرتِ حلبیہ)

اسی طرح ایک واقعہ علامہ واقدی نے اپنی ایک سند سے ذکر کیا ہے جسے حضرت ابوہریرہؓ بیان کرتے ہیں کہ ایک مرتبہ بنی خثعم کے لوگ ایک بت کے پاس بیٹھے ہوئے اس بت سے اپنے کسی جھگڑے کا فیصلہ مانگ رہے تھے، ابھی یہ لوگ وہاں بیٹھے ہوئے ہی تھے کہ اچانک انہیں فضا میں کسی پکارنے والے کی آواز آئی جو کہہ رہی تھی۔

یا ایھا الناس ذوالا جسام ومسندو الحکم الی الاصنام

ترجمہ......اے جسم اور عقل وشعور رکھنے والے لوگو! تم نے اپنے معاملات ان پتھر کے بے جان اور بے حس بتوں کے حوالے کر دیئے۔

اماترون ما اریٰ امامی من ساطع و جلود جی الظلام

کیا تم ایسی روشنی کو نہیں دیکھ رہے ہو جسے میں اپنے سامنے پا رہا ہوں اور جو اندھیروں کو مٹاتی جا رہی ہے۔

ذاک نبیّ سید الانام من ھاشم فی ذروۃ السنام

وہ بنی آدم کے سردار اور عظیم نبی ہیں، جو بنی ہاشم کی معزز نسل سے تعلق رکھتے ہیں

مستعلن بالبلد الحرام جاء یھدا لکفر بالا سلام

وہ نبی اس محترم شہر میں اپنی نبوت کا اعلان کر رہے ہیں اور گمراہوں کو اسلام کے ساتھ ہدایت دینے کے لیے آئے ہیں۔ اکر م الرحمن من امام: اور جن کو اللہ تعالیٰ نے شروع ہی سے بڑے اعزاز عطا فرمائے ہیں۔

حضرت ابو ہریرہؓ کہتے ہیں کہ تھوڑی دیر تک وہ لوگ ان شعروں کو دہراتے رہے اور جب ان کو یاد ہو گئے تو وہ لوگ وہاں سے اٹھ گئے۔ ابھی اس واقعہ کو تین دن بھی نہ گزرے تھے کہ اچانک انہیں خبر ملی کہ مکے میں رسول اللہ ﷺ ظاہر ہوئے ہیں۔ یعنی اس سے پہلے وہاں کوئی آپ کے بارے میں کچھ نہیں جانتا تھا بلکہ اس واقعہ کے ایک دو دن بعد بالکل اچانک انہیں آپ ﷺ کے ظہور کا حال معلوم ہوا، پھر بھی ختعمی قوم کے یہ لوگ فوراً ہی مسلمان نہیں ہوئے بلکہ کافی عرصے کے بعد انہوں نے اسلام قبول کیا۔

اسی طرح کا ایک واقعہ زمل ابن عمر وغدری کا ہے وہ کہتے ہیں کہ بنی غدرہ کا جو یمن کا ایک قبیلہ تھا، ایک بت تھا جس کا نام خمام تھا، یہ قبیلہ اس بت کی بہت عزت وعظمت کرتا تھا مگر یہ بُت بنی ہند ابن حرام کا تھا اور اس بت کے خادم کا نام طارق تھا۔ اس طارق (کے حالات معلوم نہیں ہو سکے۔ اس) کے بارے میں کتاب نور میں یہ بھی لکھا ہے کہ نہ تو اس

کے متعلق تفصیلات معلوم ہو سکیں اور نہ یہ پتہ چل سکا کہ آیا یہ مسلمان ہوا تھا یا نہیں، غرض یہ لوگ اس بت کے سامنے اکثر جانوروں کی قربانیاں پیش کرتے تھے۔ اسی زمانے میں جب رسول اللہ ﷺ کا ظہور ہو چکا تھا ہم نے ایک دن ایک آواز سنی جو یہ کہہ رہی تھی۔

''اے بنی ہند ابن حرام حق اور سچائی ظاہر ہو گئی۔ خمام بت تباہ ہو گیا اور اسلام نے شرک کو ختم کر دیا''۔ زمل کہتے ہیں کہ اس غیبی آواز سے ہم لوگ بہت گھبرائے اور خوف زدہ ہوئے پھر کچھ ہی دن گزرے تھے کہ ایک روز پھر ہم نے اسی طرح کی ایک آواز سنی جو یہ کہہ رہی تھی۔

''اے طارق۔ اے طارق۔ وہ سچے نبی ظاہر ہو گئے، جو صاف صاف وحی کا سلسلہ ساتھ لائے ہیں۔ تہامہ میں ایک اچانک اور زبردست ہلچل پیدا ہوئی ہے۔ لیکن اس نبی کے مددگاروں کے حق میں سلامتی اور امن ہے اور ان کے جھٹلانے والوں کے نصیب میں ندامت اور رسوائی ہے۔ بس اب میں قیامت تک کے لئے رخصت ہوتا ہوں۔'' اس کے ساتھ ہی خمام نامی وہ بت منہ کے بل زمین پر گر پڑا۔

اب اگر یہ آواز اس بت کے اندر سے آئی تھی۔ جیسا کہ آخری جملے سے ظاہر ہوتا ہے کہ اب میں قیامت تک کے لئے رخصت ہوتا ہوں۔ تو اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ واقعہ اس قسم میں شمار نہیں کیا جانا چاہئے جن کا بیان چل رہا ہے (کیونکہ یہ بیان اس قسم کے واقعات کا چل رہا ہے جن میں آنحضرت ﷺ کے متعلق اچانک فضاؤں میں آوازیں گونجیں ۔ کسی درخت، پتھر یا بت اور ذبح شدہ جانور کے اندر سے نہیں ابھریں) لیکن اگر اس واقعہ میں بھی مراد یہی ہے کہ یہ آواز حمام بت کے اندر سے نہیں آئی تھی بلکہ فضا میں سے سنائی دی تھی تو پھر اس جگہ اس واقعہ کا ذکر ٹھیک ہو جاتا ہے۔

غرض زمل کہتے ہیں کہ اس واقعہ کے بعد میں نے فوراً ایک اونٹنی خریدی اور اس پر سوار ہو کر اپنی قوم کے کچھ دوسرے لوگوں کے ساتھ میں آنحضرت ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ وہاں پہنچ کر میں نے یہ شعر پڑھے۔

الیک رسول اللّٰہ اعلمتھا انصھا النص ھو الغایۃ فی السیر

ترجمہ......یارسول اللہ! میں نے اپنی اونٹنی کو روانہ کیا جس کی منزل آپ ہی تھے۔

اکفلھا حزنا وقوزاً من الرمل لا نصر خیر الناس قصوراً موزرا

میں اس اونٹنی پر اونچے اونچے اور ریتیلے ٹیلے عبور کر کے آیا ہوں تا کہ میں سب سے بہترین انسان یعنی آپ کی زیادہ سے زیادہ مدد کروں۔

واعقد حبلا من حبالک فی حبلیٰ واشھد ان اللّٰہ لا غیرہ

اور تا کہ آپ سے ایک مضبوط اور پختہ عہد کروں اور گواہی دوں کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی معبود نہیں ہے۔ ما اثـقلت قدمی نعلی. میرے جوتوں نے مجھے آپ تک پہنچنے میں بالکل نہیں تھکایا۔

اسی طرح کا ایک واقعہ تمیم داری کا ہے ان کا لقب ابو رقیہ تھا رقیہ ان کی بیٹی کا نام تھا اور اس بیٹی کے سوا ان کے کوئی اولاد نہیں تھی رسول اللہ ﷺ نے دجال کے متعلق دجال کے ساتھ جساسہ کا واقعہ منبر پر کھڑے ہو کر ان ہی کے حوالے سے بیان کیا اور فرمایا کہ مجھے تمیم داری نے بتلایا۔ اس کے بعد آپ نے وہ قصہ بیان فرمایا۔ اسی کی بنیاد پر بعض علماء نے لکھا ہے کہ بڑوں کا اپنے چھوٹوں سے، روایت بیان کرنے کا جو اصول محدثین ثابت کرتے ہیں یہ اس کی سب سے بہترین مثال ہے، اسی اصول کی بنیاد کے طور پر ایک یہ واقعہ بھی پیش کیا جاتا ہے جو اس طرح ہے کہ ایک دن ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ اپنی صاحبزادی حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے پاس گئے اور ان سے پوچھا! ''کیا تم نے رسول اللہ ﷺ سے کوئی دعا سنی ہے''؟ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا! ''میں نے آنحضرت ﷺ سے ایک دعا سنی ہے جو آپ ہمیں بتلایا کرتے تھے اور فرماتے تھے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام یہ دعا اپنے اصحاب کو سکھلایا کرتے تھے اور ان سے کہتے تھے کہ! ''اگر تم میں سے کسی پر ایک سونے کے پہاڑ کے برابر بھی قرض ہو (اور وہ اس دعا کو پڑھتا رہے) تو اللہ تعالیٰ اس کی برکت سے اس شخص کے اتنے زبردست قرض کو بھی ادا کرادے گا۔'' پھر آپ نے فرمایا عیسیٰ علیہ السلام کی وہ دعا یہ تھی۔

اَللّٰھُمَّ فَارِجَ الْھَمِّ کَاشِفَ الْغَمِّ، مُجِیْبُ دَعْوَۃِ الْمُضْطَرِّیْنَ، رَحْمٰنُ الدُّنیا وَ الْاٰخِرۃِ و رَحِیْمُھَا اَنْتَ تَرحَمُنِی فَا رْحَمْنِی بِرَحْمَۃِ تُغْنِیْنِی بِھا عَنْ رَحْمَۃِ مِن سِوَاکَ" (حدیث)

ترجمہ: "اے اللہ! غموں کے کھولنے والے، پریشانیوں کے دور کرنے والے، بے چین لوگوں کی دعاؤں کے قبول کرنے والے، دنیا اور آخرت دونوں عالموں میں مہربانی اور رحم کرنے والے، تو ہی مجھ پر رحم فرماتا ہے، پس مجھ پر رحم اور رحمت فرما، جو ایسی زبردست اور بے پایاں رحمت ہو کہ جو تیرے سوا دوسروں کی مہربانیوں اور منت پذیری سے مستغنی اور بے پروا کر دے"

(اسی دعا کی تاثیر کے سلسلے میں) حضرت ابوبکرؓ سے روایت ہے کہ ایک دفعہ مجھ پر کچھ قرض تھا۔ اس قرض کی ادائیگی میرے لئے دشوار ہو رہی تھی میں نے اسی دوران میں یہ دعا پڑھی جس کی برکت سے وہ قرض ادا کرنا میرے لئے آسان ہو گیا۔

حضرت تمیم داری رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ جب رسول اللہ ﷺ کا ظہور ہوا اس زمانے میں میں ملک شام میں تھا اسی دوران میں ایک دن اپنے کچھ کاموں کے سلسلے میں وہاں سے روانہ ہوا۔ سفر میں مجھے رات ہو گئی (چونکہ بہت لوگ تنہا بھی سفر میں جایا کرتے تھے اور رات ہونے پر وہ اکیلے ہی صحراؤں اور جنگلوں میں رات گزارا کرتے تھے جہاں ان کو جنات سے خطرہ رہتا تھا اس لئے وہ لوگ ایسے موقع پر جہاں بھی ٹھہرتے تو اس طرح کی دعا پڑھ کر ٹھہرتے تھے کہ میں اس جگہ کے جن یا یہاں کی طاقتور ترین ہستی یا یہاں کے مالک کی پناہ لے کر ٹھہرتا ہوں۔ اس طرح ان کو اطمینان ہو جاتا تھا کہ اب ہم یہاں کے جن کی پناہ میں آ گئے ہیں اور وہ ہمیں پریشان نہیں کرے گا، چنانچہ تمیم داری کہتے ہیں کہ رات گزارنے کے لئے میں ایک وادی میں ٹھہرا اور میں نے یہ دعا پڑھی! "میں اس وادی کے مالک یعنی بڑے جن کی پناہ اور امان میں یہاں ٹھہرتا ہوں"۔

اس کے بعد جب میں وہیں ایک جگہ سونے کے لئے لیٹا تو اچانک مجھے کسی

پکارنے والے کی آواز آئی جبکہ بولنے والا کہیں نظر نہیں آیا۔ وہ آواز یہ کہہ رہی تھی! ''تو اللہ تعالیٰ کی پناہ مانگ اس لئے کہ اللہ تعالیٰ کے مقابلے میں جنات کو کسی کو پناہ دینے کی مجال نہیں ہے۔'' یہ آواز سن کر میں نے کہا! اس بات سے تیری کیا مراد ہے۔ اس پر یہ جواب سنائی دیا، یہ کہ رسول امّی ظاہر ہو چکے ہیں اور ہم یعنی جنات حجون کے مقام پر ان کے پیچھے نماز پڑھ چکے ہیں یہ حجون مکے کا قبرستان ہے جس کو معلاۃ بھی کہا جاتا تھا۔ ہم جنات ان پیغمبروں پر ایمان لا چکے ہیں اور ان کے پیرو بن چکے ہیں اب جنات کا فریب ختم ہو گیا ہے (یعنی اب وہ لوگ آسمانوں کے قریب جا کر چھپ چھپ کر وہاں کی ٹوٹی پھوٹی خبریں نہیں سن سکتے جو وہ کاہنوں کو بتلا دیا کرتے تھے اور اس طرح لوگ کاہنوں اور جنوں کو غیب داں سمجھتے تھے) کیونکہ جنات کو رسول اللہ ﷺ کے ظہور کے وقت سے آسمانوں تک پہنچنے کی ممانعت ہو گئی اور ان کو اب ستارے اور شہاب مار مار کر وہاں سے بھگا دیا جاتا ہے۔ اسی لئے محمد ﷺ کے پاس جا اور مسلمان ہو جا۔''

تمیم داری کہتے ہیں کہ (یہ آواز سن کر میں رات بھر اسی کے متعلق سوچتا رہا آخر) صبح ہوئی تو دیر ایوب میں جو ایک عیسائی راہب کی خانقاہ تھی وہاں گیا اور میں نے راہب سے سارا واقعہ سنایا۔ یہ سن کر اس نے کہا! ''انہوں نے یعنی جنات نے تم سے ٹھیک کہا ہے، ہم اپنی کتابوں میں یہ ذکر پاتے ہیں کہ وہ نبی حرم یعنی مکے میں ظاہر ہوں گے اور ان کی ہجرت گاہ حرم یعنی مدینہ ہوگی اور یہ کہ وہ سب سے بہترین نبی ہوں گے۔ اس لئے پہلی فرصت میں ان کے پاس پہنچو۔

تمیم داری کہتے ہیں کہ راہب کی بات سن کر میں نے فوراً ہی سفر کا انتظام کیا یہاں تک کہ میں رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں پہنچ کر مسلمان ہو گیا۔''

اس روایت کے ظاہری الفاظ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ حضرت تمیم داری آنحضرت ﷺ کی ہجرت سے پہلے مکے میں مسلمان ہوئے ہیں لیکن اس بارے میں اختلاف ہے اگرچہ ایک جگہ تو ایسی روایت کے آخر میں یہ لفظ تک صاف صاف موجود ہیں کہ۔ پھر میں

مکے گیا اور آنحضرت ﷺ سے ملا، اس وقت آپ چھپے ہوئے تھے میں فوراً آپ پر ایمان لے آیا، مگر بعض محدثوں نے لکھا ہے کہ یہ روایت غلط ہے کیونکہ تمیم داری حقیقت میں ۹ھ میں مُسلمان ہوئے ہیں۔ واللہ اعلم۔

اسی طرح فضاؤں میں آنحضرت ﷺ کے متعلق آوازیں بلند ہونے کا ایک واقعہ اور ہے۔ جس کو حضرت سعید بن جبیرؓ نے بیان کیا ہے کہ بنی تمیم کے ایک شخص نے اپنے اسلام قبول کرنے کا واقعہ بیان کرتے ہوئے کہا! ''میں ایک رات ریگستان میں سفر کر رہا تھا کہ اچانک مجھ کو نیند آنے لگی میں نے اپنی سواری سے اتر کر اس کو ایک طرف بٹھا دیا اور خود پڑ کر سو گیا سونے سے پہلے میں نے حفاظت کے لئے دعا پڑھی!'' میں جنات سے اس وادی کے مالک کی پناہ مانگتا ہوں''

اس کے بعد میں سو گیا تو میں نے خواب میں دیکھا کہ ایک شخص اپنے ہاتھ میں ایک ہتھیار لئے ہوئے ہے اور اس کو میری اونٹنی کی گردن پر مارنا چاہتا ہے۔ اسی وقت گھبرا کر میری آنکھ کھل گی، میں نے جلدی سے چاروں طرف دیکھا مگر مجھے کوئی نظر نہیں آیا، میں نے سوچا کہ یہ پریشان خیالی کے خواب ہیں اس لئے میں نے پھر وہی دعا پڑھی، اور دوبارہ پڑ کر سو گیا، مگر اس دفعہ پھر میں نے ویسا ہی خواب دیکھا اور یہ کہ میری اونٹنی کانپ رہی ہے غرض میں تیسری بار پھر سو گیا تو پھر میں نے وہی سب کچھ دیکھا میں فوراً جاگ اٹھا اور دیکھا کہ میری اونٹنی بے چین اور گھبرائی ہوئی ہے میں جوں ہی اونٹنی کی طرف متوجہ ہوا تو میں نے ایک نوجوان آدمی کو وہاں کھڑے ہوئے دیکھا جو ہو بہو ویسا ہی تھا جیسا آدمی مجھے خواب میں نظر آیا تھا اس نوجوان کے ہاتھ میں ایک ہتھیار بھی تھا ساتھ ہی مجھے ایک بوڑھا شخص بھی نظر آیا جو اس نوجوان کا ہاتھ پکڑے ہوئے تھا اور اس کو میری اونٹنی کے پاس جانے سے روک رہا تھا، اسی بات پر ان دونوں میں کشمکش اور کھینچ تان ہو رہی تھی، ابھی یہ دونوں جھگڑ ہی رہے تھے کہ اچانک تین وحشی سانڈ ظاہر ہوئے ان کو دیکھتے ہی اس بوڑھے شیخ نے اس نوجوان سے کہا۔'' آؤ میری پناہ میں آئے ہوئے اس انسان کی اونٹنی کے بدلے میں تم ان تینوں

سانڈوں میں سے کوئی بھی لے لو۔'' یہ سن کر وہ نوجوان بڑھا اور اس نے ان میں سے ایک سانڈ پکڑ لیا اور اسے لیکر وہاں سے چلا گیا اب اس نوجوان کے جانے کے بعد وہ بوڑھا شخص میری طرف متوجہ ہوا اور کہنے لگا۔''نوجوان! آئندہ تم جب بھی کسی وادی میں رات کے وقت پہنچو اور وہاں تمہیں ڈر محسوس ہو تم یہ دعا پڑھا کرو!''اس وادی کے خطرات سے میں محمد ﷺ کے پروردگار اللہ تعالیٰ کی پناہ مانگتا ہوں۔''

تم اب جنات میں سے کسی کی حفاظت مت مانگا کرو اس لئے کہ جنوں کا زور اب ٹوٹ چکا ہے۔میں نے یہ سن کر پوچھا کہ محمد کون ہیں، اس نے کہا!''وہ نبی عربی ہیں جو نہ صرف مشرق والوں کے لئے ہیں اور نہ صرف مغرب والوں کے لئے ہیں۔''میں نے پوچھا !''ان کا ٹھکانا کہاں ہے''اس نے کہا!''نخلستانوں والا یثرب''میں اسی وقت اپنی اونٹنی پر سوار ہو کر تیز رفتاری کے ساتھ روانہ ہوا۔آخر مدینے پہنچ کر میں نے آنحضرت ﷺ کی زیارت کی،ابھی میں نے آپ سے کچھ بتلایا بھی نہیں تھا کہ آپ نے مجھے میرا خواب سنایا اور پھر اسلام قبول کرنے کی دعوت دی، چنانچہ میں اسی وقت مسلمان ہو گیا۔

اس آخری حصے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ واقعہ آنحضرت ﷺ کی ہجرت کے بعد کا ہے ظہور کے وقت کا نہیں ہے جبکہ یہاں ان واقعات کا ذکر چل رہا ہے جو آپ کے ظہور کے وقت پیش آئے۔

اسی طرح کا ایک واقعہ یہ ہے جس کو ایک صحابی نے بیان کیا ہے کہ ایک دفعہ میں اپنے اونٹوں کو چرانے کے لئے گیا، اس وقت ہمارا عقیدہ یہ تھا کہ جب ہم کسی وادی میں پہنچ کر رات گزارتے تھے تو یہ کہا کرتے تھے کہ! ہم اس وادی کے بڑے کی پناہ مانگتے ہیں۔غرض میں نے اپنی اونٹنی کو وہیں باندھا اور یہی دعا پڑھی اسی وقت مجھے ایک پکارنے والے کی آواز سنائی دی جو یہ کہہ رہا تھا۔

ویحک غد باللہ ذی الجلال منزل الحرام والحلال

ترجمہ...... تجھے برائی ہو تو صرف اللہ تعالیٰ سے ہی پناہ مانگ جو جلال والا ہے اور

حرام اور حلال کو اتارنے والا ہے۔

ووحد اللّٰہ و لا تبال　　　ما کید ذی الجن من الاھوال

ترجمہ...... اللہ تعالیٰ کو ایک جان اور کوئی فکر نہ کر کیونکہ پھر جنات کے مکر اور فریب سے کوئی پریشانی پیدا نہیں ہوگی۔

اذیذ کر اللّٰہ علی الاحوال　　　وفی سھول الارض و الجبال

تجھے ہر حال میں اللہ تعالیٰ کا ذکر کرنا چاہئیے چاہے تو میدانوں میں ہو اور چاہے بھیانک پہاڑوں میں۔

وصار کید الجن فی سفال　　　الا النبی و صالح الاعمال

اللہ تعالیٰ کے ذکر سے جنات کا مکر و فریب پاش پاش ہو جائے گا اور اس کے نبی اور نیک عمل کے اثرات باقی رہیں گے۔ یہ سن کر میں نے اس پکارنے والے سے کہا!

یا ایھا القائل ماتقول　　　ارشد عندک ام تضلیل

ترجمہ...... اے صدا دینے والے تو کیا کہہ رہا ہے جو کچھ کہہ رہا ہے وہ درست ہے یا غلط۔ جواب میں آواز آئی!

ھذا رسول اللّٰہ ذوالخیرات　　　جاء یٰسین و حا میمات

یہ رسول اللہ ہیں نیکیوں والے، جو سورۃ یٰسین اور وہ سورتیں لے کر آئیں ہیں جن کے شروع میں حٰم ہے۔

و سور بعد مفصلات　　　یا مربا صلاۃ و الذکات

نیز کچھ ایسی سورتیں جو مفصل سورتوں کے بعد ہیں جن کے ذریعے نماز اور زکواۃ کا حکم دیا گیا ہے۔

ویذ جر الا قوام عن ھنات　　　قد کن فی الاسلام منکرات

وہ پیغمبر اپنی قوم کو بُرائیوں سے روکتے ہیں ان چیزوں سے جو اسلام کے آنے کے بعد برائیاں بن گئی ہیں۔ میں نے یہ آواز سن کر کہا! ”اگر کوئی شخص اس وقت میرے یہ اونٹ

لے جا کر میرے گھر پہنچانے کا ذمہ لے تو ان پیغمبر کے پاس حاضر ہو کر میں ابھی مسلمان ہو جاؤں۔" جواب میں وہی آواز سنائی دی کہ اونٹوں کو پہنچانے کا میں ذمہ دار ہوں۔ چنانچہ میں اسی وقت ایک اونٹ پر سوار ہو کر آپ کے پاس حاضر ہوا، اس وقت آنحضرت ﷺ منبر پر تشریف فرما تھے ایک روایت میں اس طرح ہے کہ میں جمعہ کے دن وہاں پہنچا جبکہ لوگ نماز جمعہ میں مصروف تھے۔ میں ابھی اپنے اونٹ کو باندھ ہی رہا تھا کہ حضرت ابوذر غفاری ؓ مسجد سے نکل کر میرے پاس آئے اور بولے! "رسول اللہ ﷺ تم کو فرما رہے ہیں کہ اندر آ جاؤ" میں فوراً ہی مسجد کے اندر گیا آپ نے مجھے دیکھ کر پوچھا۔

اس شخص نے کیا کیا۔ اور ایک روایت میں ہے کہ اس بوڑھے شیخ نے کیا کیا جس نے تمہارے اونٹوں کو تمہارے گھر پہنچانے کی ذمہ داری لی تھی۔ کیا اس نے وہ اونٹ صحیح سالم ہی نہیں پہنچا دیئے۔

جاہلیت کے زمانے میں عربوں کا جو یہ دستور تھا کہ جب وہ کسی تاریک اور بھیانک وادی میں بسیرا لیتے تھے تو یہ کہا کرتے تھے میں اس وادی کے شریروں سے یہاں کے سردار اور بڑے کی پناہ مانگتا ہوں۔ اس کو اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں اس طرح ذکر فرمایا اور اپنے نبی کو اس کی خبر دی۔ "وَاَنَّهٗ كَانَ رِجَالٌ مِّنَ الْاِنْسِ يَعُوْذُوْنَ بِرِجَالٍ مِّنَ الْجِنِّ فَزَادُوْهُمْ رَهَقًا" (پ۲۹ سورۃ جن ع۱) ترجمہ: اور بہت سے لوگ آدمیوں میں ایسے تھے کہ وہ جنات میں سے بعض لوگوں کی پناہ لیا کرتے تھے سو ان آدمیوں نے ان جنات کی بد دماغی بڑھا دی۔

یعنی جاہلیت کے زمانے میں لوگ جب سفر پر جاتے اور کسی بھیانک اور وحشت ناک جگہ پر انہیں پڑاؤ کرنا پڑتا تو وہ جنات سے پناہ اور امان طلب کیا کرتے تھے۔ وہ لوگ اس وقت یہ کہا کرتے تھے کہ میں اس جگہ کے شریروں سے یہاں کے سردار اور بڑے جن کی پناہ مانگتا ہوں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جنات کے سردار بہت ہی زیادہ سرکش اور مغرور ہو گئے ، کیونکہ جب انسان ان کی پناہ طلب کرتے تو وہ کہتے کہ اب ہم انسانوں اور جنوں دونوں کے

سردار بن گئے ہیں۔

اسی طرح ایک اور واقعہ جس کو وائل ابن حجر حضری نے بیان کیا ہے، ان کا لقب ابو ہُنیدہ تھا یہ حضر موت کے رئیسوں میں سے ایک تھا اور ان کا باپ وہاں کے بادشاہوں میں سے تھا غرض وائل کہتے ہیں کہ جب میں رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا تو آپ نے میرے آنے سے پہلے ہی اپنے صحابہ کو میری آمد کی خبر دیدی تھی اور فرمایا تھا۔

''تمہارے پاس وائل ابن حجر حضر موت کی دور دراز سرزمین سے آ رہا ہے۔ اسے اللہ عزوجل اور اس کے رسول کی محبت لے کر آ رہی ہے اور وہ وہاں کے بادشاہوں کی نشانی ہے'' وائل کہتے ہیں کہ صحابہ میں سے جو بھی مجھ سے ملا اس نے مجھ سے کہا! ''تمہاری آمد سے بھی تین دن پہلے رسول اللہ ﷺ ہمیں تمہارے آنے کی خبر دے چکے تھے۔'' غرض جب میں رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا تو آپ ﷺ نے مرحبا کہہ کر میرا استقبال کیا اور مجھے اپنے قریب بلایا، آپ نے مجھے اپنے برابر بٹھایا اور میرے لئے اپنی چادر بچھا کر مجھے اس پر بٹھایا پھر آپ نے مجھے یہ دعا دی۔ ''اے اللہ! وائل ابن حجر اور اس کی اولاد کی اولاد میں برکت عطا فرما۔'' اس کے بعد آپ منبر پر چڑھے اور مجھے اپنے ساتھ کھڑا کر لیا پھر آپ نے فرمایا۔

''لوگو یہ وائل ابن حجر ہیں جو حضر موت جیسی دور دراز سرزمین سے اسلام کی محبت کی خاطر آئے ہیں۔'' میں نے عرض کیا۔ یا رسول اللہ! مجھے آپ کے ظہور کی خبر ملی تو اس وقت میں ایک بڑی حکومت کا مالک تھا مگر پھر یہ اللہ تعالیٰ کا فضل و کرم اور رحمت تھی کہ میں نے سب عیش و آرام کو ٹھکرا دیا اور اللہ تعالیٰ کے دین کو پسند کر لیا۔ آپ نے فرمایا! ''تو نے ٹھیک کہا۔ اے اللہ! وائل ابن حجر، اس کی اولاد اور اولاد کی اولاد میں برکت عطا فرما۔''

غرض یہ وائل ابن حجرؓ کہتے ہیں کہ میرے رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہونے کا سبب یہ ہوا کہ میرے پاس ایک بت تھا جو یاقوت کا بنا ہوا تھا ایک روز جبکہ میں سو رہا تھا مجھے اچانک ایک آواز آئی جو اس کمرے سے آ رہی تھی جہاں وہ بت رکھا ہوا تھا میں فوراً گھبرا کر بت کے پاس آیا اور اس کو سجدہ کیا۔ اسی وقت کسی کہنے والے کی آواز آئی جو یہ کہہ رہا تھا۔

وَاَعُجَباً لوائل ابن حجر نحال یدری وھو لیس یدری

تعجب ہے وائل ابن حجر پر جو اپنے بارے میں یہ سمجھتا ہے کہ وہ سب کچھ جانتا ہے حالانکہ وہ بے خبر ہے۔

ماذا یرجی من نحیت صحر لیس بذی نفع ولا ضر

یہ کیا توقع رکھتا ہے ان پتھر کے تراشے ہوئے بتوں سے جن سے نہ کوئی فائدہ پہنچ سکتا ہے اور نہ نقصان۔لو کان ذا حجر اطاع امری کاش یہ بت پرست میری بات مانتا ۔یہ سن کر میں نے کہا ''نصیحت کرنے والے میں نے تمہاری آواز سن لی اب تم مجھے کیا حکم دیتے ہو۔'' اس نے کہا۔

ارجل الی یثرب ذات النخل تدین دین الصائم المصلی

ترجمہ..... تو یثرب کے نخلستانوں کی طرف جا اور اس نئے نبی کا دین اختیار کر جو روزے رکھنے والا اور نمازیں پڑھنے والا ہے۔محمد النبی خیر الرسل یعنی نبی کریم محمد ﷺ جو سب پیغمبروں میں بہترین اور افضل ہیں۔اس کے ساتھ ہی وہ بت منہ کے بل زمین پر گر پڑا اور اس کی گردن ٹوٹ گی پھر خود میں نے آگے بڑھ کر اس کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا اس کے بعد میں بڑی تیزی کے ساتھ وہاں سے روانہ ہو کر مدینہ منورہ پہنچا اور مسجد نبوی میں داخل ہوا (جبکہ یہاں آنحضرت ﷺ نے صحابہ کو پہلے ہی ان کے متعلق خبر دیدی تھی)۔

(بحوالہ سیرت حلبیہ جلد اول نصف اول)

یَا رَبِّ صَلِّ وَسَلِّمْ دَائِمًا اَبَدًا عَلٰی حَبِیْبِکَ خَیْرِ الْخَلْقِ کُلِّھِم

❁❁❁❁❁

خصوصیت نمبر ٦٧

رسولِ اکرم ﷺ کے ناموں کے نقوش مختلف چیزوں پر نظر آئے

قابلِ احترام قارئین! رسولِ اکرم ﷺ کی امتیازی خصوصیات میں سے یہ سرسٹھویں خصوصیت پیش کی جارہی ہے، جس کا عنوان ہے ''رسولِ اکرم ﷺ کے ناموں کے نقوش مختلف چیزوں پر نظر آئے'' الحمدللہ اس خصوصیت کو ترتیب دینے کے لئے بھی اللہ تعالیٰ نے روضہ رسول ﷺ کے قریب ریاض الجنۃ میں بیٹھنے کی توفیق دی، بے شک یہ اللہ ہی کا فضل ہے

بہر حال محترم قارئین! ہمارے نبی ﷺ کی یہ خصوصیت بھی عظیم خصوصیت ہے کہ ہمارے نبی ﷺ کے ناموں کے نقوش مختلف چیزوں پر نظر آئے، بے شک یہ آپ ﷺ ہی کہ خصوصیت کا مظہر ہے جبکہ دیگر انبیاء کرامؑ کے بارے میں کہیں نہیں ملتا کہ ہمارے نبی ﷺ کی طرح ان کے ناموں کے نقوش بھی مختلف چیزوں پر نظر آئے ہوں ہمارے نبی ﷺ کے ناموں کے نقوش کہاں کہاں نظر آئے۔ آنے والے اوراق میں اس کی تفصیل کو مستند حوالوں کے ساتھ لکھا گیا ہے، جیسا کہ آپ ابھی ملاحظہ فرمائیں گے، اس تفصیل کو پڑھنے کے بعد انشاء اللہ ایمان میں بھی اضافہ ہوگا اور پیغمبر ﷺ سے محبت کو بھی جلا ملے گی دعا کیجئے کہ اللہ تعالیٰ ہم سب کو اپنے نبی ﷺ سے سچی محبت کرنے کی توفیق عطا فرمائے آمین یارب العالمین

سرسٹھ نمبر خصوصیت کی وضاحت احادیث کی روشنی میں

خراسان کے ایک پہاڑ پر انحضرت ﷺ کے نام کا نقش

بعض علماء نے لکھا ہے کہ ۴۵ھ میں خراسان میں ایک زبردست اور خوفناک آندھی آئی کہ جس سے قوم عاد پر عذاب کی شکل میں آنے والے آندھی کا تصور ہوتا تھا یہاں تک کہ آندھی کے نتیجے میں پہاڑ تک پلٹ گئے (یعنی بڑی بڑی چٹانیں الٹ گئیں) اور وحشی جانور

بدحواس ہو کر بھاگنے لگے۔ لوگوں کو یقین ہو گیا کہ قیامت کا وقت آ گیا ہے چنانچہ بہت زور سے کلمہ و استغفار پڑھنے لگے۔ اسی دوران میں اچانک ان کی نظر اٹھی تو انہوں نے دیکھا کہ آسمان سے ایک زبردست نور اتر رہا ہے اور ان پہاڑوں میں سے ایک پہاڑ پر آ رہا ہے۔ اسی وقت لوگوں نے وحشی جانوروں کی طرف دیکھا کہ اب وہ (بدحواس ہو کر بھاگنے کے بجائے) اچانک مڑ کر اسی پہاڑ کی طرف جانے لگے جس پر وہ نور اتر رہا تھا۔ اب لوگ بھی جانوروں کے ساتھ ساتھ اسی پہاڑ کی طرف چلے۔ وہاں پہنچ کر انہوں نے ایک پتھر دیکھا جو ایک ہاتھ لمبا تھا اور تین انگل چوڑا تھا۔ اس پتھر پر تین سطور قدرتی طور پر لکھی ہوئی تھیں۔ پہلی سطر یہ تھی۔ "میرے سوا کوئی معبود نہیں ہے اس لئے میری عبادت کرو۔" دوسری سطر یہ تھی "محمد ﷺ جو قریشی ہیں اللہ کے رسول ہیں" تیسری سطر یہ تھی "مغرب میں پیش آنے والے واقعہ سے بچو اس لئے کہ وہ ان سات یا تین میں ہو گا (جو اخیر زمانے کی نشانیوں میں سے ہوں گے۔ مغرب سے مراد یہاں سمت مغرب بھی ہو سکتی ہے اور ملک مراکش بھی ہو سکتا ہے جس کو عام طور پر مغرب کہا جاتا ہے۔ اور قیامت قریب آ چکی ہے۔"

آسمانوں اور جنتوں میں ہر جگہ آنحضرت ﷺ کے نام کے نقش

ایک حدیث میں آتا ہے کہ آدمؑ نے فرمایا۔ میں تمام آسمانوں میں گھوما، آسمانوں میں میں نے ایسا کوئی مقام نہیں دیکھا جہاں محمد ﷺ کا نام لکھا ہوا نہ ہو، نہ ہی مجھے جنت میں کوئی ایسا محل اور کھڑکی نظر آئی جس پر آپ کا نام نامی لکھا ہوا نہ ہو اسی طرح میں نے آنحضرت ﷺ کا نام حور عین کی گردنوں پر اور جنت میں بانس کے درختوں تک پر لکھا ہوا پایا اسی طرح جنت میں شجرہ طوبیٰ، سدرۃ المنتہیٰ بیری کے درخت اور فرشتوں کی آنکھوں کے درمیان اور ہر پردے میں آپ کا نام لکھا ہوا پایا مگر بعض محدثین نے اس حدیث کو موضوع قرار دیا ہے۔ (بحوالہ سیرت حلبیہ)

لوحِ محفوظ میں قلم کی سب سے پہلی تحریر اور آپ ﷺ کا ذکر

ایک قول ہے کہ لوحِ محفوظ میں (یعنی اس تختی پر جس پر کہ اس عالم کے بنانے سے پہلے یہاں پیش آنے والا چھوٹا اور بڑا ایک ایک واقعہ لکھ دیا گیا ہے اس پر) قلم نے سب سے پہلے جو قلمات لکھے وہ یہ ہیں۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم انی انا اللہ لا الہ الا انا محمد رسولی .الخ

ترجمہ: آغاز ہے اللہ تعالیٰ کے نام کے ساتھ جو بڑا مہربان اور نہایت رحم والا ہے۔ میں اللہ ہوں میرے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں۔ محمد ﷺ میرے رسول ہیں۔ جو شخص میری تقدیر پر راضی رہا اور جس نے میری بھیجی سختیوں پر صبر کیا اور جس نے میری بھیجی ہوئی نعمتوں پر شکر ادا کیا اور جو میرے فیصلوں پر سر جھکا تا رہا میں اس کا نام صدیقین (بلند مقام میں لکھوں گا اور قیامت کے دن اس کو صدیقین کے ساتھ اٹھاؤں گا)

ایک روایت میں یہ ہے کہ لوحِ محفوظ کے شروع میں یہ کلمات لکھے ہوئے ہیں' اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں ہے۔ اس کا دین اسلام ہے محمد ﷺ اس کے بندے اور رسول ہیں جو اس بات پر ایمان لائے گا اللہ تعالیٰ اس کو جنت میں داخل کرے گا۔"

ایک روایت میں یہ ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے قلم کو حکم دیا کہ اگلی اور پچھلی تمام باتیں لکھ دے تو اس نے عرش کے پردوں پر یہ کلمہ لکھا **لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ.**

اس بارے میں روایتوں کا یہ اختلاف قابلِ غور ہے (کیونکہ یہاں روایتوں کے اختلاف کے علاوہ لوحِ محفوظ اور عرش کے پردوں دونوں کا دو روایتوں میں ذکر ہوا ہے کہ قلم کو جب اللہ تعالیٰ نے اگلے اور پچھلے واقعات لکھنے کا حکم دیا تو ایک روایت کے مطابق قلم نے لوحِ محفوظ پر لکھا اور دوسری روایت کے مطابق اس نے عرش کے پردوں پر لکھا) اب یہاں روایت کے ظاہر سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ جب قلم کو اگلی پچھلی تمام باتیں لکھنے کا حکم دیا گیا تو سب سے پہلے اس نے عرش کے پردوں پر وہ کلمہ لکھا جو بیان ہوا اور اس کے بعد اس کو

جس چیز کے لکھنے کا حکم دیا گیا اس نے اسکو تحریر کیا۔ جیسا کہ جب اس کو حکم دیا گیا تھا تو اس نے لوح محفوظ میں وہ کلمات لکھے تھے جو بیان ہوئے۔ یہ مراد روایتوں کے ظاہر سے معلوم ہوتی ہے اور اگر حقیقت میں یہی مراد ہے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ قلم نے اگلی اور پچھلی تمام باتیں لوح محفوظ اور عرش کے پردوں دونوں پر لکھیں۔

اسی طرح ایک روایت ہے جسے حضرت عمرؓ نے آنحضرت ﷺ سے نقل کیا ہے کہ آدمؑ نے فرمایا: "میں نے شجر طوبیٰ اور سدرۃ المنتہیٰ اور جنت کے بانسوں کے درختوں کے پتوں پر آنحضرت ﷺ کا نام نامی لکھا ہوا دیکھا۔" (حوالا بالا)

درختوں کے پتوں پر آپ ﷺ کے نام کے نقش

اسی طرح ایک بزرگ نے اپنا واقعہ بیان کیا ہے کہ ایک دفعہ ہم جہاد میں تھے اسی دوران میں اتفاق سے ایک جھاڑی میں پہنچ گیا وہاں میں نے ایک درخت دیکھا جس پر سرخ رنگ کے پتے پر سفید رنگ میں لکھا ہوا تھا **لا اله الا الله محمد رسول الله.**

اسی طرح ایک بزرگ سے روایت ہے کہ میں نے ایک جزیرے میں ایک بہت بڑا درخت دیکھا جس کے پتے بھی بہت بڑے بڑے تھے اور بہت خوشبودار تھے۔ ان سب سبز رنگ کے پتوں پر سرخ اور سفید رنگ سے بڑے بڑے صاف اور واضح انداز میں قدرتی طور پر پتے کے اندر تین سطریں لکھی ہوئی تھی۔ پہلی سطر میں یہ لکھا ہوا تھا **لا اله الا الله** دوسری سطر میں یہ لکھا تھا، **محمد رسول الله** و رتیسری سطر میں یہ تحریر تھا کہ۔ اللہ تعالیٰ کے نزدیک دین صرف اسلام ہی ہے۔ ایسے ہی ایک اور بزرگ سے روایت ہے کہ ایک دفعہ میں ہندوستان کے علاقے میں گیا۔ وہاں کے ایک گاؤں میں میں نے ایک سیاہ رنگ کا گلاب کا پودا دیکھا جو ایک بڑے سیاہ گلاب میں سے پھوٹ رہا تھا۔ اس میں بڑی عمدہ خوشبو آ رہی تھی اور پر سفید رنگ میں یہ لکھا ہوا تھا۔ **لا الـه الا الله محمد رسول الله ابوبكر ن الصديق عمر الفاروق**

مجھے اس کو دیکھ کر شک ہوا کہ شاید ایسا ہاتھ سے لکھا گیا ہو۔ اس لئے میں ایک دوسرے گلاب کی طرف گیا جو ابھی کھلا نہیں تھا مگر اس میں بھی وہی عبارت نظر آئی جو دوسری تمام پتیوں پر تھی۔ اس بستی میں اس قسم کے پودے بہت سارے ہیں حالانکہ اس علاقے کے لوگ بتوں اور پتھروں کو پوجنے والے ہیں۔ (بحوالہ سیرت حلبیہ)

گلاب کی پنکھڑی پر عجیب تحریر

ابن مرزوق نے شرح بردہ میں کسی بزرگ کی روایت نقل کی ہے کہ ایک مرتبہ جبکہ ہم بحر ہند کے گہرے پانیوں میں سفر کر رہے تھے اچانک ایک زبردست آندھی چلی۔ ہماری کشتی ہوا کے زور میں ایک جزیرے پر پہنچ گئی وہاں ہم نے ایک سرخ گلاب کا پودا دیکھا۔ یہ گلاب بڑا خوشبودار تھا اور اس پر زرد رنگ میں یہ لکھا ہوا تھا۔ "رحمٰن ورحیم کی جانب سے نعمتوں سے بھرپور جنتوں تک پہنچنے کے لئے یہ فرمان اور پروانہ مقرر کیا گیا ہے۔ **لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ.**

اسی طرح ایک مؤرخ نے لکھا ہے کہ ہندوستان کے علاقوں میں ایک درخت دیکھا جس پر بادام کے جیسا پھل لگتا ہے اور اس پر دو چھلکے ہوتے ہیں اسے توڑا جائے تو اس میں سے سبز رنگ کا ایک لپٹا ہوا پتہ سا نکلتا ہے اور اس پر یہ لکھا ہوا ہوتا ہے **لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ** یہ کلمہ اس پر بڑے صاف الفاظ میں لکھا ہوتا ہے وہاں کے لوگ اس درخت سے برکت حاصل کرتے ہیں اور اگر خشک سالی کا زمانہ ہوتا ہے تو اس سے بارش کی دعا مانگتے ہیں۔

کتاب مزیل الخفاء میں بھی یہ واقعہ ذکر ہے مگر اس میں صرف **لا الــــہ الا اللہ** لکھا ہوا ہونیکا ذکر ہے۔ اگر اس روایت کو صحیح مان لیا جائے تو اس کا مطلب یہ ہوگا یہ روایت ہمارے اس موضوع کی دلیل نہیں بنے گی (جس کے مطابق رسول اللہ ﷺ کا نام نامی پتھروں اور درختوں وغیرہ پر لکھا ہوا پایا گیا)۔

اسی طرح ایک روایت ہے جس کو علامہ حافظ سلفی نے کسی سے نقل کیا ہے کہ ہندوستان کے ایک علاقے میں ایک درخت ہے جس کے پتے ہلکے سبز ہوتے ہیں اور ہر پتے پر گہرے سبز رنگ میں لکھا ہوا ہوتا ہے **لا الـہ الا اللہ محمد رسول اللہ** اس علاقے کے لوگ بت پرست تھے وہ اس درخت کو کاٹ ڈالتے تھے اور کچھ جڑیں باقی رہنے دیتے تھے یہ درخت بہت تھوڑے سے وقت میں پھر دوبارہ بڑھ کر اپنی اصلی حالت پر آجاتا تھا۔ آخر ایک دفعہ انہوں نے سیسہ پگھلا کر اس کی جڑ میں بھر دیا مگر اس سیسے کے چاروں طرف سے درخت کی چار شاخیں پھوٹیں اور ہر شاخ پر **لا الـہ الا اللہ محمد رسول اللہ** لکھا ہوا تھا۔ اس (حیرت ناک کرامت) کو دیکھ کر وہ لوگ اس درخت سے برکت حاصل کرنے لگے اور بیماریوں میں اس کو شفاء حاصل کرنے کے لئے استعمال کرنے لگے۔ وہ اس کو زعفران اور دیگر بہترین خوشبوؤں کے ساتھ استعمال کرنے لگے۔ (حوالا بالا)

انگور کے دانے میں لفظ محمد ﷺ کا نقش

اسی طرح ایک روایت ہے کہ ۸۰۷ھ ۸۰۹ھ میں انگور کا ایسا دانہ پایا گیا تھا جس میں سیاہ رنگ سے بہت صاف صاف محمد لکھا ہوا تھا۔

جانوروں کے جسموں پر آنحضرت ﷺ کے نام کے قدرتی نقوش

ایک روایت ہے کہ ایک شخص نے ایک مچھلی شکار کی تھی جس کے دائیں جانب لا الہ الا اللہ لکھا ہوا تھا اور بائیں جانب **محمد رسول اللہ** ﷺ تحریر تھا راوی کہتا ہے کہ جب میں نے دیکھا تو میں نے احترام کے طور پر اس کو واپس نہر میں ڈال دیا۔

ایک اور شخص سے حکایت ہے کہ ایک مرتبہ میں مغربی علاقے کے سمندر میں سفر کر رہا تھا ہمارے ساتھ ایک غلام تھا جس کے پاس مچھلی پکڑنے کا جال تھا۔ اس نے اس کو دریا میں ڈالا اور ایک مچھلی پکڑی۔ یہ مچھلی ایک بالشت لمبی تھی۔ ہم نے اس کو دیکھا تو اس کے کان کے پاس ''لا الـہ الا اللہ '' لکھا ہوا تھا اور اس کی گردن کی پشت سے لیکر دوسرے کان

کی جگہ "محمد رسول اللہ" لکھا ہوا تھا۔ ہم نے یہ دیکھ کر اس مچھلی کو واپس سمندر میں ڈال دیا۔

ایک شخص سے حکایت ہے کہ اس نے ایک مچھلی دیکھی جو سفید رنگ کی تھی اس کی گردن کی پشت پر سیاہ رنگ میں لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ لکھا ہوا تھا۔

حضرت ابن عباس سے روایت ہے کہ ایک مرتبہ ہم رسول اللہ ﷺ کے پاس بیٹھے ہوئے تھے اچانک ایک پرندہ آیا جس کی چونچ میں سبز رنگ کا ایک بادام تھا اس نے اس کو وہیں گرا دیا۔ آنحضرت ﷺ نے اس کو اٹھالیا۔ اس کے اندر ایک سبز رنگ کا کیڑا تھا جس پر زرد رنگ سے لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ تحریر تھا۔ (بحوالہ سیرت حلبیہ)

بادلوں کے ظاہر سے ہونے والی کلمے کی تحریر

اسی طرح ایک بزرگ سے روایت ہے کہ طبرستان کے علاقے میں ایک فرقہ تھا جو لا الہ الا اللہ وحدہ لا شریک لہ کو نہیں مانتا تھا یعنی یہ تو مانتے تھے کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں جو تنہا ہے اور جس کا کوئی شریک نہیں ہے مگر وہ لوگ آنحضرت ﷺ کی نبوت و رسالت کو نہیں مانتے تھے ان لوگوں کی وجہ سے کافی فتنہ پھیل رہا تھا۔ ایک روز جبکہ سخت گرمی پڑ رہی تھی اچانک ایک سفید بادل ظاہر ہوا اور پھیلنا شروع ہوا یہاں تک کہ مشرق سے مغرب تک وہ بادل چھا گیا اور آسمان اس کے پیچھے چھپ گیا۔ اسی حالت میں جب زوال کا وقت ہوا تو اچانک بادلوں کے اندر بالکل صاف اور واضح انداز میں یہ کلمہ لکھا ہوا ظاہر ہوا لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ یہ کلمہ زوال سے لے کر عصر کے وقت تک اسی طرح باقی رہا۔ اس حیرت ناک واقعہ کو دیکھ کر اس فرقے کے لوگوں نے فوراً توبہ قبول کر لی۔ ادھر ساتھ ہی وہاں جو یہودی اور عیسائی رہتے تھے ان میں سے اکثر لوگ مسلمان ہو گئے۔

واقعہ خضرؑ و موسیٰؑ میں دیوار والے خزانے کی حقیقت

اسی طرح حضرت عمر بن خطابؓ سے روایت ہے کہ قرآن پاک میں حق تعالیٰ کا

جو یہ ارشاد ہے: **و کان تحته کنز لهما** (پ۱۶ سورہ کہف ع۹) اتر جمہ: اور اس دیوار کے نیچے ان کا مال مدفون تھا (جو ان کے باپ سے میراث میں پہنچا ہے)۔

سونے کی اس تختی پر عبرت آمیز کلمات اور آنحضرت ﷺ کا نام

یہ حضرت موسیٰ اور حضرت خضر کے واقعات کا ایک حصہ ہے، جس کو مترجم سیرت حلبیہ اس روایت کے بعد تفصیلی علم کے لئے پیش کرر ہے ہیں۔ ملاحظہ فرمائیے۔

حضرت عمرؓ فرماتے ہیں کہ مجھے خزانے اور مال کے متعلق روایت پہنچی ہے کہ یہ ایک سونے کی تختی تھی اور ایک قول کے مطابق سنگ مرمر کی ایک تختی تھی، جس پر یہ عبارت لکھی ہوئی تھی۔

''اس شخص پر حیرت ہے، جو موت پر ایمان رکھتا ہے یعنی مانتا ہے کہ ایک دن اسے اس دنیا کو خیر باد کہنا ہے۔ اور پھر بھی وہ ہنستا اور خوش رہتا ہے۔ اس شخص پر حیرت ہے جو حساب و کتاب پر یقین رکھتا ہے یعنی ایمان رکھتا ہے کہ مرنے کے بعد (قیامت کے دن) اس کے عمل کا حساب و کتاب ہوگا۔ لیکن اس کے باوجود بھی غافل رہتا ہے۔ اس شخص پر تعجب ہے جو تقدیر پر ایمان رکھتا ہے یعنی یہ جانتا ہے کہ ہر کام اللہ تعالیٰ کی تقدیر کے تحت ہوتا ہے۔ لیکن پھر بھی وہ (ناگوار حادثوں پر) غمگین ہوتا ہے۔ اس انسان پر حیرت ہے، جو دنیا کو اور اس میں رہنے والوں کے ساتھ اس کے الٹ پلٹ اور انقلاب کو دیکھتا ہے اور پھر بھی اس دنیا سے مطمئن اور خوش رہتا ہے۔ **لا الٰه الا الله محمد رسول الله**''

(اسی خزانے کے متعلق) علامہ بیہقی وغیرہ نے حضرت علیؓ سے روایت بیان کی ہے کہ (ان دونوں لڑکوں کا) وہ خزانہ، جس کے متعلق اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں تذکرہ فرمایا ہے سونے کی ایک تختی تھی، جس پر یہ لکھا ہوا تھا۔

''بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔ مجھے اس پر حیرانی ہے جو تقدیر الٰہی پر یقین رکھنے کے باوجود (مشکل حالات میں) گھبراتا اور پریشان ہوتا ہے۔ مجھے اس شخص پر تعجب ہے، جس

کے سامنے ذکر آتا ہے جہنم کا لیکن اس کے باوجود بھی اس کے ہونٹوں پر ہنسی باقی رہتی ہے۔ مجھے اس شخص پر حیرت ہے جس کے سامنے موت کا ذکر ہوتا ہے۔ لیکن اس کے باوجود بھی غافل رہتا ہے۔ **لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ** اور ایک اور روایت کے الفاظ کے مطابق **لا الہ الا اللہ محمد عبدی و رسولی** میرے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں اور محمد ﷺ میرے بندے اور رسول ہیں۔

تفسیر بیضاوی میں یہ ہے (کہ اس تختی پر یہ لکھا ہوا تھا)۔ مجھے حیرت ہے کہ جو شخص تقدیر پر ایمان رکھتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کو رزق دینے والا ہے (مشکل حالات اور تنگی سے) کیوں تھکتا اور پریشان ہوتا ہے! مجھے حیرت ہے کہ جو آدمی موت پر ایمان رکھتا ہے وہ کیسے خوش رہتا ہے! مجھے حیرت ہے کہ جو شخص (قیامت کے دن) حساب و کتاب پر ایمان رکھتا ہے وہ کیسے غفلت کرتا ہے! مجھے حیرانی ہے کہ جو شخص دنیا اور یہاں رہنے والوں کے ساتھ اس کی بے وفائی اور انقلابات کو دیکھتا ہے وہ کیسے اس سے مطمئن اور خوش رہتا ہے۔ **لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ**"

مولف سیرت حلبیہ کہتے ہیں (چونکہ اس تختی پر عبارت کے متعلق کئی روایتیں اور الفاظ آئے ہیں جس سے آپس میں روایتوں کا اختلاف اور کمزوری ظاہر ہوتی ہے اس لئے مولف کہتے ہیں) اس بارے میں کہا جاتا ہے کہ ممکن ہے روایت میں جو عبارت ذکر کی گئی ہے وہ تختی کے ایک طرف ہو اور دوسری روایت میں جو الفاظ بیان ہوئے ہیں وہ اس تختی کے دوسری طرف ہوں۔ یا پھر یہ کہا جا سکتا ہے کہ ممکن ہے بعض راویوں نے عبارت کے الفاظ میں کچھ زیادتی کر دی ہے اور بعض نے کمی کر دی ہے اور بعض نے روایت بالمعنی بیان کی ہے (روایت بالمعنی کا مطلب ہے کہ روایت سن کر اس کو ان ہی الفاظ میں نقل نہ کیا جائے جن میں اسے سنا بلکہ روایت کے مطلب اور مفہوم کو اپنے الفاظ میں بیان کر دیا جائے۔ اس کے مقابلے میں ایک روایت بالالفاظ ہوتی ہے جو وہ ہے کہ روایت کو ان ہی الفاظ میں نقل اور بیان کیا جائے جن میں اسے سنا گیا ہے۔)

ان دونوں بھائیوں کی خاطر اللہ تعالیٰ نے یہ خزانہ اتنی لمبی مدت تک اس لئے محفوظ رکھا کی ان کا وہ باپ بہت نیک اور صالح آدمی تھی، جس نے وہ خزانہ محفوظ کیا تھا۔ یہ شخص ان لڑکوں کا نویں پشت میں دادا ہوتا تھا۔

علامہ محمد ابن منکدرؒ کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ ایک نیک آدمی کی خاطر اس کی اولاد اور اولاد کی اولاد تک کی حفاظت فرماتا ہے اور اس جگہ تک کی حفاظت فرماتا ہے جس میں وہ ہوتا ہے یہاں تک کہ اس کے قرب و جوار اور آس پاس کی چیزوں تک کی حفاظت فرماتا ہے۔ چنانچہ یہ سب کے سب ہمیشہ اللہ تعالیٰ کی حفاظت اور نگہبانی میں رہتے ہیں۔

اسی سلسلے میں ایک واقعہ بیان کیا جاتا ہے کہ ایک علوی شخص کو ہارون رشید بادشاہ نے قتل کرنے کا ارادہ کیا (اور اسی نیت سے اس کو بلوایا) مگر جب وہ بادشاہ کے پاس آیا تو ہارون رشید نے اس کا بہت احترام کیا اور پھر اس کو چھوڑ دیا۔ بعد میں اس شخص سے کسی نے پوچھا۔ "تم نے وہ کونسی دعا کی تھی کہ اللہ تعالیٰ نے تمہیں قتل سے نجات دے دی۔" اس نے کہا میں نے یہ دعا مانگی تھی کہ اسے وہ ذات جس نے ان دونوں بچوں کے خزانے کی ان کے باپ کی نیکی کی وجہ سے حفاظت فرمائی، میرے باپ دادا کی نیکیوں کی وجہ سے میرے بھی بادشاہ سے حفاظت فرما۔" کتاب عرائس میں یہ واقعہ اسی طرح ذکر ہے۔ واللہ اعلم

تشریح: اب اس واقعہ کی تفصیلات البدایہ والنہایہ، تفسیر ابن کثیر اور تفسیر خازن سے لے کر پیش کی جارہی ہیں تا کہ پیچھے گزرنے والی حضرت عمرؓ کی روایت میں اس واقعے کے جس قصے کی طرف اشارہ کیا گیا ہے وہ بھی تفصیل سے سامنے آجائے اور پورے واقعہ کے متعلق بھی پڑھنے والوں کو ضروری معلومات حاصل ہو جائیں۔

اس واقعہ کو اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں سورہ کہف میں ذکر فرمایا ہے۔ جسکا ترجمہ ہے۔ اور وہ وقت یاد کرو جب کہ موسیٰ نے اپنے خادم سے فرمایا کہ میں اس سفر میں برابر چلا جاؤں گا یہاں تک کہ اس موقعہ پر پہنچ جاؤں جہاں دو دریا آپس میں ملتے ہیں یا یوں ہے کہ زمانہ دراز چلتا رہوں گا۔ پس جب چلتے چلتے دونوں دریاؤں کے جمع ہونے کے موقع پر

پہنچے اس میں اپنی مچھلی کو دونوں بھول گئے اور مچھلی نے دریا میں اپنی راہ لی اور چل دی۔ پھر جب دونوں وہاں سے آگے بڑھ گئے تو موسیٰ نے اپنے خادم سے فرمایا کہ ہمارا ناشتہ لاؤ۔ ہم کو اس سفر میں (یعنی آج کی منزل میں) بڑی تکلیف ہوئی۔ خادم نے کہا لیجئے دیکھئے (عجیب بات ہوئی) جب ہم اس پتھر کے قریب ٹھہرے تھے سو میں اس مچھلی کے تذکرے کو بھول گیا اور مجھ کو شیطان ہی نے بھلا دیا کہ میں اس کو ذکر کرتا اور (وہ قصہ یہ ہوا کہ) اس مچھلی نے (زندہ ہونے کے بعد) دریا میں عجیب طور پر پناہ لی۔ موسیٰ نے (یہ حکایت سن کر) فرمایا یہی وہ موقع ہے جس کی ہم کو تلاش تھی۔ سو دونوں اپنے قدموں کے نشان دیکھتے ہوئے الٹ لوٹے۔ سو وہاں پہنچ کر انہوں نے ہمارے بندوں میں سے ایک بندے کو پایا جن کو ہم نے اپنی خاص رحمت (یعنی مقبولیت) دی تھی اور ہم نے ان کو اپنے پاس سے ایک خاص علم سکھلایا تھا۔ (ترجمہ تھانویؒ)

اس واقعہ کے متعلق علامہ ابن کثیر البدایہ والنہایہ میں لکھتے ہیں بعض اہل کتاب کہتے ہیں کہ موسیٰ جو حضرت خضرؑ کے پاس گئے تھے (پیغمبر حضرت موسیٰ ابن عمران نہیں تھے بلکہ) یہ موسیٰ ابن میشا ابن یوسف ابن یعقوب ابن اسحاق ابن ابراہیم تھے۔ اس بات کو بعض ایسے لوگوں نے بھی مانا ہے جو اسرائیلی صحیفوں کے عالم ہیں اور ان کے واقعات نقل کرتے ہیں جیسے نوف ابن فضالہ لیکن صحیح یہ ہے جس پر قرآن وحدیث سے بھی تائید ملتی ہے اور جس پر علماء میں اتفاق ہے کہ حضرت موسیٰ ابن عمرانؑ تھے جو بنی اسرائیل کے نبی تھے۔

بخاری میں سعید ابن جبیرؓ سے روایت ہے کہ میں نے ایک مرتبہ حضرت ابن عباسؓ سے کہا۔ لوئی البکالی یہ دعویٰ کرتا ہے کہ حضرت خضرؑ کے ساتھ جانے والے موسیٰ بنی اسرائیل کے پیغمبر حضرت موسیٰ ابن عمرانؑ نہیں تھے؟ حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا۔ ”وہ خدا کا دشمن جھوٹ بولتا ہے ہمیں ابی بن کعب نے بتلایا کہ اس نے رسول ﷺ کو یہ فرماتے سنا ہے کہ ایک مرتبہ موسیٰ اپنی قوم کے درمیان خطبہ دے رہے تھے۔ اسی دوران میں کسی نے ان سے پوچھا ”کون شخص سب سے زیادہ عالم ہے؟“ موسیٰ نے کہا میں ہوں۔ یہ بات اللہ تعالیٰ کو نہ پسند

ہوئی کیونکہ انہوں نے جواب میں یہ نہیں کہا کہ اللہ تعالیٰ کو خبر ہے (کہ کون آدمی سب سے زیادہ عالم ہے) چنانچہ اسی وقت وحی نازل ہوئی کہ ''مجمع البحرین یعنی جہاں دو دریاؤں کے پانی ملتے ہیں وہاں ہمارا ایک بندہ ہے جو تم سے بڑا عالم ہے۔''

(موسیٰ کو وہاں جانے کا حکم ملا تو وہ وہاں پہنچے اور ان سے ملنے کے لئے بیتاب ہوئے) چنانچہ انہوں حق تعالیٰ سے عرض کیا۔ ''اے پروردگار! میں وہاں کیسے پہنچوں گا؟'' اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔ ''اپنے ساتھ ایک مچھلی ناشتہ دان میں رکھ لو وہ مچھلی جہاں کھو جائے اسی جگہ وہ بندہ ملے گا۔'' چنانچہ موسیٰؑ نے ایک مچھلی (پکا کر) توشہ دان میں رکھ لی اور وہاں روانہ ہو گئے۔ انہوں نے اپنے ساتھ ایک نوجوان یوشع ابن نون کو خادم کے طور پر ہمراہ لے لیا۔ یہاں تک کہ وہ ایک خاص پتھر تک پہنچے تو دونوں (تھکن کی وجہ سے) اس پتھر پر سر رکھ کر لیٹے اور سو گئے۔ اسی وقت توشہ دان میں مچھلی تڑپی اور اس میں سے نکل کر دریا میں جا کودی اور اس طرح سمندر کی تہہ میں اتر گئی جیسے کسی سرنگ میں اتر جاتے ہیں۔ جس جگہ وہ مچھلی سمندر میں کودی وہاں اللہ کی قدرت سے چاروں طرف پانی رک کر ایک سوراخ سا پیدا ہو گیا اور اسی طرح باقی رہا۔

اس کے بعد جب موسیٰؑ اور ان کے ساتھی جاگے تو وہ خادم آپ سے یہ بتلانا بھول گئے کہ مچھلی یہاں توشہ دان سے نکل کر پانی میں کود گئی ہے۔ چنانچہ وہ دونوں وہاں سے راوانہ ہو گئے اور بقیہ پورا دن اور ایک رات چلتے رہے صبح ہوئی تو موسیٰؑ نے اپنے ساتھی سے فرمایا۔ ''ہمارا ناشتہ (یعنی وہ مچھلی) لاؤ آج کے سفر نے تو ہم کو تھکا دیا۔''

یہ تھکان بھی موسیٰؑ کو اس جگہ سے آگے نکلنے کے بعد ہی معلوم ہوئی جہاں جانے کا ان کو اللہ تعالیٰ نے حکم دیا تھا اس سے پہلے انہیں تھکان محسوس نہیں ہوئی تھی۔ غرض ناشتہ مانگنے پر اب ان کے خُادم نے ان سے کہا۔ ''دیکھئے جب ہم نے اس پتھر کے پاس آرام کیا تھا تو اس وقت اس مچھلی کا ذکر کرنا بھول گیا۔ یہ بات یقیناً شیطان نے ہی مجھے بھلائی ہے اور اس مچھلی نے تو عجیب طریقے سے سمندر میں اپنا راستہ بنا لیا اور پانی میں کود گئی تھی۔''

اس طرح مچھلی کے لئے پانی میں سرنگ بن گئی اور موسیٰؑ اوران کے خادم کے لئے یہ ایک حیرت ناک واقعہ بن گیا۔ موسیٰؑ نے فرمایا۔''اسی جگہ تو (جہاں وہ مچھلی گم ہوئی ہے) ہم جانا چاہتے تھے!''

چنانچہ اب دونوں اپنے پیروں کے نشانات دیکھتے ہوئے وہاں سے لوٹے یہاں تک کہ اسی پتھر کے پاس پہنچے اور دیکھا کہ وہاں کپڑا اوڑھے ایک شخص بیٹھا ہے (یہ بزرگ حضرت خضر تھے) موسیٰؑ نے ان کو سلام کیا۔ حضرت خضر نے (یہ سلام سن کر حیرت سے) کہا۔'' آپ کے اس علاقے میں سلام کا یہ طریقہ کہاں سے آیا؟ حضرت موسیٰؑ (سمجھ گئے یہ ان کو پہچانے نہیں ہیں اس لئے انہوں) نے کہا'''' میں موسیٰؑ ہوں۔'' حضرت خضر نے پوچھا کیا بنی اسرائیل کے (پیغمبر) موسیٰؑ؟ موسیٰؑ نے کہا'' ہاں اور آپ کے پاس میں اس لئے آیا ہوں کہ آپ مجھے بھلائی اور نیکی کی وہ باتیں بتلائیں جو آپ کو اللہ تعالیٰ نے سکھلائی ہیں۔'' حضرت خضر نے کہا'' مگر آپ میرے ساتھ صبر نہیں کر سکتے موسیٰ۔ مجھے اللہ تعالیٰ نے اپنے علم میں سے وہ علم دیا ہے جو تم نہیں جانتے اور تمہیں اللہ تعالیٰ نے اپنے علم سے جو باتیں بتلائی ہیں وہ میں نہیں جانتا۔'''' موسیٰؑ نے فرمایا کہ آپ انشاء اللہ مجھے صبر کرنے والا ہی پائیں گے اور میں آپ کے کسی حکم کی نافرمانی نہیں کروں گا۔'' آخر حضرت خضر نے فرمایا'' اچھا اگر میرے ساتھ چلنا ہی چاہتے ہو تو مجھ سے کسی بات کے بارے میں خود سے مت پوچھنا یہاں تک کہ میں خود ہی اس کے متعلق آپ کو بتلا دوں۔'' اس کے بعد دونوں وہاں سے روانہ ہوئے اور سمندر کے کنارے پہنچے وہاں ایک کشتی کھڑی ہوئی پائی۔ حضرت خضر نے ان کشتی والوں سے بات کی کہ وہ ان کو دوسرے کنارے پر پہنچا دیں۔ وہ لوگ حضرت خضر کو پہچان گئے اور بغیر اجرت لئے ان کو کشتی میں بٹھالیا تھوڑی ہی دور چلے تھے کہ موسیٰ نے دیکھا حضرت خضر کلہاڑی سے کشتی کا ایک تختہ توڑنے لگے۔ موسیٰؑ نے (حیران ہوکر) کہا'' جن لوگوں نے ہمیں بغیر کرایہ لئے سوار کرلیا آپ ان کی کشتی کو تباہ کرنے کا ارادہ کررہے ہیں تاکہ کشتی والے بچارے غرق ہوجائیں۔ یہ تو آپ بڑی نہ مناسب بات کررہے

ہیں۔" حضرت خضر نے فرمایا "کیا میں نے آپ سے کہا نہ تھا کہ آپ میرے ساتھ صبر نہیں کر سکتے۔" موسیٰؑ نے فرمایا "مجھ سے بھول ہو گئی آپ اس غلطی کو معاف کریں اور سختی نہ کریں۔" آنحضرت ﷺ نے (موسیٰ کی اس پہلی بھول کے متعلق) فرمایا کہ "پہلی بار موسیٰ سے واقعی بھول ہو گئی تھی۔" (اس سفر کے دوران ہی) کشتی کے ایک تختے پر ایک چڑیا آکر بیٹھی۔ اس نے سمندر میں چونچ ڈال کر پانی پیا اور اڑ گئی۔ حضرت خضر نے یہ دیکھ کر حضرت موسیٰ سے یہ فرمایا۔ "مجھے اور تمہیں اللہ نے جو علم دیا ہے اس سے اللہ کے علم میں اگر کوئی کمی ہوئی ہے تو اس اتنی ہی جتنی اس چڑیا کے ایک قطرہ پانی پینے سے اس سمندر میں ہوئی ہے۔

غرض دوسرے کنارے پہنچنے کے بعد دونوں کشتی میں سے اترے اور ساحل کے ساتھ ساتھ چلنے لگے اسی وقت حضرت خضر نے ایک لڑکے کو دیکھا جو چند دوسرے لڑکوں کے ساتھ کھیل رہا تھا۔ حضرت خضر نے فوراً بڑھ کر اس لڑکے کا سر اپنے ہاتھ میں پکڑا اور ایک دم اس کی گردن مروڑ دی جس سے وہ بچہ ہلاک ہو گیا۔ موسیٰؑ نے یہ منظر دیکھا۔ تو (ان سے صبر نہ ہو سکا اور) فوراً بولے۔ "آپ نے اس معصوم بچے کو بغیر کسی وجہ سے مار ڈالا! یہ تو آپ نے بہت ہی نہ مناسب کام کیا ہے؟" حضرت خضر نے فرمایا "میں نے پہلے آپ سے کہا تھا کہ آپ میرے ساتھ صبر نہیں کر سکتے!"

حضرت خضر نے اس دفعہ پہلے سے بھی زیادہ سختی سے یہ بات کہی تھی۔ حضرت موسیٰؑ (کو فوراً ہی اپنی بھول کا خیال ہوا اور انہوں) نے معذرت کرتے ہوئے کہا۔ "اچھا اگر اس کے بعد میں آپ سے کوئی بات پوچھوں تو آپ میرا ساتھ چھوڑ دیں۔ اب آپ بے شک معذور ہوں گے۔" اس کے بعد یہ دونوں پھر آگے روانہ ہو گئے۔ آخر یہ ایک گاؤں میں پہنچے حضرت خضر نے ان سے کھانے کی درخواست کی مگر بستی والوں نے ان مسافروں کو کھانا کھلانے سے انکار کر دیا۔ اس کے بعد آگے بڑھے تو اسی بستی میں ایک دیوار نظر آئی جو (بوسیدہ ہو کر) ایک طرف کو جھک گئی تھی اور کسی بھی وقت گر سکتی تھی۔ حضرت خضر نے اس کو دیکھا تو فوراً بڑھ کر اپنے ہاتھ سے اس کو سیدھا کر دیا۔ یہ صورت دیکھ کر حضرت موسیٰ (سے

پھر صبر نہ ہوسکا اور انہوں) نے کہا۔ ”یہ ایسے لوگ ہیں کہ ہم ان کے یہاں آئے تو انہوں نے ہمیں کھانا بھی نہیں دیا اور ہماری میزبانی سے صاف انکار کر دیا۔ آپ نے ان لوگوں کا یہ کام کیا ہے آپ کو اس پر اجرت لینی چاہئے تھی (تا کہ اس کے ذریعہ پیٹ بھر سکتے) حضرت خضر موسیٰ کو دو مرتبہ سوال کرنے پر ٹوک چکے تھے آخر اب انہوں نے موسیٰ سے صاف کہہ دیا۔ ” بس یہیں سے تمہارا اور میرا ساتھ چھوٹتا ہے۔ لیکن (جدا ہونے سے پہلے) میں تمہیں ان سب باتوں کا سبب ضرور بتلائے دیتا ہوں جن کے متعلق آپ سے صبر نہ ہوسکا۔“

آنحضرت ﷺ فرماتے ہیں کاش موسیٰ کچھ اور صبر کر لیتے تا کہ اللہ تعالیٰ ان باتوں کے متعلق ہمیں مزید تفصیلات بتلاتا!“ سعید ابن جبیرؓ کہتے ہیں کہ حضرت ابن عباسؓ اس آیت میں کان و رائهم کے بجائے کان اما مهم بھی پڑھتے تھے اسی طرح کُلُّ سَفِينَة صالحة پڑھا کرتے تھے اسی طرح اما الغلام کے بعد فکان کافرا بھی پڑھا کرتے تھے۔ امام بخاری نے بھی اس قرات کو سند کے ساتھ نقل کیا ہے۔

اس حدیث میں یہ ہے کہ موسیٰؑ اپنے خادم یوشع ابن نون کے ساتھ ایک مچھلی لیکر روانہ ہوئے اور ایک پتھر کے پاس پہنچے اور وہاں (آرام کرنے کے لئے) رکے۔ پھر کہتے ہیں۔ موسیٰ اس پتھر پر سر رکھ کر لیٹے اور سو گئے۔ پھر کہتے ہیں۔ اس پتھر کی جڑ میں سے ایک چشمہ نکلتا تھا جس کا نام نہر حیات تھا۔ جس چیز کو بھی اس نہر کا پانی چھو جاتا وہ زندہ ہو جاتی ہے (اسی کو اردو میں آب حیات کہتے ہیں) چنانچہ اس چشمہ کا پانی کسی طرح اس مردہ مچھلی کو چھو گیا (جو موسیٰ کے ساتھ تھی) وہ فوراً زندہ ہو کر حرکت کرنے لگی اور کود کر پانی میں پہنچ گئی۔ پھر جب موسیٰ کی آنکھ کھلی تو انہوں نے اپنے خادم سے کہا کہ ہمارا ناشتہ لاؤ۔ وغیرہ وغیرہ۔ پھر اسی روایت میں ہے کہ اسی دوران ایک چڑیا آ کر کشتی کے ایک تختے پر بیٹھ گئی اور اس نے پانی کے لئے اپنی چونچ سمندر میں ڈالی۔ اس وقت حضرت خضر نے موسیٰ سے کہا۔ ”تمہارا اور میرا علم اور ساری مخلوق کا علم اللہ تعالیٰ کے علم کے مقابلے میں اتنا ہی ہے جتنا پانی اس چڑیا نے سمندر میں سے اپنی چونچ میں لیا۔“ الخ

حضرت سعید ابن جبیر کی ایک حدیث ہے کہ ایک دفعہ ہم حضرت ابن عباسؓ کے پاس ان کے گھر میں بیٹھے ہوئے تھے کہ حضرت ابن عباسؓ نے ہم سے کہا کہ مجھ سے کچھ سوال کرو۔ میں نے کہا۔ ''اے ابن عباس۔ اللہ تعالیٰ مجھے آپ پر فدا کرے۔ کوفے میں ایک واعظ ہے جس کا نام نوف ہے وہ یہ کہتا ہے کہ (موسیٰ اور خضر کے واقعہ میں) یہ موسیٰ وہ نہیں ہیں جو بنی اسرئیل کے پیغمبر تھے۔'' اس روایت کو ابن جریج نے دو آدمیوں سے نقل کیا ہے ایک یعلی ابن مسلم اور دوسرے عمرو ابن دینار اور یہ دونوں اس کو حضرت سعید ابن جبیرؒ سے روایت کرتے ہیں۔ غرض ابن جریج اتنی روایت بیان کرنے کے بعد کہتے ہیں کہ جہاں تک عمرو ابن دینار کا تعلق ہے انہوں نے کہا کہ اس پر حضرت ابن عباسؓ نے یہ فرمایا کہ اس خدا کے دشمن نے جھوٹ کہا۔ اور جہاں تک یعلی ابن مسلم کا تعلق ہے انہوں نے یہاں تک بیان کرنے کے بعد کہا کہ اس حضرت ابن عباسؓ نے حضرت ابی بن کعب سے روایت بیان کی کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا۔

''اللہ تعالیٰ کے رسول موسیٰ نے ایک مرتبہ لوگوں کے سامنے کھڑے ہو کر وعظ کہا جس کو سن کر سننے والوں کے دل بہت متاثر ہوئے اور وہ رونے لگے۔ اس کے بعد حضرت موسیٰ وعظ ختم کر کے واپس روانہ ہوئے۔ ایک شخص ان کے پیچھے گیا (جو ان کا وعظ سنکر اور ان کا علم دیکھ کر حیران اور متاثر ہو رہا تھا) اور ان سے پوچھنے لگا۔ ''کیا اس دنیا میں آپ سے بڑا بھی کوئی عالم ہے!'' اس پر موسیٰؑ نے فرمایا۔ ''نہیں'' یہ بات اللہ تعالیٰ کو نہ پسند ہوئی کہ موسیٰ نے جواب میں یہ کیوں نہیں کہا کہ اللہ تعالیٰ ہی جاننے والا ہے چنانچہ حق تعالیٰ کی طرف سے موسیٰ سے فرمایا گیا بے شک (تم سے بڑا عالم موجود) ہے۔ موسیٰ نے عرض کیا ''پروردگار۔ وہ کہاں ہے؟'' فرمایا گیا، ''جہاں دو دریا ملتے ہیں۔'' موسیٰ نے عرض کیا۔ ''اے پروردگار! مجھے ایسا علم عطا فرما جس کے ذریعہ میں اس جگہ کا پتا لگا سکوں جواب ملا۔ ''جہاں مچھلی تمہارا ساتھ چھوڑ جائے (وہی وہ جگہ ہوگی)۔'' اس روایت کو یعلی نے جس طرح بیان کیا اس کے مطابق حق تعالیٰ نے جواب میں فرمایا۔ تم ایک مری ہوئی مچھلی اپنے ساتھ لیکر چلو۔ جہاں بھی وہ

زندہ ہو جائے (وہیں وہ جگہ ہوگی جہاں وہ عالم موجود ہیں جو تم سے زیادہ جانتے ہیں) چنانچہ موسیٰ نے ایک مچھلی اپنے ساتھ لی اور اس کو توشہ دان میں رکھ لیا۔ پھر انہوں نے اپنے خادم سے کہا۔ "تمہیں صرف اتنا کام کرنا ہے کہ جہاں یہ مچھلی تمہارا ساتھ چھوڑ دے وہیں مجھے فوراً خبر کر دو۔" خادم نے کہا "یہ تو آپ نے بڑا آسان کام بتایا ہے۔"

آیت پاک میں خادم سے مراد یہی یوشع ابن نون ہیں۔ غرض اب یہی دونوں ایک ٹھنڈی اور سائے دار جگہ پہنچ کر ٹھہرے جو سمندر کے کنارے تھی۔ موسیٰ کی اس وقت آنکھ لگ گئی تھی۔ اسی وقت وہ مچھلی اچانک زندہ ہو کر تڑپی اور پانی میں کود گئی۔ خادم نے دل میں سوچا کہ فوراً جگا کر خبر کرنا ٹھیک نہیں۔ اس لئے انہوں نے موسیٰ کے خود جاگنے کا انتظار کیا مگر جب وہ جاگے تو خادم ان کو اس وقعہ کی اطلاع دینا بھول گیا۔ ادھر مچھلی سمندر میں کودی اور پانی کے اندر اتر گئی۔ اللہ تعالیٰ کی قدرت سے پانی اس جگہ سے رک گیا اور پتھر کی طرح سے سخت ہو گیا۔ وہ مچھلی جس جگہ سے پانی میں اتری وہاں اس طرح سوراخ سا بن گیا جیسے پتھر میں سوراخ ہو جایا کرتا ہے۔ حدیث کے راوی ابن جریج کہتے ہیں کہ عمرو ابن دینار نے مجھے اپنے انگوٹھوں اور ان کے برابر کی انگلیوں سے سوراخ سا بنا کر اس کے متعلق بتلایا۔ موسیٰ نے اپنے خادم سے ناشتہ مانگتے ہوئے کہا تھا "ہم اپنے اس سفر سے آج بہت تھک گئے۔"

حالانکہ اس سے پہلے جتنا وہ سفر کر چکے تھے اس میں بالکل تھکن محسوس نہیں ہوئی (گویا یہ بھی اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہی ہوا کہ حضرت موسیٰ نے تھک کر آرام کیا اور ناشتہ مانگا جس پر خادم کو مچھلی کے گم ہونے کی بات یاد آئی) غرض اس کے بعد (جب حضرت موسیٰ کو مچھلی کے غائب ہونے کا حال معلوم ہوا تو) وہ فوراً اپنے خادم کے ساتھ وہاں سے واپس ہوئے اور اس جگہ پہنچ کر انہوں نے وہاں حضرت خضر کو دیکھا جو ایک سبز رنگ کا گدا بچھائے ہوئے اس پر لیٹے تھے انہوں نے ایک کپڑا اپنے اوپر اس طرح اوڑھ رکھا تھا کہ اس کا ایک سرا تو پاؤں کے نیچے دبا رکھا تھا اور دوسرا سر کے نیچے دبائے ہوئے تھے موسیٰ نے قریب پہنچ کر انکو سلام کیا۔ حضرت خضر نے اپنا منہ چادر میں سے نکال کر موسیٰ کو دیکھا اور کہا۔

''کیا اس سرزمین میں بھی کوئی ایسا شخص ہے جو (حق تعالیٰ کا یہ پسندیدہ) سلام کرتا ہو! آپ کون ہے۔''انہوں نے کہا۔''میں موسیٰ ہوں۔''حضرت خضر نے پوچھا۔''کیا اسرائیلیوں کے پیغمبر موسیٰ۔''انہوں نے کہا''ہاں''تب حضرت خضر نے پوچھا''کیا مقصد ہے۔''موسیٰؑ نے فرمایا''میں آپ کے پاس اس لئے آیا ہوں مجھے آپ وہ بھلائیاں اور علم سکھلائیں جو آپ کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے ملی ہیں۔حضرت خضر نے فرمایا''اے موسیٰ! کیا آپ کو یہ بات یعنی یہ علم کافی نہیں کہ آپ کے ہاتھ میں تورات ہے اور یہ کہ آپ کے پاس وحی آتی ہے! جہاں تک اس علم کا تعلق ہے جو میرے پاس ہے اس کا جاننا آپ کے لئے اچھا نہیں ہے اسی طرح آپ کے پاس جو علم ہے اس کا جاننا میرے لئے مناسب نہیں ہے۔''

اسی وقت (جب کہ یہ باتیں کر رہے تھے) ایک پرندہ آیا اور سمندر میں اپنی چونچ ڈال کر پانی پینے لگا حضرت خضر نے یہ منظر دیکھ کر فرمایا۔''خدا کی قسم میرا علم اور تمہارا علم اللہ تعالیٰ کے علم کے مقابلے میں اتنا ہی ہے جتنا پانی اس پرندے نے سمندر میں سے اپنی چونچ میں بھرا ہے۔''

پھر اس کے بعد جب (حضرت موسیٰؑ کو اپنے ساتھ لے کر چلنے پر تیار ہو گئے اور وہ دونوں وہاں سے چل پڑے تو) ایک کشتی میں جا کر سوار ہو گئے۔یہ کشتی والے لوگوں سے اجرت لے کر ان کو اس کنارے سے اس کنارے پہنچا دیا کرتے تھے۔انہوں نے حضرت خضرؑ کو پہچان لیا اور کہا کہ ہم ان سے اجرت نہیں لیں گے۔حضرت خضرؑ کشتی میں سوار ہوئے تو انہوں نے اس میں ایک سوراخ کر دیا۔موسیٰؑ یہ دیکھ کر پھر ایک دم بول اٹھے کہ آپ نے یہ کیا کیا۔آپ یہ چاہتے ہیں کہ اس کشتی کے لوگ غرق ہو جائیں۔حضرت خضرؑ نے ان کو یاد دلایا کہ میں نے آپ سے کہا نہیں تھا کہ آپ میرے ساتھ رہ کر صبر نہیں کر سکتے۔موسیٰؑ نے اس پر فوراً معذرت کی اور پھر حضرت خضرؑ کے ساتھ چل پڑے۔کچھ دور چل کر انہیں ایک لڑکا ملا جسے حضرت خضر نے قتل کر دیا۔یہاں کچھ لڑکے کھیل رہے تھے۔حضرت خضر نے ان میں کافر لڑکے کو پکڑا جو بہت ذہین اور سمجھ دار تھا۔پھر انہوں نے اس کو زمین پر ڈال کر چھری

سے ذبح کر دیا۔ موسیٰ یہ منظر دیکھ کر گھبرا گئے اور فوراً بول اٹھے کہ آپ نے بلا سبب ایک جان لے لی۔ حضرت ابن عباسؓ کی ایک قرأت کے مطابق یہ لڑکا مؤمن تھا۔ (حضرت خضر نے پھر حضرت موسیٰ کو ٹوکا اور انہوں نے پھر معذرت کر کے آئیندہ کچھ نہ پوچھنے کا وعدہ کیا۔ پھر وہاں سے آگے چلے تو ایک جگہ انہیں ایک دیوار نظر آئی جو جھک رہی تھی اور گرنے کے قریب تھی۔ حضرت خضر نے اس دیوار کو سیدھا کر دیا۔ موسیٰؑ پھر بول اٹھے کہ آپ چاہتے تو اس بستی کے لوگوں سے اس کام کی اجرت بھی لے سکتے تھے۔ (کیونکہ یہاں کے لوگوں نے ان دونوں مہمانوں کو کھانا کھلانے سے انکار کر دیا تھا) حوالہ البدایہ والنہایۃ۔ اس کے بعد کی تفصیل تفسیر خازن سے لی گئی ہے۔)

یعنی دیوار کی مرمت کرنے کی اجرت آپ بستی والوں سے لے سکتے تھے کیونکہ آپ کو معلوم ہے کہ ہم لوگ بھوکے ہیں اور بستی کے لوگوں نے کھانا کھلانے سے انکار کر دیا ہے اس لئے بہتر تھا کہ آپ اپنے اس کام کی اجرت لیتے۔ آخر حضرت خضرؑ نے اس دفعہ حضرت موسیٰؑ کے سوال کرنے پر صاف صاف کہہ دیا کہ بس اب میرے اور آپ کے درمیان یہاں سے جدائی ہے۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ انکار اجرت نہ لینے کے سلسلے میں تھا (لیکن ساتھ ہی حضرت خضرؑ نے کہا) 'میں آپ کو ان چیزوں کی حقیقت بتلائے دیتا ہوں جن پر آپ سے صبر نہ ہو سکا۔'' اس سلسلے میں یہ بھی کہا گیا ہے کہ (حضرت خضرؑ نے خود اسے ان باتوں کی حقیقت بتلانے کے متعلق نہیں کہا تھا بلکہ) یہ ہوا کہ پہلے موسیٰؑ نے حضرت خضرؑ کا دامن پکڑ لیا اور کہا۔ ''اس سے پہلے کہ آپ میرا ساتھ چھوڑ دیں مجھے ان سب کاموں کی حقیقت بتلائیے جو آپ نے کئے ہیں۔'' حضرت خضرؑ نے فرمایا ''جہاں تک اس کشتی کا تعلق ہے (جس میں میں نے سوراخ کر دیا تھا) وہ چند غریب آدمیوں کی تھی جو (اس کے ذریعہ) سے دریا میں محنت مزدوری کر کے پیٹ پالتے تھے۔''

ایک قول یہ ہے کہ یہ دس بھائی تھے جن میں سے پانچ دریا میں محنت مزدوری کرتے تھے اور اس کے ذریعہ روزی کماتے تھے۔ یہاں قرآن پاک میں فرمایا گیا ہے کہ یہ کشتی چند

مسکینوں کی تھی۔ اس کا مطلب ہے کہ مسکین شخص اگر کسی چیز کا مالک بھی ہو تب بھی اسکو مسکین ہی کہا جائے گا یعنی اگر اس کے پاس اتنا مال نہ ہو جس سے وہ اطمینان سے اپنی ضرورتیں پوری کر سکے تو اس کو مسکین ہی کہا جائے گا (چاہے وہ کسی ایک آدھ معمولی چیز کا مالک ہی کیوں نہ ہو) اس کے مقابلے میں فقر وہ ہوتا ہے جو بالکل خالی ہاتھ اور مفلس ہو۔ وہ مسکین سے زیادہ تنگ حال ہوتا ہے۔ مسکین کی تعریف یہ اس لئے بتلائی گئی کہ اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں کو مسکین فرمایا ہے حالانکہ وہ لوگ اس کشتی کے مالک تھے۔ غرض اس کے بعد حضرت خضر فرماتے ہیں۔

''میں نے اس کشتی میں عیب ڈالنے کا اس لئے ارادہ کیا کہ ان لوگوں کے پیچھے ایک ظالم بادشاہ تھا جو ہر کشتی کو زبردستی چھین لیا کرتا تھا۔ یعنی جو بھی اچھی کشتی ہوتی اسی کو وہ ظالم بادشاہ چھین لیا کرتا تھا۔ اس لئے میں نے اس میں سوراخ کر کے اسے عیب دار کر دیا تھا کہ وہ جابر بادشاہ اس کشتی کو نہ چھینے۔

اس بادشاہ کا نام جلندی ازدی تھا۔ یہ ایک کافر بادشاہ تھا۔ ایک قول یہ بھی ہے کہ اس کا نام ہدد ابن ہدد تھا۔ ایک روایت یہ بھی ہے کہ کشتی میں سوراخ کرنے کے بعد حضرت خضر نے کشتی والوں سے معذرت کی تھی اور ان کو اس ظالم بادشاہ کے متعلق بتلایا جو ہر اچھی کشتی چھین لیا کرتا تھا۔ یہ لوگ اس بات سے واقف نہیں تھے کہ آگے وہ بادشاہ موجود ہے جو اس طرح کشتیاں چھین لیتا ہے۔ چنانچہ حضرت خضرؑ نے ان سے فرمایا۔ ''میں چاہتا ہوں کہ جب بادشاہ کے پاس سے کشتی گزرے تو وہ اسکو عیب دار اور خراب سمجھ کر چھوڑ دے۔'' جب یہ کشتی وہاں سے صحیح سلامت گزر گئی تو ان لوگوں نے اس کو ٹھیک کر لیا اور اس سے برابر فائدہ اٹھاتے رہے۔

پھر حضرت خضر نے اس لڑکے کو قتل کرنے کا راز بتلاتے ہوئے کہا جہاں تک اس لڑکے کا تعلق ہے تو اس کے ماں باپ مؤمن تھے۔ اس لئے ہمیں خوف ہوا کہ اس لڑکے کی محبت ان کو کفر اور سرکشی میں ڈال دے۔ اس لئے ہم کو یہ منظور ہوا کہ اس کے بجائے ان کا

پروردگار ان کو ایسی اولاد دے جو پاکیزگی یعنی دین میں اس سے بہتر ہو۔" یعنی اس کے بدلے میں ماں باپ کو ایسی اولاد میسر آئے جو نیک اور باصلاحیت اور پارسا اور محبت کی مستحق ہو۔ چنانچہ ایک قول ہے کہ اس لڑکے کے قتل کے بعد اللہ تعالیٰ نے ان کو ایک بیٹی عطا فرمائی جس سے ایک پیغمبر نے نکاح کیا اور پھر خود اس کے پیٹ سے بھی ایک نبی پیدا ہوئے جن کے ہاتھ پر اللہ تعالیٰ نے ایک پوری امت کو ہدایت عطا فرمائی۔ ایک کمزور قول یہ بھی ہے کہ اس لڑکی کے پیٹ سے ستر نبی پیدا ہوئے۔ اسی طرح ایک قول یہ ہے کہ اس لڑکے کے بدلے میں اللہ تعالیٰ نے ان کو ایک اور لڑکا عطا فرمایا جو مسلمان تھا۔ ایک روایت ہے کہ یہ لڑکا جس کو قتل کیا گیا (اپنے ماں باپ کا بہت چہیتا تھا) جب پیدا ہوا تھا تو اس وقت ماں باپ نے بہت خوشیاں منائی تھیں اور جب قتل ہوا تو انہوں نے اس کا ماتم کیا۔ اگر وہ لڑکا زندہ رہ جاتا تو اس کے ذریعہ ان دونوں کی بربادی لازم تھی۔ لہٰذا بندے کو اللہ تعالیٰ کے فیصلوں پر ہمیشہ راضی رہنا چاہیے کیونکہ اللہ تعالیٰ کے فیصلے مومن کے لئے اگر بظاہر ناپسندیدہ بھی نظر آئیں تو حقیقت میں ہمیشہ خیر اور بھلائی سے بھرے ہوئے ہوتے ہیں۔ (پھر حضرت خضر نے اس بستی کی دیوار کو سیدھا کرنے کا راز بتلاتے ہوئے کہا)

"اور جہاں تک اس دیوار کا تعلق ہے تو وہ دو یتیم لڑکوں کی تھی جو اس شہر میں رہتے ہیں۔ اس کے نیچے ان کا کچھ مال دفن تھا (جو انہیں اپنے باپ سے میراث میں پہنچا ہے) ان کا باپ (جو مر چکا ہے) ایک نیک آدمی تھا اس لئے آپ کے پروردگار نے اپنی مہربانی سے چاہا کہ وہ دونوں اپنی جوانی کی عمر کو پہنچ جائیں اور اپنا مال نکال لیں۔ یہ سارے کام میں نے الہام الٰہی سے کئے ہیں۔ ان میں سے کوئی کام میں نے اپنی رائے سے نہیں کیا۔ بس یہ ہے ان سب باتوں کی حقیقت جن پر آپ کو صبر نہ ہو سکا۔"

کہا جاتا ہے کہ ان دونوں لڑکوں کے نام اصرم اور صریم تھے۔ جہاں تک اس خزانے کا تعلق ہے تو حضرت ابودرداء آنحضرت ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ وہ سونا چاندی تھی۔ ایک قول یہ ہے کہ وہ اصل میں علمی خزانہ تھا کچھ تحریریں تھیں جن میں علم تھا۔ (اس بارے میں

یہ تفصیل گزر چکی ہے کہ وہ سونے کی ایک تختی تھی جس پر ایک عبارت تحریر تھی جو بیان ہو چکی ہے) اور اس کے دوسری طرف یہ عبارت تحریر تھی۔ ”میں اللہ ہوں، میرے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں ہے، میں اکیلا ہوں، میرا کوئی شریک نہیں ہے۔ میں نے ہی بھلائی اور برائی کو پیدا کیا ہے پس اس کے لئے خوش خبری ہے جس کو میں نے خیر کے لئے پیدا کیا ہے اور اس خیر اور بھلائی کو اس کے ہاتھوں پر ظاہر کر دیا ہے۔ اور اس کے لئے افسوس ہے۔ سخت افسوس جس کو میں نے برائی کے لئے پیدا کیا اور اس برائی اور شر کو اس کے ہاتھوں ظاہر کر دیا۔“

ایک قول یہ ہے کہ خزانے کا لفظ جب مطلق یعنی بلا قید استعمال ہوتا ہے تو اس سے مراد مال ہی ہوتا اور اگر اس کے ساتھ کوئی قید بھی ہو جیسے کہا جائے کہ فلاں کے پاس علم کا خزانہ ہے تو پھر دولت کے سوا دوسری چیز مراد ہو سکتی ہے مگر اس تختی کو دونوں ہی طرح کا خزانہ کہا جا سکتا ہے (کیونکہ دولت کا خزانہ تو اس لئے تھی کہ یہ ایک روایت کے مطابق سونے کی تھی اور علم کا خزانہ اس لئے تھی کہ اس پر حکمت کی باتیں لکھی ہوئی تھیں)۔

جہاں تک ان دونوں لڑکوں کے باپ کا تعلق ہے کہا جاتا ہے کہ اس کا نام شح تھا اور وہ بڑے نیک اور پرہیز گار لوگوں میں سے تھا۔ حضرت عباسؓ اس آیت کی تفسیر میں کہتے ہیں کہ یہ خزانہ ان لڑکوں کے لئے ان کے باپ کی نیکی کی وجہ سے محفوظ رکھا گیا تھا۔ ایک قول ہے کہ ان لڑکوں اور ان کے باپ کے درمیان سات پشتوں کا فاصلہ تھا (یعنی وہ نیک شخص ان لڑکوں کا حقیقی باپ نہیں تھا بلکہ ساتویں پشت میں دادا تھا جس کو باپ کے لفظ سے تعبیر کیا گیا ہے۔ غرض باپ کی نیکی اور پرہیز گاری اس کی اولاد کے کام آتی ہے۔ جیسا کہ اس بارے میں ایک روایت گزر چکی ہے۔ اسی طرح حضرت سعید ابن مسیّب کہتے ہیں کہ نماز پڑھتے ہو ئے جب مجھے اپنے بیٹے کا خیال آجاتا ہے تو اپنی نماز اور زیادہ لمبی کر دیتا ہوں (تا کہ میری یہ عبادت میری اولاد کے بھی کام آئے)۔

غرض اللہ تعالیٰ نے یہ چاہا کہ جب لڑکے اپنی جوانی کی عمر کو پہنچیں تو ان کا خزانہ محفوظ ہو یعنی وہ بڑے ہو جائیں اور اپنے مال اور رزق کو سمجھنے لگیں۔ اس سے مراد یہ ہے کہ وہ بالغ ہو

جائیں۔ایک قول کے مطابق جوانی کی عمر اٹھارہ سال کی ہوتی ہے۔

یہاں ایک چیز قابل غور ہے قران پاک کی آیت میں ہے کہ وہ کشتی کچھ مسکین لوگوں کی تھی جو دریا میں محنت مزدوری کرتے تھے اس لئے میں نے چاہا کہ اسمیں عیب ڈال دوں۔ یہاں یہ کہا گیا ہے کہ "میں نے چاہا" پھر اسی آیت میں آگے فرمایا گیا ہے کہ اس لڑکے کے ماں باپ مومن تھے اور ڈر تھا کہ اس لڑکے کی محبت انہیں گمراہی اور سرکشی میں نہ ڈال دے اس لئے "ہم نے چاہا کہ" اس کے بجائے ان کو نیک اولاد میسر ہو۔تو یہاں "ہم نے چاہا" کہا گیا ہے۔اس کے بعد آگے جہاں اس دیوار کو سیدھا کرنے کی مصلحت بتلائی گئی ہے جس کے نیچے ایک خزانہ تھا وہاں کہا گیا ہے کہ "پس آپ کے رب نے چاہا" تینوں جگہ اس فرق کے متعلق سوال کیا جا سکتا ہے کہ ایسا کس لئے ہے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ پہلی بار جہاں "میں نے چاہا" کہا گیا ہے، وہاں کشتی میں عیب ڈالنے کا ذکر کیا گیا ہے اس لئے اس فعل کی نسبت حضرت خضر نے حق تعالیٰ کی طرف کرنے کے بجائے ادب کی وجہ سے اپنی ذات کی طرف کی ہے دوسری جگہ لڑکے کو قتل کرنے کے فعل کو بھی اپنی ذات کی طرف نسبت دی لیکن "میں" کے بجائے "ہم" کہا جس سے اپنی اونچی شان کا خاص طور پر اظہار کرنا مقصود ہے کہ وہ باطن اور حکمت کے علم میں ایک اونچے درجے کے عالم ہیں اور یہ کہ وہ اس قتل جیسے فعل کو کسی بڑی اور اہم حکمت کے بغیر ہرگز نہیں کر سکتے۔ پھر تیسری جگہ یتیم کے مال کا ذکر ہے کہ ان دونوں یتیموں کے باپ کی نیکی کی وجہ سے ان کے اس حق کی حفاظت کی گئی تو اس فعل کو اللہ تعالیٰ کی ذات کی طرف نسبت دی گئی کیونکہ باپ دادا کے نیک اعمال کی وجہ سے اولاد کی حفاظت اور ان کے حالات کو صحیح رکھنا سوائے اللہ تعالیٰ کے کسی کے بس میں نہیں ہے۔

آیت پاک میں ہے کہ حضرت خضرؑ نے موسیٰؑ کو تینوں کاموں کو حکمت بتلانے کے بعد کہا کہ میں نے یہ کام اپنی مرضی اور رائے سے نہیں کئے بلکہ ان کے متعلق مجھے اللہ تعالیٰ کی طرف سے حکم اور الہام ملا تھا۔ کیونکہ ظاہر ہے لوگوں کا مال خراب کر دینا یا خون بہا دینا یا

بلا اجازت کسی چیز کی حالت بدل دینا ایسے کام ہیں جو اللہ تعالیٰ کے حکم اور صاف نص کے بغیر نہیں کئے جا سکتے۔ چنانچہ آیت پاک کے اس حصے کی بنیاد پر بعض علماء نے کہا ہے کہ حضرت خضرؑ نبی تھے کیونکہ اس طرح حکم آنے کا مطلب وحی ہے اور وحی صرف نبیوں کے پاس ہی آتی ہے۔ مگر اس بارے میں صحیح قول یہ ہے کہ حضرت خضر صرف ایک ولی اللہ تھے نبی نہیں تھے۔ جہاں تک اس آیت سے حضرت خضر کی نبوت ثابت کرنے کا تعلق ہے اس کے جواب میں کہا جاتا ہے کہ یہ حکم وحی نہیں بلکہ الہام تھا جو ولی اللہ کے درجہ کے مطابق ہوتا ہے۔

ایک قول کے مطابق اس آیت کے معنی یہ ہیں کہ میں نے یہ کام اس غرض سے کئے ہیں کہ ان کے نتیجے میں اللہ تعالیٰ کی رحمت ظاہر ہو۔ اس تفسیر سے بھی ایک ہی معنی پیدا ہوتے ہیں یعنی کسی بڑے نقصان سے بچانے کے لئے کسی چھوٹے نقصان میں ڈالنا اور اسے برداشت کرنا۔ غرض اپنے کاموں کی یہ حکمت بتلانے کے بعد حضرت خضر نے موسیٰ سے کہا کہ یہ ہے ان کاموں کی حقیقت اور اصلیت جن پر آپ سے صبر نہ ہو سکا۔

روایت ہے کہ جب موسیٰ حضرت خضر سے جدا ہونے لگے تو حضرت خضر سے کہنے لگے۔ "مجھے کوئی نصیحت وصیت کیجئے" حضرت خضر نے فرمایا "علم اس لئے حاصل نہ کیجئے کہ اس کو لوگوں کو سنائیں بلکہ اس لئے حاصل کیجئے کہ اس پر عمل کریں۔" اس بارے میں علماء کا اختلاف ہے ہے آیا حضرت خضر آج تک زندہ ہیں یا وفات پا چکے ہیں۔ ایک قول ہے کہ وہ زندہ ہیں۔ اکثر علماء کا قول یہی ہے اور صوفیاء کے یہاں اسی قول پر سب کا اتفاق ہے۔ (یہ قول علامہ علاؤ الدین خازن نے نقل کیا ہے۔ اس کے خلاف جو دوسرے قول ہیں وہ مترجم دوسری کتابوں سے آگے پیش کر رہے ہیں) غرض حضرات مشائخ اور صوفیاء کے یہاں ان کو دیکھنے، ان سے ملنے اور نیک اور خیر کی جگہوں پر ان کے موجود ہونے کے متعلق بھی اتفاق ہے۔

شیخ عمرو ابن اصلاح نے لکھا ہے کہ حضرت خضرؑ، جمہور علماء اور صالحین کے نزدیک زندہ ہیں۔ ایک قول یہ ہے کہ حضرت خضرؑ اور حضرت الیاسؑ دونوں زندہ ہیں اور ہر سال حج

کے موسم میں مکے میں ایک دوسرے سے ملنے آتے ہیں۔ حضرت خضرؑ کے زندہ رہنے کا جو سبب بیان کیا جاتا ہے وہ یہ ہے کہ انہوں نے چشمہ حیات کا پانی پی لیا تھا (چشمہ حیات کو اردو میں اکثر آبِ حیات کہا جاتا ہے)

یہ اس وقت کی بات ہے جبکہ سکندر ذوالقرنین دنیا کو فتح کرنے کے بعد چشمہ حیات کی تلاش میں روانہ ہوئے اور وادیٔ ظلمت میں داخل ہوئے اس وقت حضرت خضر و ذوالقرنین کے ہراول میں موجود تھے اتفاق سے حضرت خضر چشمہ حیات تک پہنچ گئے انہوں نے اس میں غسل کیا اور اس کا پانی (جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اس چشمہ کا پانی پی لینے والا قیامت تک زندہ رہتا ہے) اس کے بعد انہوں نے اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرنے کے لئے نماز پڑھی۔ ادھر ذوالقرنین جو چشمہ حیات کی تلاش میں نکلے تھے اور حضرت خضر کے پیچھے پیچھے آرہے تھے راستہ بھول گئے (اور چشمہ حیات تک پہنچنے کی حسرت دل میں لئے واپس لوٹ گئے۔ ان علماء کے برخلاف کچھ حضرات کی رائے یہ ہے کہ حضرت خضر کی وفات ہوچکی ہے۔ ان علماء کی رائے اس آیت کی بنیاد پر ہوتی ہے۔ **وجعلنا لبشر من قبلک الخلد** (سورہ انبیاء ع ۳) ترجمہ: اور ہم نے آپ سے پہلے کسی بشر کے لئے ہمیشہ رہنا تجویز نہیں کیا۔

ایک حدیث میں ہے کہ ایک رات رسول اللہ ﷺ نے عشاء کی نماز پڑھنے کے بعد صحابہ سے فرمایا۔ "تم آج کی یہ رات دیکھ رہے ہو۔ آج سے چودہ سو سال کے بعد اس زمین کی پشت پر ان میں سے کوئی باقی نہ رہے گا جو آج موجود ہیں۔" تو حضرت خضر اس وقت زندہ تھے تو اس سو سال کے اندر وہ بھی گزر چکے ہیں (جن کے متعلق آنحضرت ﷺ نے یہ ارشاد فرمایا ہے) (تفسیر خازن ۴۸/۲۴۵ جلد سوم)

حضرت خضرؑ سے متعلق تاریخ البدایہ والنہایہ میں تفصیل سے بحث کی گئی ہے۔ جس کا کچھ حصہ احقر یہاں پیش کر رہا ہے۔

ان ہی آیات میں حق تعالیٰ نے حضرت خضر کا یہ قول نقل فرمایا ہے کہ رحمتہ من

ربک وما فعلته عن امری (پ۱۶ سورہ کہف ع۹) ترجمہ: اور سارے کام میں نے الہام الٰہی سے کئے ہیں ان میں سے کوئی کام میں نے اپنی رائے سے نہیں کیا۔

(یہاں الہام کے بجائے بعض علماء نے وحی مراد لی ہے) لہذا یہ بات اس کی دلیل بنتی ہے کہ وہ نبی تھے اور یہ کہ انہوں نے کوئی کام اپنی رائے اور مرضی سے نہیں کیا بلکہ اللہ تعالیٰ کے حکم یعنی وحی سے کیا ہے لہٰذا وہ نبی تھے۔ ایک قول یہ ہے کہ وہ رسول تھے۔ ایک قول یہ ہے کہ وہ ولی تھے۔ اس سے بھی زیادہ ایک عجیب قول یہ ہے کہ وہ فرشتے تھے۔ اور میرے خیال میں اس سے بھی کہیں زیادہ عجیب قول یہ ہے کہ حضرت خضر فرعون کے بیٹے تھے۔ ایسے ہی ایک قول یہ ہے کہ وہ ضحاک بادشاہ کے بیٹے تھے جس نے ایک ہزار سال تک دنیا پر حکومت کی (اب گویا نبی، رسول، ولی اور فرشتہ ہونے کے علاوہ ایسے قول بھی موجود ہیں جن کے مطابق حضرت خضر شہزادے تھے)۔

علامہ ابن جریر کہتے ہیں عام طور پر اہل کتاب کی رائے یہ ہے کہ حضرت خضر فارس کے بادشاہ افریدوں کے زمانے میں تھے۔ کہا جاتا ہے کہ وہ اس ذوالقرنین کے ہراول میں موجود تھے جس کے متعلق مشہور ہے کہ وہ ہی افریدوں اور ذوالقرس تھا جو حضرت ابراہیم خلیلؑ کے زمانے میں تھے۔ کچھ علماء کا قول ہے کہ حضرت خضر نے چشمہ حیات کا پانی پی لیا تھا اس لئے وہ ہمیشہ زندہ ہیں اور اب تک موجود ہیں۔ ایک قول ہے کہ ان لوگوں میں سے کسی کی اولاد ہیں جو حضرت ابراہیمؑ پر ایمان لائے تھے اور بابل کے علاقے سے ابراہیمؑ کے ساتھ ہجرت کر کے آئے تھے۔ ایک قول ہے کہ ان کا نام مالکان تھا۔ ایک قول کے مطابق ارمیا ابن خلقیا تھا۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ وہ سباسب ابن ہراہب کے زمانے میں نبی تھے۔

(البدایہ والنہایہ جلد اول)

امام بن قتیبہ نے معارف میں لکھا ہے کہ ان کا نام ملیا ابن ملکا تھا اور نوح کی اولاد میں سے تھے۔ ان کی کنیت ابوالعباس اور لقب خضر تھا۔ ابن صلاح نے تو یہاں تک لکھا ہے کہ وہ آج تک زندہ ہیں اور قیامت تک زندہ رہیں گے۔ اگر چہ کچھ حدیثیں ایسی ہیں جن

سے حضرت خضرؑ کے زندہ ہونے کے متعلق معلوم ہوتا ہے مگر وہ سب حدیثیں کمزور ہیں ان میں سے کوئی صحیح حدیث نہیں ہے۔ بہر حال اکثر محدثین حیات خضر کے قائل نہیں ہیں۔ اس کی ایک دلیل تو وہی قرآن پاک کی آیت ہے جو پچھلے صفحوں میں گزری ہے کہ ہم نے آپ سے پہلے کسی کو ہمیشگی کی زندگی نہیں دی۔ اس کے علاوہ ایک دلیل اور بھی ہے۔ حدیث میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے غزوہ بدر میں فتح کی دعا مانگتے ہوئے حق تعالیٰ سے عرض کیا تھا۔ ''اے اللہ! اگر میری جماعت ہلاک ہوگئی تو پھر زمین پر کوئی شخص تیری عبادت کرنے والا نہ رہے گا۔

(چنانچہ اگر حضرت خضر جو ایک ولی تھے زندہ ہوتے تو آنحضرت ﷺ کا یہ ارشاد کیسے صحیح ہوتا) اس کے علاوہ حضرت خضر کے زندہ نہ ہونے کی ایک دلیل یہ بھی ہے کہ اگر وہ زندہ ہوتے تو رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر یقیناً اسلام قبول کرتے اور آپ کے صحابہ میں سے کہلاتے۔ اس لئے کہ رسول اللہ ﷺ سارے عالم اور تمام انسانوں اور جنات کی طرف رسول بنا کر بھیجے گئے تھے۔ چنانچہ آپ ﷺ کا ارشاد ہے کہ ''اگر آج موسیٰ اور عیسیٰ زندہ ہوتے تو ان کے پاس بھی میری اطاعت اور مجھ پر ایمان لانے کے سوا کوئی چارہ نہ ہوتا۔

(تفسیر ابن کثیر پ ۱۶ سورہ کہف)

چنانچہ اس کی دلیل میں قرآن پاک کی یہ آیت ہے وہ وَاِذْ اَخَذَ اللّٰہُ مِیثَاقَ النَّبِیّٖنَ لَمَا اٰتَیْتُکُم مِّن کِتَابٍ وَّحِکْمَۃٍ ثُمَّ جَآءَ کُمْ رَسُوْلٌ مُّصَدِّقٌ لِّمَا مَعَکُمْ لَتُؤْمِنُنَّ بِہٖ وَلَتَنْصُرُنَّہٗ قَالَ ءَ اَقْرَرْتُم ۔ (یہ پ ۳۸۱ سورہ آل عمران ع ۹)

ترجمہ: ''اور جب کہ اللہ تعالیٰ نے ہر نبی سے یہ عہد لیا تھا کہ ان کے بعد جو نبی آئے (اگر وہ اس وقت تک زندہ رہے) تو اس کے بعد والے پر ایمان لائے اور اس کی مدد کرے۔ لہذا اس کی روشنی میں معلوم ہو جاتا ہے کہ اگر حضرت خضر رسول اللہ ﷺ کے زمانے میں زندہ ہوتے تو ان کے پاس بھی اس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا کہ وہ آنحضرت ﷺ کا اتباع کرتے، آپ کے ساتھ شریک ہوتے اور آپ کے مددگار بنتے، اسی طرح غزوہ بدر کے

وقت وہ بھی آنحضرت ﷺ کے جھنڈے تلے موجود ہوتے جیسا کہ حضرت جبرئیل اور دوسرے بڑے بڑے فرشتے تک موجود تھے۔ (البدایہ والنہایہ جلد اول)

لفظ خضر اصل میں خُضر سے بنا ہے جس کے معنی ہیں سبزی یا سبز رنگ کے، حضرت خضر کو خضر اس لئے کہا گیا ہے کہ وہ ایک دفعہ سوکھی اور سفید گھاس پر یا خشک زمین پر بیٹھ گئے تھے اور ان کی برکت سے وہ گھاس فوراً ہری بھری ہوگئی وہ وہ جگہ سبزہ زار ہو کر لہلہانے لگی۔

(تفسیر ابن کثیر پ سورہ کہف)

یہاں تک حضرت خضرؑ سے متعلق تشریح مکمل ہوئی، اب اس کے بعد اصل موضوع شروع کیا جاتا ہے۔

آدمیوں اور جانوروں کے جسموں پر آنحضرت ﷺ کے نام اور کلمہ کے نقش

اصل بیان آنحضرت ﷺ کے نام نامی کے پتھروں اور درختوں اور مختلف چیزوں و غیرہ پر لکھا ہوا پایا جانے کا چل رہا ہے چنانچہ اسی سلسلے میں حضرت جابرؓ سے روایت ہے کہ حضرت آدمؑ کے دونوں مونڈھوں کے درمیان یہ کلمہ لکھا ہوا تھا۔ **محمد رسول اللہ خاتم النبین** محمد ﷺ اللہ تعالیٰ کے رسول اور آخری پیغمبر ہیں۔

نومولود بچے کے مونڈھوں پر کلمہ کا نقش

اسی طرح ایک بزرگ نے اپنا واقعہ نقل کیا ہے کہ انہوں نے خراسان کے علاقے میں ایک نومولود بچے کو دیکھا جس کے مونڈھے پر **لا الہ الا اللہ** اور دوسرے پر **محمد رسول اللہ** لکھا ہوا تھا۔ ایک بزرگ روایت کرتے ہیں کہ ۴۷۶ھ میں میرے بکری کا ایک بچہ پیدا ہوا جس کی پیشانی پر ایک بالکل گول سفید دائرہ تھا اور اس میں بہت خوبصورت اور صاف خط میں محمد ﷺ لکھا ہوا تھا۔ ایسے ہی ایک روایت میں ہے کہ میں نے افریقہ کے ملک مغرب یعنی مراکش میں ایک بچہ دیکھا جس کی دائیں آنکھ کے سفید ڈھیلے میں نیچے کی طرف سرخ پانی سے بہت باریک خط میں محمد رسول اللہ ﷺ لکھا ہوا تھا۔

علامہ شیخ عبدالواہاب شعرانیؒ نے اپنی کتاب میں لکھا ہے کہ جس روز میں اس کتاب کا یہ حصہ لکھ رہا تھا اس روز میں نے نبوت کی ایک نشانی دیکھی وہ یہ کہ ایک شخص میرے پاس ایک بکرے کے بچے کا سر لایا یہ بکری اس نے ذبح کی تھی اور اس کو پکا کر کھا بھی چکا تھا اس نے مجھے دکھایا کہ اس سر میں قدرتی تحریر سے پیشانی پر بہت صاف صاف یہ لکھا ہوا تھا۔ ''**لاالہ الااللہ محمد رسول اللہ** ﷺ اللہ نے اپنے رسول کو ہدایت اور سچا دین دے کر بھیجا ہے جس کے ذریعہ وہ جسے چاہے ہدایت دیتا ہے۔'' پھر علامہ شعرانی نے لکھا ہے کہ آنحضرت ﷺ کا نام بار بار لکھنے میں حکمتیں چھپی ہیں ورنہ ظاہر کے کے نعوذ باللہ اللہ تعالیٰ بھولتا نہیں۔ یہاں تک علامہ کا کلام ہے۔ اس بارے میں کہا جاتا ہے کہ شاید اس ہدایت کے بلند اور اونچے مقام کی وجہ سے یہ تاکید کی گئی ہے۔

ایک افتادہ پتھر پر تحریر

علامہ زہری سے روایت ہے کہ ایک روز میں ہشام بن عبدالملک کے پاس جا رہا تھا۔ جب میں بلقار کے مقام پر پہنچا تو مجھے وہاں ایک پتھر ملا جس پر عبرانی زبان میں کچھ لکھا ہوا تھا۔ میں اس پتھر کو لے کر ایک شیخ کے پاس پہنچا جو عبرانی زبان جانتے تھے اور وہ اسے پڑھ کر ہنسے اور بولے کہ یہ عجب معاملہ ہے اس پر یہ لکھا ہے کہ اے اللہ تیرے نام سے شروع کرتا ہوں صاف عربی زبان میں تیرے رب کی طرف سے حق اور سچائی کا پیغام آ گیا۔ **لاالہ الااللہ محمد رسول اللہ**. اس کو حضرت موسیٰ بن عمران نے لکھا ہے۔

(بحوالہ تغیر وتبدل کے ساتھ جستہ جستہ از سیرت حلبیہ، جلد اول نصف آخر)

یَا رَبِّ صَلِّ وَسَلِّمْ دَائِمًا اَبَدًا　　　عَلٰی حَبِیْبِکَ خَیْرِ الْخَلْقِ کُلِّھِم

❁❁❁

خصوصیت نمبر ٦٨

رسولِ اکرم ﷺ کا نام عرش پر اللہ تعالیٰ کے نام کے ساتھ لکھا ہوا ہے

قابلِ احترام قارئین! رسولِ اکرم ﷺ کی امتیازی خصوصیات میں سے یہ اڑسٹھ نمبر خصوصیت پیش کی جا رہی ہے، جس کا عنوان ہے ''رسولِ اکرم ﷺ کا نام عرش پر اللہ تعالیٰ کے نام کے ساتھ لکھا ہوا ہے'' الحمد للہ اس خصوصیت کو ترتیب دینے کے لئے بھی اللہ تعالیٰ نے روضہ رسول ﷺ کے قریب ریاض الجنۃ میں بیٹھنے کی توفیق دی، بے شک یہ اللہ ہی کا فضل ہے اس پر میں اپنے اللہ کا صد بار شکر ادا کرتا ہوں کہ جس ذات نے ریاض الجنۃ میں بٹھا کر اپنے محبوب ﷺ کی خصوصیت سے متعلق کام کرنے کی توفیق عطا فرمائی اور مزید اسی اللہ تعالیٰ کی ذات سے قوی امید ہے کہ وہ میری اس ٹوٹی پھوٹی کاوش کو مقبول و منظور بھی فرمائے گا انشاء اللہ۔

بہر حال محترم قارئین! ہمارے حضور ﷺ کی منجملہ خصوصیات میں سے یہ بھی ایک عظیم خصوصیت ہے کہ ہمارے نبی ﷺ کا نام اللہ تعالیٰ کے نام کے ساتھ عرش پر لکھا ہوا ہے، جبکہ دیگر انبیاء کرام سے متعلق کہیں ایسی خصوصیت نظر نہیں آتی یقیناً یہ آپ ﷺ سے اللہ تعالیٰ کی خاص محبت کی علامت ہے جیسا کہ آنے والے اوراق میں آپ ملاحظہ فرمائیں گے کہ کس طرح عرش پر آپ ﷺ کا نام لکھا ہے اور کہاں سے یہ بات ثابت ہے، امید ہے کہ انشاء اللہ اس خصوصیت کا مطالعہ بھی ہمارے ایمان میں اضافے کا باعث اور رسول اللہ سے سچی محبت کا سبب بنے گا، اور اس میں کوئی شک نہیں کہ ہم سب کی کامیابی و کامرانی صرف اور صرف اپنے نبی ﷺ کی محبت اور آپ ﷺ کی تعلیمات پر عمل کرنے کے اندر ہے۔ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہم سب کو اپنے پیارے نبی ﷺ کی صحیح صحیح قدر جاننے اور آپ ﷺ سے سچی محبت کرنے کی توفیق عطا فرمائے، آمین یارب العالمین۔

لیجئے اب آنے والے اوراق میں اس خصوصیت کی تفصیل ملاحظہ فرمایئے:۔

اڑسٹھ نمبر خصوصیت کی وضاحت قرآن واحادیث کی روشنی میں

علامہ سیوطیؒ نے اپنی کتاب خصائص کبریٰ میں لکھا ہے کہ۔"یہ بات آنحضرت ﷺ کی خصوصیات میں سے ہے کہ عرش پر اللہ تعالیٰ کے نام پاک کے ساتھ آپ ﷺ کا نام نامی بھی لکھا ہوا ہے۔" اسی کتاب میں یہ بھی ہے کہ حق تعالیٰ نے فرمایا: میں نے عرش کو پانی کے اوپر پیدا کیا تو اس کی ہیبت سے پانی لرزنے لگا تب میں نے عرش پر لا الہ الا اللہ محمد الرسول اللہ لکھ دیا جس کی برکت سے عرش ساکن ہو گیا۔

اسی طرح اسی کتاب میں یہ بھی ہے کہ تمام ملکوت یعنی آسمانوں اور جنتوں اور ان میں جو کچھ ہے ان سب پر آنحضرت ﷺ کا نام نامی لکھا ہوا ہے۔ علامہ سیوطیؒ کی ہی دوسری کتاب خصائص صغریٰ میں ہے کہ آنحضرت ﷺ کی خصوصیات میں سے یہ بھی ہے کہ عرش پر، ہر آسمان پر، تمام جنتوں پر، اور ان میں موجود چیزوں پر اور تمام ملکوت میں جو کچھ بھی ہے ان سب پر آنحضرت ﷺ کا نام نامی لکھا ہوا ہے۔

مولف سیرت حلبیہ کہتے ہیں: یہاں ایک شبہ پیدا ہوتا ہے، جس کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ ایک روایت پچھلے صفحوں میں گزری ہے کہ جب آدمؑ زمین پر اترے تو تنہائی کی وجہ سے بہت پریشان اور وحشت زدہ ہوئے۔ آخر جبرئیلؑ نازل ہوئے اور انہوں نے زور سے اذان دی جس میں دو مرتبہ اللہ اکبر اللہ اکبر کہا، دو مرتبہ اشہد ان لا الہ الا اللہ کہا اور دو مرتبہ اشہد ان محمد الرسول اللہ۔ آنحضرت ﷺ کا نام سن کر آدمؑ نے حضرت جبرئیل سے پوچھا۔"محمد کون ہیں؟" جبرئیل نے کہا "وہ آپ کی اولاد میں سے سب سے آخری نبی ہوں گے۔"

اب اس روایت سے یہ شبہ ہوتا ہے کہ اگر عرش اور جنتوں اور آسمانوں میں ہر جگہ اور ہر ہر چیز پر آنحضرت ﷺ کا نام لکھا ہوا موجود ہے تو آدمؑ نے جنت میں رہتے ہوئے اس نام کو ضرور دیکھا ہوگا اور آپ ﷺ کو جانتے ہوں گے۔ یا ایسے ہی ایک روایت میں آتا ہے کہ

آدمؑ نے فرمایا کہ جب مجھ میں روح ڈالی جا رہی تھی تو روح کے ٹانگوں تک پہنچنے سے پہلے ہی میں اٹھ کر بیٹھ گیا اور عرش پر میری نظر پڑی تو وہاں آنحضرت ﷺ کا نام لکھا ہوا دیکھا۔ تو ان سب روایتوں میں معلوم ہوتا ہے کہ آدمؑ آنحضرت ﷺ کو جانتے تھے لہٰذا اس روایت میں انکا آنحضرت ﷺ کے متعلق پوچھنا شبہ کا باعث بنتا ہے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ اس روایت کو درست ماننے کی صورت میں کہا جاتا ہے کہ ممکن ہے اس سوال کے ذریعہ آدمؑ یہ اطمینان کرنا چاہتے ہوں کہ آیا یہ محمد ﷺ کوئی اور ہیں یا وہی جن کا نام انہوں نے آسمانوں میں لکھا ہوا دیکھا تھا اور جن کے بارے میں ان کو بتلایا گیا تھا کہ ان کی اولاد میں وہ آخری نبی ہوں گے اور یہ کہ اگر وہ یعنی آنحضرت ﷺ نہ ہوتے تو خود آدمؑ کو بھی پیدا نہ کیا جاتا اور جن کے نام سے آدمؑ نے اپنی دعا میں سفارش کی تھی، بہرحال یہ اختلاف قابلِ غور ہے۔ (بحوالہ چیدہ چیدہ از سیرتِ حلبیہ جلدِ اوّل)

يَا رَبِّ صَلِّ وَسَلِّمْ دَائِمًا اَبَدًا عَلٰى حَبِيْبِكَ خَيْرِ الْخَلْقِ كُلِّهِمِ

خصوصیت نمبر ٦٩

رسولِ اکرم ﷺ کے ظہور سے متعلق وحشی جانوروں کے منہ سے بھی صدائیں بلند ہوئیں

قابل احترام قارئین! رسولِ اکرم ﷺ کی امتیازی خصوصیات میں سے یہ انتہر ویں خصوصیت پیش کی جارہی ہے، جس کا عنوان ہے ''رسولِ اکرم ﷺ کے ظہور سے متعلق وحشی جانوروں کے منہ سے بھی صدائیں بلند ہوئیں'' الحمدللہ اس خصوصیت کو ترتیب دینے کے لئے بھی اللہ تعالیٰ نے روضہ رسول ﷺ کے قریب ریاض الجنۃ میں بیٹھنے کی توفیق دی، اس پر میں اپنے اللہ کا صد بار شکر ادا کرتا ہوں۔

بہر حال محترم قارئین! آپ ﷺ کی یہ عظمت اور بلند شان ہے کہ آپ ﷺ کے ظہور کو اللہ تعالیٰ نے دنیا میں اس طرح متعارف کروایا کہ دنیا کے ہر ہر کونے سے آپ ﷺ کے ظہور سے متعلق خوشخبریاں سنائیں۔ جیسا کہ ذیل کی خصوصیت میں بھی آرہا ہے کہ آپ ﷺ کے ظہور سے متعلق وحشی جانوروں کے منہ سے بھی صدائیں بلند ہوئیں، جیسا کہ آنے والے اوراق میں احادیث کی روشنی میں آپ اس کی تفصیل کو ملاحظہ فرمائیں گے انشاء اللہ، دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہم سب کو اپنے پیارے نبی ﷺ کی صحیح صحیح قدردانی کرنے کی توفیق عطا فرمائے آمین یارب العٰلمین۔ لیجئے اب اس خصوصیت کی وضاحت ملاحظہ فرمایئے۔

انتر نمبر خصوصیت کی وضاحت احادیث کی روشنی میں

آپ کے ظہور کے متعلق بعض وحشی جانوروں نے بھی کلام کیا ہے۔ ایسے واقعات میں سے ایک یہ ہے جس کو حضرت ابوسعید خدریؓ نے بیان کیا ہے کہ ایک مرتبہ جزیرہ عرب

میں ایک چرواہا اپنی بکریاں چرا رہا تھا کہ اچانک وہاں ایک بھیڑیا (بجائے چرواہے پر حملہ کرنے یا بھاگ جانے کے) اسی وقت اپنی پچھلی ٹانگوں پر بیٹھ گیا اور کہنے لگا۔

"کیا تو خدا سے نہیں ڈرتا جو تو میرے اور اس رزق کے درمیان حائل ہو گیا جو اللہ تعالیٰ نے مجھے عطا فرمایا تھا؟" یہ سن کر وہ چرواہا (سخت حیران ہوا اور) کہنے لگا۔ "مجھے تو یہ حیرت ہے کہ ایک بھیڑیا مجھ سے انسانوں کی طرح بات کر رہا ہے۔" اس پر اس بھیڑیئے نے کہا۔ کیا میں تجھے اس سے بھی زیادہ حیرت ناک اور عمدہ بات بتلاؤں۔ کہ رسول اللہ ﷺ جو حرہ کے دونوں مقامات کے درمیان میں ہیں۔ اور ایک روایت میں ہے کہ جو یثرب میں ہیں لوگوں کو گزشتہ واقعات کی خبریں دے رہے ہیں۔ ایک روایت کے لفظ یوں ہیں کہ پچھلی باتیں بتلاتے ہیں اور اسی طرح وہ باتیں بھی جو تمہارے بعد یعنی آئندہ زمانے میں پیش آنے والی ہیں۔

آنحضرت ﷺ کے متعلق یہ باتیں چرواہے کے دل میں گھر کر گئیں اور وہ تحقیق اور تصدیق کے لئے بکریاں گھر پہنچا کر مدینہ منورہ پہنچا اگلے دن جب وہ آنحضرت ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا تو اس نے بھیڑیئے کی بات آپ سے بیان کی۔ آپ ﷺ نے یہ سن کر فرمایا۔

"چرواہا سچ کہتا ہے۔ بیشک قیامت کی نشانیوں میں سے ایک بات یہ بھی ہے کہ وحشی درندے انسانوں سے کلام کریں گے قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ میں محمد کی جان ہے کہ قیامت اس وقت تک ہرگز قائم نہیں ہوگی جب تک انسان سے اس کے جوتے کے تسمہ تک بھی بات نہیں کرے گا۔ (تسمہ سے مراد وہ فیتہ ہے جو جوتے کے اوپر ہوتا ہے اور اسی طرح اس کے چابک کی گانٹھ اور ایک قول کے مطابق تسمہ کے ایک حصہ کو کہتے ہیں) اور اس کو بتلا نہیں دے گا کہ اس کے گھر والے کیا کر رہے ہیں۔

ایک اور روایت میں ہے کہ اس چرواہے کی بات سننے کے بعد آنحضرت ﷺ نے حکم دیا کہ سب لوگوں کو مسجد میں جمع ہونے کی ہدایت کی جائے (جب سب لوگ آ گئے تو) آپ

حجرہ مبارک سے باہر تشریف لائے اور چرواہے کو حکم دیا کہ لوگوں کو اپنا واقعہ سناؤ۔ چنانچہ اس نے یہ واقعہ کہہ سنایا۔

ایک اور روایت یہ ہے کہ یہ چرواہا ایک یہودی تھا۔ ایک روایت میں یہ ہے کہ بھیڑیئے نے چرواہے سے یہ کہا تھا۔ ''مگر تو تو مجھ سے بھی زیادہ عجیب ہے کہ یہاں اپنی بکریاں لئے کھڑا ہوا ہے اور اس عظیم نبی کی طرف توجہ نہیں دی جس سے بڑی شان کا نبی آج تک ظاہر نہیں ہوا تھا۔ جن کے لئے جنت کے دروازے کھول دیئے گئے ہیں اور جنت کے لوگ ان کے صحابہ کو جنگیں کرتے ہوئے شوق سے دیکھتے ہیں۔ حالانکہ تیرے اور اس نبی کے درمیان صرف اس گھاٹی کا فاصلہ ہے۔ اس لئے جا اور اللہ تعالیٰ کے لشکر میں شامل ہو جا۔'' یہ سن کر چرواہے نے کہا۔ ''پھر میری بکریوں کی رکھوالی کون کرے گا؟'' بھیڑیئے نے کہا۔ ''جب تک تو واپس آئے میں ان کی رکھوالی کروں گا۔'' چرواہے نے اسی وقت بکریاں بھیڑیئے کے سپرد کیں اور خود آنحضرت ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر مسلمان ہو گیا۔ پھر آنحضرت ﷺ نے اس سے فرمایا۔ ''اپنی بکریوں کے پاس جاؤ تم ان کو اتنی ہی پاؤ گے جتنی چھوڑ کر آئے تھے یعنی بھیڑیئے نے ان میں سے ایک کو بھی نہیں کھایا ہو گا۔''

چنانچہ چرواہا وہاں واپس پہنچا تو اس نے بکریوں کو جوں کا توں پایا (بھیڑیا بھی وہاں پر موجود تھا) پھر اس نے ایک بکری بھیڑیئے کے لئے کاٹی۔

آپؐ کے ظہور سے متعلق ذبح شدہ جانوروں کے پیٹ سے بھی صدائیں بلند ہوئیں

رسول اللہ ﷺ کے ظہور کے وقت ایسے واقعات بھی پیش آئے ہیں کہ ذبح کئے ہوئے جانوروں کے پیٹ سے آپ ﷺ کے متعلق آوازیں بلند ہوئیں اور لوگوں نے انہیں سنا (یہ بات واضح رہے کہ جب کسی نبی کے ظہور کا وقت آتا ہے تو اس سے پہلے اللہ تعالیٰ دنیا میں عجیب اور غیر معمولی واقعات فرماتا ہے جو اس بات کی علامت ہوتے ہیں کہ دنیا میں کوئی نیا اور غیر معمولی واقعہ ہونے والا ہے۔ ایسے عجیب اور غیر معمولی واقعات کو شریعت کی اصطلاح میں ارہاصات کہا جاتا ہے۔

ان میں سے ایک واقعہ یہ ہے جسے حضرت عمر فاروقؓ نے بیان کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ ایک روز ہم قبیلہ قریش کے ایک محلے میں بیٹھے ہوئے تھے۔ یہاں رہنے والے خاندان کو آل ذریح کہا جاتا تھا۔ ان لوگوں نے ایک بچھڑا ذبح کیا ہوا تھا اور قصائی اس کا گوشت بنا رہا تھا کہ اچانک اس بچھڑے کے پیٹ میں سے ہمیں ایک آواز سنائی دی۔ حالانکہ بولنے والے کا کہیں پتا نہ تھا وہ آواز یہ کہہ رہی تھی۔

''اے آل ذریح! ایک زبرست واقعہ پیش آ رہا ہے۔ پکارنے والا پکار رہا ہے اور بہت فصیح انداز میں گواہی دے رہا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی معبود اور عبادت کے لائق نہیں ہے۔''

خود ذریح کے معنی سرخ کے ہیں لہذا ذریح سے مراد ذبح کیا ہوا بچھڑا ہے کیونکہ وہ خون میں لتھڑا ہوا ہوتا ہے چنانچہ عربی میں گہرے سرخ رنگ کو احمر ذریحی کہا جاتا ہے۔

بخاری شریف میں اس روایت کے الفاظ اس طرح ہیں۔

اے جلیح! ایک بڑا واقعہ پیش آ رہا ہے۔ پکارنے والا پکار رہا ہے اور ایک فصیح وشائستہ آدمی گواہی دے رہا ہے اور کہہ رہا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں ہے۔''

یہاں جلیح سے مراد بھی ذبح کیا ہوا بچھڑا ہے کیونکہ جلیح کھلی ہوئی چیز کو کہتے ہیں اور ذبح کیے ہوئے بچھڑے کی کھال اتار کر اس کا گوشت پوست بھی کھول دیا جاتا۔

(بحوالہ سیرت حلبیہ ج ا)

یَا رَبِّ صَلِّ وَسَلِّمْ دَائِمًا اَبَدًا عَلٰی حَبِیْبِکَ خَیْرِ الْخَلْقِ کُلِّھِمِ

خصوصیت نمبر ۷۰

رسولِ اکرم ﷺ کی امت میں اللہ تعالیٰ نے اونچے درجے کے علماء پیدا فرمائے

قابل احترام قارئین! رسولِ اکرم ﷺ کی امتیازی خصوصیات میں سے یہ ستر نمبر خصوصیت ہے، جسکا عنوان ہے "رسولِ اکرم ﷺ کی امت میں اللہ تعالیٰ نے اونچے درجے کے علماء پیدا فرمائے" بیشک ذیل میں آنے والی خصوصیت بھی ایک عظیم خصوصیت ہے کہ رسول اکرم ﷺ کی امت میں اللہ تعالیٰ نے عظیم اور اونچے درجے کے علماء پیدا فرمائے، جیسا کہ انشاء اللہ آنے والے اوراق میں آپ اس خصوصیت کی وضاحت ملاحظہ فرمائیں گے، آنے والے اوراق میں بطور نمونہ کے ہم نے آپ ﷺ کی امت میں سے دس علماء کرام کی سیرت کو مرتب کیا ہے، ان حضرات کی سیرت کے مطالعہ کے بعد اندازہ ہوجائے گا کہ اللہ نے آپ ﷺ کی امت میں کیسے کیسے عظیم علماء پیدا فرمائے، واضح رہے کہ آپ ﷺ کو صحابہ کی جو عظیم جماعت ملی وہ بھی آپ ﷺ کی عظیم خصوصیت ہے، اسکی تفصیل انشاء اللہ اگلی جلد میں آپ ملاحظہ فرمائیں گے۔ دیگر جس قدر امتیں گزری ہیں کسی نبی کی امت میں ایسے ایسے عظیم علماء نہیں ملتے تو معلوم ہوا کہ یہ خاصہ صرف اور صرف محمد رسول اللہ ﷺ کا ہے، چنانچہ ہمیں بھی چاہیئے کہ رسول اکرم ﷺ کی امت میں پیدا ہونے پر اپنے اللہ کا خوب خوب شکر ادا کریں، اور اپنے پیارے نبی ﷺ سے سچی محبت کے ساتھ ان کی مکمل اتباع کریں۔ بے شک اسی میں ہماری کامیابی ہے، اللہ تعالیٰ ہم سب کو سچا امتی بننے کی توفیق عطا فرمائے آمین یارب العٰلمین۔

سترنمبر خصوصیت کی وضاحت

منجملہ آپ ﷺ کی خصوصیات میں سے اس امت کے علماء وصلحاء آپ کی نبوت و رسالت کی عظیم خصوصیت ہیں، کہ حق جل شانہ نے آپ کی امت کو خیر الامم بنایا اور انبیاء کرامؑ کا وارث بنایا، اور ایسا بے مثال حافظہ اور بے نظیر علم وفہم عطا کیا کہ اولین وآخرین میں اس کی نظیر نہیں حضراتِ محدثین کو قوتِ حافظہ میں کراماً کاتبین کا نمونہ بنایا اور حضرات فقہاء کو قوت اجتہاد واستنباط عطا کی اور فہم وادارک ونکتہ سنجی ودقیقہ رسی میں ملائکہ مقربین کا نمونہ بنایا اور اولیاء عارفین کو اپنے عشق اور محبت کی دولت سے نوازا اور عرش عظیم اور بیت المعمور کا لیل و نہار طواف کرنے والے فرشتوں کا نمونہ بنایا کسی امت میں علماء اسلام جیسا علم اور تحقیق و تدقیق کا نام ونشان نہ ملے گا اور نہ ان کی بے مثال اور بلند پایہ تصانیف کی کوئی نظیر نظر آئے گی۔

مغربی اقوام نے صنعت اور کاریگری میں حیرت انگریز کرشمے دکھائے، مگر ان قوموں میں توریت اور انجیل کا نہ کوئی بخاری اور مسلم نظر آتا ہے کہ جس کو توریت وانجیل از بر یاد ہو اور نہ یحییٰ بن سعید القطان اور یحییٰ بن معین جیسا اسماء الرجال کا حافظ وعالم پیدا ہوا تو جن قوموں نے اپنے پیغمبروں کی کتابوں اور صحیفوں میں دیدہ دانستہ تحریف کر ڈالی، ایسی قوموں میں احمد بن حنبل اور یحییٰ بن معین جیسا حافظ حدیث ناممکن اور محال ہے۔ اور نہ یہود اور نصاریٰ کے اولین وآخرین میں ابوحنیفہؒ اور شافعیؒ جیسا فقیہ اور مجتہد نظر آتا ہے کہ جو دین ودنیا اعتقادت عبادات معاملات، معاشرت، سیاست مکہ ومدینہ کے تمام مسائل کو توریت وانجیل کی نصوص کی روشنی میں حل کر سکے، اور نہ ابوالحسن اشعری، ابومنصور ماتریدی، غزالی اور رازی جیسا کوئی متکلم کسی امت میں نظر آتا ہے کہ جب میدان مباحثہ ومناظرہ میں نکلے تو عقائد اسلامیہ کی تحقیق کے لئے عقلی ونقلی دلائل کا لشکر اس کے ساتھ ہو اور باطل کی گردن پر اس کی تیغ بے دریغ چل رہی ہو اور دنیا اسلام کی سرفرازی اور سربلندی، کفر وباطل کی ذلت وخواری

اور سرنگونی کا تماشہ دیکھ رہی ہو اور نہ جنید و شبلی، بایزید اور معروف کرخی جیسا عابد و زاہد اور خداوند ذوالجلال کا عاشق اور مجنون کسی امت میں پیدا ہوا اور نہ خلیل بن احمد اور سیبویہ جیسا علم اعراب کا موجد و امام کسی ملت میں ہو اور نہ عبدالقاہر جرجانی اور سعد الدین تفتازانی جیسا اسرار بلاغت اور دلائل اعجاز کا امام کسی امت میں پیدا ہوا۔

علمائے یہود اور علمائے نصاریٰ عبرانی، سریانی یا انگریزی زبان کی لغت میں کوئی لسان العرب، قاموس اور تاج العروس جیسی کتاب تو دکھلائیں جمال الدین ابن حاجب اور جامی کا ذکر کیا کروں میزان و منشعب اور صرف میر و نحو میر، جو علم صرف و نحو کی بالکل ابتدائی کتابوں میں ہیں، روئے زمین کے علمائے یہود و نصاریٰ عبرانی و سریانی یا انگریزی زبان کے متعلق کوئی میزان یا منشعب تو دکھلائیں بطور نمونہ ان چند علوم کا ذکر کر دیا گیا ہے علاوہ ازیں دیگر علوم کو انہی پر آگے قیاس کر لیا جائے۔

یہود و نصاریٰ سے ہمارا مطالبہ یہ ہے کہ علمائے اسلام کا شریعت موسویہ اور شریعت عیسویہ کے علماء اور فضلاء سے موازنہ کر کے دیکھو صنعتی اور حرفتی ترقی پر نظر نہ کرو یہ علمی اور اخلاقی ترقی نہیں بلکہ یہ کاری گری ہے، اس میں دن بدن ترقی ہوگی اور ظاہر ہے کہ اسلام میں یہ علمی، اخلاقی ترقی سب آنحضرت ﷺ کی شریعت کی اتباع کی برکت سے ہوئی، کیا یہ اسلام کا معجزہ نہیں کہ شریعت اسلامیہ کی برکت سے علم و حکمت کے دروازے کھل گئے اور امت محمدیہ میں ایسے بے مثل علماء و فضلاء اور اولیاء و اتقیاء پیدا ہوئے کہ کسی امت میں ان کی نظیر نہیں۔

بطور نمونہ کے ہم صرف دس علماء کے سیرت پیش کر رہے ہیں۔ تا کہ اندازہ ہو کہ اللہ تعالیٰ نے رسول اکرم ﷺ کی امت میں کیسے کیسے عظیم علماء اور زعماء پیدا فرمائے، چنانچہ امت محمدیہ ﷺ کے دس علماء کو بطور نمونہ کے پیش کیا جا رہا ہے۔ صحابہ کرام کا مرتبہ و مقام اپنی جگہ پر ہے، بے شک تمام صحابہ ہی ایسے عظیم ہیں کہ جنکا مقابلہ پچھلی امتوں کے لوگ نہیں کر سکتے۔ علاوہ ازیں صحابہ کے بعد بھی اس امت میں ایسے ایسے عظیم رجال کار افراد ہوئے

کہ پہلی امتیں ان کی مثال پیش کرنے سے عاجز ہیں، لیجئے چند کا ذکر ملاحظہ فرمایئے۔

داعی حق حضرت سعید بن جبیر شہید رحمہ اللہ

حضرت ابوعبداللہ سعید بن جبیرؒ کا شمار ان جلیل القدر تابعین میں ہوتا ہے جو علم وعمل کا مجمع البحرین تھے۔ کوفہ کے رہنے والے تھے اور بنی والبہ بن الحارث بن ثعلبہ بن دودان کے غلام تھے۔ والبہ بن اسد کی ایک شاخ تھا۔ اس نسبت سے انہیں والبی والاسدی کہا جاتا ہے۔ انہوں نے حضرت عبداللہ بن عباسؓ، حضرت ابوسعید خدریؓ، حضرت انسؓ بن مالک، حضرت عبداللہ بن زبیرؓ، حضرت ابو ہریرہؓ اور حضرت ام المومنین عائشہ صدیقہؓ جیسی بلند مرتبہ شخصیتوں کے فیضان علم سے پورا پورا استفادہ کیا تھا اور علم وفضل کا بحر زخار بن گئے تھے۔ تفسیر حدیث اور فقہ میں وحید العصر تھے۔ ان کے علم وفضل سے ایک دنیا فیض اٹھاتی تھی۔ حق گوئی کا یہ عالم تھا کہ کسی بڑی سے بڑی شخصیت سے مرعوب نہ ہوتے تھے اور بے دھڑک حق بات اس کے منہ پر کہہ دیتے تھے۔ بے حد عابد وزاہد تھے۔ خشیت الٰہی اور سوز گذار کا اتنا غلبہ تھا کہ ہر وقت آنکھیں اشکبار رہتی تھی۔ قرآن کریم کے حافظ تھے اور عام طور پر دو رات میں پورا قرآن ختم کر لیتے تھے۔ حج بیت اللہ کے لئے اکثر جاتے تھے اور فرط ذوق وشوق میں کوفہ ہی سے احرام باندھ لیا کرتے تھے۔ لوگوں کی عیب جوئی اور غیبت سے سخت پرہیز کرتے۔ ان کی زبان پر ہر وقت یہ دعا جاری رہتی۔

اَللّٰھُم اِنِّی اَسئَلُکَ صِدْقَ التَّوَکُّلُ عَلیکَ و حُسنَ الظَّنِّ بِکَ (الٰہی میں تو اس چیز کا طالب ہوں کہ تجھ پر سچا توکل اور حسنِ ظن حاصل ہو)

اپنے نفس کو بے حد حقیر سمجھتے تھے اور فرماتے تھے کہ کسی شخص کو گناہ میں مبتلا دیکھتا ہوں مگر جب اپنے آپ پر نظر ڈالتا ہوں تو اس کو ٹوکتے ہوئے شرم محسوس ہوتی ہے۔ کسی نے پوچھا سب سے بڑا عابد کون ہے؟ فرمایا: جس نے گناہوں میں مبتلا ہو کر توبہ کر لی اور پھر یہ خیال کیا کہ میری سب نیکیاں گناہوں کے مقابلہ میں بے حقیقت ہیں۔

اسلام کو ایک مکمل ضابطہ حیات سمجھتے تھے اور محض نماز و روزہ اور ذکر و شغل کو اسلام نہیں سمجھتے تھے۔ فرمایا کرتے تھے "ذکر یہ ہے کہ آدمی زندگی کے ہر شعبے میں اللہ کی اطاعت کرے، جس نے اپنے ہر قول و فعل میں اللہ کے احکام کی اطاعت نہ کی، وہ خواہ کتنی ہی عبادت کرے اسے اللہ کی یاد رکھنے والا نہیں کہا جا سکتا۔ اللہ کی یاد تو یہ ہے کہ اس کا خوف گناہ کرنے کی طاقت ہی نہ چھوڑے۔" نماز پڑھتے وقت سورۂ بقرۃ کی آیت کو بار بار دہرایا کرتے تھے اور خوف خدا سے کانپا کرتے تھے۔ وَاتَّقُوا يَوْمًا تُرْجَعُونَ فِيهِ إِلَى اللَّهِ اس دن سے ڈرو جس دن خدا کی طرف لوٹائے جاؤ گے۔

حضرت عبداللہ بن عباسؓ کو سعیدؒ بن جبیر کے فتوؤں پر اتنا اعتماد تھا کی اگر کوفہ سے کوئی شخص ان سے فتویٰ لینے یا کوئی مسئلہ پوچھنے آتا تو معاً اس سے یہ سوال کرتے: "کیا تمہارے شہر میں سعیدؒ بن جبیر نہیں ہیں؟"

ایک مرتبہ حضرت ابن عباسؓ نے حضرت سعید سے کہا، حدیث سناؤ۔ انہوں نے عرض کیا، میں آپ کی موجوگی میں حدیث کس طرح سنا سکتا ہوں۔ ابن عباس نے فرمایا: "کیا یہ خدا کی نعمت نہیں کہ تم میرے سامنے حدیثیں بیان کرو، اگر صحیح بیان کرو گے تو بہتر ورنہ میں تصحیح کر دوں گا۔"

ایک دفعہ حضرت سعیدؒ بن جبیر کے علم و فضل کے اعتراف میں حجاج بن یوسف ثقفی نے انہیں جامع کوفہ کا امام اور کوفہ کا قاضی مقرر کیا۔ جب کوفہ کے لوگوں نے مطالبہ کیا کہ ہمارا قاضی کوئی عربی النسل شخص ہونا چاہیے تو حجاج نے انہیں منصب قضا سے ہٹا دیا۔ سعیدؒ بن جبیر نے خلق خدا کو فیض پہنچانے کی غرض سے عہدہ امامت و قضا قبول کر لیا تھا ورنہ حجاج بن یوسف کے مظالم کی وجہ سے اس سے سخت نفرت کرتے تھے۔ حجاج نے ہزار ہا بندگان خدا کا خون ناحق بہایا تھا۔ بیت اللہ پر سنگباری کر کے اس کی بے حرمتی کی تھی۔ حواری رسول ﷺ حضرت زبیرؓ بن العوام کے جلیل القدر فرزند اور صدیق اکبرؓ کے نواسے عبداللہ (ابن زبیرؓ) کو شہید کیا تھا اور ذات النطاقین اسماء بنت ابی بکر صدیقؓ کی توہین کی تھی۔ وہ رسول کریم ﷺ

کی اس پیشنگوئی کا مصداق تھا کہ قبیلہ ثقیف میں کذاب اور ظالم پیدا ہوگا۔ حضرت اسمٰؓ کے قول کے مطابق کذاب مختار ثقفی تھا اور ظالم حجاج ثقفی۔ سعیدؒ بن جبیر حجاج کے مظالم اور سفاکیوں سے سخت نالاں تھے۔ چنانچہ جب اس کے ایک جرنیل ابن اشعث نے حکومت کے خلاف علَمِ بغاوت بلند کیا تو ابن جبیرؒ نے کھلم کھلا ابن اشعث کا ساتھ دیا۔ انہوں نے فتویٰ دے دیا کہ حکومت وقت کے خدا کے بندوں پر مظالم نمازوں میں تاخیر اور مسلمانوں کی تذلیل وتحقیر پر اس کا مقابلہ کرو۔ اس فتویٰ کی بناء پر حجاج ان کا جانی دشمن بن گیا۔

حضرت عبداللہ ابن زبیرؓ کی شہادت کے بعد بنی امیہ کی قوت بہت بڑھ گئی تھی۔ انکی بے پناہ عسکری طاقت نے ابنِ اشعث کو شکست دی اور وہ سیستان کی طرف نکل گیا۔ سعیدؒ بن جبیر مکہ چلے گئے اور وہاں بنی امیہ کی طرف سے خالد بن عبداللہ قسری حاکم تھا۔ اس نے سعیدؒ بن جبیر کو پکڑ کر حجاج کے پاس بھجوا دیا۔

حجاج انہیں دیکھتے ہی شعلہ جوالہ بن گیا۔ اسکی جفا جو اور خون آشام طبیعت کو ایک ضیافت ہاتھ آگئی۔ سعیدؒ بن جبیر اور اس کے درمیان اس موقع پر جو گفتگو ہوئی تاریخ نے اسے اپنے صفحات میں محفوظ کرلیا جس سے حضرت سعید بن جُبیر کی ہمت واستقامت اور جرأت ومردانگی کا پتہ چلتا ہے چنانچہ اس کی تفصیل یہ ہے:

حجاج: (طنزاً) تمہارا نام کیا ہے؟

سعیدؒ: سعیدؒ بن جبیر (سعید کے معنی نیک بخت کے ہیں اور جبیر کے معنی اصلاح یافتہ چیز کے ہیں)

حجاج: (چیں بجبیں ہوکر) انت لشقی بن کسیر (تم شقی بن کسیر ہو)

(شقی کے معنی بد بخت اور کسیر کے معنی ٹوٹی پھوٹی چیز کے ہیں۔)

سعیدؒ: میری ماں میرا نام تجھ سے بہتر جانتی تھیں۔

حجاج: شَقِیتْ اُمُّکَ وَشَقِی أنت تم بھی بد بخت ہو اور تمہاری والدہ بھی بد بخت

سعیدؒ: غیب کا علم تیرے پاس نہیں، یہ کسی دوسری ذات کے پاس ہے۔

حجاج: میں تم کو دنیا کے بدلے بھڑکتی ہوئی آگ کے سپرد کر دوں گا۔

سعیدؒ: اگر میں یہ جانتا کہ ایسا کرنا تیرے اختیار میں ہے تو تجھے عبادت کے لائق سمجھتا۔

حجاج: رسول کریم ﷺ کے بارے میں تم کیا کہتے ہو؟

سعید: آپ ﷺ اللہ تعالیٰ کے برگزیدہ رسول تھے، ہمارے ہادی ورہبر تھے۔۔۔ اور رحمۃ للعلمین تھے۔

حجاج: علیؓ اور عثمانؓ کی نسبت تمہاری کیا رائے ہے۔

سعیدؒ: علیؓ تو جوانوں میں سب سے پہلے اسلام لائے۔ رسول کریم ﷺ کے چچازاد بھائی، سیدۃ النساء کے سرتاج اور حسنینؓ کے باپ تھے۔ عثمانؓ دامادِ رسول ﷺ تھے، ذوالنورین تھے۔ انہوں نے اپنا گھر بار راہ خدا میں لٹایا۔ ان کو ناحق قتل کیا گیا۔

حجاج: خلفاء کی نسبت تمہارا کیا قول ہے؟

سعیدؒ: لَستَ عَلَیھِم بِوَکیل (میں ان کا وکیل نہیں ہوں)

حجاج: ان میں سے کون سب سے بہتر تھا؟

سعیدؒ: اَرضا ھُم لِخالِقِی، جو میرے خالق کی رضا کا سب سے زیادہ پابند تھا۔

حجاج: خالق کی رضا کا کون سب سے زیادہ پابند تھا؟

سعیدؒ: عِلمُ ذالک عندَ الذِی یَعلَمُ سِرَّھُم و نجوَاھُم ۔اس کا علم اس ذات کو ہے جو بھیدوں اور پوشیدہ باتوں سے واقف ہے۔

حجاج: امیر المومنین عبدالملک کے متعلق تمہارا کیا خیال ہے؟

سعیدؒ: اس کے عظیم گناہوں میں سے ایک گناہ تمہارا وجود ہے۔

حجاج: میرے متعلق کیا کہتے ہو؟

سعیدؒ: تمہارا قول و فعل کتاب الٰہی کے خلاف ہے۔ تم اپنا رعب اور دبدبہ قائم کرنے

کے لئے سفاکیاں کرتے ہو۔ یہ کام تمہیں برباد کررہے ہیں۔ کل داورِ محشر کے سامنے حاضر ہو گے تو قدرِ عافیت معلوم ہو جائے گی۔

حجاج: تم پر ہلاکت ہو۔

سعیدؒ: ہلاکت اس شخص پر ہے۔ جس کو جنت سے الگ کر کے دوزخ میں پھینک دیا جائے گا۔

حجاج: تم ہنستے کیوں نہیں؟

سعیدؒ: وہ کس طرح ہنس سکتا ہے جو مٹی سے پیدا کیا گیا ہے اور مٹی کو آگ کھا جاتی ہے۔

حجاج: پھر ہم لوگ تفریحی مشاغل سے کیوں ہنستے ہیں؟

سعیدؒ: سب کے دل یکساں نہیں ہوتے۔

حجاج: تم نے تفریح کا سامان کبھی دیکھا ہے؟

اب حجاج نے عود اور بانسری بجانے کا حکم دیا۔ سعیدؒ ان کی آواز کو سن کر رونے لگے۔ حجاج نے کہا، یہ رونے کا کیا موقع ہے؟ عود اور بانسری کے نغمے تو تفریح بخش ہیں۔

سعیدؒ نے جواب دیا۔ نہیں بانسری کی آواز نے مجھے وہ دن یاد دلایا جب صور پھونکا جائے گا اور عود ایک کاٹے ہوئے درخت کی لکڑی ہے جو ممکن ہے ناحق کاٹی گئی ہو اور اس کے تار بکریوں کے پٹھوں کے ہیں جو انکے ساتھ قیامت کے دن اٹھائی جائیں گی۔

اس گفتگو کے بعد حجاج بولا، سعید تمہاری حالت قابل افسوس ہے۔

حضرت سعیدؒ نے فرمایا: وہ شخص افسوس کے قابل نہیں ہے جو آگ سے نجات پا گیا ہو اور جنت میں داخل کر دیا گیا ہو۔

بعض روایتوں میں ہے کہ اس موقع پر حجاج نے بہت موتی زبرجد اور یاقوت منگوا کر اپنے سامنے رکھے۔ حضرت سعیدؒ نے انہیں دیکھ کر فرمایا:

''اگر تم نے انہیں اس لئے جمع کیا ہے کہ ان کے ذریعے یوم قیامت کے خوف سے

بچ جاؤ تو ٹھیک ہے ورنہ یادرکھو کہ قیامت کا ایک جھٹکا دودھ پلانے والی عورتوں کو ان کے شیر خوار بچوں سے غافل کر دے گا اور جو چیزیں دنیا کے لئے جمع کی جائیں گی ان میں صرف پاکیزہ اور طیب ہی عمدہ اور پسندیدہ ہیں۔''

حجاج: کیا میں نے تمہیں کوفہ کا امام اور قاضی نہیں بنایا تھا؟

سعیدؒ: بیشک بنایا تھا۔

حجاج: کیا میں نے تمہیں ایک لاکھ کی رقم خیرات کرنے کے لئے نہیں دی تھی؟

سعیدؒ: بیشک دی تھی۔

حجاج: تو پھر تم میری مخالفت پر کیوں کمر بستہ ہوئے۔

سعیدؒ: تمہارے مظالم اور بداعمالیوں نے مجھے اس پر مجبور کیا اور پھر مجھے ابن اشعث کی بیعت کا بھی پاس تھا۔

حجاج: خدا کی قسم میں تجھے قتل کئے بغیر یہاں سے نہ ہٹوں گا۔

سعیدؒ: کوئی بات نہیں تم میری دنیا خراب کرو گے میں تمہاری آخرت برباد کردوں گا۔

حجاج: بتاؤ تم کس طریقے سے قتل ہونا پسند کرو گے؟

سعیدؒ: تو خود ہی پسند کر۔ رب اکبر کی قسم جس طرح تو مجھ کو قتل کرے گا اسی طرح خدا تجھ کو آخرت میں قتل کرے گا۔

حجاج: کیا تمہارا جی چاہتا ہے کہ تمہیں معافی مل جائے؟

سعیدؒ: معافی دینا اللہ کے اختیار میں ہے، رہا تو۔۔۔۔تو یہ تیری قدرت سے باہر ہے کہ کسی کو بری کرے یا کسی کا عذر قبول کرے۔

حجاج: تو میں تم کو ضرور قتل کروں گا۔

سعیدؒ: ہر شخص کی موت کا ایک وقت مقرر ہے۔ اگر میرا آخری وقت آگیا ہے تو اسے کوئی ٹال نہیں سکتا، اگر ابھی وقت نہیں آیا تو تو کوئی مجھے مار نہیں سکتا۔

اب حجاج فرطِ غضب سے بیتاب ہوگیا۔ جلاّد کو حکم دیا کہ اسے لے جاؤ اور قتل کردو۔۔۔ اس وقت حاضرین میں سے ایک شخص بے قابو ہوکر اس معدن علم وفضل کی مصیبت پر رونے لگا۔ حضرت سعید بن جبیر نے فرمایا: ''بھائی روتے کیوں ہو، ہر بات اللہ تعالیٰ بہتر جانتا ہے، پھر یہ آیت پڑھی:

﴿مَا اَصَابَ مِن مُّصِيبَةٍ فِي الْاَرْضِ وَلَا فِي اَنفُسِكُم اِلَّافِي كِتٰبٍ مِّنْ قَبلِ اَنْ نَّبرَاَهَا﴾ (الحدید آیۃ ۲۲)

''زمین میں جو مصیبتیں بھی پہنچتی ہیں، یا تمہارے نفسوں پر وارد ہوتی ہیں ان کے پیدا ہونے سے قبل کتاب میں لکھی ہیں۔''

اس کے بعد لڑکے کو آخری بار دیکھنے کے لئے بلا بھیجا۔ وہ آئے تو بے اختیار رونے لگے۔ سعیدؒ نے انہیں صبر کی تلقین کی اور کہا: ''بیٹے اس سے زیادہ تیرے باپ کی زندگی تھی ہی نہیں، رونے سے کیا ہوگا۔'' اب جلاد نے انہیں قتل کی طرف کھینچا۔ حضرت سعید بن جبیرؒ کھلکھلا کر ہنس پڑے۔ حجاج نے کہا اسے واپس لاؤ۔ جب پھر حجاج کے سامنے آئے تو اس نے پوچھا: ''تم کس بات پر ہنسے؟''

سعیدؒ نے جواب دیا: ''**عجبت من جراتک علی اللہ وحلم اللہ علیک**''

(خدا کے مقابلے میں تیری جرأت اور تیری نسبت خدا کا عفو وحلم دیکھ کر مجھے تعجب ہوا)

حجاج اس فقرے کو سن کر اور بھڑک اٹھا اور جلاد کو حکم دیا اسے میرے سامنے قتل کرو۔ جلاد نے چمڑا بچھا دیا۔ حضرت سعیدؒ بھی سر کٹانے کے لئے مستعد ہوگئے اور قبلہ رو ہوکر یہ آیت پڑھی:

﴿اِنِّی وَجَّهتُ وَجهِيَ لِلَّذِي فَطَرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ حَنِيفاً وَّمَآ اَنَا مِنَ الْمُشرِكِينَ﴾ (الانعام آیۃ ۸۰)

''میں نے سب سے یکسو ہوکر اپنے تئیں اسی ذات کی طرف متوجہ کیا جس نے

آسمان وزمین بنائے ،ایک طرف کا ہوکراور میں مشرکوں میں سے نہیں ہوں۔"

حجاج نے حکم دیا اس کا منہ قبلے کی طرف سے پھیر دو۔

حضرت سعیدؒ کی زبان پر قرآن حکیم کے یہ الفاظ جاری ہو گئے:

﴿فَاَینَمَا تُوَ لُّوا فَثَمَّ وَجهُ اللّٰہِ﴾ (سورہ بقرہ)

(جدھر رخ کرو ادھر اللہ کی ذات ہے)

اب حجاج نے حکم دیا اسے منہ کے بل لٹادو۔ سعیدؒ خود ہی اوندھے لیٹ گئے اور اس آیت کی تلاوت کی:

﴿مِنهَا خَلَقنٰکُم وَ فِیهَا نُعِیدُکُم وَمِنهَا نُخرِجُکُم تَارَۃً اُخریٰ﴾

(طٰہٰ آیت ۵۵)

"ہم نے اسی (زمین) سے تم کو پیدا کیا اور اسی میں تم کو لوٹائیں گے اور اسی سے ایک دفعہ پھر نکالیں گے"

حجاج اب سخت مشتعل ہوگیا۔اس نے چلا کر جلاد کو حکم دیا۔"اس کا سر فوراً قلم کر دو۔"

سعیدؒ نے اس وقت بارگاہ رب العزت میں دعا مانگی ،بارالٰہی میرے قتل کے بعد اس ظالم کو کسی اور کے قتل پر قادر نہ کرنا۔۔۔۔۔۔۔" پھر کلمہ شہادت پڑھا: **اشھدان لاالہ الا اللہ وحدہٗ لاشریک لہٗ وا شھدان محمد اعبدہٗ ورسولہ ....**

ابھی کلمہ شہادت زبان پر جاری تھا کی جلاد کی تلوار گردن پر پڑی اور سر تن مبارک سے جدا ہو گیا۔

بنا کردند خوش رسمے بخون وخاک غلطیدن خدا رحمت کند ایں عاشقان پاک طینت را

شہادت کے بعد جسم مبارک سے خون کے فوارے چھوٹنے لگے۔حجاج کو اتنا خون نکلنے سے بہت تعجب ہوا،اپنے طبیب خاص سے اس کی وجہ دریافت کی،اس نے کہا:

دوسرے لوگوں کا خون قتل کا حکم سنتے ہی خشک ہو جاتا ہے لیکن سعیدؒ کی طبیعت بالکل مطمئن تھی اور قتل کا خوف مطلقاً ان کے دل میں نہ تھا۔اسی لئے ان کے جسم سے خلاف

معمول زیادہ خون نکلا۔"

یہ المناک واقعہ شعبان ۹۴ھ میں پیش آیا، اس وقت حضرت سعیدؒ کی عمر باختلاف روایت ۴۹ یا ۵۷ سال کی تھی، ان کی شہادت سے لوگوں میں کہرام مچ گیا۔

خواجہ حسن بصریؒ نے فرمایا: خدایا ثقیف ظالم سے سعیدؒ کے قتل کا انتقام لے۔ خدا کی قسم دنیا کے تمام باشندے بھی سعیدؒ کے قتل میں شریک ہوتے تو خدا ان سب کو منہ کے بل نار جہنم میں جھونک دیتا۔"

اس واقعہ کے بعد حجاج تھوڑا ہی عرصہ زندہ رہا۔ اس کے معدے میں کیڑے پڑ گئے جسم میں سردی سما گئی اور عجیب وغریب دماغی عارضہ ہو گیا، اکثر بے ہوشی کے دورے پڑتے تھے، بے ہوشی کی حالت میں یارات کو خواب میں سعیدؒ بن جبیر اسے نظر آتے جو پوچھتے "فاسق تو نے مجھے کس جرم کی پاداش میں قتل کیا؟" چونک کر کہتا "میرا سعید سے کیا تعلق۔"

غرض اسی طرح نہایت کرب والم کے عالم میں ۹۵ھ میں راہی ملک عدم ہوا۔ اللہ تعالیٰ نے مرد صالح سعیدؒ بن جبیر کی دعا کو شرف قبولیت بخشا اور انکی شہادت کے بعد حجاج کسی شخص کے قتل پر قادر نہ ہو سکا۔

علامہ دمیریؒ نے حیوۃ الحیوان میں لکھا: "حضرت عمر بن عبد العزیزؒ نے حجاج کو اس کے مرنے کے بعد خواب میں دیکھا کہ وہ بدبودار مردار کی صورت میں ہے۔ انہوں نے اس سے پوچھا کہ اللہ تعالیٰ نے تیرے ساتھ کیا سلوک کیا۔ اس نے کہا کہ اللہ تعالیٰ نے مجھ کو ہر مقتول کے عوض میں جس کو میں نے قتل کیا تھا، ایک ایک دفعہ قتل کیا، لیکن سعید بن جبیرؒ کے بدلے میں مجھ کو ستر مرتبہ قتل کیا گیا۔"

اس کے بعد علامہ دمیریؒ لکھتے ہیں: "اگر کہا جائے کہ اس میں کیا حکمت ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حجاج کو ہر اس شخص کے بدلے میں، جس کو اس نے ایک مرتبہ قتل کیا اور سعید بن جبیرؒ کے بدلے میں ستر مرتبہ قتل کیا، حالانکہ حجاج نے عبد اللہ بن زبیرؓ کو بھی قتل کیا ہے تو عالم میں ان کے مثل بہت سے صحابہ موجود تھے جیسے عبد اللہ بن عمرؓ اور انسؓ بن مالک وغیرہ ہم،

لیکن جب سعید بن جبیرؒ کو قتل کیا ہے تو کوئی نظیر ان کا موجود نہ تھا اور اکثر مصنفین نے ذکر کیا ہے کہ جب حضرت حسن بصریؒ کو سعید بن جبیر کی خبر ہوئی تو انہوں نے فرمایا کہ خدا کی قسم سعید بن جبیر دنیا سے ایسے وقت میں اٹھے کہ جب تمام دنیا مشرق سے لیکر مغرب تک ان کے علم کی محتاج تھی۔ یہ وجہ تھی کی ان کے قتل کی وجہ سے حجاج پر زیادہ عذاب ہوا۔'' (حیاۃ الحیوان)

حضرت سعیدؒ کو شہر واسط میں سپرد خاک کیا گیا، انہوں نے اپنے پیچھے تین لڑکے چھوڑے، عبداللہ، محمد اور عبدالملک۔

ابن سعدؒ نے حضرت سعیدؒ کا حلیہ اس طرح لکھا ہے: رنگ سیاہ، سر اور داڑھی کے بال سفید، خضاب لگانا پسند نہ کرتے تھے۔ کسی نے ویمہ کے خضاب کے بارے میں پوچھا، فرمایا؛ اللہ تو بندہ کے چہرے کو نور سے روشن کرتا ہے اور بندہ اس کو سیاہی سے بجھا دیتا ہے۔

حافظ ذہبی نے ''تذکرۃ الحفاظ'' میں بیان کیا ہے کہ سعید بن جبیر عمامہ باندھا کرتے تھے، اور پیچھے کی طرف ایک بالشت شملہ چھوڑ دیا کرتے تھے۔

ان کے ارشد تلامذہ میں دو صاحبزادوں عبداللہ اور عبدالملک کے علاوہ ابواسحٰق سبیعی، عطاء بن سائب، اشعثؒ بن الشعثا طلحہؒ بن مصرف، عبدالملک بن سلیمان ابوالزبیر مکیؒ اور آدم بن سلیمان جیسے اکابرامت شامل ہیں۔

حضرت امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ

نام ونسب..... نعمان نام، ابوحنیفہ کنیت، امام اعظم لقب، شجرہ نسب یہ ہے۔ نعمان بن ثابت بن زوطی بن ماہ، شجرہ نسب سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ امام صاحب عجمی النسل تھے۔ تاریخ بغداد میں خطیب بغدادی نے امام کے پوتے اسماعیل کی زبانی یہ روایت نقل کی ہے۔ کہ میں اسماعیل بن حماد بن نعمان بن ثابت بن نعمان بن مرزبان، ہم لوگ نسل فارس سے ہیں۔ اور کبھی کسی کی غلامی میں نہیں آئے۔ ہمارے دادا ابوحنیفہؒ ۸۰ھ میں پیدا ہوئے۔ ثابت بچپن میں حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی خدمت میں حاضر ہوئے تھے۔

انہوں نے ان کے خاندان کے حق میں دعائے خیر کی تھی، ہم کو امید ہے کہ وہ دعا بے اثر نہیں رہی۔ (بحوالہ تاریخ بغداد)

امام صاحب کے پوتے اسماعیل نے اپنے پردادا کا نام نعمان بتایا اور سگڑدادا کا نام مرزبان۔ عام طور پر زوطی اور ماہ مشہور ہیں۔ غالباً جب زوطی ایمان لائے تو ان کا نام زوطی سے نعمان میں بدل دیا گیا۔ اور اسماعیل نے سلسلۂ نسب کے بیان میں زوطی کا وہی اسلامی نام لیا اور حمیت اسلامی کا مقتضا بھی یہی تھا۔ زوطی کے والد کا نام غالباً کچھ اور ہوگا۔ اور ماہ اور مرزبانی لقب ہوں گے۔ کیونکہ اسماعیل کی روایت سے اس قدر اور بھی ثابت ہے کہ ان کا خاندان فارسی کا ایک معزز اور مشہور خاندان تھا۔ فارسی میں رئیس شہر کو مرزبان کہتے ہیں اس لئے نہایت قرین قیاس ہے کہ ماہ اور مرزبان لقب ہیں نہ کہ نام، حافظ ابوالمحاس نے قیاس لگایا ہے کہ ماہ اور مرزبان ہم معنی الفاظ ہوں گے انہوں نے قیاساً کہا کیونکہ وہ فارسی زبان نہیں جانتے تھے لیکن یہ یقیناً کہا جا سکتا ہے کہ درحقیقت ماہ اور مرزبان ہم معنی لفظ ہیں۔ ماہ دراصل وہی مہ ہے جس کے معنی بزرگ اور سردار کے ہیں۔

عام طور پر دشمنوں نے امام صاحب کے متعلق یہ مشہور کر رکھا ہے کہ وہ غلام تھے۔ حالانکہ یہ بات قطعاً غلط ہے۔ کیونکہ امام صاحب نے وہ شہرت دوام حاصل کی۔ جس سے جریدہ عالم پر ان کی زندگی نقش ہوگئی جیسا کہ مشہور ہے۔ ثبت است بر جریدہ عالم دوام۔

بعض مورخ امام صاحب کے دادا زوطی جن کا اسلامی نام نعمان تھا کہ بارے میں لکھتے ہیں۔ کہ یہ کابل سے گرفتار ہو کر آئے اور قبیلہ بنی تیم اللہ کی ایک عورت نے خرید لیا۔ کچھ دونوں غلامی میں رہے پھر اس نے آزاد کر دیا اسی لئے امام کا خاندان مولیٰ بنی تیم اللہ کہلاتا ہے۔ اول تو یہ ایک تاریخی غلطی ہے۔ جس کو بعض مورخوں نے امام صاحب کے حسد میں خوب اچھالا لیکن اگر درست بھی ہو تو یہ کوئی عیب نہیں اگر ہم صحابہ اکرام میں سے چوٹی کے فقہاء اور مفسرین کی تاریخ پر نظر ڈالیں تو ان میں سے اکثر غلام تھے ان مقتدر حضرات میں ذرا ناموں کی فہرست ملاحظہ فرمائیں کہ یہ سب غلام تھے لیکن انکا نام ان کا

تذکرہ باعث ثواب وعزت ہے۔ ان کے وسیلے سے دعائیں قبول ہوتی ہیں ان کی برکت سے اللہ تعالیٰ بارش برساتا ہے۔ ان بزرگوں میں چند یہ ہیں۔ امام حسن بصری، ابن سیرین، طاؤس، عطاء بن یسار نافع، عکرمہ مکحول، یہ چند علماء اور فقہا تھے۔ جو غلام تھے تو اگر امام صاحب غلام ہوئے بھی تو کیا عیب ہے۔

پھر انہی پر کیا بس ہے حضرت یوسف علیہ السلام نے کئی سال مصر میں غلامی کی زندگی گزاری ہے۔ حضرت یونس علیہ السلام کے بارے میں قرآن کہتا ہے۔ **اِذْاَبَقَ اِلَى الْفُلْكِ الْمَشْحُوْن** تو ثابت ہوا کہ غلام ہونا کوئی عیب نہیں۔ رہا یہ سوال کہ امام صاحب دادا مولیٰ سے کیسے مشہور ہوئے تو اس کا جواب یہ ہے کہ عرب میں دستور ہے کہ جب کسی سے تعلق جوڑتے ہیں۔ یا کسی کو امن دیتے ہیں تو مولیٰ مشہور کر دیتے ہیں۔ اور اس جگہ ہذا مولای کا لفظ استعمال کرتے تھے۔ قوی امکان ہے کہ امام صاحب کے دادا نے بھی عرب کے کسی قبیلے سے اپنا تعلق استوار کرلیا ہو اور اس تعلق کی وجہ سے مولیٰ مشہور ہو گئے۔ رفتہ رفتہ یہ خیال عام ہو گیا اور مؤرخوں نے جن کی عادت ہوتی ہے کہ بات کی تحقیق کئے بغیر قبول نہیں کر لیتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اسماعیل کو اپنے بیان میں خاص طور پر یہ کہنا پڑا کہ ہم غلام نہیں ہیں۔ اور نہ کبھی غلام ہوئے۔ اسماعیل کی روایت کئی وجوہ سے قابل قبول ہے۔ کیونکہ یہ نہایت ثقہ اور معزز شخص تھے۔ قاضی صمیری نے اس کی تصریح کی ہے کہ زوطی بنی تیم اللہ کے حلیف تھے۔ زوطی کی نسبت یہ معلوم نہ ہوسکا۔ کہ ان کا خاص شہر کونسا تھا۔ مختلف مورخوں نے کئی ایک شہروں کے نام لئے ہیں۔ جن میں سے کسی ایک کو ترجیح نہیں دی جاسکتی۔ یقینی طور پر صرف اس قدر قبول کیا جاسکتا ہے کہ اقلیم فارس کے کسی شہر کے باشندے تھے۔ یہ اقلیم اس زمانے میں اسلامی اثر قبول کر چکے تھے۔ اسلام کی اثر پزیری کی وجہ سے بڑے بڑے خاندان اسلام قبول کر چکے تھے۔ غالبا زوطی اسی زمانے میں اسلام لائے ہوں گے۔ اور اسلام قبول کرنے کی وجہ سے تمام خاندان کی ناراضگی مول لی۔ جس کی وجہ سے اقلیم فارس سے ہجرت کرکے عرب کا رخ کیا۔

اس زمانے میں امیر المومنین حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی خلافت تھی۔ جب زوطی

نے ہجرت کی اور کوفہ کو اسلامی دارالحکومت ہونے کا شرف حاصل تھا۔ زوطی نے بھی کوفہ ہی میں سکونت اختیار کی کبھی کبھار زوطی امیر المؤمنین کے خدمت میں حاضر ہوتے اور خلوص عقیدت سے قدم بوسی کا شرف حاصل کرتے، ایک بار پارسیوں کے عید کے دن امیر رضی اللہ عنہ کی خدمت میں ازراہ محبت وعقیدت فالودہ بھیجا۔ حضرت امیر رضی اللہ عنہ نے فرمایا ہمارے ہاں روز عید ہے۔ ثابت امام ابوحنیفہؒ کے والد بزرگوار کوفہ ہی میں پیدا ہوئے زوطی نے نیک بخت لڑکے کو حضرت علی کی خدمت میں حاضر کیا آپؓ نے بزرگانہ شفقت سے دعائے خیر فرمائی۔ جو اللہ تعالیٰ نے قبول فرمائی اور اللہ نے اس خاندان کی عظمت قیامت تک کے لئے باقی رکھی۔

امام صاحب کے والد بزرگوار ثابت ایسی کوئی مشہور شخصیت نہ تھے کہ جس سے ان کے حالات ضبط تحریر میں لائے جاتے لہٰذا مؤرخوں نے ان کا کوئی تذکرہ نہیں کیا۔ البتہ اتنا معلوم ہوتا ہے کہ مشغلہ حیات تجارت تھا۔ جب عمر عزیز چالیس کے قریب ہوئی تو اللہ نے وہ عظیم فرزند عطا کیا جس کے نام کو اللہ تعالیٰ نے رہتی دنیا تک زندہ و پائندہ رکھا۔ امام صاحب کی پیدائش کے وقت عبدالملک بن مروان کی حکومت تھی جو دولت مروانیہ کا دوسرا تاجدار تھا۔ اس مبارک دور میں کچھ ایسے خوش قسمت لوگ موجود تھے۔ جن کی آنکھوں نے آقائے دو جہاں سرکار دو عالم ﷺ کے رخ انور کا دیدار کیا تھا اور ان خوش قسمت انسانوں میں سے کچھ امام ابوحنیفہؒ کے عہد شباب تک زندہ تھے۔ انس بن مالکؓ کی وفات ۹۳ھ میں ہوئی۔ سہل بن سعدؓ کا انتقال ۹۱ھ میں ہوا اور ابوطفیل عامر بن واثلہ ایک صدی ہجری تک حیات تھے۔ امام ابوحنیفہؒ نے ان لوگوں میں سے کسی سے بھی روایت نہیں کی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ امام ابوحنیفہ اس وقت امام ابوحنیفہؒ نہیں تھے بلکہ ایک عام تاجر زادے تھے۔

امام ابوحنیفہؒ کی جوانی اور تعلیم

امام صاحب چونکہ ایک تاجر گھرانے میں پیدا ہوئے لہٰذا ان کی ساری توجہ اپنے اس

آبائی پیشہ کی طرف تھی البتہ خاندانی وجاہت وعزت ایسی تھی کہ بےعلم نہ رہے۔اس دور کے لوگوں کی طرح کچھ نہ کچھ سیکھتے رہے۔لیکن اتنا نہیں کہ ہم اسے خاص طور پر تعلیم سے متعلق سمجھیں۔البتہ اتنا ضرور ہے کہ اللہ نے جس کام کے لئے ان کو پیدا فرمایا تھااس کے آثار امام صاحب کی روشن پیشانی میں صاف دیکھے جاسکتے تھے۔چنانچہ شبلی نعمانی نے امام ابوحنیفہؒ کے علم دین کی طرف تحریک کے بارے میں ایک عمدہ بات لکھی ہے فرماتے ہیں۔

ایک دن بازار میں جارہے تھے،امام شعبی جو کہ کوفہ کے مشہور امام تھے۔ان کا مکان راہ میں تھا۔سامنے سے نکلے توانہوں نے یہ سمجھ کر کہ کوئی نوجوان طالب علم ہے،پاس بلایا اور پوچھا کہاں جارہے ہو؟انہوں نے ایک سوداگر کا نام لیاامام شعبی نے کہا میرا مطلب یہ تھا کہ تم پڑھتے کس سے ہو؟انہوں نے افسوس کے ساتھ جواب دیا کہ کسی سے بھی نہیں،شعبی نے کہا کہ مجھ کو تم میں قابلیت کے جواہر نظر آتے ہیں،تم علماء کی صحبت میں بیٹھا کرواس نصیحت نے ان کے دل میں گھر کرلیا اور نہایت اہتمام سے تحصیل علم پر متوجہ ہوئے۔(بحوالہ سیرت النعمان)

اس وقت کے مروجہ علوم ادب،انساب،ایام العرب،فقہ،حدیث اور علم الکلام تھے۔امام صاحب کی ابتدائی تعلیم کے بارے میں ایک اور روایت ہے۔جس کا سلسلہ سند خطیب بغدادی نے امام صاحب تک پہنچایا ہے،لکھتے ہیں کہ امام صاحب کہتے ہیں کہ جب تحصیل علم کی طرف توجہ ہوئی تو بہت سے علوم میرے سامنے تھے اور کشمکش میں تھا۔کہ ان علوم مروجہ میں سے کس کو اختیار کروں،سب سے پہلے علم کلام کا خیال آیا،ساتھ ہی دل میں یہ خطرہ گزرا کہ کوہ کندن وکاہ برآوردن ہے۔ایک مدت کے بعد کمال بھی پیدا کیا تو علانیہ اس کا اظہار نہیں کرسکتے کہ لوگ الحاد کی تہمت نہ لگادیں۔ادب اور قرأت کا اس کے سوا کوئی فائدہ نظر نہ آیا کہ مکتب میں بیٹھ کر پڑھائیں شعروشاعری میں سوائے جھوٹی مدح سرائی اور ہجوگوئی کے کیا دھرا ہے؟ حدیث کے لئے اولاً ایک عمر چاہیئے،اوراس کے بعد کم سنوں سے واسطہ پڑتا اور ہروقت یہی فکر سوار رہتی کہ لوگ جرح وتعدیل کا نشانہ نہ بنائیں۔آخر فقہ پر نظر پڑی اور دنیاودین کی ضرورتیں اس سے وابستہ نظر آئیں۔ (تاریخ بغداد)

اس روایت پر علامہ شبلی نعمانی تنقید کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ ''یہ روایت محض غلط ہے تمام معتمد روایتیں اس کے خلاف ہیں جو ریمارک امام صاحب کی طرف سے منسوب کئے ہیں ایسے جاہلانہ ریمارک ہیں کہ ایک معمولی آدمی کی طرح منسوب نہیں کئے جا سکتے۔'' اس روایت کو صحیح مانیں تو ماننا پڑے گا کہ حدیث وکلام کی طرف امام صاحب نے توجہ ہی نہیں کی حالانکہ ان فنون میں امام ابوحنیفہؒ کا جو پایہ ہے اس سے کون انکار کر سکتا ہے۔ یہ ممکن ہے کہ تحصیل علوم کے بعد امام نے خیال کیا ہو کہ کس فن کو اپنا خاص فن بنائیں۔ اور چونکہ عام خلائق کی ضرورتوں فقہ سے وابستہ دیکھیں۔ اسی کو ترجیح دی یہی بات طرز بیان کی رنگ آمیز یوں سے اس حد تک پہنچ گئی۔ (بحوالہ سیرت النعمان)

امام ابوحنیفہؒ حضرت حمادؒ کی خدمت میں

حماد کوفہ کے مشہور امام اور استاذ وقت تھے۔ حضرت انسؓ جو رسول مقبول ﷺ کے کفش برادر اور خادم خاص تھے اس سے حدیث کی سماعت کی تھی اور بڑے بڑے تابعین کے فیض صحبت سے مستفید ہوئے تھے، اس وقت کوفہ میں انہیں کا مدرسہ مرجع عام تھا۔ معرو شعبہ نے جو ائمہ فن خیال کئے گئے ہیں انہی کے حلقہ درس میں تعلیم پائی تھی۔ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے جو فقہ کا سلسلہ چلا آتا تھا اس کا مدار انہیں پر رہ گیا تھا۔ ان باتوں کے ساتھ زمانے نے بھی ان کا ساتھ دیا تھا۔ یعنی دولت مند و فارغ البال تھے۔ اللہ نے انہیں فکر معاش سے آزاد کر رکھا تھا۔ اس وجہ سے نہایت اطمینان و دلجمعی کے ساتھ اپنے کام میں مشغول رہتے تھے، ان وجوہ سے امام ابوحنیفہؒ نے علم فقہ پڑھنا چاہا، تو استادی کے لئے انہی کو منتخب کیا، اس وقت درس کا طریقہ یہ تھا کہ استاد کسی خاص مسئلے پر زبانی گفتگو کرتا تھا۔ جس کو شاگرد یاد کر لیتے اور کبھی لکھ لیا کرتے تھے امام ابوحنیفہؒ پہلے دن بائیں صف میں بیٹھے۔ کیونکہ مبتدیوں کے لئے یہ امتیاز عموماً قائم رکھا جاتا تھا۔ لیکن چند روز کے بعد جب حمادؒ کو تجربہ ہو گیا کہ تمام حلقہ میں ایک شخص بھی حافظہ اور ذہانت میں ان کا ہمسر نہیں ہے۔ تو حکم دیا کہ

ابوحنیفہ سب سے آگے بیٹھا کریں۔

خود امام صاحب کا بیان ہے کہ میں حمادؒ کے درس میں دو برس تک رہا۔ پھر خیال ہوا کہ خود درس قائم کروں لیکن استاد کا ادب مانع آیا۔ اتفاق سے انہیں دنوں حماد کا ایک رشتہ دار جو بصرہ میں رہا کرتا تھا انتقال کر گیا حماد کے سوا اور کوئی اس کا وارث نہ تھا اور ضرورت سے ان کو بصرہ جانا پڑا چونکہ مجھے اپنا جانشین مقرر کر گئے تھے۔ تلامذہ اور ارباب حاجت نے میری طرف رجوع کیا۔ حماد کی غیر موجودگی میں بہت سے ایسے مسئلے پیش آئے جن میں ان سے میں نے کوئی، روایت نہیں سنی تھی۔ اس لئے اپنے اجتہاد سے جواب دیئے اور احتیاطاً ایک یادداشت لکھتا چلا گیا، دو مہینے کے بعد حماد بصرہ سے واپس آئے۔ میں نے وہ یادداشت خدمت میں پیش کی کل ساٹھ مسئلے تھے ان میں بیس میں غلطیاں نکالیں باقی کی نسبت فرمایا کہ تمہارے، جواب صحیح ہیں، میں نے دل میں عہد کرلیا کہ حضرت حمادؒ جب تک زندہ ہیں ان کی شاگردی کا تعلق نہ چھوڑوں گا۔

امام حمادؒ کا انتقال ۱۲۰ھ میں ہوا۔ امام ابوحنیفہؒ نے اگرچہ اور فقہائے کرام سے بھی تحصیل فقہ کی تھی لیکن فی الحقیقت فقہ میں ان کے اول و آخر استاد حضرت حمادؒ ہی تھے۔

امام اعظم ابوحنیفہؒ اور علم حدیث

حماد کی زندگی ہی میں امام نے علمِ حدیث کی طرف توجہ کی کیونکہ تفقہ فی الدین علم حدیث سے مکمل آگہی کے بغیر ناممکن تھی۔ اس وقت تمام ممالک اسلامیہ میں بڑے زور وشور سے حدیث کا درس جاری تھا اور ہر جگہ مسند اور روایت کے درس کھلے ہوئے تھے صحابہ جن کی تعداد کم از کم دس ہزار تھی۔ تمام ممالک میں پہنچ گئے تھے۔ اور اس کی وجہ سے اسناد و روایت کا ایک عظیم الشان سلسلہ قائم ہو گیا تھا لوگ جہاں کسی صحابی کا نام سن پاتے تھے۔ ہر طرف سے ٹوٹ پڑتے تھے کہ چل کر رسول اللہ کے حالات سنیں یا مسائل شرعیہ کی تحقیق کریں اس طرح تابعین کا جو صحابہ کے شاگرد کہلاتے تھے۔ بے شمار گروہ پیدا ہو گیا تھا جس کے سلسلے

تمام ممالک اسلامیہ میں پھیل گئے تھے۔ جن شہروں میں صحابہ یا تابعین کا زیادہ مجمع تھا وہ دارالعلم کے لقب سے ممتاز تھے۔ ان میں مکہ معظمہ، مدینہ منورہ، یمن، بصرہ اور کوفہ کو خاص امتیاز تھا کیونکہ اسلامی آثار کے لحاظ سے کوئی شہران مذکورہ مقامات کا ہم سر نہ تھا۔

کوفہ کو یہ فخر حاصل ہے کہ یہی شہر امام ابوحنیفہؒ کا مسکن تھا اسلام کی تمدنی زندگی کا سب سے اہم گہوارہ یہی شہر تھا۔ اس شہر کی بنیاد کی وجہ مورخین نے یہ لکھی ہے کہ ''حضرت عمر نے سعد بن ابی وقاص کو جو اس وقت حکومت کسریٰ کا خاتمہ کر کے مدائن میں سکونت پذیر تھے ۔خط لکھا کہ مسلمانوں کیلئے ایک ایسا شہر بساؤ جوان کا دارالہجرت اور قرار گاہ ہو۔'' حضرت سعدؓ نے کوفہ کی زمین پسند کی ۱۷ھ میں اس شہر کی بنیاد کا پتھر رکھا گیا۔ اول اول معمولی قسم کی عمارتیں تعمیر ہوئیں اسی وقت سے اطراف واکناف سے لوگ آ کر آباد ہونے لگے۔ تھوڑے ہی دونوں میں یہ شہر علم وفن کی درسگاہ اور تہذیب وتمدن اسلامی کا گہوارہ بن گیا۔ کچھ مدت کے بعد یہ حالت ہوئی کہ حضرت عمر فاروقؓ نے اس شہر کو رمح اللہ، کنز ایمان جیسے القاب سے نوازا۔ بعد میں اس کی وسعت اور کشادگی دیکھ کر چند ملکی مصلحتوں کی بناء پر امیر المومنین حضرت علیؓ نے اس شہر کو دارالخلافہ مقرر کیا۔ نیک اور پاکیزہ صحابہ کی اقامت سے یہاں ہر طرف قال اللہ اور قال الرسول کی صدائیں آنے لگیں۔ یہاں تک کہ کوفہ کا ہر گھر حدیث اور روات کی درس گاہ بن گیا۔

بصرہ بھی حضرت عمرؓ کے حکم سے آباد ہوا ہے۔ یہ شہر بھی وسعت علم اور اشاعت حدیث کے لحاظ سے کوفہ کا ہمسر تھا۔ کوفہ وبصرہ مکہ اور مدینہ کی طرح علوم اسلامی کے دارالعلم خیال کیے جاتے ہیں۔

تذکرہ الحفاظ میں علامہ ذہبی نے مسروق بن الاجدع، عبیدہ بن عمر، اسود بن یزید ،ابوعمر النخعی ذر بن حبیش، ربیع بن خثیم، عبدالرحمٰن بن ابی لیلی، ابوعبدالرحمٰن سلمی، شریح بن الحرث، شریح بن ہانی ابووائل شفیق ابن سلمہ قیس بن حازم، محمد بن سیرین حسن بصری، شعبہ بن حجاج، قتادہ بن دعامہ کا تذکرہ لکھا ہے اور ان سب کو حفاظ حدیث میں شمار کیا ہے۔ یہ سب

انہیں دونوں شہروں کے باشندے تھے۔ سفیان بن عیینہ جو ائمہ حدیث میں سے ہیں کوفہ کی تعریف کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔ کہ مناسک کے لئے مکہ، قرأت کے لئے مدینہ اور حلال اور حرام یعنی نفقہ کے لئے کوفہ ہے۔

فقہ میں امام صاحب نے زیادہ تر حمادؒ کا حلقہ درس کافی سمجھا تھا۔ لیکن حدیث میں یہ قناعت ممکن نہ تھی، یہاں صرف ذہانت اور اجتہاد سے کام نہیں چل سکتا تھا بلکہ درایت کے ساتھ روایت کی بھی ضرورت تھی حدیثیں اس وقت نہایت پریشان اور غیر مرتب حالت میں تھیں۔ یہاں تک کہ بڑے بڑے اساتذہ دو چار احادیث سے زیادہ یاد نہیں رکھتے تھے یہ تعداد ضروری کے لئے بھی ناکافی تھی اس کے علاوہ طریق روایت میں اس قدر اختلافات پیدا ہو گئے تھے۔ کہ ایک حدیث جب تک متعدد طریق سے نہ معلوم ہو اس کے مفہوم و تعبیر کا ٹھیک ٹھیک متعین ہونا دشوار تھا۔ امام ابوحنیفہؒ کو حماد کی صحبت اور پختگی عمر نے ان ضرورتوں سے اچھی طرح واقف کرا دیا تھا۔ اس لئے نہایت سعی و اہتمام سے حدیثوں کے بہم پہنچانے پر توجہ کی کوفہ میں کوئی ایسا محدث باقی نہ رہا تھا۔ جس کے سامنے امام صاحب نے زانوئے شاگردی تہہ نہ کیا ہو اور حدیثیں نہ سیکھی ہوں۔ اکثر مورخین نے ان کے اساتذہ کی تعداد ترانوے بتلائی ہے۔ ان اساتذہ میں سے اکثر تابعی تھے۔

ہم یہاں مختصراً ان محدثین کرام کے حالات زندگی درج کرتے ہیں کہ جس سے بہ آسانی یہ اندازہ ہو جائے گا کہ امام صاحب فن حدیث میں کس پایہ کے عالم تھے۔

امام شعبیؒ...... یہی بزرگ ہیں جنہوں نے امام کو علم دین کی تحصیل کی ترغیب دی تھی ان کے متعلق مشہور ہے کہ انہوں نے پانچ سو صحابہ کو دیکھا تھا۔ عراق، عرب اور شام میں چار اشخاص استاد کامل تسلیم کئے جاتے تھے ان میں سے ایک یہ تھے امام زہری کہا کرتے تھے کہ عالم صرف چار ہیں۔ مدینہ میں ابن المسیب، بصرہ میں حسن شام میں مکحول کوفہ میں شعبیؒ۔ حضرت عبداللہ بن عمر نے ان کو ایک بار معازی کا درس دیتے دیکھا تو فرمایا "واللہ یہ

شخص اس فن کو مجھ سے اچھا جانتا ہے'' ایک مدت تک منصب قضا پر مامور رہے۔ خلفا اور اعیان سلطنت ان کا نہایت احترام کرتے ۱۰۴ھ یا ۱۰۶ میں علم حدیث کا یہ آفتاب غروب ہو گیا۔ (بحوالہ سیرت تابعین)

سلمہ بن کہیلؒ...... مشہور محدث اور تابعی تھے۔ جندب بن عبداللہ، ابن ابی ادفیٰ ابوالطفیل اور ان کے علاوہ اور بہت سے صحابہؓ سے حدیثیں روایت کیں۔ ابن سعد نے ان کو کثیر الحدیث لکھا ہے۔ سفیان بن عیینہ فرماتے تھے کہ سلمہ بن کہیل ارکان میں سے ایک رکن ہیں ابن مہدی کا قول ہے کہ کوفہ میں چار شخص سب سے زیادہ صحیح الروایۃ تھے۔ منصور، سلمہ، عمرو بن مرہ ابو حصین۔

ابواسحاق سبیعیؒ...... کبار تابعین میں سے تھے عبداللہ بن عباس، عبداللہ بن عمر، ابن زبیر، نعمان بن بشیر، زین بن ارقم اور بہت سے صحابہ سے جن کے نام علامہ نوویؒ نے تہذیب الاسماء میں تفصیل سے لکھے ہیں احادیث کی سماعت کی ہے۔ عجلی نے کہا ہے کہ ۳۸ صحابہ سے ان کو بالمشافہ روایت ہے، علی بن المدینی جو حدیث میں امام بخاری کے استاد تھے کا قول ہے کہ ابواسحاق کے شیوخ حدیث میں نے شمار کئے تو کم و بیش تین سو ٹھہرے حافظ ابن حجر عسقلانی نے تہذیب میں ان کا مفصل تذکرہ لکھا ہے۔

حضرت سماک بن حربؒ...... سماک بن حرب بہت بڑے محدث تھے۔ اور حدیث میں امام ابوحنیفہؒ کے استاد تھے۔ امام سفیان ثوری نے ان کے بارے میں کہا ہے کہ سماک نے کبھی حدیث میں غلطی نہیں کی خود سماک کا بیان ہے کہ میں اسی ۸۰ صحابہ سے ملا ہوں۔

حضرت محارث بن وثارؒ...... محارث بن وثار نے عبداللہ بن عمرؓ اور جابرؓ وغیرہ سے رو ایت کی، امام سفیان ثوری کہا کرتے تھے کہ میں نے کسی زاہد کو نہیں دیکھا جس کو محارث پر ترجیح دوں علامہ ذہبی نے لکھا ہے کہ محارب عموماً حجۃ ہیں یحییٰ ابن معین، ابوزرعہ، دارقطنی، ابو حاتم، یعقوب ابن سفیان اور نسائی نے ان کو ثقہ تسلیم کیا ہے، کوفہ میں منصب قضا پر مامور

تھے، ۱۱۶ھ میں وفات فرمائی۔ عون بن عبداللہ بن عیینہ بن مسعود، حضرت ابوہریرہؓ اور عبداللہ بن عمرؓ سے حدیثیں روایت کیں، نہایت ثقہ اور پرہیزگار تھے۔

حضرت ہشام بن عروہؒ...... ہشام بن عروہ، معزز و مشہور تابعی تھے بہت سے صحابہ سے حدیثیں روایت کیں، بڑے بڑے ائمہ حدیث مثلاً سفیان ثوری، امام مالک، سفیان بن عیینہ کے شاگرد تھے۔ ابوجعفر منصور کے زمانے میں ان سے حدیثیں روایت کیں۔ خلیفہ منصور ان کا بہت احترام کرتا تھا۔ ایک بار ایک لاکھ درہم ان کو عطا کئے ان کی جنازہ کی نماز بھی منصور ہی نے پڑھائی تھی۔ صاحب طبقات ابن سعد نے لکھا ہے کہ ثقہ اور کثیر الحدیث تھے۔ ابوحاتم نے ان کو امام الحدیث کہا ہے۔

حضرت سلیمان بن مہرانؒ...... سلیمان بن مہران المعروف بہ اعمش کوفہ کے مشہور امام تھے صحابہ میں سے انس بن مالکؓ سے ملتے تھے اور عبداللہ بن ابی وقاص سے حدیث سنی تھی، سفیان ثوری اور شعبہ ان کے شاگرد ہیں)۔

امام ابوحنیفہؒ کی تحصیل حدیث کا دوسرا مدرسہ بصرہ تھا۔ جو امام حسن بصری، شعبہ و قتادہ کے فیض تعلیم سے مالا مال تھا، تعجب ہے کہ حسن بصری باوجودیکہ ۱۱۰ھ تک زندہ رہے لیکن امام کا ان کے درس سے مستفید ثابت نہیں ہوتا۔ البتہ قتادہ کی شاگردی کا ذکر عام محدثین نے کیا ہے اور تاریخ و سیر کی مختلف کتابوں سے معلوم ہوتا ہے کہ امام نے شعبہ سے روایت حدیث کی اجازت بھی لی تھی۔

حضرت قتادہؒ...... حضرت قتادہؒ بہت بڑے محدث اور مشہور تابعی تھے۔ حضرت انس بن مالک، عبداللہ بن سرخس اور ابوطفیلؓ اور دیگر صحابہؓ سے حدیثیں روایت کیں۔ حضرت انسؓ کے دو شاگرد جو نہایت نامور ہیں، ان میں سے ایک حضرت قتادہؒ ہیں۔ اس خصوصیت میں ان کو اللہ نے نہایت شہرت دی تھی۔ حدیث کو بعینہ ادا کرتے تھے یعنی الفاظ و معانی میں بالکل فرق نہیں ہوتا تھا۔ ان کی قوت حافظہ کی ایک عجیب حکایت لکھی ہے۔ عمرو بن عبداللہ کا بیان ہے، کہ یہ مدینہ میں سعید بن المسیب سے فقہ و حدیث پڑھتے تھے۔ ایک دن

انہوں نے فرمایا کہ تم ہر روز بہت سی باتیں پوچھتے ہو کیا تمہیں ان میں سے کچھ یاد بھی ہے۔ انہوں نے کہا ایک ایک حرف محفوظ ہے، چنانچہ جس قدر ان سے سنا تھا بقید تاریخ اور دن بیان کرنا شروع کر دیا وہ نہایت متعجب ہوئے اور کہا خدا نے دنیا میں تم جیسے لوگ بھی پیدا کئے ہیں۔ اسی بنا پر لوگ انہیں احفظ الناس کہا کرتے تھے۔ امام احمد بن حنبل نے ان کے تفقہ وواقفیت اختلاف وتفسیر دانی کی نہایت مدح کی ہے کہ کوئی شخص ان باتوں میں ان کے برابر ہوتو ہومگر ان سے بڑھ نہیں سکتا۔ حافظ ابن حجر عسقلانی نے تہذیب میں ان کا حال تفصیل سے لکھا ہے جس سے ان کی عظمت وشان کا اندازہ ہوسکتا ہے۔

حضرت شعبہؒ...... حضرت شعبہ بھی بڑے مرتبے کے محدث تھے دو ہزار حدیثیں ان کو ازبر یاد تھیں۔ سفیان ثوریؒ نے فن حدیث میں ان کو امیر المؤمنین مانا ہے۔ عراق میں یہ پہلے شخص ہیں جس نے جرح وتعدیل کے مراتب مقرر کئے۔ امام شافعی فرمایا کرتے تھے کہ شعبہ نہ ہوتے تو عراق میں حدیث کا رواج نہ ہوتا۔ ۱۶۰ھ میں اس جہان فانی سے رخصت ہو گئے شعبہ اور امام ابوحنیفہ کا آپس میں بہت گہرا تعلق تھا ان کی غیر موجودگی میں ان کی بڑی تعریف کیا کرتے تھے۔ ایک مرتبہ دوران تذکرہ فرمانے لگے کہ جس طرح میں یہ جانتا ہوں کہ آفتاب روشن ہے اتنی یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ علم اور ابوحنیفہ ساتھ ساتھ ہیں۔ یحییٰ بن معینؒ سے جو امام بخاریؒ کے استاد تھے۔ کسی نے پوچھا کی آپ ابوحنیفہ کی نسبت کا کیا خیال رکھتے ہیں؟۔ فرمایا اس قدر کافی ہے کہ شعبہ نے ان کو حدیث وروایات کی اجازت دی اور شعبہ آخر شعبہ ہی ہے۔ بصرہ کے اور شیوخ جن سے امام نے حدیثیں روایت کیں ان میں عبدالکریم بن امیہ اور عاصم بن سلیمان الاحول زیادہ ممتاز ہیں۔

امام ابوحنیفہؒ حرمین کی طرف

امام ابوحنیفہ گو اگرچہ ان درسگاہوں سے حدیث کا بڑا ذخیرہ ہاتھ آیا تھا۔ تاہم تحصیل کی سند حاصل کرنے کے لئے حرمین جانا ضروری تھا جو علوم مذہبی کے اصل مرکز تھے۔ تاریخو

ل سے یہ پتا نہیں چلتا کہ امام کا پہلا سفر کس سن میں واقع ہوا تاہم ظن غالب ہے کہ جب انہوں نے حرمین کا سفر کیا تو تحصیل کا آغاز تھا۔ مورخ ابن خلکان نے لکھا ہے کہ وکیع نے خود امام ابوحنیفہؒ سے روایت کی ہے کہ حج میں ایک حجام نے جس سے میں نے بال منڈوائے تھے کئی باتوں سے مجھ پر گرفت کی میں نے اجرت پوچھی تو بولا مناسک چکائے نہیں جاتے میں چپ ہو کر اصلاح بنوانے لگا اس نے پھر ٹوکا کہ حج میں چپکا نہیں رہنا چاہیے تکبیر کہے جاؤ۔ حجامت سے فارغ ہو کر گھر چلا تو اس نے کہا پہلے دو رکعت نماز پڑھ لو پھر کہیں جانا، میں نے متعجب ہو کر پوچھا یہ مسائل تو نے کہاں سے سیکھے بولا عطاء ابن ابی رباح کا فیض ہے۔ اس واقعہ سے زیادہ قریبی قیاس کیا ہو سکتا ہے کہ ابتدائی زمانہ تھا۔ جس زمانے میں امام ابو حنیفہؒ مکہ معظمہ پہنچے درس وتدریس کا نہایت زور تھا۔ متعدد اساتذہ کی جو فن حدیث میں کمال رکھتے تھے اور اکثر صحابہ کی خدمت سے مستفید ہوئے تھے الگ الگ درسگاہ قائم تھی ان میں عطاء ابن ابی رباح کا حلقہ درس سب سے زیادہ، وسیع اور مستند تھا۔ عطا مشہور تابعی تھے اکثر صحابہ کی خدمت میں رہتے تھے اور ان کے فیض صحبت سے اجتہاد کا رتبہ حاصل کیا تھا۔ حضرت عبداللہ بن سائب، عقیلؓ، ابن عمر ابن زبیر، اسامہ بن زبیر، جابر ابن عبداللہ زبیر ابن ارقم رافعؓ ابو درداء، ابو ہریرہ رضوان اللہ علیہم اجمعین وغیرہ اور بہت سے صحابہؓ سے حدیثیں سنی تھیں، خود ان کا بیان ہے کہ میں دو بزرگوں سے ملا ہوں جن کو رسول کریم ﷺ کی صحبت کا شرف حاصل تھا۔ مجتہدین صحابہ ان کے علم وفضل کے بہت معترف تھے۔ عبداللہ بن عمر جو حضرت فاروق اعظمؓ کے فرزند اور صاحب افتا تھے اکثر فرماتے تھے کہ عطا بن ابی رباح کے ہوتے لوگ میرے پاس کیوں آتے ہیں۔ حج کے موقع کے زمانے میں ہمیشہ سلطنت کی طرف سے ایک منادی مقرر ہوتا تھا کہ عطا کے سوا کوئی شخص فتویٰ دینے کا مجاز نہیں ہے، بڑے بڑے ائمہ حدیث مثلاً امام اوزاعی، زہری، عمرو بن دینار انہی کے حلقہ درس سے نکل کر استاد کہلائے۔

امام ابوحنیفہؒ استفادہ کی غرض سے ان کی خدمت میں حاضر ہوئے تو انہوں نے

احتیاط کے لحاظ سے عقیدہ پوچھا تو امام نے کہا میں اسلاف کو برا نہیں کہتا گنہگار کو کافر نہیں سمجھتا قضا و قدر کا قائل ہوں عطا نے اجازت دی کہ حلقہ درس میں شریک ہوا کریں۔ روز بروز وہ ان کی ذہانت کے جوہر کھلنے لگے اور اس کے ساتھ استاد کی نظر میں ان کا وقار بھی بڑھتا گیا یہاں تک کہ جب حلقۂ درس میں جاتے اور عطا اوروں کو ہٹا کر ان کو اپنے پہلو میں جگہ دیتے۔

عطا ۱۱۵ھ تک زندہ رہے۔ اس مدت میں امام ابوحنیفہؒ کو جب مکہ معظّمہ جانے کا اتفاق ہوا تو ان کی خدمت میں اکثر حاضر رہتے اور مستفید ہوتے۔

عطا کے سوا مکہ معظّمہ کے اور محدثین جن سے امام نے حدیث کی سند لی ان میں عکرمہ کا ذکر خصوصیت کے ساتھ کیا جا سکتا ہے عکرمہ حضرت عبداللہ بن عباس کے غلام اور شاگرد تھے انہوں نے نہایت توجہ اور کوشش سے ان کی تربیت کی تھی یہاں تک کہ اپنی زندگی ہی میں اجتہاد و فتویٰ کا مجاز قرار دیا تھا عکرمہ نے اور بہت سے صحابہ حضرت علیؓ، ابو ہریرہؓ، عبداللہ بن عمرؓ، عقبہ بن عمرؓ صفوان، جابرؓ، ابوقتادہ سے حدیثیں سنی تھیں۔ اور فقہی مسائل تحقیق کئے تھے کم و بیش ستر ۷۰ مشہور تابعین حدیث و تفسیر میں ان کے شاگرد ہیں اما شعبی کہا کرتے تھے کہ قرآن جاننے والا عکرمہ سے بڑھ کر نہیں رہا سعید بن جبیر جو کہ تابعین کے سردار تھے ان سے ایک شخص نے پوچھا کہ دنیا میں آپ سے بڑھ کر کوئی عالم ہے فرمایا ہاں عکرمہ۔

امام ابوحنیفہؒ مدینہ کی طرف

اسی عہد میں یعنی ۱۰۲ھ سے پہلے امام ابوحنیفہؒ نے مدینہ کا رخ کیا۔ مقصد یہ تھا کہ اس جگہ سے حدیث کا علم حاصل کیا جائے جو حدیث کا منبع اور مخزن تھا۔ صحابہ کے بعد تابعین کے گروہ میں سے سات شخص علم فقہ و حدیث کے مرجع بن گئے تھے اور مسائل شرعیہ میں ان کی طرف رجوع کیا جاتا تھا۔ ان لوگوں نے بڑے بڑے صحابہ کے دامن فیض میں تعلیم پائی تھی۔ اور یہ مرتبہ حاصل کیا تھا کہ تمام ممالک اسلامیہ میں واسطہ در واسطہ ان کے درس کا

سلسلہ پھیلا ہوا تھا۔ یہ لوگ ہمعصر تھے اور ایک مشترکہ مجلس افتا کے ذریعے سے تمام شرعی مسائل کا فیصلہ کرتے تھے۔ مدینہ کی فقہ جس کے تدوین امام مالک نے کی اس کی بنیاد زیادہ تر انہی کے فتوؤں پر ہے امام ابوحنیفہؒ مدینہ پہنچے تو ان بزرگوں میں دو شخص زندہ تھے۔ سلیمان و سالم بن عبداللہ، سلیمان حضرت میمونہ کے جو رسول اللہ ﷺ کی ازواج مطہرات میں تھیں کے غلام تھے اور فقہائے سبعہ میں فضل وکمال کے لحاظ سے ان کا دوسرا نمبر تھا۔ سالم حضرت عمر فاروق ؓ کے پوتے اور اپنے والد بزرگوار سے تعلیم پائی تھی۔ امام ابوحنیفہؒ دونوں بزرگوں کی خدمت میں حاضر ہوئے اور ان سے حدیثیں روایت کیں۔

امام ابوحنیفہؒ کی طالب العلمی کی ساخت اگرچہ مدینہ تک محدود ہے تاہم تعلیم کا سلسلہ اخیر زندگی تک قائم رہا۔ اکثر حرمین جاتے اور مہینوں قیام کرتے حج کی تقریب میں ممالک اسلامی کے ہر گوشہ سے بڑے بڑے اہل کمال مکہ آکر جمع ہو جاتے تھے۔ جن کا مقصد حج کے ساتھ افادہ اور استفادہ بھی ہوتا تھا امام صاحب اکثر ان لوگوں سے ملتے اور مستفید ہوتے امام اوزاعی اور مکحول شامی کہ شام کے امام المذہب کہلاتے تھے امام ابوحنیفہؒ نے مکے ہی میں ان لوگوں سے تعارف حاصل کیا اور حدیث کی سند لی۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ امام صاحب کی ذہانت و اجتہاد کی شہرت دور دور تک پہنچ گئی تھی۔ یہاں تک کہ ظاہر بینوں نے ان کو قیاس مشہور کر دیا تھا انہیں دنوں میں عبداللہ بن مبارک نے جو امام ابوحنیفہؒ کے مشہور شاگرد ہیں۔ بیرو ت کا سفر کیا کہ امام اوزاعی سے فن حدیث کی تکمیل کریں پہلی ہی ملاقات میں اوزاعی نے ان سے پوچھا کہ کوفہ میں امام ابوحنیفہ کون شخص پیدا ہوا ہے۔ جو دین میں نئی باتیں نکالتا ہے۔ انہوں نے کچھ جواب نہ دیا اور گھر چلے آئے۔ دو تین دن کے بعد پھر گئے تو اجزا ساتھ لیتے گئے۔ اوزاعی نے ان کے ہاتھ سے اجزا لے لئے سرنامہ پر لکھا تھا۔ قال نعمان بن ثابت۔ دیر تک غور سے دیکھا پھر عبداللہ سے پوچھا نعمان کون بزرگ ہیں۔ انہوں نے کہا عراق کے ایک شخص ہیں، جن کی صحبت میں میں رہا ہوں۔ فرمایا بڑے پایہ کا شخص ہے۔ عبداللہ نے عرض کی یہ وہی امام ابوحنیفہؒ ہیں جن کو آپ مبتداع بتاتے ہیں۔ (بحوالہ تارخ بغداد)

امام اوزاعیؒ کو اپنی غلطی پر افسوس ہوا حج کی تقریب پر امام اوزاعیؒ مکہ گئے تو امام ابوحنیفہ سے ملاقات ہوئی اتفاق سے عبداللہ بن المبارکؒ بھی موجود تھے، ان کا بیان ہے کہ امام ابوحنیفہؒ نے اس خوبی سے تقریر کی کہ امام اوزاعیؒ حیران رہ گئے امام ابوحنیفہؒ کے جانے کے بعد مجھ سے کہا کہ اس شخص کے کمال نے اس کو لوگوں کا محسود بنا دیا ہے۔ بے شبہ میری بدگمانی غلط تھی، جسکا مجھے بہت افسوس ہے، تاریخوں سے ثابت ہوتا ہے کہ امام ابوحنیفہؒ نے فن حدیث میں امام اوزاعیؒ کی شاگردی کی ہے۔ غالباً یہی وہ زمانہ ہوگا۔

حضرت ابوحنیفہؒ امام باقرؒ کی خدمت میں

حضرت امام باقرؒ سے جو اپنے زمانے کے محدث، فقیہ اور بڑے متقی صحابی تھے امام ابوحنیفہؒ کی ملاقات کا تذکرہ مؤرخوں نے کیا ہے۔ لکھتے ہیں کہ ایک بار امام ابوحنیفہؒ مدینہ گئے تو امام باقرؒ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ ان کے ایک ساتھی نے تعارف کرایا کہ یہ امام ابو حنیفہؒ ہیں۔ انہوں نے امام سے مخاطب ہو کر فرمایا ہاں تم ہی قیاس کی بنا پر ہمارے دادا کی حدیثوں سے مخالفت کرتے ہو' انہوں نے نہایت ادب سے کہا ''العیاذ باللہ'' حدیث کی کون مخالفت کرسکتا ہے آپ تشریف رکھیں تو میں کچھ عرض کروں پھر مندرجہ ذیل گفتگو ہوئی۔

ابوحنیفہ:۔ مرد ضعیف ہے یا عورت؟

امام باقر:۔ عورت۔

ابوحنیفہ:۔ وراثت میں مرد کا حصہ زیادہ ہے یا عورت کا؟

امام باقر:۔ مرد کا۔

ابوحنیفہ:۔ اگر میں قیاس لگاتا ہوں کہ عورت کو زیادہ حصہ دیا جائے، کیوں کہ ضعیف کو ظاہر قیاس کی بنا پر زیادہ ملنا چاہئے تو پھر پوچھا نماز افضل ہے یا روزہ؟

امام باقر:۔ نماز۔

ابوحنیفہ:۔ اس اعتبار سے حائضہ عورت پر نماز کی قضاء واجب ہونی چاہئے نہ روزہ

کی۔ حالانکہ میں روزہ ہی کی قضا کا فتویٰ دیتا ہوں امام باقر اس قدر خوش ہوئے کہ اٹھ کر پیشانی چوم لی۔ ابوحنیفہ ایک مدت تک استفادہ کی غرض سے ان کی خدمت میں حاضر رہے اور فقہ و حدیث کے متعلق بہت سی نادر باتیں حاصل کیں شیعہ و سنی دونوں نے تسلیم کیا کہ ابوحنیفہ کی معلومات کا بڑا ذخیرہ حضرت ممدوح کی فیضِ صحبت کا نتیجہ تھا۔

امام مالک نے ان کے فرزند رشید حضرت جعفر صادقؒ کے فیضِ صحبت سے بڑا فائدہ اٹھایا۔ فنِ حدیث کی تحصیل میں امام کو ایک بہت اونچا مقام حاصل تھا کیونکہ ان کے شیوخ حدیث لاتعداد تھے۔ ابوحفص عمر نے دعویٰ کیا ہے کہ امام نے کم از کم چار ہزار شخصوں سے حدیثیں روایت کی ہیں۔ علامہ ذہبی نے تذکرۃ الحفاظ میں جہاں انکے شیوخ کے نام شمار کئے ہیں وہیں آخر میں لکھ دیا ہے "خلق کثیر"

امام ابوحنیفہؒ کی احتیاط و تحقیق

امام صاحب روایت میں بے حد محتاط تھے اور اس نکتہ سے خوب واقف تھے کہ روایت میں جس قدر واسطے زیادہ ہوتے ہیں اسی قدر تغیر و تبدیل کا احتمال بڑھ جاتا ہے۔ یہی بات ہے کہ ان کے اساتذہ اکثر تابعین ہیں جن کا رسول اللہ تک صرف ایک واسطہ ہے یا وہ لوگ ہیں جو مدت تک بڑے بڑے تابعین کی صحبت میں رہے تھے اور علم و فضل، دیانت و پرہیز گاری کے نمونہ خیال کیے جاتے تھے۔ ان دو قسموں کے سوا اگر ہیں شاذ ہیں۔ ان کی تعلیم کا طریقہ بھی عام طالب علم سے الگ تھا۔ بحث و اجتہاد کی شروع سے عادت تھی اور اس باب میں وہ استادوں کی مخالفت کی کوئی پرواہ نہ کرتے تھے۔

ایک بار حماد کے ساتھ اعمش کی مشایعت کو نکلے، چلتے چلتے مغرب کا وقت آ گیا وضو کے لئے پانی کی تلاش ہوئی مگر کہیں پانی نہ مل سکا، حماد نے تیمّم کا فتویٰ دیا امام نے مخالفت کی کہ اخیر وقت تک پانی کا انتظار کرنا چاہیئے۔ اتفاق یہ کہ کچھ دور چل کر پانی مل گیا اور سب نے وضو سے نماز ادا کی، کہتے ہیں کہ یہ پہلا موقع تھا کہ استاد کی مخالفت کی۔ امام شعبیؒ، ان کے

استاد قائل تھے۔ کہ معصیت میں کفارہ نہیں ایک دفعہ استاد شاگرد کشتی میں سوار جارہے تھے اس مسئلہ کا ذکر آیا، انہوں نے کہا "ضرور معصیت میں کفارہ ہے۔" کیونکہ خدا نے ظہار میں کفارہ مقرر کیا ہے اور اس آیت وانّھم لیقولون منکرا من القول و زورا میں تصریح کردی ہے کہ ظہار معصیت ہے" امام شعبیؒ کچھ جواب نہ دے سکے۔ عطا بن ابی رباح سے کسی نے آس آیت کے معنی پوچھے وا تینا ہ اھلہٗ و مثلھم معھم عطا نے کہا خدا نے حضرت ایوب کی آل اولاد جو مرگئی تھی زندہ کردی اور ان کے ساتھ اور نئی پیدا کردی، امام ابوحنیفہ نے کہا جو شخص کسی کی صلب سے نہ پیدا ہو وہ اس کی اولاد کیوں کر ہوسکتا ہے۔

امام ابوحنیفہؒ اور تدوین فقہ

امام صاحب کی زندگی کا سب سے بڑا اور عظیم الشان کارنامہ فقہ اسلامی کی تدوین ہے، بلاشبہ امام ابوحنیفہؒ پہلے شخص ہیں، جنہوں نے فقہ اسلامی باقاعدہ منظم طریقے سے مدون کیا۔ فقہ کے لغوی معنی سمجھ کے ہیں۔ قرآن کریم میں بھی یہ لفظ انہی معنی میں استعمال کیا گیا ہے۔ اصلاح شریعت میں اعمال شرعیہ کے مسائل فقہ کہلاتے ہیں۔ اس سے زیادہ جامع تعریف یہ ہے کہ فقہ شریعت کے ان فروعی احکام کے علم کو کہتے ہیں جو احکام کے مفصل دلائل سے حاصل ہوئے ہوں۔

علماء نے فقہ کے چار ماخذ بیان کئے ہیں۔ ۱...... کتاب اللہ ۲...... سنت رسول ﷺ
۳...... اجماع۔ صحابہ وائمہ مجتہدین ۴...... قیاس

اسلامی شریعت میں قرآن کریم کو وہی حیثیت حاصل ہے جو ملکی قوانین میں دستور کی ہوتی ہے۔ قرآن دور نبوی ﷺ اور آپ کے بعد قیامت تک ساری امت کیلئے رہنما اور پیشوا ہے۔ قرآن کی وہی حیثیت اور صفت ہے جو ایک دستور کی ہوتی ہے۔ یعنی اس میں منصوص احکام کا مجمل بیان ہے اور یہی بیان الٰہی شریعت کا ماخذ اول ہے۔ اسلامی شریعت کا دوسرا ماخذ سنت رسول ہے لفظ سنت کا اطلاق ہر اس قول، فعل یا تقریر پر ہوتا ہے۔

جوآنحضرت ﷺ کی طرف منسوب ہواور آپ سے منقول ہو کر ہم تک پہنچا ہواس معنی کی رو سے سنت لفظ حدیث کے مترادف ہے۔

تیسرا ماخذ جو اجماع کہلاتا ہے کا مطلب یہ ہے کہ آنحضور ﷺ جب اس عالم سے تشریف لے گئے تو بعد میں ایسے شرعی مسائل میں صحابہ کو باہمی مشاورت کی ضرورت پڑی جو یا تو مجمل تھے یا پھر حضور ﷺ کے ایک ہی عمل کے بارے میں مختلف روایتیں جمع ہوگئیں۔ تو ان مختلف فیہ روایتوں میں صحابہ کا جو متفقہ فیصلہ ہوتا اسی کو اجماع کہا جاتا ہے۔

فقہ اسلامی کا چوتھا ماخذ قیاس ہے کسی امر کا جو شرعی حکم ہے وہی حکم علت مشترکہ کی وجہ سے کسی دوسرے امر کا اقرار دینا قیاس کہلاتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں یعنی کوئی چیز شریعت میں کسی علت کی وجہ سے حرام ہے تو اگر وہی علت کسی دوسری چیز میں پائی جاتی ہے تو از روئے قیاس اس کو بھی حرام قرار دیا جائے گا۔

اس کی مثال یہ ہے کہ قرآن کریم میں اللہ نے حکم دیا ہے کہ **وَلَا تَقْرَبُوا الزِّنٰی اِنَّهٗ كَانَ فَاحِشَةً** یعنی زنا کے قریب نہ جاؤ کہ بے شک وہ بے حیائی ہے۔ اب زنا اس لئے حرام ہے کہ یہ بے حیائی ہے اس کی حرمت کی علت بے حیائی ہے پس وہ کام جس میں بے حیائی ہوگی حرام قرار دیا جائے گا۔ لیکن بے حیائی اور فحش کی اپنی تعریف ہے، جو کام بھی فحش پر اطلاق کیا جائے گا۔ حرام ہوگا۔

تدوین فقہ کی ابتداء دوسری صدی ہجری کے ربع دوم میں ہوئی اس وقت سے لیکر موجودہ دور تک فقہ اسلامی کو تین ادوار میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔

دوسری صدی کا ربع اول ختم ہو چکا تھا اسلامی مملکت کے حدود بہت زیادہ پھیل چکے تھے۔ جب اسلام کی سادہ تعلیمات کو دنیا کی مختلف اور نگارنگ تہذیبوں سے سابقہ پڑا تو نت نئے مسائل سامنے آئے۔ اسی دور میں اللہ نے امام ابوحنیفہؒ کو وہ استطاعت وقوت عطا فرمائی کہ وہ اپنی مجتہدانہ فطرت وذہانت سے ان مسائل کا حل دریافت کریں چنانچہ امام ابوحنیفہؒ ۱۲۱ھ میں تدوین فقہ کی طرف پورے طور سے متوجہ ہوئے۔

فقہ کی تدوین کا بنیادی مقصد تو یہ تھا کہ عملی زندگی میں رسول کریم ﷺ کی لائی ہوئی شریعت کے متفرق مسائل کو منظم اور مرتب کر دیا جائے اور اس کی ایسی آخری اور فیصلہ کن صورت معین کر دی جائے جس پر مسلمان سہولت کے ساتھ کما حقہ عمل کر سکیں۔ مگر شریعت اسلامی کیونکہ کسی خاص دور اور معین قوم اور علاقہ کیلئے نہ تھی بلکہ اسے قیامت کے لئے جاری اور نافذ رہنا تھا اس لئے ضروری تھا کی اس کی تدوین کی جائے اور بوقت تدوین دو باتوں کا خاص طور پر اہتمام کیا جائے۔ اول یہ کہ وہ شخصی رائے اور اجتہاد پر منحصر نہ ہو۔ اس کی ترتیب و تدوین میں مختلف علوم وفنون کے، ماہرین اور اساتذہ فن شامل ہوں جن کا علم وفضل مسلم اور ان کا زہد وتقویٰ اللہ کو مقبول ہو۔ دوسرے اس اہم کام کی انجام دہی کے لئے کسی ایسی جگہ کا انتخاب کیا جائے جو نہ صرف مختلف علوم وفنون کا گہوارہ ہو بلکہ قدیم وجدید، عربی وعجمی تہذیب کا سنگھم بھی ہو۔ امام ابوحنیفہؒ نے ان دونوں باتوں کا پورا پورا لحاظ رکھا اور اس کے لئے کوفہ کا انتخاب کیا۔ یہی وہ خاص شہر تھا جہاں عرب وعجم کی تہذیبیں مل رہی تھیں۔

امام ابوحنیفہؒ نے مسائل کی ترتیب اور اصول وضوابط کی تدوین اپنی ذات تک محدود نہیں رکھی۔ بلکہ چالیس علماء اور ائمہ کی ایک مجلس قائم کی۔ اس مجلس میں تمام علوم کے ماہر اور ائمہ جمع کئے گئے۔ جن کی تدوین فقہ میں ضرورت پیش آ سکتی تھی۔ ان ائمہ فن کی تعداد چالیس تھی جیسا کہ امام طحاوی نے امام مالک کے شاگرد اسد بن فرات کا قول نقل کیا ہے کہ۔

''امام ابوحنیفہؒ کی مجلس تدوین فقہ کے اراکین چالیس تھے'' یہ سب کے سب فقہ میں درجہ اجتہاد کو پہنچے ہوئے تھے ان میں دس ممتاز ترین اہل علم پر مشتمل ایک مجلس خاص تھی جس کے ارکان ابو یوسف، داؤد طائی، اسد بن عمر، یوسف بن خالد اور یحییٰ بن ابی زائدہ تھے۔ امام ابوحنیفہؒ کی مجلس تدوین فقہ کے متعلق مشہور محدث وکیع بن الجراح کی رائے ہے۔

''امام ابوحنیفہؒ کے کام میں غلطی کیسے رہ سکتی تھی۔ جب کہ واقعہ یہ تھا کہ ان کے ساتھ ابو یوسف، زفر اور محمد جیسے قیاس واجتہاد کے ماہر موجود تھے اور حدیث کے باب میں یحییٰ بن ذکریا ابن زائدہ منص بن غیاث، صبان جیسے ماہرین حدیث قاسم بن معن جیسے لغت عرب

کے ماہر، داؤد بن نصیر طائی اور فضیل بن عیاض جیسے زہد وتقویٰ کے مجسمے ان کے شریک کار تھے۔ ظاہر ہے کہ ایسے جامع کمالات وفضائل رفقاء اور مشیروں کی موجودگی میں غلطی کیسے رہ سکتی ہے۔ (ملخص از جامع الاسانید)

امام ابوحنیفہؒ کا طریقہ استنباط یہ تھا کہ پہلے ہر مسئلہ کو کتاب اللہ سے مستنبط کیا جاتا اگر کامیابی ہو جاتی تو اس کو معین فرما دیتے اگر کسی طور کتاب اللہ سے براہ راست کوئی سراغ نہ ملتا تو سنت اللہ رسول اللہ ﷺ میں اس مسئلے کی تلاش وجستجو کی جاتی، سنت رسول اللہ ﷺ میں یہ خاص بات پیش نظر رہتی کہ رسول اللہ کا آخری عمل اور آخری رائے کیا تھی آپ ہمیشہ اسکو اختیار فرماتے اگر حجازی اور عراقی صحابہ کی مرفوع حدیثوں میں اختلاف ہوتا تو بنا بر فقہ راوی فقہ کی روایت کو ترجیح دیتے۔

اگر حدیث طیبہ سے بھی کوئی فیصلہ نہ ہوتا تو پھر اہل فتویٰ صحابہ اور فقہاء تابعین کے فیصلے اور اقوال تلاش کرتے اور جس امر پر فقہاء صحابہ کا اجماع ہوتا اس کو اختیار کر لیتے اگر یہاں بھی کوئی جواب نہ پاتے تو پھر چوتھے مرحلے پر قیاس اور استحسان کی طرف آتے اور انکی روشنی میں مسائل کو حل کرتے۔ مسئلہ پر غور کرتے وقت یہ بھی دیکھتے کہ مسئلہ سے متعلق نصوص کی حیثیت تشریعی ہے یا غیر تشریعی اس ضمن میں مسائل کے طے کرنے کی بھی ضرورت پڑتی تھی نصوص میں ضابطہ کلیہ اور واقعات جزئیہ میں اگر تعارض ہوتا تو ضابطہ نص کو ترجیح دیتے اور واقعہ جزئیہ کی توجیہ کر لیتے۔

امام ابوحنیفہؒ کی ترتیب وتدوین فقہ کی طرف متوجہ ہونے سے پہلے فقہاء اور محدثین کسی مسئلے کے وقوع پذیر ہونے سے پہلے اس مسئلے پر حکم لگانے کے بارے میں غور وخوض کو معیوب سمجھتے تھے مگر امام ابوحنیفہؒ سب سے پہلے شخص ہیں کہ جنہوں نے اس رجحان کے خلاف عمل کیا، چنانچہ فرماتے ہیں۔

''اہل علم کو چاہیئے کہ جن باتوں سے لوگوں میں مبتلا ہونے کا امکان ہے ان پر غور وفکر کریں تا کہ اگر وہ کسی وقت وقوع پذیر ہوں تو لوگوں کے لئے نئی اور انوکھی بات نہ ہو بلکہ یہ

بات پیش نظر ہی رہنی چاہیئے کہ ان امور میں کسی نہ کسی وقت مبتلا ہونا ہی پڑے گا تو ابتلاء کے وقت شریعت نے کیا راہ معین کی ہے۔ بہتر ہے کہ ابھی سے سوچ کر رکھ لیں۔

مشہور محدث قیس بن ربیع نے بڑے مختصر الفاظ میں اس حقیقت کی طرف اشارہ کیا ہے اس معاملے میں امام ابو حنیفہؒ کی فوقیت واولیت کا واضح طور پر اعتراف کیا ہے، کہتے ہیں ،امام ابو حنیفہؒ ان مسائل کو جو ابھی وقوع پذیر نہیں ہوئے سب لوگوں سے زیادہ جانتے تھے ،اس بنا پر امام ابو حنیفہؒ نے ان تمام فقہی مسائل پر بالتفصیل غور وفکر شروع کیا جو اگر چہ ابھی وقوع پذیر نہیں ہوئے تھے۔ مگر ایک نہ ایک دن ان کا وقوع متوقع اور ممکن تھا۔ مجلس تدوین کا طریقہ یہ تھا کہ امام صاحب کے گرد تمام اراکین مجلس بیٹھ جاتے۔ امام صاحب ایک ایک مسئلہ کو بصورت سوال پیش کرتے لوگوں کے خیالات معلوم کرتے جو کچھ اراکین مجلس کے آرا ہوتے ان کو بغور سنتے اگر تمام اراکین جواب مسئلہ میں متفق ہو جاتے تو وہ فیصلہ اسی وقت قلم بند کر لیا جاتا۔ اختلاف کی صورت میں نہایت آزادی کے ساتھ مسئلہ کے تمام پہلوؤں پر بحث وتمحیص ہوتی بسا اوقات یہ بحث ہفتوں جاری رہتی سب کی بحثیں سننے کے بعد امام صاحب اپنی رائے اور فیصلہ کا اظہار کرتے آپ کی رائے اتنی نپی تلی ہوتی کہ سب لوگ اسے بلا تامل قبول کر لیتے اور مسئلہ کا ایک رخ معین ہو جاتا۔ کبھی ایسا ہوتا کہ بعض اراکین مجلس امام صاحب کی رائے سے اختلاف کرتے تو ان کی اختلافی رائے بھی فوراً لکھ لی جاتی جب کوئی مشکل اور پیچیدہ مسئلہ طویل بحث ونظر کے بعد اتفاق رائے سے طے پاتا تو اراکین شوریٰ بے اختیار اللہ اکبر پکار اٹھتے۔

تقریباً بائیس سال کی اس شبانہ روز سخت کاوش کے بعد امام صاحب کی مجلس تدوین فقہ کا مجموعہ فقہی تیار ہو کر اہل علم کے ہاتھوں میں آیا یہ مجموعہ تراسی ہزار دفعات پر مشتمل تھا۔ جس میں اڑتیس ہزار مسائل عبادات سے متعلق تھے اور باقی پنتالیس ہزار کا تعلق معاملات اور عقوبات سے تھا۔ اسمیں انسان کے دنیوی کاروبار کے متعلق آئین وضوابط اور معاشیات و سیاسیات کے بارہ میں تمام بنیادی اجتماعی امور موجود تھے۔ یہ مجموعہ ۱۴۴ھ سے پہلے مکمل

ہو چکا تھا مگر بعد میں اس میں اضافے ہوتے رہے امام صاحب کے ایام اسیری میں بھی یہ سلسلہ چلتا رہا حضرت عبداللہ ابن مبارکؒ کا قول ہے۔ ''میں نے امام ابوحنیفہؒ کی کتابوں کو متعدد بار لکھا ان میں اضافے بھی ہوتے رہے ان اضافوں کو بھی لکھ لیا کرو۔''

اس مجموعے نے امام صاحب کے زمانے میں قبول عام حاصل کیا اس مجموعہ کے تکمیل کے بعد امام ابوحنیفہؒ نے اپنے تلامذہ کو جمع ہونے کا حکم دیا چنانچہ کوفہ کی جامع مسجد میں ایک ہزار اہل علم شاگرد جمع ہوئے جن میں وہ چالیس علماء بھی موجود تھے جو امام ابوحنیفہؒ کی مجلس تدوین کے رکن تھے امام صاحب نے ان تمام اہل علم سے مخاطب ہو کر کہا۔

میری دلی مسرتوں کا سرمایہ صرف تم لوگ ہو تمہارے وجود میں میرے غم واندوہ کا مداوا ہے۔ میں نے فقہ اسلامی کی زین تمہارے لئے تیار کر دی ہے۔ اب تمہارا جب اور جس وقت دل چاہے تم اس پر سوار ہو سکتے ہو میں نے ایسی صورت حال پیدا کر دی ہے، کہ لوگ تمہارے نقش تل تلاش کریں گے۔ اور اسی چیز پر چلنے کی کوشش کریں گے میں نے گردنوں کو تمہارے لئے جھکا دیا۔ اب وقت آ گیا ہے کہ تم سب علم کی حفاظت میں میری مدد کرو۔ تم میں چالیس آدمی ایسے ہیں جو قاضیوں کی تربیت وتادیب کا کام بخوبی سرانجام دے سکتے ہیں۔ میں تم سب کو اللہ کی قسم اور اس علم کا واسطہ دیتا ہوں جو تم کو ملا ہے کہ اس علم کو کبھی ذلیل نہ کرو۔ اس علم کو محکوم ہونے کی بے عزتی سے بچانا اگر تم لوگوں میں سے کسی کو عہدہ قضا کی ذمہ داری سونپی جائے تو ایسی کمزوریوں کو اپنے فیصلوں میں ہرگز لحاظ نہ کرنا جو لوگوں کی نظروں سے پوشیدہ ہوں، قضا کا عہدہ اس وقت تک درست ہے جب تک قاضی کا ظاہر وباطن ایک ہو۔ تم میں سے جو اس عہدہ کو قبول کرے وہ اپنے اور عوام کے درمیان رکاوٹیں قائم نہ کرے۔ ہر حاجت مند کی تم تک رسائی ہونی چاہیئے۔ پانچ وقت کی نمازیں مسجد میں پڑھے مسلمانوں کا امیر اگر مخلوق خدا کے ساتھ غلط رویہ اختیار کرے تو وہ اس سے باز پرس کریں۔

امام ابوحنیفہؒ کی اس تقریر کے بعد مجموعہ فقہی کی حیثیت واضح ہو گئی۔ غالباً اس کی تشہیر کے بعد خلیفہ منصور نے امام صاحب کو بغداد طلب کیا اور عہدہ قضا کی پیش کش کی مگر

امام صاحب نے قبول کرنے سے انکار کر دیا۔امام ابوحنیفہؒ کے اس مرتب مدون کردہ فقہ کا نام فقہ حنفی ہوا، جو عالم اسلام کے مشرق و مغرب میں پھیل گیا۔

امام ابوحنیفہؒ کی وفات حسرت آیات

۱۴۶ھ میں منصور نے امام صاحب کو قید کر دیا۔لیکن قید کرنے کے باوجود اسے امام صاحب کی طرف سے خطرہ لاحق تھا۔بغداد دارالخلافہ ہونے کی وجہ سے علوم وفنون کا مرکز بن گیا تھا۔طالبان کمال اسلامی ملکوں کے گوشے گوشے سے اٹھ کر بغداد کا رخ کرتے تھے، امام صاحب کی شہرت دور دور پہنچ چکی تھی۔قید کی حالت نے ان کے اثر اور قبول کو عام کو بجائے کم کرنے کے اور زیادہ کر دیا تھا۔بعد کی علمی جماعت جس کا شہر میں بہت کچھ اثر تھا۔ان کے ساتھ نہایت خلوص رکھتی تھی ان باتوں کا یہ اثر تھا کہ منصور نے ان کو گو نظر بند کر رکھا تھا لیکن کوئی امیر ان کے ادب و تعظیم کے خلاف نہ کر سکتا تھا۔قید خانہ میں انکا سلسلہ تعلیم و تدریس بھی برابر قائم رہا۔امام محمد نے جو کہ فقہ حنفی کے دست و بازو ہیں۔قید خانہ ہی میں تعلیم پائی ان وجوہ سے منصور کو امام صاحب کی طرف سے جو اندیشہ تھا وہ قید خانہ کی حالت میں باقی رہا جس کی آخری تدبیر یہ تھی کہ بے خبری میں ان کو زہر دلوا دیا۔جب ان کو زہر کا اثر محسوس ہوا تو سجدہ کیا اور اسی حالت میں قضا کی۔

ان کے مرنے کی خبر بہت جلد شہر میں پھیل گئی اور سارا بغداد اُمڈ آیا۔حسن بن عمارہ نے جو شہر کے قاضی تھے غسل دیا، نہلاتے جاتے اور کہتے جاتے "واللہ تم سب سے بڑے فقیہ، بڑے عابد، بڑے زاہد تھے تم میں تمام خوبیاں جمع تھیں، تم نے اپنے جاں نشینوں کو مایوس کر دیا، کہ وہ تمہارے مرتبہ تک پہنچ سکیں۔" غسل سے فارغ ہوتے ہی لوگوں کی اتنی کثرت ہوئی کہ پہلی بار نماز جنازہ میں کم وبیش پچاس ہزار کا مجمع تھا اس پر آنے والوں کا سلسلہ قائم تھا، یہاں تک کہ چھ ۶ بار نماز جنازہ پڑھی گئی اور عصر کے قریب جا کر لاش دفن ہو سکی۔امام صاحب نے وصیت کی تھی کہ خیزران کے قبرستان میں دفن کئے جائیں کیونکہ یہ جگہ ان کے

خیال میں غصب شدہ نہیں تھی، اس وصیت کے موافق خیزران کے مشرق جانب ان کا مقبرہ تیار ہوا مؤرخ خطیب نے لکھا ہے کہ دفن کے بعد بھی بیس دن تک لوگ ان کی نماز جنازہ پڑھتے رہے۔ جو قبول عام امام کو اس وقت حاصل تھا وہ کسی کو کب حاصل ہو سکتا ہے۔

امام ابوحنیفہؒ کے اخلاق و عادات

امام صاحب کا حلیہ اور اخلاق بیان کرنے میں مؤرخین نے بہت کچھ مبالغہ سے کام لیا ہے، لیکن صحت کے سب سے زیادہ قریب امام ابو یوسف کا قول ہے۔ آیئے ہم دیکھتے ہیں کہ یہ شاگرد اپنے پیارے اور محترم استاد کے بارے میں کیا کہتے ہیں۔ یہ وہ تقریر ہے، جو انہوں نے خلیفہ ہارون الرشید کے سامنے کی تھی درا صل ہوا یہ کہ خلیفہ ہارون الرشید نے ایک بار امام ابو یوسفؒ سے کہا کہ امام ابوحنیفہؒ کے کچھ اوصاف بیان کرو۔

انہوں نے کہا کہ جہاں تک میں جانتا ہوں، امام ابوحنیفہؒ کے اخلاق و عادات یہ تھے کہ نہایت پرہیز گار تھے، منہیات سے بچتے تھے اکثر چپ رہ کر سوچا کرتے تھے کوئی شخص مسئلہ پوچھتا اور ان کو معلوم ہوتا تو جواب دیتے ورنہ چپ رہتے نہایت سخی اور فیاض تھے کسی کے آگے حاجت نہ لے جاتے، اہل دنیا سے احتراز تھا۔ دنیاوی جاہ و عزت کو حقیر سمجھتے، غیبت سے بہت بچتے تھے جب کسی کا ذکر ہوتا تو بھلائی کے ساتھ کرتے بہت بڑے عالم تھے۔ مال کی طرح علم صرف کرنے میں بھی بڑے فیاض تھے، ہارون الرشید نے یہ سن کر کہا صالحین کے یہی اخلاق ہوتے ہیں۔

امام ابوحنیفہؒ کا حلیہ اور گفتگو

امام صاحب کو خدا نے حسن سیرت کے ساتھ جمال صورت بھی دیا تھا۔ میانہ قد خوش رو اور موزوں اندام تھے، گفتگو نہایت شیریں اور بلند آواز اور صاف تھی، کیسا ہی پیچیدہ مضمون ہوتا نہایت فصاحت اور صفائی سے ادا کرتے تھے۔

امام ابوحنیفہؒ کی اولاد

کسی مؤرخ نے بھی تفصیل سے امام صاحب کی اولاد کے بارے میں نہیں بتلایا البتہ عام طور پر مورخوں کے ہاں یہ بات لکھی گئی ہے کہ وفات کے وقت حماد کے سوا کوئی ان کی اولاد موجود نہ تھی۔ حماد بڑے رتبے کے عالم فاضل آدمی تھے۔ بچپن میں ان کی تعلیم نہایت اہتمام سے ہوئی تھی۔ چنانچہ جب الحمد ختم کی تو ان کے پدر بزرگوار نے اس تقریب میں معلم کو پانچ سو درہم نذر کئے بڑے ہوئے تو خود امام صاحب سے مراتب علمی کی تکمیل کی علم وفضل کے ساتھ بے نیازی و پرہیز گاری میں بھی باپ کے خلف الرشید تھے، امام صاحب نے جب انتقال کیا تو ان کے گھر میں لوگوں کا بہت سامال و اسباب امانت رکھا تھا۔ انہوں نے قاضی شہر کے پاس جا کر حاضر کیا کہ جن کی امانتیں ہیں ان کو پہنچا دی جائیں، قاضی صاحب نے کہا ابھی اپنے پاس ہی رہنے دو کہ زیادہ حفاظت سے رہیگا انہوں نے کہا کہ آپ جانچ کرلیں کہ میرے باپ کا ذمہ بری ہو جائے غرض تمام مال و اسباب قاضی کے سپرد کر کے خود روپوش ہو گئے، اور اس وقت ظاہر ہوئے جبکہ وہ چیزیں کسی اور کے اہتمام میں دے دی گئیں، تمام عمر کسی کی ملازمت نہیں کی نہ شاہی دربار سے کچھ تعلق پیدا کیا ذی قعدہ ۱۷۶ ھ میں اس دنیائے فانی سے آخرت کی طرف کوچ کیا چار بیٹے چھوڑے جن کے نام عمر، اسماعیل ابوحیان اور عثمان ہیں، اسماعیل نے نہایت شہرت حاصل کی، چنانچہ مامون الرشید نے ان کو عہدہ قضا پر مامور کیا، جس کو انہوں نے اس دیانتداری اور انصاف سے انجام دیا کہ جب بصرہ سے چلے تو سارا شہر انکی مشائعت کو نکلا، سب لوگ انکی جان و مال کو دعائیں دیتے تھے۔

امام ابوحنیفہؒ کی تصنیفات

امام اعظمؒ کی طرف جو کتابیں منسوب ہیں ان کے نام یہ ہیں۔

ا۔۔۔۔۔فقہ اکبر: یہ عقائد کے بارے میں ایک مختصر رسالہ ہے، مسائل اور ترتیب وہی

ہے جو عقائد نسفی وغیرہ کی ہے۔ یہ رسالہ زیور طبع سے آراستہ ہو چکا ہے اور عام طور پر آسانی سے دستیاب ہے۔ جس طرح عقائد نسفی کی شرحیں لکھی گئی ہیں اس طرح اس مختصر رسالہ کی بھی شرحیں لکھی گئی ہیں۔ لیکن جس طرح کی شہرت عقائد نسفی کو حاصل ہے اس طرح کی فقہ اکبر کو حاصل نہیں پھر یہ ایک عمدہ رسالہ ہے۔ اس کتاب کے شارحین کے نام درج ذیل ہیں

ا۔......محی الدین محمد بن بہاء الدین متوفی ۹۳۵ھ۔

ب۔......مولیٰ الیاس بن ابراہیم السینوبی۔

ج۔......مولیٰ احمد بن محمد المعتساری۔

د۔......حکیم اسحاق اس شرح کا ایک منظوم نسخہ ابو البقا احمدی کا نظم کیا ہوا موجود ہے۔

ل۔......شیخ اکمل الدین

و۔......ملا علی قاری، ملا علی قاری کی یہ شرح بہت اعلیٰ پایہ کی اور متداول ہے۔

۲۔......العالم والمتعلم: سوال و جواب کے طرز پر ایک مختصر رسالہ ہے۔

۳۔......مسند: اس وقت تک دنیا میں مسند اعظم کے متعدد نسخے ہیں۔ ان نسخوں کے جامع المؤید محمد بن محمود الخوارزمی متوفی ۶۶۵ھ ہیں، ابو المؤید اس مرتبہ نسخے کے دیباچہ میں لکھتے ہیں "بلاد شام میں بعض جاہلوں کو میں نے یہ کہتے سنا کہ امام ابو حنیفہؒ کو فن حدیث میں چنداں دخل نہ تھا اور اسی وجہ سے حدیث میں ان کی کوئی کتاب نہیں ہے، اس پر مجھ کو حمیت مذہبی کا جوش ہوا اور میں نے چاہا کہ ان تمام مسندوں کو یکجا کر دوں جو علماء کرام نے امام ابو حنیفہؒ کی حدیثوں سے مرتب کئے ہیں اور جن کی تفصیل حسب ذیل ہے۔

ا۔ مسند حافظ ابو محمد عبد اللہ بن محمد یعقوب الحارثی المعروف بہ عبد اللہ الدنیا۔

۲۔ مسند امام ابو القاسم طلحہ بن محمد بن جعفر الشاہد۔

۳۔ حافظ ابو الحسن محمد بن المظفر بن موسیٰ بن عیسیٰ

۴۔ مسند حافظ ابو نعیم اصفہانی صاحب حلیہ

۵۔ مسند شیخ ابو بکر محمد بن عبد الباقی محمد الانصاری

۶۔ مسند امام ابوبکر احمد عبداللہ بن عدی الجرجانی

۷۔ مسند امام حافظ عمر بن حسن الاشنانی۔

۸۔ مسند ابوبکر احمد بن محمد بن خالد الکلاعی

۹۔ مسند امام محمد

۱۰۔ مسند حماد بن امام ابوحنیفہؒ

۱۱۔ مسند ابویوسف قاضی

۱۲۔ مسند امام ابوالقاسم عبداللہ بن ابی العوام العدی

۱۳۔ مسند حافظ حسنین بن خسرو بلخی

۱۴۔ مسند علامہ حصکفی اس مسند کی شرح علامہ ملا علی قاری نے کی ہے۔ اور یہی مسند بہ روایت حصکفی علامہ شیخ محمد عابد سندھی نے جمع کی جس کا اردو ترجمہ بھی شائع ہو چکا ہے۔

۱۵۔ مسند ماوردی

۱۶۔ مسند ابن عبدالبز ازی

ان مسندوں میں بعض کی نہایت عمدہ شرحیں بھی لکھی گئیں ہیں۔ جن کا تذکرہ حاجی خلیفہ نے کشف الظنون میں نہایت صراحت سے کیا ہے۔ (بحوالہ مسند امام اعظمؒ)

فقیہ المشرق والمغرب حضرت عبداللہ بن مبارک مروزیؒ

خلیفہ ہارون الرشید عباسی (۱۷۰ھ تا ۱۹۳ھ) کے عہد میں مسلمانوں اور رومیوں کے درمیان سرحدوں پر وقتاً فوقتاً معرکہ آرائی ہو رہی تھی۔ ایک دفعہ ایسے ہی ایک معرکے میں رومی اور اسلامی لشکر ایک دوسرے کے مقابل ہوئے تو رومی لشکر سے ایک ذرہ پوش جنگجو نے اپنی صف سے نکل کر مسلمانوں کو مقابلے کے لئے للکارا۔ اسلامی لشکر سے ایک مجاہد جس نے

اپنے چہرے پر ڈھاٹا باندھ رکھا تھا، جھپٹ کر اس کی طرف بڑھا اور ایک ہی وار میں رومی جنگجو کا کام تمام کردیا۔ پھر ایک رومی سپاہی پھنکارتا ہوا میدان میں آیا۔ نقاب پوش مجاہد نے اس کو بھی ڈھیر کردیا۔ اس کے بعد یکے بعد دیگرے کئی رومی جنگجو مقابلے کے لئے آئے۔ نقاب پوش مجاہد نے اپنی تلوار یا نیزے کے وار سے سب کو جہنم رسید کردیا۔ مسلمانوں نے فرط مسرت میں نعرہ تکبیر بلند کیا اور دوڑ کر اس مجاہد کو یہ دیکھنے کے لئے گھیر لیا کہ آخر یہ شیر اور شجاعت کا پیکر کون ہے جس کو اپنی شناخت کرانا بھی پسند نہیں۔ انہوں نے بڑے زور اور اصرار سے اس کے چہرے سے ڈھاٹا ہٹایا تو یہ دیکھ کر دنگ رہ گئے کہ وہ کوئی عام لشکری نہیں تھا بلکہ علم وفضل کے مجمع البحرین، فقیہ المشرق والمغرب حضرت عبد اللہ بن مبارک رحمۃ اللہ علیہ تھے۔۔۔ وہی حضرت عبد اللہ بن مبارک رحمۃ اللہ علیہ جن کے فضل وکمال کے تمام دنیائے اسلام میں ڈنکے بج رہے تھے اور جن کے مرجوعۂ خلائق ہونے کی کیفیت تھی کہ ایک دفعہ رقہ تشریف لے گئے تو ہزاروں لوگ استقبال کے لئے دیوانہ وار اٹھ دوڑے۔ اس قدر ہنگامہ ہوا کہ لوگوں کی جوتیاں ٹوٹ گئیں اور ساری فضا غبار آلود ہوگئی۔ اتفاق سے خلیفہ ہارون رشید بھی ان دنوں رقہ آیا ہوا تھا۔ اس کے حرم کی ایک خاتون نے شاہی محل (قصر الخشب) کے برج سے یہ نظارہ دیکھا تو ملازموں سے پوچھا، یہ اژدحام کیسا ہے؟ انہوں نے بتایا کہ ”خراسان کے ایک عالم آرہے ہیں، جن کا نام عبد اللہ بن مبارک ہے۔ یہ سب لوگ ان کے استقبال میں ایک دوسرے سے بازی لے جانے کے لیے کشمکش کررہے ہیں۔“ بے ساختہ بولی۔۔۔ ”واللہ بادشاہ تو حقیقت میں یہ ہیں، بھلا ہارون رشید کیا بادشاہ ہیں جو لوگوں کو سپاہیوں، چوبداروں، کوڑوں اور ڈنڈوں سے اپنے گرد جمع کرتا ہے۔“

حضرت عبد اللہ بن مبارک رحمۃ اللہ علیہ تبع تابعین کی اس مقدس جماعت کے گل سر سبد ہیں جس کا ہر فرد اپنی ذات میں دین کا ستون اور زمانہ کا امام تھا۔ ان کے والد مبارک بن واضح ترک، بنو حنظلہ کے ایک رئیس کے غلام تھے وہ نہایت ہی نیک اور دیندار آدمی تھے اور زہد وتقویٰ، دیانت وامانت اور خوف خدا کے اعتبار سے فی الواقع اسم بامسمی تھے۔ حنظلی رئیس

نے اپنے باغ کی نگرانی ان کے سپرد کر رکھی تھی۔ ایک مرتبہ اس نے مبارکؒ کو حکم دیا کہ باغ سے ایک شیریں انار توڑ کر لاؤ۔ وہ گئے اور ایک انار لا کر پیش کر دیا۔ مالک نے اسے چیر کر دیکھا تو ترش نکلا۔ اس نے خفاء ہو کر کہا، میں نے میٹھا انار مانگا، تم نے کھٹا لا کر دے دیا جاؤ کوئی اچھا سا شیریں انار لاؤ۔ وہ گئے اور دوسرے درخت کا انار لا کر پیش کیا۔ بدقسمتی سے وہ بھی کھٹا نکلا۔ آقا کا غصہ اور بھڑک اٹھا اور اس نے انہیں ڈانٹتے ہوئے تیسری مرتبہ پھر انار لانے کے لئے بھیجا۔ اب کے بار بھی انار ترش نکلا تو اس نے برافروختہ ہو کر کہا "کیا تمہاری قوت ذائقہ ترش وشیریں کی تمیز نہیں کر سکتی؟ مبارک نے کہا "نہیں"

آقا نے سبب پوچھا تو انہوں نے کہا "آپ نے مجھے انار کھانے کی اجازت نہیں دی اس لئے میں نے آج تک باغ کے کسی انار کو چکھا تک نہیں۔ میرا کام تو باغ کی دیکھ بھال کرنا ہے اس سے کوئی غرض نہیں کہ کس درخت کے انار میٹھے ہیں اور کس کے کھٹے۔"

آقا نے اپنے طور پر حالات کی تحقیق کی تو معلوم ہوا کہ مبارک نے جو کچھ کہا تھا وہ بالکل صحیح تھا۔ اسے ان کی غیر معمولی دیانتداری اور خوف خدا پر بڑی حیرت ہوئی اور وہ ان کی بہت عزت وتکریم کرنے لگا۔

اس رئیس کی ایک لڑکی تھی جس کے لئے اونچے اونچے گھرانوں کی طرف سے پیغام آرہے تھے۔ دنیاوی ثروت کے لحاظ سے پیغام دینے والوں میں ایک سے ایک بڑھ کر تھا اس لئے رئیس فیصلہ نہیں کر پا رہا تھا کہ کون سا پیغام قبول کرے اور کونسا رد کرے۔ اسی شش و پنج میں ایک دن اس نے مبارک سے بھی اس بارے میں مشورہ کیا۔ انہوں نے بڑے اخلاص کے ساتھ کہا کہ: "زمانہ جاہلیت میں لوگ اعلیٰ حسب ونسب والا داماد تلاش کرتے تھے۔ یہودیوں کے نزدیک داماد کے لئے مالدار ہونا ضروری تھا اور عیسائی حسن و جمال کو اہمیت دیتے تھے لیکن امت محمدیہ ﷺ کے نزدیک دیندار ہونا وجہ ترجیح ہے۔ آپ جو طریقہ مناسب سمجھیں، اختیار کرلیں۔"

آقا کو مبارک کا یہ مخلصانہ مشورہ بے حد پسند آیا۔ اس مشورے پر غور وفکر کے بعد

ایک دن اس نے اپنی بیوی سے کہا: ”مجھے اپنی لخت جگر کا شوہر بنانے کے لئے مبارک سے بہتر کوئی شخص نظر نہیں آتا۔“

بیوی نے پہلے تو مبارک کے افلاس اور کم حیثیتی کا عذر پیش کیا لیکن بالآخر وہ بھی شوہر سے متفق ہوگئی اور اپنی بیٹی کی شادی مبارک سے کردی، ساتھ ہی انہوں نے مبارک کو آزاد کردیا۔

حضرت عبداللہ اسی رئیس زادی کے بطن اور مبارک جیسے صاحب تقویٰ باپ کی صلب سے ۱۱۸ھ میں مرو میں پیدا ہوئے اور اسی نسبت سے مشہور ہوئے۔

حضرت عبداللہؒ کے والد مبارکؒ بن واضح نہ صرف ایک متقی آدمی تھے بلکہ علم کی قدر و قیمت سے بھی بخوبی آشنا تھے۔ انہوں نے اپنے فرزند دلبند کی تعلیم و تربیت کا خاص اہتمام کیا اور پوری کوشش کی کہ ان کا بیٹا علم کے آسمان پر سورج بن کر چمکے۔

اس وقت صحابہ کرامؓ کا دور گزر چکا تھا البتہ ہزاروں تابعین و تبع تابعین اور دوسرے ارباب علم و فضل دنیائے اسلام کے گوشے گوشے میں پھیلے ہوئے تھے۔ کوئی معروف نہر اور قصبہ ایسا نہیں تھا جو اہل فضل و کمال سے خالی ہو۔ حضرت عبداللہ بن مبارکؒ کی ابتدائی تعلیم و تربیت مرو میں ہوئی اس کے بعد وہ حصول علم کے لیے مرو سے نکل کھڑے ہوئے اور سالہا سال تک شہر شہر اور قصبہ قصبہ میں گھوم پھر کر جواہر علم اپنے دامن میں سمیٹتے رہے۔ اس مقصد کے لئے انہوں نے فاصلہ دیکھا نہ اس زمانے کے سفر کی صعوبتیں، جہاں بھی کسی صاحب علم کا پتہ چلا، اسکی خدمت میں پہنچے اور مقدور بھر اکتساب فیض کیا۔ امام احمد بن حنبلؒ فرماتے ہیں

”ابن المبارکؒ کے زمانہ میں ان سے زیادہ علم کا حریص اور علم کی جستجو کرنے والا کوئی نہ تھا، طلب علم کے لیے انہوں نے دور دراز ملکوں اور شہروں کا سفر کیا تھا مثلاً شام، عراق، یمن، مصر، کوفہ و بصرہ وغیرہ۔“

حضرت ابو اسامہؒ گواہی دیتے ہیں کہ: ”میں نے عبداللہ بن مبارکؒ سے بڑھ کر کسی کو ملک در ملک گھوم کر طلب علم کرنے والا نہیں دیکھا۔“ (تذکرہ الحفاظ حافظ ذہبیؒ)

حافظ ابن حجر عسقلانی لکھتے ہیں: ''ابن مبارکؒ کے دور میں ان سے زیادہ علم تلاش کرنے والا کوئی دوسرا نہیں تھا۔'' (تہذیب التہذیب)

حافظ ذہبیؒ فرماتے ہیں: ''تحقیق علم کے شوق میں عبداللہ بن مبارکؒ کو اپنی حیثیت کی پروا بھی نہیں ہوتی تھی وہ اپنے سے چھوٹے اور فروتر لوگوں سے بھی معلومات حاصل کرتے تھے۔'' (تہذیب الاسماء)

خود حضرت عبداللہ بن مبارکؒ کا بیان ہے کہ میں نے مختلف علاقوں کے چار ہزار جن شیوخ واساتذہ سے جملہ دینی علوم حاصل کئے، ان میں سرفرست حضرت امام اعظم، حضرت ابو حنیفہ، حضرت امام سفیان ثوریؒ اور حضرت امام اوزاعیؒ ہیں۔ دوسرے شیوخ واساتذہ سے چند کے اسمائے گرامی یہ ہیں۔

''امام مالک بن انسؒ مدنی امام اعمشؒ، ہشام بن عروہؒ حمید بن ابی حمید الطویل، موسیٰ بن عقبہ صاحب المغازیؒ یحییٰ بن سعید الانصاریؒ سلیمان التیمیؒ عبداللہ بن یزیدؒ اسماعیل بن ابی خالدؒ احمسی، سفیان بن عیینہ لیث بن سعدؒ مسعر بن کدام کوفیؒ۔ ابن جریجؒ، سعید بن ابی عروبہؒ، مہران بصریؒ، حماد بن سلمہؒ ابن ابی ذیبؒ صالح بن صالحؒ، عمرو بن میمون جزری معمر بن راشدؒ بصری، عبداللہ بن عونؒ بصری ابن قدامہ کوفیؒ بریدؒ بن عبداللہ بن ابی بردہ بن ابی موسیٰ اشعری عاصم بن سلمان الاحولؒ داود بن قیس فرا قرشی مدنیؒ، ابوسعید ابراہیم بن طہمان خراسانیؒ زکریا بن ابی زائدہ کوفیؒ وغیرہ ہم۔''

امام ابو حنیفہ اور امام سفیان ثوریؒ سے ابن مبارک کو بے حد عقیدت ومحبت تھی۔ حافظ ابن حجرؒ نے ''تہذیب التہذیب'' میں ان کا یہ قول نقل کیا ہے۔

''اگر اللہ تعالیٰ امام ابو حنیفہؒ اور سفیان ثوریؒ کے ذریعہ میری مدد نہ کرتا تو میں عام آدمیوں کی طرح ہوتا''

حافظ ذہبیؒ نے بھی ''مناقب'' میں حضرت عبداللہ بن مبارک کا اسی سے ملتا جلتا قول نقل کیا ہے۔ البتہ اس میں ''تو عام آدمیوں کی طرح ہوتا (کنت کسائر الناس)''

کے بجائے ''تو میں ایک بدعتی شخص ہوتا (کنت بدعا)'' کے الفاظ ہیں۔

حضرت عبداللہ بن مبارکؒ امام ابوحنیفہ کا ذکر ہمیشہ بڑے احترام اور عقیدت سے کرتے، انہوں نے ان کی شان میں بہت سے اشعار بھی کہے۔ (تاریخ بغداد خطیب بغدادی)

حافظ ذہبیؒ فرماتے ہیں کہ ابن مبارک نے حضرت امام ابوحنیفہؒ کے چشمہ علم سے پوری طرح سیراب ہونے کے بعد امام سفیان ثوریؒ کے سامنے زانوئے تلمذ تہہ کیا۔ اس ضمن میں انہوں نے خود حضرت عبداللہ بن مبارکؒ کا یہ قول نقل کیا ہے۔ ''میں سفیان ثوریؒ کے ساتھ اس وقت تک وابستہ نہیں ہوا جب تک میں نے امام ابوحنیفہؒ کے علوم پر پوری دسترس حاصل نہ کر لی۔'' (دسترس کی وضاحت انہوں نے ہاتھ کی مٹھی بند کر کے کی)

حضرت عبداللہ بن مبارکؒ تحصیل علم کے سلسلے میں امام اوزاعیؒ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو عجیب واقعہ پیش آیا۔ علامہ خطیب بغدادیؒ نے اسے تاریخ بغداد میں ''ابن مبارک'' کی زبانی یوں نقل کیا ہے: ''میں طلبِ علم کے لیے شام گیا اور بیروت (جو اس زمانے میں شام کا ایک حصہ تھا) جا کر امام ازاعیؒ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ انہوں نے مجھ سے پوچھا، اے خراسانی، کوفہ میں یہ کون بدعتی ابوحنیفہ پیدا ہوا ہے؟ یہ سن کر میں گھر واپس آیا، امام ابوحنیفہؒ کی کتابیں نکالیں اور ان میں سے چیدہ چیدہ مسائل چھانٹ کر نکالے (اور انہیں کتاب کی صورت میں مرتب کیا) اس میں تین دن لگ گئے۔ تیسرے روز یہ کتاب ہاتھ میں لیے ان کے پاس گیا۔۔۔ وہ مسجد کے مؤذن بھی تھے اور امام بھی۔ میرے ہاتھ میں کتاب دیکھ کر کہا، یہ کیا ہے؟ میں نے عرض کیا، یہ ملاحظہ فرمایئے۔ انہوں نے ایک مسئلہ پر نظر ڈالی جس پر لکھا تھا 'قال النعمان' اذان کہہ کر کتاب کا پہلا حصہ پڑھ لیا۔ پڑھ کر کتاب آستین میں رکھ لی۔ پھر تکبیر کہہ کر نماز پڑھی۔ نماز سے فارغ ہو کر کتاب نکالی اور سب پڑھ لی۔ اس کے بعد مجھ سے دریافت فرمایا، اے خراسانی! یہ نعمان بن ثابت کون ہیں؟ میں نے کہا 'ایک شیخ ہیں، عراق میں ان سے ملاقات ہوئی تھی۔ امام اوزاعیؒ نے فرمایا، بڑی شان کے شیخ ہیں، جاؤ اور ان سے بہت سا فیض حاصل کرو۔ میں نے کہا یہ وہی ابوحنیفہؒ ہیں جن

سے آپ نے مجھ کو روکا تھا۔" اس طرح ابن مبارکؒ نے امام ابوحنیفہؒ کے بارے میں امام اوزاعیؒ کی غائبانہ غلط فہمی کو نہایت خوبصورت انداز میں دور کر دیا اور پھر امام اوزاعیؒ کے فیضان علمی سے بھی خوب بہرہ یاب ہوئے۔

اللہ تعالیٰ نے حضرت عبداللہ بن مبارکؒ کو غیر معمولی قوت حافظہ عطا کی تھی اور وہ نہایت ذہین اور ذکی تھے۔ اپنے بے پناہ شوق علم، محنت، جستجو، قوت حافظہ، ذہانت، ذکاوت اور بڑے بڑے ائمہ عصر کے فیض صحبت کی بدولت چند سال کے اندر اندر وہ مسند علم وفن کے صدر نشین بن گئے۔ یہاں تک کہ ان کے شیوخ اور اساتذہ نے بھی انکے کمالات علمی کا برملا اعتراف کیا۔ امام سفیان ثوریؒ سے ایک مرتبہ کسی خراسانی نے کوئی مسئلہ پوچھا۔ انہوں نے فرمایا "تمہارے پاس مشرق و مغرب کے سب سے بڑے عالم عبداللہ بن مبارک موجود ہیں ان سے کیوں دریافت نہیں کرتے؟" ایک اور روایت میں ہے کہ کسی شخص نے امام سفیان ثوریؒ کے سامنے حضرت عبداللہ بن مبارکؒ کو 'یا عالم المشرق' کہہ کر خطاب کیا۔ امام سفیان ثوریؒ نے فرمایا، کیا کہہ رہے ہو وہ تو "عالم المشرق والمغرب" ہیں۔

(بحوالہ خطیب بغدادی)

عبداللہ بن سنانؒ کہتے ہیں کہ حضرت عبداللہ بن مبارکؒ مکہ معظمہ سے روانہ ہوئے تو حضرت سفیان بن عیینہؒ اور حضرت فضیل بن عیاضؒ ان کو رخصت کرنے دور تک ساتھ گئے۔ اثنائے راہ میں ان میں سے ایک نے کہا 'یہ فقیہ اہل مشرق ہیں تو دوسرے نے ٹوکتے ہوئے کہا' اہل مشرق ہی کے نہیں اہل مغرب کے فقیہ ہیں۔ (تذکرہ الحفاظ ذہبیؒ)

ابن حبانؒ کا قول ہے کہ ابن مبارک میں اہل علم کے اتنے خصائل جمع ہو گئے تھے کہ ان کے عہد میں تمام کرہ ارض پر کسی میں مجتمع نہیں ہوئے تھے۔ (تہذیب التہذیب ابن حجرؒ)

علی بن المدینیؒ عثمان بن طالوتؒ سے روایت کرتے ہیں کہ کمال علم دو آدمیوں پر ختم ہو گیا، عبداللہ بن مبارکؒ اور یحیٰ بن معینؒ پر۔ (تاریخ خطیب بغدادی)

امام نوویؒ فرماتے ہیں کہ "عبداللہ بن مبارکؒ کی امامت وجلالت پر سب کا اتفاق

ہے۔ وہ تمام چیزوں میں امام تھے۔ ان کے ذکر سے نزول رحمت ہوتا تھا، اور ان کی محبت کی وجہ سے بخشش کی امید کی جاتی تھی۔ (تہذیب الاسماء)

امام ذہبیؒ ان کا تعارف یوں کراتے ہیں: ''ابن المبارک، امام حافظ، علامہ شیخ الاسلام، فخر المجاہدین اور قدوۃ الزاہدین۔'' (تذکرہ الحفاظ)

اسماعیل بن عیاشؒ فرماتے ہیں ''روئے زمین پر ابن المبارکؒ کی مثال موجود نہیں۔''

امام نسائیؒ کا قول ہے کہ میں ابن المبارکؒ کے زمانے میں کسی ایسے شخص کو نہیں جانتا جو مرتبے میں ان سے زیادہ ہو اور جس کے اندر تمام خصائل حمیدہ اس جامعیت کے ساتھ پائے جاتے ہوں۔

امام مالک بن انسؒ فرماتے تھے ''ابن المبارک خراسان کے فقیہ ہیں ابو اسحاق الفزاری کا قول ہے حضرت عبداللہ بن مبارکؒ تمام مسلمانوں کے امام ہیں (خطیب تاریخ بغدادی)

حافظ بن حجر عسقلانیؒ فرماتے ہیں ''ابن المبارکؒ ماہر حدیث اور حافظ الحدیث ہیں۔'' (تہذیب التہذیب)

یحییٰ بن معینؒ کے سامنے کسی نے حضرت عبداللہ بن مبارکؒ کا ذکر کیا تو انہوں نے فرمایا ''وہ مسلمانوں کے سرداروں میں سے ایک سردار تھے۔'' (سید المسلمین)

علامہ ابن سعدؒ لکھتے ہیں: ''ابن المبارک نے علم کی تحصیل کا حق ادا کرنے کے لیے کثیر روایات بیان کیں، علم کے مختلف ابواب واقسام پر متعدد کتابیں لکھیں تصنیف کیں، زہد اور ترغیب جہاد میں شعر کہے، وہ معتبر تھے، حجت تھے، کثیر الحدیث تھے اور اس قابل تھے کہ ان کے قول کو سند تعلیم کیا جائے۔ (تہذیب الاسماء)

حسن بن عیسیٰؒ کا بیان ہے کہ ایک مرتبہ علماء کے ایک اجتماع میں حضرت عبداللہ بن مبارکؒ کے اوصاف وخصائل کا ذکر چھڑ گیا تو سب نے بالاتفاق تسلیم کیا کہ وہ ایک جامع الصفات ہستی ہیں علم دین، فقہ ادب، نحو، لغت، شعر، فصاحت، زہد، تقویٰ، کم گوئی، قیام اللیل

،عبادت ، حج ، جہاد، شہسواری، شجاعت ،صحت مندی ،شہزوری ،کم آمیزی، مہمل گوئی سے اجتناب وغیرہ صفات انکی ذات میں جمع ہوگئیں تھیں۔ (تذکرہ الحفاظ)

غرض حضرت عبداللہ بن مبارکؒ کے ہمعصر اور بعد کے علماء سلف سبھی نے ان کے کمالات علمی اور سیرت وکرداری کی بڑے موثر الفاظ میں تعریف وتوصیف کی ہے ابن مبارکؒ کے ہمعصر علماء جن میں بعض امام وقت تھے ،نہ صرف ان کی تعریف زبان سے کرتے تھے بلکہ عملی طور پر بھی ان کی بے حد تعظیم وتکریم کرتے تھے۔

یحییٰ بن یحییٰ اندلسیؒ کا بیان ہے کہ ایک مرتبہ ہم امام مالک بن انسؒ کی مجلس میں بیٹھے تھے کہ ابن المبارکؒ تشریف لائے۔امام مالکؒ خود جو کبھی کسی کے لیے نہیں اٹھے تھے اور نہ اپنی نشست تبدیل کرتے تھے،اٹھ بیٹھے اور اپنی نشست بدل کر ابن لمبارکؒ کو اپنے پاس بیٹھا لیا۔ (تہذیب التہذیب ابن حجرؒ)

حافظ ذہبیؒ کا بیان ہے کہ ایک مرتبہ امام مالک ابن انسؒ حدیث کا درس دے رہے تھے۔اتفاق سے عبداللہ بن مبارکؒ بھی پہنچ گئے۔ایک شاگرد نے ابن المبارکؒ سے مخاطب ہوکر کہا، اس مسئلہ کے بارے میں آپ لوگوں یعنی اہل خراسان کے پاس کوئی حدیث یا اثر ہوتو پیش کیجئے۔ابن المبارک غایت احترام میں اور ازرہ حسن ادب بہت آہستہ آہستہ جواب دیتے رہے۔امام مالکؒ کو ان کا حسن ادب اور انداز بہت پسند آیا۔جب وہ چلے گئے تو انہوں نے اہل مجلس سے مخاطب ہوکر فرمایا، یہ عبداللہ بن مبارکؒ،خراسان کے فقیہ ہیں۔ (تذکرہ الحفاظ)

احمد بن سنانؒ سے روایت ہے کہ عبداللہ بن مبارکؒ پہلی مرتبہ حماد بن زیدؒ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو انہوں نے دریافت کیا،آپ کہاں سے آرہے ہیں؟ جواب دیا، خراسان سے پوچھا،خراسان کے کس شہر سے،عرض کیا مرو سے۔اب حمادؒ نے پوچھا،وہاں کے ایک صاحب عبداللہ بن مبارکؒ کو بھی جانتے ہیں؟ عرض کیا، جانتا ہوں، پوچھا وہ کیسے؟ بولے عبداللہ بن مبارکؒ ہی تو آپ کے سامنے حاضر ہے۔حماد یہ سن کر بے قرار ہو گئے سلام

کیا اور مرحبا کہتے ہوئے گلے لگالیا۔ (تاریخ خطیب بغدادی)

حضرت عبداللہ بن مبارکؒ قرآن حدیث، فقہ، سیرت و مغازی اور دوسرے دینی علوم کے علاوہ زبان وادب، لغت وشاعری وغیرہ کے بھی بحر زخّار تھے گویا ان کی ذات دینی و دنیوی علوم کی جامع تھی یہاں تک کہ علم طب بھی ان کی دسترس سے باہر نہیں تھا۔ حافظ ذہبیؒ نے ''تذکرۃ الحفاظ'' میں حسنؒ سے روایت کی ہے کہ ابن المبارکؒ ایک دن امام سفیان ثوریؒ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو دیکھا کہ وہ شدت کرب میں کراہ رہے ہیں۔ دریافت کیا، آپ کو کیا تکلیف ہے؟ انہوں نے مرض کی کیفیت بیان کی۔ حضرت عبداللہ بن مبارکؒ نے اسی وقت پیاز کی ایک گنٹھی منگوائی اور اسے کاٹ کر حضرت سفیان ثوریؒ سے کہا، اسے سونگھئے انہوں نے تھوڑی دیر اس کو سونگھا تو ایک چھینک آئی اور طبیعت بالکل بحال ہوگئی۔ اس وقت حضرت امام ثوریؒ کی زبان پر بے ساختہ یہ الفاظ آ گئے:

''سبحان اللہ آپ فقیہ بھی ہیں طبیب بھی۔''

شعروشاعری کا ذوق نہایت پاکیزہ تھا، خطیب بغدادی نے اپنی تاریخ میں ان کے جو اشعار نقل کئے ہیں ان پر اخلاقی تعلیمات کی گہری چھاپ ہے۔

فقہ میں اتنا بلند مقام حاصل تھا کہ ان کی موجودگی میں بڑے بڑے علماء فقیہ مسئلہ بتانے سے احتراز کرتے تھے۔ اگر چہ فقہ واجتہاد میں وہ اپنے جلیل القدر استاد حضرت امام ابوحنیفہؒ کو مرتبے کو نہیں پہنچے تاہم امام مالکؒ، امام نوویؒ، امام ذہبیؒ ابن حماد حنبلیؒ ابن شماسؒ اور حافظ حجرؒ بھی نے انکے تفقہ کا اعتراف کیا ہے۔

علم حدیث سے حضرت عبداللہ کو خاص شغف حاصل تھا اسی لیے وہ ایک یگانہ روزگار محدث اور امام العصر تسلیم کئے گئے۔ علم حدیث میں ان کے مرتبہ کا اندازہ اس بات سے کیا جاسکتا ہے کہ ان کے ہمعصر محدثین میں اگر حدیث کے بارے میں اختلاف ہوتا تو وہ فیصلہ کے لئے ان کی طرف رجوع کرتے کیونکہ تمام کے نزدیک ابن مبارکؒ حفظِ حدیث کے اعتبار سے حکم فی الحدیث کی حیثیت رکھتے تھے۔ علم حدیث کے لیے جس قوت حافظہ کی

ضرورت ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ابن مبارکؒ کو اس سے وافر حصہ عطا کیا تھا۔ خطیب بغدادی نے ان کے ایک دوسرے معاصر صحر کی زبانی اپنی تاریخ میں یہ روایت نقل کی ہے کہ ایک مرتبہ میں اور ابن مبارکؒ نے خطیب کا طویل خطبہ سنا۔ خطبہ ختم ہوا تو ابن مبارکؒ نے فرمایا، مجھ کو یہ تمام خطبہ یاد ہو گیا پھر انہوں نے ایک شخص کی فرمائش پر اسی وقت وہ خطبہ شروع سے اخیر تک سنا دیا۔ حافظ ذہبیؒ کا بیان ہے کہ ایک دن عشاء کی نماز کے بعد علی بن الحسن بن شفیق سے ایک حدیث کے بارے میں گفتگو چھڑ گئی۔ ساری رات اسی گفتگو میں مسجد کے دروازے پر کھڑے کھڑے گزر گئی لیکن ابن المبارکؒ کو احساس بھی نہ ہوا۔ (تذکرۃ الحفاظ)

امام احمد حنبلؒ کا قول ہے کہ ابن المبارکؒ صاحب الحدیث اور حافظ الحدیث تھے۔

(تہذیب التہذیب)

حدیث سے اپنے والہانہ شغف کی بنا پر گھر سے بہت کم باہر نکلتے تھے۔ نعیم بن حمادؒ سے روایت ہے کہ ایک مرتبہ کسی نے پوچھا' آپ کو مکان میں ہر وقت تنہا بیٹھنے رہنے سے وحشت نہیں ہوتی؟ فرمایا ''وحشت کیسے ہو سکتی ہے جب کہ اس تنہائی میں رسول کریم ﷺ اور صحابہ کرامؓ کے فیض سے شرف یاب ہوتا ہوں۔'' (تاریخ بغداد، خطیب بغدادی)

کتب حدیث میں حضرت ابن المبارکؒ سے مروی روایات کی تعداد بیس ہزار کے لگ بھگ ہے۔ اپنی روایات کے بارے میں اسناد کا خاص تعلق رکھتے تھے۔ فرمایا کرتے تھے کہ روایت کو ہر مرحلہ میں ثقة عن ثقة ہونا چاہیئے۔ (یعنی معتبر شخص، معتبر شخص سے روایت کرے) (تذکرہ الحفاظ ذہبیؒ)

اپنے تبحر علمی اور زبردست قوت حافظہ کے باوجود اس قدر محتاط تھے کہ محض حافظہ سے روایت نہیں کرتے تھے بلکہ کتاب دیکھ کر بیان کرتے تھے۔ امام احمد حنبلؒ کا قول ہے ''ابن المبارک صاحب حدیث اور حافظ الحدیث تھے اور کتاب سے حدیث بیان کرتے تھے۔'' (تہذیب التہذیب)

حدیث نبوی ﷺ کا ان کے دل میں حد سے زیادہ احترام تھا۔ روایت وسماع کے

خاص اوقات مقرر کر رکھے تھے۔ صرف سماع حدیث کے اہل حضرات کے سامنے ہی حدیث بیان کرتے تھے۔ وہ ایسی بات برداشت نہیں کرتے تھے جس سے حدیث کی شان اور وقار میں ذرا بھی تخفیف کا پہلو نکلتا ہو۔

ایک مرتبہ ایک شخص طویل مسافت طے کر کے سماع حدیث کے لئے ان کی خدمت میں حاضر ہوا اور آتے ہی روایت حدیث کی درخواست کی۔ انہوں نے انکار کر دیا۔ اس نے اپنے ملازم سے کہا، ''چلو'' اور سواری پر بیٹھ کر چلنے لگا۔ حضرت عبداللہ نے فوراً اٹھ کر رکاب تھام لی۔ اس شخص سے کہا، آپ نے حدیث تو سنائی نہیں لیکن میری سواری کی رکاب تھام رہے ہیں۔ فرمایا، ہاں میں یہ بہتر سمجھتا ہوں کہ تمہارے لیے اپنی ذات کو ذلیل کر دوں لیکن حدیث نبوی ﷺ کی توہین مجھے گوارا نہیں۔ (تذکرۃ الحفاظ)

ایک اور موقع پر کسی شخص نے راستہ میں ان میں سے روایت حدیث کی درخواست کی۔ فرمایا ''یہ موقع حدیث کی روایت وسماع کا نہیں ہے'' (تبع تابعین)

حضرت عبداللہ بن مبارکؒ اگرچہ علم وفضل کے بحرِ بے کراں بن گئے تھے لیکن انکے سینے میں تحصیل علم کے شوق کی شمع عمر بھر فروزاں رہی۔ حافظ ابن عبدالبرؒ فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ ابن المبارکؒ سے پوچھا گیا کہ آپ کب تک علم حاصل کرتے رہیں گے تو انہوں نے جواب دیا، موت تک ان شاءاللہ۔

ایک اور موقع پر اسی قسم کے سوال کے جواب میں فرمایا: ''شاید وہ کلمہ اب تک میں نے نہ سنا ہو جو میرے کام آئے۔'' (العلم والعلماء)

چنانچہ جہاں ایک دنیا ان کے خوان علم کی زیرہ چین تھی وہ خود بھی زندگی کے کسی دور میں بھی دوسروں کے فیوض علمی سے بہرہ یاب ہونے کا موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیتے تھے۔

حضرت عبداللہ بن مبارکؒ کی زندگی کا بیشتر حصہ سفروں میں گزرا۔ لڑکپن سے جوانی تک کے زمانے میں تحصیل علم کے سلسلے میں سفر کرتے رہے۔ اس کے بعد اکثر تجارت

،حج، جہاد فی سبیل اللہ، دعوت وتبلیغ اور ارشاد واصلاح کے لیے پا بر کاب رہتے۔ یہی سبب تھا کہ وہ کسی خاص مقام پر مجلس درس قائم نہیں کر سکے لیکن ان کے کمالات علمی نے ایک دنیا کو مسخر کرلیا تھا جہاں بھی جاتے لوگ جوق در جوق انکے گرد جمع ہو جاتے اور مقدور بھر اکتساب فیض کرتے تھے۔ حافظ ذہبیؒ کا بیان ہے کہ ممالک اسلامیہ کے اس قدر لوگوں نے ان سے استفادہ کیا کہ ان کا شمار کرنا ممکن نہیں۔

طبعاً شہرت سے متنفر تھے اور گمنام رہنا پسند کرتے تھے۔ یہاں تک کہ اگر انہیں معلوم ہو جاتا کسی شاگرد نے ان کا قول نقل کرتے ہوئے قال عبداللہ بن المبارک لکھا ہے تو اس کے پاس چاقو بھیجتے تھے کہ اس سے میرا نام تصنیف میں سے چھیل دو، میری کیا حقیقت ہے کہ کسی قول کو میری طرف سے منسوب کیا جائے لیکن خدا کی قدرت، جس قدر بھی انہوں نے گمنام رہنے کی کوشش کی اسی قدر شہرت بڑھتی چلی گئی اور وہ مرجع خلائق بن گئے۔

آج کل سفر کے لئے جس قدر آسانیاں اور سہولتیں میسر ہیں ابن المبارکؒ کے زمانے میں ان کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا۔ آج جو سفر چند ساعتوں میں طے ہو جاتا ہے اس زمانے میں ہفتوں اور مہینوں میں طے ہوتا تھا اور پھر راستے میں جو دشواریاں اور مصیبتیں پیش آتی تھیں ان کی تفصیل جان کر رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ حضرت عبداللہ بن مبارکؒ کے لاتعداد سفروں پر نظر ڈالیں تو لامحالہ اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ ان کی زندگی بالکل مجاہدانہ تھی۔ کبھی مرو میں تو کبھی بغداد میں، کبھی بصرہ میں ہے تو کبھی رقہ میں، کبھی شام میں ہیں تو کبھی مصر میں، کبھی حجاز میں ہیں تو کبھی یمن میں۔ انہوں نے تجارت میں لاکھوں روپے پیدا کئے اور لاکھوں ہی راہ حق میں صرف کئے۔ فی الحقیقت ان کے سفر کا عنوان ''تجارت'' ہوتا تھا لیکن اس کی روح علمی افادہ واستفادہ اور مخلوق خدا کی خدمت ہوتی تھی۔

حضرت ابن المبارکؒ کے چند تلامیذ اور رواۃ کے اسماء گرامی یہ ہیں۔ (ان میں عظیم المرتبت ہستیاں بھی ہیں جن کی روایات کو صحاح ستہ کے مدثین نے اپنی کتابوں میں درج کیا ہے اور ایسی بھی جن کو درجہ امام حاصل ہوا اور خلق کثیر نے ان سے کسب فیض کیا۔)

امام احمد حنبلؒ، یحییٰ بن معینؒ، فضیل بن عیاضؒ، اسحاق بن راہویہؒ، ابوداوٗد الطیالسیؒ، یحییٰ بن سعید القطان نعیم بن حماد الخزاعی مروزیؒ، محمد بن العلاء کوفیؒ، ابوبکر بن عیاشؒ، علی بن الحسن بن شفیق مروزیؒ، سلیمان المروزیؒ وغیرہ۔

ابن مبارکؒ کے رُواۃ میں امام سفیان ثوریؒ، معمر بن راشدؒ، سفیان بن عیینہؒ، عبدالرحمٰن بن مہدی بصریؒ، اور ابواسحاق الفزاریؒ بھی شامل ہیں۔ یہ اصحاب ابن مبارکؒ کے استاذ بھی تھے۔

حضرت عبداللہ بن مبارکؒ کے گلشن اخلاق میں خشیت الٰہی، شجاعت، شوق جہاد، تواضع و انکساری، جود وسخا، خدمت خلق، اکرام ضیف، رقّتِ قلب، زہد وتقویٰ، عبادت و ریاضت، خودداری اور ارباب حکومت سے گریز، سب سے خوشرنگ پھول ہیں۔ ان کی سیرت وکرادر میں صحابہ کرام کی پُرعظمت اور پاکیزہ زندگی کی جھلک نظر آتی تھی۔ حضرت سفیان بن عیینہؒ فرماتے ہیں:

''میں نے صحابہ اکرام کے حالات پر غور کیا اور عبداللہ بن المبارکؒ کے حالات بھی دیکھے تو اس نتیجہ پر پہنچا کہ صحابہ کرامؓ کو اس بنا پر ابن المبارک پر فضیلت حاصل ہے کہ انہوں نے رسول کریم ﷺ کے جمال جہاں آراء سے اپنی آنکھیں روشن کیں اور آپ ﷺ کی صحبت اور غزوات میں ہمرِ کابی کا شرف حاصل کیا۔'' (تاریخ خطیب بغدادی)

گویا مخصوص فضائل کے سواعادات واخلاق میں ابن المبارکؒ صحابۂ کرامؓ کا نمونہ تھے۔ فی الحقیقت ان کو صحابہ کرامؓ سے اس قدر عقیدت اور محبت تھی کہ اپنے طور طریقوں کو انہی کے سانچہ میں ڈھال لیا تھا۔ اصحاب رسولؐ کا ان کے نزدیک جو بلند مقام تھا اس کا اندازہ اس روایت سے لگایا جا سکتا ہے جو ابن خلکان نے ابوعلی غسانی سے نقل کی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ کسی نے ابن المبارکؒ سے پوچھا، حضرت امیر معاویہؓ بن ابوسفیانؓ اور حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ (تابعی) میں سے کون افضل ہے۔ ابن المبارکؒ نے جواب دیا، واللہ وہ غبار راہ جو رسول اللہ ﷺ کی ہمرِ کابی میں حضرت معاویہؓ کی ناک میں داخل ہوا ہے وہ بھی

حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ پر ہزار درجہ فضیلت رکھتا ہے۔ حضرت امیر معاویہ کو رسول اللہ ﷺ کی اقتداء میں نماز پڑھنے کا شرف حاصل ہوا ہے اور جب حضور ﷺ نے **سمع اللہ لمن حمدہ** فرمایا تو جواب میں حضرت معاویہؓ نے **ربنا لک الحمد** کہا۔ کیا اس کے بعد بھی سوال کی ضرورت باقی رہ جاتی ہے؟ (وفیات الاعیان)

خشیت الٰہی کی یہ کیفیت تھی کہ ہر وقت اللہ کے خوف سے لرزاں و ترساں رہتے تھے۔ نعیم بن حماد سے روایت ہے کہ جب وہ (اپنی تالیف) ''کتاب الزہد والرقائق'' طلبہ کے سامنے پڑھتے تو ان پر سخت رقت طاری ہو جاتی تھی اور (جوش گریہ میں) ان کے منہ سے اس طرح آواز نکلتی تھی جیسے ذبح کی ہوئی گائے کے منہ سے۔ اس وقت وہ بات کرنے کے قابل نہیں رہتے تھے۔ (تاریخ خطیب بغدادی)

حضرت امام احمد بن حنبلؒ فرمایا کرتے تھے کہ عبداللہ بن مبارکؒ کو اللہ تعالیٰ نے جو اونچا مرتبہ دیا وہ اس بنا پر تھا کہ وہ اللہ تعالیٰ سے بہت زیادہ ڈرتے تھے۔ (صفوۃ الصفوۃ، ابن جوزی)

ابن المبارکؒ کے ایک ہمعصر عالم قاسم بن محمدؒ سے روایت ہے کہ اکثر سفر میں عبداللہ بن مبارکؒ کے ساتھ رہتا تھا۔ کبھی کبھی میرے دل میں خیال آتا تھا کہ آخر ان میں وہ کونسی خوبی ہے جس کی بنا پر ان کی اتنی قدر ہے اور مخلوق خدا ان کی راہ میں آنکھیں بچھاتی ہے' نماز وہ بھی پڑھتے ہیں ہم بھی پڑھتے ہیں' روزے وہ رکھتے ہیں تو ہم رکھتے ہیں' وہ حج کو جاتے ہیں تو ہم بھی جاتے ہیں' وہ خدا کی راہ میں جہاد کرتے ہیں تو ہم بھی جہاد میں شریک ہوتے ہیں لیکن جہاں دیکھیں ہر ایک کی زبان پر عبداللہ بن مبارکؒ کا ہی نام ہے۔ ایک مرتبہ ایسا ہوا کہ ہم لوگ شام کی طرف سفر کر رہے تھے۔ راستے میں رات آ گئی۔ ایک جگہ قیام کیا۔ کھانے کے لیے جب دستر خوان پر بیٹھے تو اتفاقاً چراغ بجھ گیا اور اندھیرا ہو گیا۔ ایک آدمی نے اٹھ کر چراغ جلایا جب روشنی ہوئی تو کیا دیکھتا ہوں کہ عبداللہ بن مبارک کی داڑھی آنسوؤں سے تر ہے۔ میں سمجھ گیا کہ اندھیرے میں ان کو قبر کا اندھیرا یاد آ گیا اور ان پر رقت طاری ہو گئی۔ اب مجھے یقین ہو گیا کہ یہی خوف خدا ان کے فضل و شرف کا باعث ہے۔

(صفوۃ الصفوۃ، ابن جوزی)

ابن المبارکؒ اگر خالق اور مخلوق کے معاملے میں انتہائی رقیق القلب تھے تو باطل کے مقابلے میں شیر ژیاں تھے جب موقع ملتا جہاد میں شریک ہوتے اور میدان جنگ میں شجاعت و بسالت کا حق ادا کر دیتے۔ایک دفعہ کچھ لوگوں کو شبہ پیدا ہوا کہ وہ عزلت پسند ہیں اور جہاد سے کوئی رغبت نہیں رکھتے لیکن جب رومیوں کے خلاف ایک لڑائی میں نقاب پوش مجاہد نے کئی رومیوں کو یکے بعد دیگرے ڈھیر کر دیا تو اس مجاہد کے چہرے سے کپڑا اٹھانے کے بعد وہ یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ یہ مجاہد عبداللہ بن مبارکؒ تھے۔اہل سیر کا بیان ہے کہ حضرت عبداللہ اکثر مصیصہ اور طرطوس وغیرہ کا سفر کرتے تھے اور یہ سفر محض شرکت جہاد کے لیے ہوا کرتا تھا۔

ایک مرتبہ کسی مجوس سے مقابلہ پیش آ گیا۔لڑائی کے دوران میں مجوسی کی عبادت کا وقت آ گیا۔اس نے ان سے مہلت چاہی کہ میں عبادت سے فارغ ہولوں اس کے بعد تم سے نبرد آزما ہوں گا۔وہ مان گئے۔مجوسی نے سورج کے سامنے سجدہ کیا تو ان کو سخت غصہ آیا اور اس کو قتل کرنا چاہا لیکن پھر حکم الٰہی کا خیال آیا کہ عہد کی باز پرس ہوگی تو ضبط سے کام لیا۔مجوسی عبادت سے فارغ ہوا تو ان کی پاسداری عہد سے اتنا متاثر ہوا کہ اسی وقت حلقہ بگوش اسلام ہو گیا۔

دینی و دنیوی وجاہت اور جلالت قدر کے باوجود حضرت عبداللہ بن مبارکؒ کی طبیعت میں عجز و انکساری اور فروتنی کا مادہ حد سے زیادہ تھا۔اپنی تعریف سننا گوارا نہیں کرتے تھے اور اپنی تعظیم و تکریم کے مظاہرے بھی پسند نہ کرتے تھے۔ایک مرتبہ ابووہب مروزی نے پوچھا کہ تکبر کی تعریف کیا ہے؟ فرمایا ''تکبر یہ ہے کہ دوسروں کو حقیر اور خود کو باعزت سمجھا جائے۔'' پھر فرمایا ''تکبر میں یہ بھی داخل ہے کہ تم اپنی کسی چیز کی نسبت یہ خیال کرو کہ یہ کسی اور کے پاس نہیں ہے۔''

فرمایا کرتے تھے ''جس شخص نے اپنے آپ کو پہچان لیا اس کی علامت یہ ہوگی کی وہ

اپنے آپ کو کتے سے بھی ذلیل سمجھنے لگا۔"

ایک مرتبہ کسی سبیل پر پانی پینے کے لیے گئے۔ وہاں بھیڑ تھی لوگوں کا ریلا جو آیا تو دھکا لگنے سے دور جا گرے۔ جب وہاں سے واپس چلنے لگے تو حسنؒ سے جو ان کے ساتھ تھے کہنے لگے "زندگی ایسی ہی ہو کہ نہ لوگ ہمیں پہچانیں اور نہ ہماری توقیر کریں۔"

مرو میں ان کے پاس ایک وسیع مکان تھا جس میں ہر وقت عقیدت مندوں کا ہجوم رہتا۔ ان کو یہ عقیدت مندی ناپسند تھی کچھ عرصہ تو اسے برداشت کیا لیکن جب دیکھا کہ اس میں روز بروز اضافہ ہو رہا ہے تو مرو سے کوفہ چلے گئے اور وہاں ایک تنگ و تاریک مکان میں قیام پزیر ہو گئے۔ لوگوں نے پوچھا' حضرت اتنا کشادہ مکان چھوڑ کر اس تنگ و تاریک مکان میں رہنے سے آپ کی طبیعت نہیں گھبراتی؟ فرمایا' لوگ عقیدت مندوں کے ہجوم میں رہنا پسند کرتے ہیں لیکن میں اس کو نہ پسند کرتا ہوں اسی لیے تو مرو سے کوفہ بھاگ آیا ہوں۔

عام لوگوں کے ساتھ تو ان کے عجز و انکسار کی یہی کیفیت تھی لیکن حاکموں اور امیروں کو خاطر میں نہیں لاتے تھے اور ان کے پاس جانا وقار علم کے منافی سمجھتے تھے۔ ابراہیم موصلی کا بیان ہے کہ خلیفہ ہارون رشید "عین ذربہ" آیا تو اس نے دو تین مرتبہ عبداللہ مبارکؒ سے ملنے کی خواہش کی لیکن میں نے کسی نہ کسی حیلے سے ٹال دیا۔۔۔ کیونکہ مجھے معلوم تھا ان کے سامنے دین و شریعت کے خلاف کوئی بات ہو گی تو وہ خلیفہ کو سختی سے روکیں گے اور یہ بات اسے ناگوار گزرے گی۔ اتفاقاً ایک دن عبداللہ بن مبارکؒ خود ہی خلیفہ سے ملنے تشریف لے آئے۔ ملاقات کے بعد کسی نے ان پوچھا' آپ تو ہارون الرشید کی ملاقات سے گریز کرتے تھے اب کیسے آ گئے؟ فرمایا' میں اپنے دل کو موت پر راضی کرنا چاہتا تھا مگر وہ نہیں ہوتا تھا اب جب کہ وہ راضی ہو گیا ہے تو میں ہارون سے ملنے آ گیا۔ گویا وہ ہارون الرشید کے سامنے حق گوئی سے باز نہیں رہ سکتے تھے اور اس کا نتیجہ ان کے قتل کی صورت میں بھی نکل سکتا تھا، جب ان کا نفس اپنی موت پر راضی ہو گیا تو وہ بے دھڑک خلیفہ کے پاس آ گئے۔ کسی دنیوی غرض کے لیے تو حکمرانوں سے انکے ملنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ ان کو نہ صرف

خود امراء و سلاطین سے ملنا ناپسند تھا بلکہ وہ اپنے احباب و اقرباء کو بھی اس سے منع کیا کرتے تھے۔ ان کے ایک عزیز دوست اور شاگرد اسماعیل بن علیہؒ تھے، وہ بھی بہت بڑے عالم اور محدّث تھے اور کاروبار میں انکے شریک تھے۔ انہوں نے بعض حاکموں اور امیروں کے پاس آنا جانا شروع کر دیا۔ بعض روایتوں میں ہے کے امراء حکام کے ساتھ ان کا یہ اٹھنا بیٹھنا اس سبب سے تھا کہ انہوں نے زکوٰۃ و صدقات کی تحصیلداری کا عہدہ قبول کر لیا تھا۔ حضرت عبداللہ بن مبارکؒ کو جب اس کی اطلاع ہوئی تو انہوں نے سخت ناگواری کا اظہار کیا۔ ایک دن اسماعیل انکی مجلس میں آئے تو ان سے مخاطب نہیں ہوئے، اسماعیل کو بہت رنج ہوا گھر جا کر ابن المبارک کی خدمت میں ایک خط لکھا جس میں انکی بے توجہی اور ناراضگی کا سبب دریافت کیا۔ اس خط کے جواب میں حضرت عبداللہؒ نے چند اشعار لکھ بھیجے جن کا مطلب یہ تھا ''تم نے علم دین کو ایسا باز بنا دیا ہے جو غریبوں کا مال سمیٹ کر کھا جاتا ہے۔ تم نے دنیا اور اس کی لذتوں کے لیے ایسی تدبیر اختیار کی ہے جو تمہارے دین کو پھونک کر رکھ دے گی۔ تمہاری وہ روایتیں کیا ہوئیں جو تم خود بیان کیا کرتے تھے اور جن میں دنیا دار حاکموں سے میل جول رکھنے کی وعید آئی ہے، دیکھو دنیا پرست پادریوں کی طرح دین سے دنیا نہ کماؤ۔

اسماعیل یہ اشعار پڑھ کر رونے لگے اور اسی وقت اپنے عہدے سے مستعفی ہو گئے۔

حضرت عبداللہ بن مبارکؒ کے نزدیک علم دین کو دولت کمانے کا ذریعہ بنانا جائز نہیں تھا۔ اس لیے انہوں نے تجارت کو اپنا ذریعۂ معاش بنایا تھا۔ وہ عموماً خراسان سے قیمتی سامان لاتے اور حجاز میں فروخت کرتے تھے۔ اللہ نے تجارت میں خوب برکت دی تھی لاکھوں ہی کماتے تھے اور لاکھوں ہی رضائے الٰہی کی خاطر کارہائے خیر میں صرف کرتے تھے۔ ان کی تجارت کا مقصد سرمایادار بن کر اپنی ذات کے لیے سامان عیش و راحت جمع کرنا نہیں تھا بلکہ اس کے ذریعے سے ایک تو وہ اپنی معیشت میں دوسروں کی دست نگری سے بے نیاز ہونا چاہتے تھے اور دوسرے خلق خدا کی خدمت میں کرنا چاہتے تھے۔ ایک مرتبہ ان کے شاگرد حضرت فضیل بن عیاض نے پوچھا، حضرت آپ ہمیں نصیحت کرتے ہیں کہ دنیا میں

دل نہ لگاؤ اور آخرت کی فکر کرو لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ آپ خود خراسان سے بیش قیمت سامان تجارت لاتے ہیں اور اسے بلد الحرام میں فروخت کرتے ہیں؟ فرمایا: "اے ابو علی! یہ میں اس لیے کرتا ہوں کہ مصائب سے بچ سکوں اور اپنی عزت و آبرو کی حفاظت کر سکوں اور اس کی مدد سے اللہ تعالیٰ کی اطاعت زیادہ سے زیادہ کروں اور اللہ کی طرف سے اپنوں پرایوں کے جو حقوق مجھ پر عائد ہوتے ہیں ان کی طرف سبقت کر کے اچھی طرح ادا کر سکوں۔ ایک اور موقع پر حضرت فضیلؒ سے فرمایا: اگر تم اور تمہارے ساتھی نہ ہوتے تو میں تجارت کی کھکھیڑ نہ اٹھاتا۔ حضرت ابن المبارکؒ کی آمدنی کے مصارف کی بڑی بڑی مدیں یہ تھیں۔

ا۔ مہمان نوازی

دستر خوان بہت وسیع تھا' سفر میں ہوں یا حضر میں مہمان نوازی کا خاص التزام تھا' دوست احباب ہوں یا اعزہ و اقارب' فقراء ہوں یا امراء' پڑوسی ہوں یا اجنبی' مسافر ہوں یا مقامی' ان کے دستر خوان پر سب کو دعوت عام تھی۔ کم از کم دو بچھڑوں کا گوشت روزانہ مہمان نوازی میں خرچ ہوتا تھا۔ مرغیوں اور بکریوں کا گوشت بھی پکتا تھا۔ ابو اسحٰق طالقانی کا بیان ہے کہ ایک دفعہ سفر کر رہے تھے تو ان کے ساتھ دو اونٹنیوں پر بھنی ہوئی مرغیاں لدی ہوئی تھیں۔ یہ ان مسافروں کے لیے تھیں جو ان کے ہم سفر تھے۔ ایک روایت میں ہے کہ سفر میں ان کے دستر خوان کا سامان ایک یا دو گاڑیوں پر لادا جاتا تھا۔ اگر کوئی چیز کھانے کو دل کرتا تو کبھی تنہا نہ کھاتے۔ کسی نہ کسی مہمان یا مہمانوں کے ساتھ بیٹھ کر تناول کرتے اور فرماتے کہ مہانوں کے ساتھ جو کھانا کھایا جاتا ہے آخرت میں اس کا محاسبہ نہیں ہوگا۔ خود روزے کثرت سے رکھتے تھے لیکن اپنے ساتھیوں کو فالودہ اور حلوہ بنوا بنوا کر کھلایا کرتے تھے۔

۲۔ علماء اور طلبہ کی اعانت

علماء اور طلبہ کی اعانت کے لیے ابن المبارکؒ اپنا مال بے دریغ لٹاتے رہتے تھے۔ اس معاملے میں ان کا نقطۂ نظر یہ تھا کی علماء اور طلبہ کو فکر معاش سے آزاد کر دیا جائے تا کہ

یکسوئی سے اشاعت علم اور تحصیل علم کر سکیں۔ وہ ایسے علماء اور طلبہ کی ڈھونڈ ڈھونڈ کر مدد کرتے تھے جو معاشی لحاظ سے پریشان حال ہوتے۔ اس مقصد کے لیے وہ جتنا روپیہ اپنے شہر کے علماء وطلبہ پر خرچ کرتے تھے اس کے کہیں زیادہ مال دوسرے شہروں کے علماء وطلبہ میں تقسیم کرتے تھے۔ خطیب بغدادیؒ نے حبان بن موسیٰؒ سے روایت کی ہے کہ بعض لوگوں نے ان سے شکایت کی کہ آپ اپنے شہر پر اتنا مال تقسیم نہیں کرتے جتنا دوسروں شہروں میں تقسیم کرتے ہیں۔ اس کے جواب میں انہوں نے فرمایا:

''جن علماء وطلبہ پر اپنا مال خرچ کرتا ہوں، میں ان کے علم وفضل اور صدق ودیانت سے بخوبی واقف ہوں۔ یہ لوگ علم دین کی اشاعت وطلب میں لگے ہوئے ہیں۔ آخر ان کی ذاتی (خانگی) ضرورتیں بھی تو وہی ہیں جو دوسروں لوگوں کی ہیں۔ اگر یہ لوگ بھی اپنی ضروریات زندگی میں پوری کرنے لگ جائیں تو علم ضائع ہو جائیگا۔ اگر ہم نے انہیں فکر معاش سے بے نیاز کر دیا تو یہ یکسوئی کے ساتھ علم کی اشاعت کریں گے اور میرے نزدیک نبوت کے ختم ہونے کے بعد علم کی اشاعت سے افضل دوسرا کوئی کام نہیں ہے۔''

ایک مرتبہ ان سے کہا گیا کہ اہل علم (یعنی طالبین علم) کی ایک جماعت لوگوں سے اموال زکواۃ لیتی ہے۔ انہوں نے فرمایا کہ پھر ہم کیا کریں، اگر ہم ان کو اس سے منع کر دیں تو وہ طلب علم سے رک جائیں گے جب کہ معاش کا کوئی ذریعہ اکے پاس نہیں ہے اور اگر ہم ان کو اس کے لئے اجازت دے دیں تو وہ یکسوئی کے ساتھ حصول علم میں لگے رہیں گے اور یہ کام دوسرے سب کاموں سے افضل ہے۔

۳۔ حجاج کی امداد

حضرت عبداللہ بن مبارکؒ کا معمول تھا کہ جب حج کے لیے روانہ ہونے لگتے تو اپنے تمام رفقائے سفر سے فرماتے کہ تم لوگ اپنا اپنا سفر خرچ میرے پاس جمع کرا دو۔ جب وہ اپنی رقمیں ان کے حوالے کر دیتے تو وہ ہر ایک کی رقم کو الگ الگ تھیلیوں میں بند کر کے ہر

تھیلی پر اس کے مالک کا نام لکھ دیتے پھر ان سب تھیلیوں کو ایک صندوق میں رکھ کر مقفّل کر دیتے۔ پورے سفر میں جو خرچ ہوتا اس کو خود برداشت کرتے۔ ان لوگوں کو عمدہ عمدہ کھانے کھلاتے اور ہر طرح کی آسائشیں مہیا کرتے۔ فریضۂ حج سے فارغ ہونے کے بعد مدینہ منورہ پہنچتے تو ان سے پوچھ پوچھ کر سب کے اہل وعیال کے لیے حسب منشا تحفے خرید کر دیتے۔ سفرِ حج ختم کر کے گھر واپس آتے تو اس زمانے کے حجاج کے دستور کے مطابق ان کے مکانات پر سفیدی وغیرہ کراتے۔ تین دن کے بعد تمام رفقائے سفر اور ان کے اعزہ اوقارب کی پرتکلف دعوت کرتے، اس سے فارغ ہو کر صندوق کھول کر ہر ایک تھیلی جس پر ان کا نام لکھا ہوتا تھا' اس کے حوالے کر دیتے تھے۔ راوی کا بیان ہے کہ زندگی بھر ان کا یہی شعار رہا۔

۴۔ جود وسخا اور اہل حاجت کی امداد

خطیب بغدادی نے ''تاریخ بغداد'' میں علی بن حسن بن شقیقؒ سے روایت کی ہے کہ ابن المبارکؒ ہر سال فقراء پر ایک لاکھ درہم خرچ کرتے تھے۔

حضرت عبداللہ بن مبارکؒ کی کتاب سیرت میں متعدد ایسے واقعات ملتے ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ بے حد فیاض اور سیر چشم تھے اور اہل حاجت کی امداد کے لیے ہر وقت کمر بستہ رہتے تھے۔

ایک مرتبہ (غالباً) جہاد میں شریک ہونے کے لیے بغداد سے مصیصہ کی جانب روانہ ہوئے تو کچھ صوفیہ بھی شریک ہو گئے۔ انہوں نے ان حضرات سے مخاطب ہو کر فرمایا کہ آپ حضرات کے نفوس قانع اس بات پر انقباض تو محسوس کریں گے کہ آپ کی خدمت میں کوئی سفر خرچ پیش کیا جائے پھر بھی زادِ راہ کی ضرورت سے بے نیاز رہنا ممکن نہیں۔ یہ کہہ کر ایک ملازم کو حکم دیا کہ ایک طشت لائے۔ وہ طشت لایا تو انہوں نے اس میں ایک معقول رقم رکھ دی اور اس کو ایک رومال سے ڈھانپ ۔ پھر ان حضرات سے فرمایا کہ ہر

صاحب باری باری اس رومال کے نیچے ہاتھ ڈال کر جو کچھ مٹھی میں آئے لے لیں۔ انہوں نے ایسا ہی کیا' کسی کو دس درہم مل گئے کسی کو بیس درہم یا اس سے کم بیش۔ مصیصہ پہنچ کر فرمایا کہ یہ پردیس ہے اور ضروریات باقی ہیں مناسب معلوم ہوتا ہے کہ جو کچھ باقی رہ گیا ہے اسے بھی تقسیم کر لیا جائے یہ کہہ کر ہر ایک کو بیس بیس دینار عطا کئے۔

ایک مرتبہ ایک شخص حضرت ابن المبارکؒ کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا کہ سات سو درہم کا مقروض ہوں' مجھے اس قرض سے نجات دلائیے۔ انہوں نے اسی وقت اپنے منشی کو لکھا کہ اس شخص کو سات ہزار درہم دے دیے جائیں۔ وہ آدمی خط لے کر منشی کے پاس پہنچا، اس نے پوچھا' تم پر کتنا قرض ہے اور تم نے کتنی رقم ابن المبارکؒ سے طلب کی تھی۔ اس نے کہا ''سات سو درہم''، منشی نے سمجھا کہ ابن المبارکؒ سے سہو قلم ہو گیا ہے اور وہ سات سو کے بجائے سات ہزار لکھ گئے ہیں چنانچہ اس نے ابن المبارکؒ کو لکھ بھیجا کہ یہ شخص صرف سات سو درہم کا مقروض ہے اور آپ نے سات ہزار دینے کا حکم دیا ہے کہیں سہو قلم تو نہیں ہو گیا؟ ابن المبارکؒ نے جواب میں لکھا کہ جس وقت میرا خط تم کو ملے اسی وقت اس شخص کو چودہ ہزار درہم دے دو۔ منشی اور بھی حیران ہوا اور اس نے از راہِ ہمدردی ان کو دوبارہ لکھا کہ آپ اس طرح اپنا سرمایا بے دریغ لٹاتے رہے تو یہ بہت جلد ختم ہو جائے گا۔ منشی کا خط پڑھ کر ابن المبارکؒ سخت برہم ہوئے اور کو سخت الفاظ میں لکھا کہ میں نے جو حکم دیا ہے اس پر عمل کرو ورنہ میری جگہ پر آ بیٹھو تم جو حکم دو گے میں اس پر عمل کروں گا۔ میرے نزدیک دولت دنیوی سے قیمتی سرمایہ ثواب آخرت اور رسول کریم ﷺ کا یہ ارشاد مبارک ہے کہ جو شخص اپنے کسی مسلمان بھائی کو غیر متوقع طور پر خوش کر دے گا اللہ اس کی مغفرت فرمائے گا۔ میں نے دانستہ سات سو کے بجائے سات ہزار درہم لکھے تھے تا کہ یہ شخص اتنی خطیر رقم اچانک پا کر خوش ہو جائے۔ دوسری مرتبہ میں نے اپنے خط میں چودہ ہزار درہم بھی سوچ سمجھ کر لکھے وہ اس لئے کہ سات ہزار کی بھنک اس شخص کے کان میں پڑ چکی تھی چودہ ہزار اس کے لیے یقیناً غیر متوقع ہوں گے اور یوں میں حضور ﷺ کے ارشاد کے مطابق اجرِ آخرت کا حقدار ٹھہروں گا۔

حضرت ابن المبارکؒ اکثر طرطوس جاتے رہتے تھے۔ راستہ میں رقہ پڑتا تھا وہاں کی ایک سرائے میں قیام کیا کرتے تھے۔ سرائے میں مقیم ایک نوجوان نہایت اخلاص سے ان کی خدمت کیا کرتا تھا اور ان سے حدیث کا درس بھی لیتا تھا۔ ایک مرتبہ حسب معمول رقہ کی اس سرائے میں ٹھہرے تو اس نوجوان کو نہ دیکھا۔ لوگوں سے اس کے بارے میں دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ اس پر فلاں شخص کا دس ہزار کا قرضہ تھا اسے ادا نہ کر سکا تو قرض خواہ نے دعویٰ کر دیا اور اس نوجوان کو قرض کی عدم ادائیگی کی پاداش میں قید خانے بھیج دیا گیا۔ حضرت عبداللہ ابن المبارکؒ نے قرض خواہ کو رات کی تنہائی میں بلایا اور اسے دس ہزار درہم دے کر کہا کہ بھائی اس نوجوان کو رہا کرادو۔ ساتھ ہی اس سے قسم لے لی کہ وہ اس بات کا تذکرہ کسی سے نہ کرے گا۔ نوجوان کی رہائی کا انتظام کر کے ابن المبارکؒ اسی رات سرائے سے روانہ ہو گئے۔ نوجوان رہا ہو کر سرائے میں آیا تو اسے ابن المبارکؒ کی آمد اور روانگی کی اطلاع ملی۔ اس کو حضرت سے شرفِ نیاز حاصل نہ کرنے کا اتنا قلق ہوا کہ اسی وقت طرطوس کی طرف روانہ ہو گیا۔ تین چار منزل کے بعد ان سے ملاقات ہوئی تو انہوں نے حال احوال پوچھا۔ اس نے عرض کیا ''جناب میں قید تھا۔ ایک نامعلوم شخص نے میرا قرض اپنی طرف سے ادا کر کے مجھے رہا کرا دیا معلوم نہیں وہ فرشتہ رحمت کون تھا۔'' حضرت عبداللہ ابن المبارکؒ نے فرمایا ''بھائی اللہ کا شکر ادا کرو کہ اس نے اس نامعلوم شخص کو تمہیں اس مصیبت سے نجات دلانے کی توفیق بخشی۔''

راوی (محمد بن عیسیٰ) کا بیان ہے کہ ابن المبارکؒ کی وفات کے بعد قرض خواہ نے یہ واقعہ لوگوں کو بتایا۔ حضرت عبداللہ ابن المبارکؒ عبات و ریاضت، زہد و ورع، امانت و دیانت اور حسن معاشرت کے اعتبار سے بھی اپنی مثال آپ تھے۔ حافظ ذہبیؒ نے ''تذکرۃ الحفاظ'' میں اسماعیل بن عیاشؒ کا یہ قول نقل کیا ہے کہ روئے زمین پر عبداللہ بن مبارکؒ جیسی کوئی شخصیت نہیں ہے اور میری دانست میں کوئی اچھی خصلت ایسی نہیں ہے جسے اللہ تعالیٰ نے ان کی ذات میں ودیعت نہ کر دیا ہو۔

حضرت فضیل بن عیاضؒ فرمایا کرتے تھے "رب کعبہ کی قسم میری آنکھوں نے عبد اللہ ابن المبارکؒ جیسا کوئی شخص نہیں دیکھا۔" عبادت وریاضت سے بہت شغف تھا، پنجگانہ نماز باجماعت فرض نمازوں کے علاوہ سنن ونوافل کا بھی خاص اہتمام تھا، بعض اوقات ساری ساری رات عبادت میں گزر جاتی۔ کثرت سے روزے رکھتے تھے۔ حج بیت اللہ کے لیے بھی اکثر تشریف لے جاتے تھے۔ دیانت وامانت کا یہ عالم تھا کہ ایک مرتبہ قیام شام کے دوران میں کس شخص سے قلم عاریتاً لیا۔ واپسی پر اسے قلم لوٹانا بھول گئے اور اسے اپنے ساتھ مرو لے آئے۔ گھر آکر دیکھا تو یاد آیا۔ افسوس کیا اور مرو سے شام تک طویل سفر دوبارہ صرف اس لیے کیا کہ وہ قلم اس کے مالک کے حوالے کرسکیں۔

حسن ادب کی یہ کیفیت تھی کہ ان کے سامنے کوئی شاگرد قراتِ حدیث کرتا تو وہ اس سے کسی عبارت کو دوبارہ نہیں پڑھواتے تھے بلکہ توجہ اور خاموشی کے ساتھ سنتے رہتے تھے۔ ایک بار مجلس میں ایک شخص کو چھینک آگئی۔ اس نے الحمد اللہ نہیں کہا۔ حضرت عبد اللہ ابن المبارکؒ نے کچھ دیر انتظار کیا۔ پھر اس سے پوچھا' جب چھینک آئے تو اس کو کیا کہنا چاہیے۔ اس نے کہا الحمد للہ اس پر انہوں نے کہا فوراً کہا "یرحمک اللہ" زندگی نہایت محتاط اور زاہدانہ تھی ابواسامہ اور شعب ابن حربؒ کہا کرتے تھے کہ ہم سال میں تین دن بھی ابن المبارک کی طرح نہیں گزار سکتے۔

ان کے زہدورع کی بنا پر اہل سیر نے انہیں زہاد تبع تابعین میں شمار کیا ہے۔

اسی طرح بعض ارباب سیر نے انہیں اولیا اللہ میں شامل کیا ہے اور انکی بہت سی کرامات بیان کی ہیں۔ علامہ خطیب بغدادی نے "تاریخ بغداد" میں ابووہبؒ کا یہ بیان نقل کیا ہے کہ ابن المبارکؒ کا گزر ایک نابینا پر ہوا تو اس نے بڑی لجاجت سے عرض کیا کہ میرے لیے بینائی کی دعا کیجئے۔ چنانچہ انہوں نے نہایت خشوع وخضوع سے دعا کی اور اللہ تعالیٰ نے اس کی بینائی بحال کردی۔

وعظ ونصیحت اور ارشاد واصلاح کا طریقہ نہایت بلیغ اور حکیمانہ ہوتا تھا۔ تذکروں

میں ان کے سینکڑوں پرمعارف اقوال ملتے ہیں جن میں سے کچھ یہ ہیں:

☆ بہت سے چھوٹے عمل ایسے ہوتے ہیں جن کو نیت بڑا بنا دیتی ہے اور بہت سے بڑے عمل ایسے ہوتے ہیں جن کو نیت چھوٹا بنا دیتی ہے۔

☆ سب سے سفلہ اور کمینہ وہ شخص ہے جو دین کو عیاشی کا ذریعہ بنائے۔

☆ عالم ہونے کے لیے یہ شرط ہے کہ دنیا کی محبت سے اس کا دل ہمیشہ خالی رہے۔

☆ دنیا کے مال پر کبھی غرور نہ کرو۔

☆ حق پر جمے رہنا سب سے بڑا جہاد ہے۔

☆ ہر کام میں ادب اور تہذیب کا خیال رکھو۔ دین کے دو حصے ادب اور تہذیب ہیں۔

☆ ایسا دوست ملنا بہت مشکل ہے جو صرف اللہ کے لے محبت کرے لیکن دوست فی الحقیقت یہی ہے۔

☆ آدمی اس وقت تک عالم رہتا ہے جب تک یہ سمجھتا رہے کہ شہر میں اس سے زیادہ علم رکھنے والے موجود ہیں مگر جب وہ یہ سمجھنے لگ جائے کہ میں ہی سب سے بڑا عالم ہوں تو یوں سمجھ لو کہ اب وہ جاہلوں کی صف میں جا کھڑا ہوا۔

☆ گمنامی کو پسند کرو اور شہرت سے دور رہو مگر یہ ظاہر نہ کرو کہ تم گمنامی کو پسند کرتے ہو اس لیے کہ اس سے بھی غرور پیدا ہوگا۔

☆ سب سے گرے ہوئے لوگ وہ ہیں جو قرض پر زندگی بسر کرتے ہیں اور ہاتھ پیر نہیں ہلاتے۔

☆ تواضع یہ ہے کہ اغنیا کے مقابلے میں خودداری کو ہاتھ سے نہ جانے دیا جائے۔

☆ حسن خلق یہ ہے کہ غصہ نہ کیا جائے۔

☆ شریف وہ ہے جسے اطاعت الٰہی کی توفیق ہوئی اور رذیل وہ ہے جس نے بے مقصد زندگی گزار دی۔

حضرت عبداللہ بن المبارکؒ ۱۸۱ھ میں جہاد فی سبیل اللہ کے لیے شام گئے۔ اثنائے سفر میں ہیت کے مقام پر طبیعت خراب ہوگئی یہاں تک کہ جانبری کی کوئی امید نہ رہی۔ انتقال سے پہلے غلام سے فرمایا' میرا سر زمین پر رکھ دو۔ غلام یہ سن کر رونے لگا۔ پوچھا' روتے کیوں ہو؟ اس نے عرض کیا' مجھے آپ کے مقام بلند کا خیال آ گیا کہ اللہ اللہ اپنے وقت کی عظیم ترین ہستی اس طرح جان دی رہی ہے۔ فرمایا' بھائی اس میں رنج کی کوئی بات نہیں' میں نے خود بارگاہ الٰہی میں دعا کی تھی کہ میں بے کسی اور فروتنی کی حالت میں جان دوں۔

ایک اور روایت میں ہے کہ مرض الموت میں آواز بیٹھ گئی تھی اس لیے اندیشہ ہوا کہ مرتے وقت کلمہ شہادت پڑھنے سے محروم نہ رہ جاؤں' اپنے شاگرد حسن بن ربیعؒ سے جو ساتھ تھے' فرمایا کہ دم نزع تم میرے سامنے کلمہ شہادت بلند آواز سے پڑھنا جب تم ایسا کرو گے تو میری زبان پر بھی کلمہ شہادت خود بخود جاری ہو جائے گا۔ چنانچہ انہوں نے اسی حالت میں ۱۳ رمضان المبارک ۱۸۱ھ (۸ نومبر ۷۹۷ء) کو بروز چہار شنبہ وفات پائی۔ اس وقت ان کی عمر ۶۲ برس کی تھی۔ مقام وفات ہیت اگرچہ ان کے وطن سے سینکڑوں میل دور تھا لیکن مخلوق خدا کے دلوں پر انکی حکمرانی کا یہ عالم تھا کہ وفات کی خبر پھیلتے ہی لوگ جوق در جوق اس دور افتادہ قصبے کی طرف دوڑ پڑے۔ جنازے پر اس قدر ہجوم تھا کہ ہیت کے حاکم کو اس واقعہ کی اطلاع بغداد بھیجنی پڑی۔ خلیفہ ہارون الرشید نے یہ خبر سنی تو اس کی زبان پر بے ساختہ یہ الفاظ آ گئے ''افسوس علماء کے سردار کا انتقال ہوگیا'' حضرت فضیل بن عیاضؒ نے فرمایا' ابن المبارکؒ فوت ہو گئے لیکن افسوس اس کا ہے کہ جو باقی رہ گئے' ان میں کوئی بھی ان کا مثل نہیں ہے۔

سفیان بن عیینہؒ بولے' اللہ عبداللہ بن مبارکؒ کو اپنے جوار رحمت میں جگہ دے' انہوں نے خراسان میں اپنا کوئی ثانی نہیں چھوڑا۔ اسی طرح دوسرے تمام علماء عصر نے بھی شاندار الفاظ میں انہیں خراج تحسین پیش کیا اور انکی وفات پر اپنے دلی کرب کا اظہار کیا۔ مختلف تذکروں میں حضرت ابن لمبارکؒ کو بہت سی کتابوں کا مصنف بتایا گیا ہے لیکن ان

میں بیشتر کتابیں نایاب ہوچکی ہیں۔خوش قسمتی سے چند سال پہلے انکی ایک معرکہ آرا تصنیف ''کتاب الزہد والرقائق'' بھارت میں چھپ کر منظر عام پر آ گئی ہے۔اس کتاب کے گیارہ حصے ہیں اور اس میں ۲۰۲۳ روایات ہیں ۔اسے مجلس احیاء المعارف مالیگاؤں (ناسک بھارت) نے شائع کیا۔ہماری دلی دعا ہے کہ خداوندِ قدوس ان کی مرقد پر کروڑوں رحمتیں نازل فرمائے آمین یارب العالمین۔

امیر المومنین فی الحدیث سیدنا محمد بن اسماعیل بخاری رحمۃ اللہ علیہ

اسماعیلؒ پایہ کے عالم اور محدث تھے،ان کے دادا مغیرہ،والی بخارا ''یمان جعفی'' کے ہاتھ پر مشرف باسلام ہوئے تھے،اسی نسبت سے ان کو بھی جعفی کہا جانے لگا۔اسماعیل کے والد کا نام ابراہیم تھا،تاریخ ابراہیم کے تذکرہ سے خاموش ہے۔ (مقدمہ فتح الباری)

اسماعیل کو حماد بن زید اور امام مالک سے حدیث کا شرف سماع حاصل ہے،اور ان سے احادیث کے راوی بھی ہیں،ابن حبان نے اسماعیل کا تذکرہ کتاب الثقات میں محدث کے طبقہ رابعہ کے تحت کیا ہے،تاج الدین سبکی ان کے متعلق طبقات کبریٰ میں لکھتے ہیں۔

''اسماعیل بن ابراہیم متقی علماء میں سے تھے،امام مالک سے سماع حدیث کا شرف حاصل کیا،حماد بن زید کی زیارت کی اور عبداللہ بن مبارک کی صحبت پائی۔۔۔۔احمد بن حفص کہتے ہیں کہ میں اسماعیل کی وفات کے وقت حاضر خدمت ہوا تو فرمانے لگے'' مجھے اپنے تمام سامان میں سے کسی ایک درہم کے مشتبہ ہونے کا علم نہیں'' احمد بن حفص کہتے ہیں یہ بات سن کر مجھے اپنی کمزوری و کم ہمتی کا احساس ہوا'' (تہذیب الکمال جلد۴)

۱۳شوال ۹۴ھ بعد نماز جمعہ بخارا میں اسماعیل کے گھر بچہ پیدا ہوا بچہ کا نام ''محمد'' رکھا گیا،کسے اندازتھا کہ یہ بچہ اسلامی تاریخ کے گلشن کا وہ گل سرسبد بنے گا جس کی مہک صدیوں رہے گی اور جس کا آوازہ زمانہ کے دبیز پردے نہیں روک سکیں گے اور کسے معلوم تھا کہ صدیوں میں پیدا ہونے والا یہ ''دیدہ ور'' کائنات کی بہترین ہستی کے بکھرے اور نکھرے

ہوئے ریحان ونسترن کی چمن بندی کی وہ لافانی خدمت انجام دے گا جوان کو ''لسان صدق فی العالمین'' اور حیات جاوداں بخشے گی۔

سالہا باشد کہ تا یک سنگ اصلی زآفتاب لعل باشد در بدخشاں یا عقیق اندر یمن

شخصیات کی عبقریت اپنے خاندان اور وطن کے تذکروں کو بھی زندہ رکھتی ہے، بخارا کے تذکرہ میں اگر آج دلچسپی ہے تو اسی حوالہ سے کہ وہ امام بخاری کا وطن ہے۔

بخارا دریائے جیحون کی زیریں گذرگاہ پر ایک بڑے نخلستان میں واقع ان مردم خیز علاقوں کا ایک شہر ہے، جن سے علم وفن کی تاریخی شخصیات کی عظمتیں وابستہ ہیں، جو علم و دانش کے بڑے بڑے سورماؤں کا وطن رہا اور جہاں صحاح ستہ کے مصنفین پیدا ہوئے۔

امام بخاری کا بخارا ہو یا امام مسلم کا نیشاپور، امام ابوداود کا سجستان ہو یا امام ترمذی کا ترمذ، امام نسائی کا نسا ہو یا ابن ماجہ کا وطن قزوین، یہ سب اسی ماوراء النہر اور اس کے اردگرد علاقوں کے لالہ زار ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ آخری صدیوں میں پھر ان علاقوں کی وہ مردم خیزی باقی نہ رہی جو اسکی تاریخی خصوصیت تھی۔

نہیں اٹھا پھر کوئی رومی عجم کے لالہ زاروں سے وہی آب وگل ایران وہی تبریز ہے ساقی

سطح سمندر سے بخارا کی بلندی ۷۲۲ فٹ (۲۲۲٫۴ میٹر) ہے اور یہ طول البلد مشرقی ۶۴ درجہ ۳۸ دقیقہ (گرین وچ) اور عرض البلد شمالی (۳۹ درجہ ۴۳ دقیقہ پر واقع ہے، اس کی مساحت (۲۰۵۰۰۰) کیلو میٹر ہے۔ (دائرہ معارف اسلامیات)

معجم البلدان میں علامہ یاقوت حموی بخارا کے متعلق لکھتے ہیں: ''بخارا (باء کے ضمہ کے ساتھ) ماوارء النہر کے بڑے اور عظیم شہروں میں سے ہے، بخارا کا طول ستاسی درجہ اور عرض اکتالیس درجہ ہے اور اقلیم خامس میں واقع ہے، بخارا کی وجہ تسمیہ باوجود تلاش کرنے کے مجھے معلوم نہ ہوسکی، بخارا ایک قدیم اور باغ و بہار والا شہر ہے وارء النہر کے تمام شہروں میں جو شادابی اور حسن بخارا کو حاصل ہے کسی دوسرے شہر کو نہیں، جب آپ باہر سے اس کے قلعے پر چڑھ کر اس کا نظارا کریں تو ہر سو آپ کو مزار اور سبزہ ہی سبزہ نظر آئے گا درمیان میں

بنے ہوئے محلات کا منظر حسین پھولوں کی مانند نظر نواز ہے۔ (حوالہ بالا)

اسکندر اکبر مقدونی کے فتوحات سے قبل بخارا فارسی حکومت کے تابع تھا، اس وقت اس کو "صغد یان" کہتے تھے، اسکندر اکبر نے جب فارس کے شہر فتح کئے تو بخارا بھی اس کے زیر نگیں آگیا، بعد میں یونانیوں کو ملا، پھر جب لشکر اسلام دنیا کے چپہ چپہ پر دین اسلام کا جھنڈا لہرانے کے لئے اٹھا تو بخارا کو بھی فتح کر ڈالا، ہوا یوں کہ جب حضرت معاویہؓ کے دور میں زیاد بن ابی سفیان کا ۵۳ھ میں انتقال ہوا تو ان کی جگہ ان کے بیٹے عبیداللہ کو خراسان کا عامل بنایا گیا، ۵۴ھ میں اس نے بخارا کی جانب پیش قدمی کی اور نسف وبیکند کو فتح کیا، بخارا کی حکومت اس وقت "خاتون" نامی عورت کے پاس تھی، عورت نے ترک کو مدد کے لئے کہا، ان کی ایک بڑی جماعت آئی، جنگ ہوئی اور انکو شکست ہوئی، خاتون نے پیغام صلح بھیجا اور ایک لاکھ سالانہ پر صلح ہوئی، پھر حضرت معاویہؓ نے ۵۵ھ میں سعید بن عثمان کو خراسان کا امیر مقرر کیا ۸۷ھ تک پھر اس کا تاریخی حال معلوم نہ ہوسکا، ۸۷ میں اسلامی فتوحات کے عظیم جرنیل قتیبہ بن مسلم کی قیادت میں اسلامی لشکر کے نہ تھمنے والے سیل رواں نے جب ان علاقوں کا رخ کیا تو بخارا کو بھی فتح کر ڈالا۔

پھر جب چنگیز خان کی تاریخی بربریت کا نام مبارک آغاز ہوا تو عالم اسلام کے بیسیوں شہروں کی طرح بخارا بھی اس کی بربادیوں کا لقمہ بنا اور یہاں اس نے سفاکی کی وہ تاریخ مرتب کی جس کی مثال تباہی اور قتل ودرندگی کی تاریخ میں کم سے کم ملے گی، چند محلات چھوڑ کر پورے شہر کو نذر آتش کر کے تاراج کیا گیا، یہ ۴ ذوالحجہ ۶۱۶ ۱۰ فروری ۱۲۲۰ کا واقعہ ہے۔ (دائرہ المعارف)

پھر تاتاری قوم اسلام کو جڑ سے اکھاڑنے اور دنیا کے نقشہ سے اس کا وجود ختم کرنے پر تلی ہوئی تھی جب پوری کی پوری مسلمان ہوگئی کہ: اسلام زندہ ہوتا ہے ہر کربلا کے بعد

اور کعبے کو صنم خانے سے پاسبان مل گئے تو چنگیزی خاندان کے مشہور اسلامی فاتح تیمور لنگ کے ہاتھ بخارا (۱۳۷۰ھ) میں آیا اور بخارا ایک بار پھر اسلامی تہذیب وتمدن کا

مرکز بن گیا، بخارا تیمور لنگ کی اولاد کے پاس رہا حتی کہ ۱۴۹۸ء میں ازبکوں نے اس پر قبضہ کیا اور تیموری خاندان کی حکومت یہاں سے ختم کر ڈالی۔

چونکہ روس کے لئے ہندوستان کی ایک رہ گذر بخارا بھی ہے، اس اہمیت کے پیش نظر مغربی وسائل کی مدد سے روس نے اس پر ۱۸۷۳ء میں قبضہ جمایا۔

پھر جب ۱۹۹۱ میں کئی ریاستوں کے عناصر سے بنے ہوئے روس کے وفاق کا عقدہ کشا ہوا تو اور چھ مسلم ریاستیں آزاد ہوئیں، ان آزاد ہونے والی چھ ریاستوں میں بخارا ریاست ازبکستان کا شہر ہے جس کا دارالحکومت تاشقند ہے۔

برسوں روس کی جارحیت کی زیرنگین رہنے والی اس ریاست سے کمیونزم کی گرد اگرچہ اب تک مکمل نہیں جھڑی تاہم ایام گردش پیہم کے ان مراحل کے بعد اب بخارا ایک اسلامی ریاست کے تحت ہے اور ان علاقوں کے "عروق مردہ" میں اب خون اسلام دوڑ ا ہے، اگر اسلامی تہذیب اور دینی تعلیم کا یہاں پھر چرچا ہونا شروع ہو تو۔۔۔

نہیں ہے ناامید اقبال اپنی کشت ویراں سے ذرا نم ہو تو یہ مٹی بہت زرخیز ہے ساقی

کیونکہ یہیں علم وفن کی نابغہ روزگار شخصیات میں سے محدث ابوزکریا عبدالرحیم بن احمد متوفی (۴۶۱ھ) پیدا ہوئے اور بخارا ہی کو فلسفہ وحکمت کی بلندیوں پر پہنچنے والے مشہور حکیم ابن سینا متوفی (۴۲۸ھ) کے وطن ہونے کا شرف حاصل ہے۔

امام نے جب آنکھ کھولی تو ہر طرف اسلامی علوم کا چرچا تھا، دنیوی ترقیاں اسلامی علوم میں مہارت پر موقوف تھیں، علم حدیث کا شاداب درخت بہاروں پر تھا، نبی کریم ﷺ کا عہد ساز دور ابھی ابھی گزرا تھا، صحابہؓ کی یادیں اور ان کے تربیت یافتہ زندہ تھے، عالم اسلام کے بڑے شہر محدثین کے مرکز میں چپہ چپہ سے آنے والے تشنگان علم حدیث کی آجگاہ تھے، خیر القرون کی مبارک فضا میں امام نے پرورش پائی، پھر قدرت کی فیاضیوں نے بلا کا حافظہ دیا، نہ ختم ہونے والے شوق سے نوازا، جہد مسلسل کی توفیق ملی، بلند ہمتی کا جوہر پایا اور سب سے بڑھ کر وہ عظیم اخلاص میسر ہوا جس کے بغیر سب کچھ بیکار، ہر عمل نامکمل اور سراب کی نمود ہے۔

امام نے سفر کی لاٹھی ہاتھ میں لی اور عالم اسلام کے بڑے شہروں کا رخ کیا، علوم کی بہتی سوتوں اور حدیث کے فرحت بخش ٹھنڈے چشموں سے تشنگی بجھا کر طلب علم کی حرارت کی تسکین کی، خطیب بغدادی لکھتے ہیں:۔ "امام بخاری نے طلب علم میں تمام محدثین کے شہروں کا سفر کیا، خراسان اور اس کے پہاڑوں، عراق کے تمام بلاد، نیز حجاز، شام اور مصر میں جا جا کر حدیثیں حاصل کیں۔ (تاریخ بغداد)

امام بخاری کی تعلیم وتربیت کے متعلق تاج الدین سبکی "طبقات" میں لکھتے ہیں:۔
امام بخاری کی نشو ونما یتیم ہونے کی حالت میں ہوئی سماع حدیث کا آغاز ۲۰۵ھ میں کیا، ابن مبارک کی تصانیف حفظ کیں، بچپن ہی سے علم کی محبت نصیب ہوئی، قوی حافظہ اس کا معاون بنا، اپنے وطن بخارا میں محمد بن سلام بیکنڈی، محمد بن یوسف اور ابراہیم بن اشعث سے سماع حدیث کے بعد ۲۲۰ھ میں دوسرے شہروں کا رخ کیا، بلخ میں مکی بن ابراہیم اور یحییٰ بن بشر سے احادیث سنیں، مرو میں علی بن الحسن اور عبدان وغیرہ سے سماع کیا، نیشاپور میں یحییٰ بن یحییٰ اور بشر بن الحکم۔ سے شرف تلمیذ حاصل کیا، رمی میں ابراہیم بن موسیٰ سے پڑھا، بغداد میں شریح بن نعمان۔۔۔ کے تلمیذ رہے، بصرہ میں ابو عاصم نبیل، اور محمد بن عبداللہ سے سنا ،کوفہ میں ابونعیم، طلق بن غنام اور حسن بن عطیہ۔ وغیرہ کے شاگرد بنے، مکہ میں حمیدی، مدینہ میں عبدالعزیز اویسی اور مطرف بن عبداللہ سے سماعت کی، الغرض واسط، مصر دمشق، قیساریہ، عسقلان اور حمص میں مخلوق خدا کا ایک جم غفیر سے آپ نے احادیث سنیں جن سب کا ذکر طول ذکر ہے۔ (طبقات شافعیہ کبریٰ)

تاج الدین سبکی نے امام بخاری کے سفر "الجزیرہ" کا انکار کیا ہے اور حاکم کی "تاریخ نیسابور" میں الجزیرہ کی طرف امام کے تذکرہ سفر کو وہم قرار دیا چنانچہ وہ فرماتے ہیں۔

وفی تاریخ نیسابور للحاکم انه سمع بالجیریرة وھذا وھم فانه لم یدخل الجزیرة۔ (حوالہ بالا)

"حاکم کی "تاریخ نیسابور" میں ہے کہ امام بخاری نے الجزیرہ میں حدیث کا سماع

کیا، لیکن یہ ان کا وہم ہے کیونکہ امام الجزیرہ میں سرے سے داخل ہی نہیں ہوئے۔"

جب کہ حافظ ابن حجر نے امام بخاری کے سفر الجزیرہ کا ذکر کیا ہے اور خود امام بخاری کا یہ قول نقل کیا ہے دخلتُ اِلی الشَّامِ و مصر ولجزیرة مرّتَین. "میں شام، مصر اور الجزیرہ دو دو بار گیا ہوں۔" علامہ نوویؒ نے بھی تہذیب الاسماء واللغات میں امام بخاری کے الجزیرہ میں سماع کا تذکرہ کیا ہے۔ بہر حال بخاری نے علم حدیث کے لئے عالم اسلام کے تمام شہروں کی خاک چھانی، وہ خود فرماتے ہیں: علم الحدیث یحتاج الی بعد الاسفار ووطی الدیار و رکوب البحار. (تہذیب الکمال)

"علم حدیث حاصل کرنے کے لئے دور دور کے سفر، مختلف دیار کے گشت اور دریاؤں کو عبور کرنا پڑتا ہے۔ چنانچہ امام نے اپنی زندگی کے طویل علمی رحلات میں ایک ہزار سے زائد محدثین سے احادیث کا سماع کیا، فرماتے ہیں: کتبت عن الف شیخ و اکثر ماعندی حدیث الا اذکر اسناده "میں نے ایک ہزار سے زائد شیوخ سے حدیثیں لکھیں، مجھے اپنی ہر حدیث کی سند یاد ہے۔

اللہ جل شانہ نے اس میدان میں ان سے کام لینا تھا اور جو کام لینا تھا اس کے تمام فطری اسباب ان میں پیدا فرما دیئے، احادیث میں علل کی معرفت کا میدان ہو یا صحیح و سقیم میں امتیاز کا مسئلہ، ہزاروں راویوں کے احوال پر اطلاع کا کٹھن مرحلہ ہو یا اسماء رجال اور ان کی کنیتوں کے حفظ کا معاملہ، امام بخاری کی عبقریت نے ان تمام میدانوں میں جولانیاں کیں، جب ان سے پوچھا گیا کہ آپ کی ابتدائی سرگزشت کا آغاز کس طرح ہوا؟ تو فرمانے لگے "میں ابھی طفل مکتب تھا کہ حفظ کا مجھے الہام ہوا۔۔۔ اس وقت میری عمر دس سال یا اس سے بھی کم تھی، مکتب سے نکل کر محدث داخلی کے ہاں جانا شروع کیا ایک دن وہ سند حدیث بیان کرتے ہوئے کہنے لگے، "سفیان عن ابی الزبیر عن ابراہیم" میں نے ان سے کہا، حضرت ابو الزبیر نے ابراہیم سے روایت نہیں کی ہے، انہوں نے مجھے جھڑکا، میں نے اصل کی جانب رخ کرنے کے لئے کہا، گھر جا کر جب اصل دیکھ آئے تو کہنے لگے،

لڑکے! پھر ابراہیم سے کون روایت کر رہا ہے؟ میں نے کہا ''زبیر بن عدی'' تو مجھ سے قلم لے کر اپنی کتاب کی تصیح کی اور فرمایا کہ تم نے ٹھیک کہا، بخاری سے جب پوچھا گیا کہ اس وقت آپ کی عمر کتنی تھی؟ فرمانے لگے، گیارہ سال۔ (تاریخ بغداد)

گیارہ سال کے اس بچے کو دیکھئے اور داخلی جیسے محدث کی سند میں غلطی پر بھری مجلس میں تنبیہ کو دیکھئے، اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ قدرت آنے والے وقت میں اس بچہ سے حدیث رسول کریم ﷺ کی کتنی عظیم خدمت لینا چاہتی تھی۔

امام بخاری کے ہمدرس حاشد بن اسماعیل کا بیان ہے کہ بخاری ہمارے ساتھ مشائخ بصرہ کے ہاں حدیث پڑھنے جاتے تھے، ہم احادیث لکھتے، بخاری نہ لکھتے، ان سے ہم کہتے کہ آپ لکھتے کیوں نہیں؟ سولہ دن گزرنے کے بعد بخاری ہم سے کہنے لگے لاؤ جو تم نے جو کچھ لکھا ہے، ہم نے پندرہ ہزار احادیث لکھی تھیں، وہ لے آئے تو بخاری وہ تمام احادیث زبانی سنا کر کہنے لگے، بتائیں میں نے وقت ضائع کیا؟...... (حوالہ بالا)

ابھی عمر کا اٹھارواں سال تھا کہ صحابہؓ اور تابعین کے اقوال پر مشتمل ایک کتاب ''قضایا الصحابة والتابعین'' کے نام سے لکھی اور اسی عمر میں اپنی شہرہ آفاق کتاب ''تاریخ کبیر'' لکھی، روضہ اطہر کے پاس، مدینہ کی منور فضاء اور حسین چاندنی راتوں میں لکھی گئی اس مبارک کتاب کے بارے میں خطیب بغدادی نے سعید بن العاص کا یہ تبصرہ نقل کیا ہے کہ

''اگر کوئی شخص چاہے تیس ہزار حدیثیں ہی کیوں نہ لکھ دے تاہم وہ بخاری کی ''تاریخ'' سے مستغنی نہیں ہوسکتا'' سلیم بن مجاہد ایک دن مشہور محدث محمد بن سلام بیکندی کی خدمت میں حاضر ہوئے، بیکندی فرمانے لگے، اگر کچھ دیر قبل آتے تو ستر ہزار حدیثیں حفظ کرنے والا بچہ دیکھ لیتے، سلیم یہ سن کر بچہ کی طلب میں نکلے، ملاقات کر کے پوچھا، ستر ہزار احادیث کے حفظ کا آپ کو دعویٰ ہے؟ بخاری کہنے لگے، جی ہاں بلکہ اس سے بھی زیادہ مزید یہ کہ جس صحابی اور تابعی کی حدیث آپ کو سناؤں گا ان تمام کی ولادت، وفات، اور مساکن کا بھی علم رکھتا ہوں۔ (تہذیب الکمال)

بیکندی کہتے تھے کہ، جب یہ بچہ میرے درس حدیث میں آجاتا ہے میں پریشان ہوجاتا ہوں اور مجھے گھبراہٹ کی بناپر حدیث میں التباس ہونے لگتا ہے۔

یہ آسمان علم حدیث کے بدر کامل کی اس وقت کی چند جھلکیاں ہیں جس کے ظہور کی ابھی ابتدا تھی جس قمر کے مرحلہ ''ہلال'' میں ضیاپاشیوں کا یہ عالم ہو، ماہ تاباں میں اس کے جلوؤں کا عالم کیا ہوگا۔

امام نے حافظہ بلا کا پایا تھا اور حقیقت یہ ہے کہ جس راہ کے آپ مسافر تھے اس میں غیر معمولی حافظہ کا قدرتی توشہ اگر پاس ومعاون نہ ہوتا تو منزل کی ان بلندیوں پر جہاں آج آپ ہیں پہنچنا مشکل ہوتا، رجال کا فن امام کے زمانے میں مدون نہ تھا، آج کی طرح کسی راوی کے ضعف وصحت کے حتمی فیصلوں پر کتابیں ابھی وجود میں نہیں آئی تھیں، سینکڑوں ثقہ و غیرہ ثقہ ہم نام راویوں میں فرق کرنے کا واحد ذریعہ حافظہ تھا اور ہزاروں کی تعداد میں رجال حدیث کے ضعف وصحت کا مدار بھی اسی پر تھا، محدثین امتحان لیتے، آپ کی قوت حفظ کے کرشمے دیکھتے اور ششدر وحیران ہوتے۔

ایک مرتبہ بغداد آئے، محدثین جمع ہوئے، امتحان لیا اس طرح کی دس آدمیوں نے دس دس حدیثیں لے کر ان کے سامنے پیش کیں، ان احادیث کے متون اور سندوں کو بدلا گیا تھا، متن ایک حدیث کا اور سند دوسری حدیث کی لگا دی تھی، امام حدیث سنتے او رکہتے ''لا اعرفہ (مجھے یہ حدیث معلوم نہیں) خواص امام کی مہارت جان گئے، کہنے لگے، امام واقعی امام ہیں، عوام کو خیال ہوا کہ یہ کیسے امام ہیں ان کی جانب سے تو ہر حدیث کے بارے میں ''لا اعرفہ'' کا اعلان ہے، جب اپنی دس دس حدیثیں سنا کر سب فارغ ہوگئے تو امام پہلے شخص کی جانب یہ کہتے ہوئے متوجہ ہوئے۔

تم نے پہلی حدیث یوں سنائی تھی اور صحیح یوں ہے، سب کے ساتھ ایسا کیا، پہلے انہیں ان کی مقلوب حدیث سناتے پھر تصحیح کرتے جب ایک ہی مجلس میں ان سب کی سو مقلوب حدیثیں سنائیں پھر ان کی تصحیح کی تو مجمع حیران تھا، مجلس تعجب کا نشان تھی، حافظ ابن

حجرؒ نے یہ واقعہ لکھا تو یہ تبصرہ بھی کر دیا۔

هنا يخضع للبخاری ،فما العجب من رده الخطا الى الصواب ، فانه كان حافظا،بل العجب من حفظه للخطا علی ترتيب ماألقو ه عليه من مرة واحدة. (تاریخ بغداد)

"یہاں بخاری کی امامت تسلیم کرنی پڑتی ہے، تعجب اس پر نہیں کہ بخاری نے غلط احادیث کی تصحیح ،اس لئے کہ وہ تو تھے ہی حافظ، تعجب تو اس کرشمہ پر ہے کہ امام نے ایک ہی دفعہ میں ان کی بیان کردہ ترتیب کے مطابق وہ تمام مقلوب احادیث یاد کر لیں۔"

واقعی اس واقعہ میں دوسری بات زیادہ باعث تعجب ہے، پر امام کے حافظہ نے اس سے بھی زیادہ عجائبات دکھائے ہیں، ہم پہلے لکھ چکے ہیں کہ امام نے مشائخ بصرہ کی سولہ روزہ مجالس کی پندرہ ہزار احادیث زبانی سنائی تھیں جن میں ایک دن کی مجلس کی احادیث ۹۳۷ سے کچھ اوپر بنتی ہیں، امتحان کی اس مجلس میں تو صرف سو حدیثیں یکبار سننے سے یاد ہوئیں۔

ابو بکر کلواذانی کہتے ہیں کہ میں نے بخاری جیسا شخص نہیں دیکھا وہ کسی عالم سے کتاب لے لیتے ،ایک نظر اس پر ڈالتے ہیں اور کتاب کی احادیث کے اکثر اطراف یاد کر لیتے ہیں۔ (مقدمہ فتح الباری)

سمرقند میں چار سو محدثین جمع ہوئے ،احادیث کی اسانید میں تبدیلیاں کر کے سات دن تک امام بخاری کو مغالطہ میں ڈالنے کی کوشش کرتے رہے لیکن کامیاب نہ ہو سکے۔

فرماتے ہیں: "مجھے ایک لاکھ صحیح حدیثیں اور دو لاکھ غیر صحیح احادیث یاد ہیں"

امام بخاری گلستان علم حدیث کی بہار تھے، جہاں جاتے تشنگان علم حدیث کی مجلسیں آباد ہو جاتیں ،ایک مرتبہ بلخ گئے ،اصحاب حدیث جمع ہوئے ،املاء حدیث کی درخواست کی، ہزار راویوں کی ہزار حدیثیں سب کو لکھوا دیں۔

یوسف بن مروزی کہتے ہیں، میں بصرہ کی جامع مسجد میں تھا، کسی نے اعلان کیا بخاری آئے ہیں ان کی طلب میں نکلو، لوگ نکلے، میں بھی ساتھ ہو لیا، کیا دیکھتا ہوں، عقب

ستون میں مصروف نماز ایک نوجوان شخص ہے، جس کی داڑھی نے ابھی سفیدی کو اجازت نہیں دی، یہ تھے بخاری، جوں ہی نماز سے فارغ ہوئے لوگوں نے مجلس حدیث منعقد کرنے کا مطالبہ کیا، امام انکار کیسے کرتے، حدیث کی مجلسوں ہی سے تو انکی زندگی کا چمن آباد تھا، محدثین، فقہاء اور حفاظ کا ایک جم غفیر جمع ہو گیا، ابھی املاء شروع نہیں کیا کہ مجمع کو مخاطب کر کے فرمانے لگے "میں ایک نوعمر انسان ہوں، آپ لوگوں نے مجھ سے املاء حدیث کا مطالبہ کیا تو اب مناسب یہ ہے کہ میں آپ کو ایسی احادیث سناؤں جو تمہارے پاس پہلے سے نہ ہوں تا کہ آپ سب مستفید ہو سکیں۔" پھر املا یوں شروع کرائی: **حدثنا عبد اللہ بن عثمان بلدیکم قال : ثنا ابی عن شعبة عن منصور عن سالم بن ابی الجعد عن انس أن أعرابیا جاء الی النبی ﷺ فقال :یا رسول اللہ الرجل یحب القوم ...الخ...** سند اور احادیث سنانے کے بعد فرمانے لگے، تمہارے پاس یہ حدیث ہے تو سہی لیکن منصور کے طریق سے نہیں، اس طرح املاء کراتے رہے اور ہر حدیث کے بعد یہ فرماتے رہے کہ یہ حدیث تمہارے پاس فلاں راوی کے طریق سے ہے، میرے بیان کردہ راوی کے طریق سے نہیں، مجلس برخاست ہوئی، تو اہل مجلس حیران تھے۔ (تاریخ بغداد)

فرماتے تھے، ایک دن حضرت انسؓ کے شاگردوں پر نظر دوڑائی تو ایک ہی لمحہ میں تین سو حافظہ کے پردہ پر آ گئے۔

امام بخاری علم کی محبت قدرت کے عطیہ کے طور پر پائے تھے، اس کے لئے پوری زندگی گشت کرتے رہے، علم آپکا اوڑھنا تھا، بچھونا تھا، علم آپ کے لئے سامان راحت تھا اس کے لئے زندگی کی ہر راحت کو قربان کیا، آپ کی زندگی کی رونق تھا اس رونق پر دنیا کی تمام رونقیں لٹائیں، پوری عمر حدیث پڑھی، حدیث پڑھائی، حدیث لکھی اور دوسروں کو لکھوائی، غضب کے حافظہ کے باوجود طلب اور جدوجہد میں کمی نہ آئی، طلب اور محنت کے پتھر پر گھسنے کے بعد زندگی کی "حنا" رنگ لائی اور خوب لائی۔

محمد بن یوسف بخاری کہتے ہیں، میں امام بخاری کے ساتھ ایک رات اس کے گھر

رہا، امام رات کو اٹھتے، چراغ جلاتے، کچھ لکھ کر پھر لیٹ جاتے، میں نے گنتی کی تو اٹھارہ بار آپ اٹھے۔ (تہذیب الکمال)

محمد بن حاتم کہتے ہیں، میں ایک سفر میں بخاری کے ساتھ تھا، میں نے دیکھا کہ امام بخاری رات کو پندرہ پندرہ اور بیس بیس مرتبہ اٹھتے، چراغ جلاتے، اور احادیث پر کچھ نشان لگا کر لیٹ جاتے۔ جامع بخاری کی صحت پر آج جو پوری دنیا متفق ہے کسے اندازہ ہے کہ محنت کے کن شدید مراحل سے گزرنے کے بعد اس درجہ تک پہنچی۔

ہانی بن نضر کہتے ہیں، ہم شام میں محمد بن یوسف فریابی کے پاس تھے، جوان تھے، جوانوں کی طرح مزاح و مذاق رہتا لیکن بخاری صرف علم ہی پر چھائے رہتے، ہمارے ساتھ شریک نہ ہوتے۔ محمد بن ابی حاتم نے کسی سے سنا کہ امام بخاری نے بلاذر (خاص قسم کی دوا) کھائی ہے اس لئے ان کا حافظہ قوی ہے انہوں نے امام بخاری سے دریافت کیا کہ حافظہ کی کوئی دوا ہے؟ امام فرمانے لگے مجھے نہیں معلوم، پھر فرمانے لگے: **لا أعلم شيئا انفع للحفظ من نهمة الرجل ومداومة النظر**. "حافظہ کے لئے آدمی کے انہماک، دائمی نظر و مطالعہ سے بہتر کوئی چیز میرے علم میں نہیں ہے۔ فرماتے ہیں کہ میں نے اپنی تمام کتابیں تین بار لکھی ہیں، محمد بن ابی حاتم نے پوچھا، آپ کو اپنی کتابوں کے تمام مندرجات یاد ہیں؟ فرمانے لگے، "**لایخفی علی جمیع مافیها**" ان میں سے کوئی چیز مجھ سے مخفی نہیں۔

رے کے قاضی ابوالعباس عہدہ قضا سے معزول ہو کر بخارا آئے، اسحاق بن ابراہیم اپنے شاگرد ابوالمظفر کو ان کی خدمت میں لے گئے، قاضی سے فرمائش کی کہ اس بچہ کو کچھ احادیث پڑھا دیجئے ابوالعباس نے معذرت کرتے ہوئے کہا کہ مجھے مشائخ سے سماع حدیث کا شرف نہیں حاصل، اسحاق کہنے لگے، یہ کیونکر ممکن ہے؟ آپ تو فقیہ ہیں، قاضی ابو العباس نے کہا، درحقیقت میں جب لکھنے پڑھنے کے قابل ہوا تو حدیث کا شوق مجھے امام بخاری کے پاس لے آیا، ان کے سامنے میں نے اپنے ارادہ شوق کا اظہار کیا تو امام بخاری فرمانے لگے، بیٹے! کسی چیز میں داخل ہونے سے پہلے اس کے حدود و شرائط جان لیا کرو،

میں نے کہا، میں جس چیز کا شوق لیکر آیا ہوں اس کے حدود و شرائط آپ ہی مجھے بتا دیں تو بخاری فرمانے لگے،

اعلم ان الرجل لایصیر محدثاً کاملاً فی حدیثہ الا بعد ان یکتب أربعا مع أربع کأربع مثل أربع فی أربعٍ عند أربع بأربعٍ علیٰ أربع عن أربع لأربع وکل ھذہ الرباعیات لاتتم الا بأربع مع أربع، فاذا تمت لہ کلھا ھانت علیہ أربع، وابتلی بأربع ، فا ذا صبر علیٰ ذٰلک أکرمہ اللہ تعالیٰ فی الدنیا بأربع وأثابہ فی الآخرۃ بأربع.

'اس میں کوئی شک نہیں کہ آدمی اسی وقت کامل محدث بن سکتا ہے کہ اولاً چار چیزوں کو چار چیزوں کے ساتھ چار چیزوں کی طرح لکھیں، جیسے چار چیزیں، چار (مقاصد) وجہ سے، چار (قسم کے لوگوں) سے، چار چیزوں پر، چار (مقامات) میں، چار (حالات) کے وقت (اور زندگی کے مختلف) چار (زمانوں) میں لکھی جاتی ہیں اور تمام رباعیات اسی وقت مکمل ہوسکتی ہیں جب انسان کو چار (کمالات) چار نعمتوں سمیت حاصل ہوں اور جب یہ سب آدمی کو حاصل ہوجائیں تو پھر اس کے لئے چار چیزیں۔۔۔۔آسان ہوجاتیں ہیں اور چار (آزمائشوں) میں وہ مبتلا ہوجاتا ہے اور جب ان (آزمائشوں) پر صبر کرلے تو اللہ تعالیٰ دنیا میں اس کو چار (نعمتوں) سے نوازتے ہیں اور آخرت میں چار نعمتیں نصیب فرماتے ہیں۔''

ابوالعباس بے چارے ''رباعیات'' کے اس طویل سلسلہ کا فلسفہ کیا جانتے، کہنے لگے اب مہربانی فرما کر ان کی تشریح بھی فرمادیجئے، امام بخاری نے تشریح فرماتے ہوئے کہا،

جو چار چیزیں اولاً لکھنا ضروری ہیں، وہ ہیں۔۱۔ نبی کریم ﷺ کی احادیث اور دیگر احکام شریعت ۲۔اور انکے احوال، ۳۔تابعین اور انکے حالات، ۴۔دیگر علماء امت کی تاریخ۔

ان چار کو جن کے ساتھ لکھنا ہے، وہ ہیں، ۱۔راویوں کے نام، ۲۔رجال حدیث کی کنیتیں، ۳۔رجال حدیث کے علاقے اور، ۴۔انکا زمانہ اور دور۔

یہ ایسی لازمی ہیں جیسے خطبے کے ساتھ حمد وثناء انبیاء کے ناموں کے ساتھ درود وسلام ،قرآن کی سورتوں کے ساتھ بسم اللہ اور نماز کے ساتھ تکبیر۔

جیسے احادیث مسندہ، احادیث مرسلہ۔ احادیث موقوفہ اور احادیث مقطوعہ چار قسم کی احادیث بچپن میں لکھی جاتی ہیں اور لڑکپن میں بھی، جوانی میں لکھتے ہیں اور کہولت میں بھی، مشغولیت میں بھی اور فراغت میں بھی ،فقر میں بھی ،اور غنا میں بھی، پہاڑوں پر چڑھ کر بھی اور دریاؤں کو عبور کر کے بھی، شہروں میں جا کر بھی اور صحراؤں کی خاک چھان کر بھی، پتھروں پر بھی اور اصواف (اون) پر بھی، چمڑوں پر بھی اور ہڈیوں پر بھی۔

پھر یہ احادیث بڑے سے بھی لکھی جا سکتی ہیں اور ہم عمر سے بھی، چھوٹے سے براہ راست بھی لکھی جاسکتی ہیں اور اس کے والد کی کتاب سے بھی۔

اور ان سب کا مقصد یہ ہو کہ اللہ کی رضا حاصل ہو، رضاء خداوندی کے طالبین میں ان احادیث کی اشاعت ہو، کتاب اللہ کے موافق عمل ہو اور آنے والی نسلوں کے لئے تالیف کی صورت میں ذخیرہ ہو۔ لیکن یہ اسی وقت ممکن ہے جب انسان لکھنا بھی جانتا ہو اور زبان سے بھی واقف ہو، صرف کا علم رکھتا ہو اور نحو کا بھی۔

اس کے ساتھ ساتھ اللہ کی جانب سے صحت عطا ہو، کام کرنے کی قدرت حاصل ہو ،شوق وطلب کا جذبہ ہو اور حافظہ کی قوت پاس ہو، جب ان تمام کی تکمیل ہو جائے تو پھر اہل و عیال اور مال ووطن کی محبت انسان کے لئے ہلکی ہو جاتی ہے اور دشمنوں کی شماتت، دوستوں کی ملامت، جاہلوں کے طعن اور علماء کے حسد کی آزمائش میں انسان مبتلا ہو جاتا ہے۔ اور جب ان تمام پر آدمی صبر کر لے تو دنیا میں اللہ تعالیٰ کی جانب سے پھر چار نعمتیں ملتی ہیں۔

۱۔ قناعت کی عزت ۲۔ نفس کی ہیبت ۳۔ علم کی لذت ۴۔ اور ابدی حیات،

اور چار نعمتیں آخرت میں ملتی ہیں۔

۱۔ حق شفاعت کہ جس کے لئے چاہے اللہ سے سفارش کر دے۔ ۲۔ عرش خداوندی کے سایہ میں جگہ۔ ۳۔ اپنے نبی محمد ﷺ کے حوض سے پانی پلانے کا اختیار۔ ۴۔ اور اعلیٰ علیین

میں انبیاء کے جوار میں سکونت۔

امام بخاریؒ یہ تفصیل سنا کر قاضی ابوالعباس سے فرمانے لگے، "بیٹے! اب تجھے علم حدیث کا مشغلہ اختیار کرنے میں اختیار ہے۔" قاضی ابوالعباس نے حدیث میں مہارت کی ان تمام شرطوں کی تاب اپنے اندر نہ پا کر فقہ کی طرف توجہ دی کہ اس کے لئے بہر حال اتنے پاپڑ نہیں بیلنے پڑتے اور فقہ بن کر قاضی ہوئے۔

حافظ ابن حجرؒ نے اس کلام کی امام بخاری کی طرف نسبت مشکوک قرار دی ہے اور اس پر وضع کا شبہ ظاہر کیا ہے لیکن اس کے موضوع پر ہونے والی کوئی دلیل پیش نہ کر سکے، چنانچہ حضرت شیخ الحدیثؒ نے مقدمۂ اوجز المسالک میں مذکورہ کلام میں حافظ کے اس شبہ کو ضعیف قرار دیا ہے۔ (تہذیب الکمال)

آپ کے دن علم حدیث کے سدابہار گلشن کی سیر میں گزرتے اور آپ کی راتیں عبادت اور "آہ سحر گاہی" سے معمور تھیں، بندگی کو وہ درجہ آپ کو بھی نصیب تھا جہاں بیداری شب کی لذت اور آہ سحر گاہی کے سامنے دنیا کی تمام لذتیں انسان کو ہیچ محسوس ہوتی ہیں اور جس کی تعبیر اقبال کے الفاظ نے یوں کی ہے۔

واقف ہو اگر لذت بیداریٔ شب سے — اونچی ہے ثریا سے بھی یہ خاک پراسرار

اور

عطار ہو رومی ہو رازی ہو غزالی ہو — کچھ ہاتھ نہیں آتا بے آہ سحر گاہی

امام بخاریؒ کا معمول تھا آخری شب سحر کے وقت اٹھتے اور تہجد کی نماز ادا کرتے۔

نماز میں خشوع وخضوع کی یہ کیفیت تھی کہ ایک دن نماز سے فارغ ہو کر پاس والوں سے کہنے لگے "میری قمیص میں دیکھو کوئی چیز تو نہیں؟ دیکھا تو زنبور تھا، سولہ سترہ جگہ پشت پر کاٹا تھا۔ پوری پیٹھ سوجھ گئی تھی، جب امام صاحب سے کہا گیا کہ آپ نے اتنی بار کاٹنے کا موقع ہی کیوں دیا پہلی ہی بار میں نماز چھوڑ دیتے؟ فرمانے لگے ایک سورت شروع کی تھی، میں چاہ رہا تھا کہ وہ پوری کردوں۔ (تاریخ بغداد)

زنبور (بھڑ) جیسے موذی جانور کا سولہ سترہ جگہ پر کاٹنا لیکن اس کے باوجود قرآن میں محو رہنا در حقیقت ہمارے اسلاف کو حاصل وہ ''لطف قرآن'' تھا جوان کو ہر چیز سے بے نیاز اور ہر تکلیف سے بے پرواہ کر دیتا تھا اور جس پر اس دور میں جب کہ ''در سینہ سوز جگر نماند لطف قرآن سحر نماند'' یقین میں دشواری پیش آتی ہے۔

امام بخاریؒ کا رمضان المبارک میں ہر روز ایک مرتبہ قرآن اور تراویح کے بعد ہر تین راتوں میں ختم معمول تھا۔ ایک مرتبہ تیر اندازی کرتے ہوئے تیر کسی پل کے میخ پر لگا، کچھ شگاف پڑا، بخاری تیر اندازی چھوڑ کر ساتھیوں سے کہنے لگے، پل کا مالک تلاش کرو، پل کے مالک حمید بن اخضر کو نقصان کا تاوان دینا چاہا، اس نے انکار کیا، کہا کہ آپ پر تو میرا تمام مال فدا ہے، امام اتنا خوش ہوئے کہ تین سو دراہم غرباء میں تقسیم کئے، پانچ سو احادیث اس دن طلبہ کو پڑھائیں۔ پوری زندگی کسی کی غیبت نہیں کی، فرماتے تھے، ''جب سے غیبت کے حرام ہونے کا علم ہوا ہے کسی کی غیبت نہیں کی'' ایک بار ابو معشر ضریر سے فرمانے لگے، قصور معاف فرمایئے، ابو معشر نے کہا، آپ سے کونسا قصور سرزد ہوا؟ فرمانے لگے ایک دن حدیث سنانے کے دوران جب آپ پر نظر پڑی تو حدیث سنتے ہوئے آپ کے عجیب جھومنے کی کیفیت پر ہنسی آئی، ابومشر نے کہا آپ پر اللہ کی رحمت نازل ہو آپ میری طرف سے بری ہیں۔

دور سے آنے والے چند ساعات کے مہمان کے ساتھ بد کیا بدترین اخلاق کا حامل انسان بھی خوش خلقی سے پیش آتا ہے لیکن اچھے اخلاق جانچنے کی کسوٹی یہ نہیں، سفر وحضر میں ساتھ رہنے والوں کے ساتھ اخلاقی برتاؤ کا نمونہ بہتری اخلاق کے فیصلہ کا معیار ہے۔

امام بخاری کے سفر وحضر کے ساتھی محمد بن ابی حاتم نے نو سو بیس درہم کا ایک گھر خریدا، بخاری نے ایک ہزار درہم دیتے ہوئے کہا ''ان کو گھر کی قیمت میں خرچ کرلو'' محمد نے اس وقت لے لئے، کچھ دیر بعد بخاری سے کہا، ''میری ایک حاجت ہے لیکن کہنے کی جرأت نہیں پاتا'' امام سمجھے کہ شاید مزید درہم کی ضرورت ہے، کہنے لگے، ''آپ کو میرے سامنے

اپنی ضرورت بیان کرتے ہوئے جھجک محسوس نہیں ہونی چاہیئے'' محمد بن ابی حاتم نے کہا، ''آپ پوری کرنے کا وعدہ کرتے ہیں تو بیان کروں'' امام نے وعدہ کیا، محمد نے کہا یہ درہم آپ واپس لے لیں، یہی میری حاجت تھی، امام نے چونکہ وعدہ کیا تھا اس لئے واپس لے لئے۔

ایک مرتبہ امام بخاریؒ نے ان کو کچھ رقم دی اور فرمایا کہ اس سے اپنے لئے کچھ خرید لو، محمد بن ابی حاتم نے امام کی طبیعت کی مناسب اشیاء خرید کر ان کے گھر بھیج دیں، امام بخاری نے ان سے کہا، رقم آپ کو دے کر اشیاء اپنے لئے منگوانا میرا مقصد نہ تھا، محمد بن ابی حاتم نے کہا، آپ نے دنیا اور آخرت دونوں کی بھلائی جمع کر دی ہے، جتنا اچھا سلوک آپ مجھ سے برتتے ہیں کون اپنے خادم کے ساتھ اتنا اچھا سلوک کرتا ہے۔ امام گھر میں تھے، باندی آئی، امام کے سامنے دوات میں بھری سیاہی گرادی، امام نے تنبیہ کی، کیسے چلتی ہو؟ باندی نے کہا، راستہ نہ ہو تو کیسے چلوں؟ امام نے دونوں ہاتھ پھیلا کر کہا تم آزاد ہو، فرماتے تھے جب دنیا کا ذکر کلام میں آتا ہے اللہ کی حمد سے ابتدء کرتا ہوں۔ (مقدمہ فتح الباری)

سلیم بن مجاہد کہتے ہیں میں نے بخاری سے زیادہ دنیا میں بے رغبتی کرنے والا کسی کو نہیں دیکھا، امام کو اپنے والد سے ترکہ میں کافی مال ملا تھا، علم میں مشغولیت کی وجہ سے وہ مال مضاربت کے سپرد کر دیا کرتے تھے، ایک مرتبہ ایک مضارب نے پچیس ہزار درہم غبن کئے، امام سے کہا گیا کہ مقامی حاکم سے کہہ دیں وہ دلوا دیں گے، امام فرمانے لگے اگر حاکم سے اس سلسلہ میں مدد لوں گا تو کل وہ میرے دین میں دخل اندازی کرے گا اور میں اپنا دین دنیا کے عوض نہیں ضائع کرنا چاہتا۔

ایک مرتبہ امام کے پاس کچھ سامان آ گیا، تاجر جمع ہوئے، پانچ ہزار درہم پر بیع کرنا چاہ رہے تھے، امام نے کہا، رات گزرنے دو صبح دیکھیں گے، صبح دوسرے تاجر آئے اور دس ہزار دینے لگے لیکن امام نے کہا میں نے رات پہلے تاجروں کو دینے کی نیت کی ہے اب نیت نہیں بدلنا چاہتا۔

فرماتے تھے ایک دفعہ آدم بن ابی ایاس کے ہاں پڑھنے گیا، خرچ ختم ہوا، گھاس تک کھانی پڑی کسی کو اطلاع مناسب نہ سمجھی، تین دن بعد ایک اجنبی نے اشرفیوں کی تھیلی دی اور چلا گیا۔

ایک مرتبہ بصرہ میں طالب علمی کے دوران کئی دن درس میں نہ آئے۔ تفتیش کی تو معلوم ہوا کہ کپڑے اور خرچ دونوں ندارد، ساتھیوں نے پھر اس کا انتظام کیا۔ (تاریخ بغداد)

لافانی علم کے حامل امام کی فانی دنیا سے بے رغبتی کی یہ چند مثالیں ہیں اسی کا نتیجہ دریادلی وسخاوت کے عظیم جذبہ کی صورت میں امام کی شخصیت کا وصف تاباں بنا۔

ضرورت مندوں پر بڑا خرچ کرتے تھے، اس بات کی احتیاط کرتے کہ کسی کو اس کا علم نہ ہونے پائے، ایک بار حدیث کے ایک طالب علم کو تین سو درہم عطا کئے، اس نے چاہا کہ دعائیں دے، امام نے جلد موضوع بدل کر بات شروع کی کہ کسی کو خبر نہ ہو۔

آپ کی جائداد کی ماہانہ پانچ سو درہم آمدنی آتی وہ سب فقراء طلبہ میں تقسیم کرتے۔

الغرض امام بخاری کی شخصیت کے ترکیبی عناصر میں ذہن کی بیداری بھی تھی اور علم کی پختگی بھی، حافظہ کی غیر معمولی قوت بھی تھی اور سخت جانی و جانفشانی بھی، طلب جستجو بھی تھی اور ہمت کی بلندی بھی، ذوق وشوق بھی تھا اور فقر و درویشی بھی، معلومات کی وسعت بھی تھی اور نظر کی گہرائی بھی، ملکہ کا رسوخ بھی تھا اور تجربہ کی گیرائی بھی، اخلاص وتقویٰ بھی تھا اور بیداری شب و آہ سحر گاہی بھی، علمی جلال بھی تھا اور اخلاص کی نرمی وخوش خرامی بھی، دنیا سے بے رغبتی بھی تھی اور وصف سخا و دریادلی بھی،

یہ چیزیں ملیں تو علم کا چشمہ پھوٹا اور ایسا پھوٹا کہ جس نے بحث وتحقیق ۔۔۔ فقہ و حدیث اور روایت درروایت کے تمام گوشوں کو سیراب کیا۔

حدیث میں ہے ابنیاء پر بڑی سخت آزمائشیں آتی تھیں پھر جس کی انبیاء سے جتنی مماثلت ہوگی اتنی ہی سخت آزمائشوں میں وہ مبتلا ہوگا۔ (مشکوۃ شریف)

ا......امام بخاریؒ کو بھی زندگی میں بڑے طوفانوں سے گزرنا پڑا، ابھی بچے ہی تھے

کہ بینائی جاتی رہی، ماتا کی مامتا نے نہ جانے کتنی دعائیں کی ہوں گی کہ ایک دن حضرت ابراہیم علیہ السلام کو خواب میں دیکھا فرمارہے ہیں۔

''اللہ نے آپ کی دعاؤں کی کثرت کی وجہ سے آپ کے بیٹے کی بینائی لوٹادی'' صبح ہوئی تو دیکھا تو امام کی بینائی لوٹ آئی تھی۔

۲...... جب خراسان گئے تو دوبارہ بینائی جاتی رہی کسی نے گل خطمی کو سر پر ملنے کے لئے کہا، اس سے بینائی پھر لوٹ آئی۔

۳...... نیشاپور امام آئے تو لوگوں نے بادشاہوں کی طرح استقبال کیا، امام مسلم کہتے ہیں ''بخاری نیشاپور آنے لگے تو لوگ دو تین منزل شہر سے نکل کر باہر آگئے، ایسا فقید المثال استقبال کیا کہ میں نے کسی عالم اور حکمران کو نہیں دیکھا کہ اہل شہر نے ان کا اس طرح استقبال کیا ہو، نیشاپور کے شیخ اور محدث محمد بن یحییٰ ذہلی اور شہر کے دوسرے علماء سب استقبال کے لئے گئے۔'' (مقدمہ فتح الباری)

محمد بن یحییٰ ذہلی نے اپنے شاگردوں سے کہا کہ درس حدیث میں خلق قرآن کے متعلق بخاری سے سوال نہ کرنا خدانخواستہ اگر وہ اس مسئلے میں ہماری رائے کے برعکس جو اب دے دیں تو ہمارے درمیان اختلافات پڑے گا اور خارجی، رافضی اور جہمی سب ہنسیں گے۔

نیشاپور میں امام بخاریؒ کی مجلس حدیث کی ابتدا ہوئی تو تل دھرنے کو جگہ نہ تھی، کھوئے سے کھوا اچھل رہا تھا، مسجد اور اس کا صحن لوگوں سے کچھا کھچ بھرا ہوا تھا، دوسرے تیسرے دن مجلس کا آغاز ہوا تو ایک آدمی نے ''لفظی بالقرآن'' کے متعلق پوچھا، امام نے توجہ نہ دی، اس نے دوبارہ سوال کیا، امام خاموش تھے، تیسری مرتبہ سوال پر امام نے کہا

''القرآن کلام اللہ غیر مخلوق وافعال العباد مخلوقة، ولا متحان بدعة''

''قرآن اللہ کا کلام غیر مخلوق ہے، بندوں کے افعال مخلوق ہیں اور اس کے متعلق سوال کرنا اور امتحان لینا بدعت ہے۔''

امام بخاری سے یہ سوال چونکہ ایک خاص سازش کے تحت کیا گیا تھا، اس لئے مخالفین نے دھماچوکڑی مچادی، کچھ لوگ کہہ رہے تھے "لفظی بالقرآن" کو مخلوق کہہ دیا، بعض کہہ رہے تھے، نہیں کہا، چونکہ یہ مسئلہ زبردست معرکۃ الاراء بنا ہوا تھا اور امام احمد بن حنبل ؒ کا اس سلسلہ میں پوری حکومت سے ٹکر لینا ابھی ابھی کا واقعہ تھا اس لئے لوگ اس میں بڑے تشدد کا شکار تھے کسی کی طرف سے ذرا سا اجمال اس مسئلہ میں اہلسنت کے بڑے بڑے علماء کے جذبات پر انگیختہ کرنے کا سبب بن جاتا، پھر شدید اختلافی نوعیت کے اس جیسے مسئلہ میں کسی بڑی شخصیت کے کلام میں تھوڑے سے ابہام کے متعلق بھانت بھانت کی بولیاں بولنا تو بہر حال عوام کا فطری خاصہ ہے۔ کچھ لوگوں نے جا کر نیشاپور کے شیخ محمد بن یحییٰ ذہلی کے سامنے یہ بے پر کی اڑادی کہ بخاری نے کلام اللہ کو مخلوق کہہ دیا ہے، اس خبر نے ذہلی کو بخاری کی شدید مخالفت پر آمادہ کر دیا اور انہوں نے یہ اعلان کر دیا کہ "**الا من یختلف الی مجلسہ فلا یختلف الی مجلسنا**" "جو کوئی بخاری کی مجلس میں جائے گا وہ ہماری مجلس میں شرکت نہ کرے" (تاریخ بغداد)

محمد بن یحییٰ ذہلی بخاری کے استاذ ہیں، امام بخاری ؒ نے ان سے ۳۴ روایتیں لی ہیں، حنفی جلیل القدر عالم، نیشاپور کے شیخ اور بلند پایہ محدث ہیں، علامہ ذہبی نے سیر اعلام النبلاء میں ان کا تذکرہ ان الفاظ کے ساتھ شروع کیا، **محمد بن یحی الامام، العلامۃ الحافظ، البارع، شیخ الاسلام، وعالم أھل المشرق وإمام اھل الحدیث بخراسان۔** (تہذیب التہذیب)

امام بخاری ؒ اور علامہ ذہلی کے اختلاف کی عام طور پر کتابوں میں دو وجہ لکھیں ہیں۔

۱...... چونکہ اس وقت مسئلہ "خلق قرآن" کا اختلاف زوروں پر تھا اس مسئلہ میں معتزلہ کے باطل عقیدہ کو ختم کرنے کی غرض سے اہلسنت کے بعض علماء ذرہ برابر نرمی یا ابہام برداشت نہیں کرتے تھے اور جیسے کے ماقبل میں لکھ چکے ہیں کہ علامہ ذہلی نے اپنے شاگردوں سے کہا تھا کہ اس مسئلہ کے متعلق امام بخاری ؒ سے سوال نہ کرنا کیونکہ اگر وہ ایسا

جواب دیں گے جس سے ہمارے عقیدہ پر زد پڑتی ہو تو ہم میں اختلاف پیدا ہوگا۔ جب لوگوں نے امام بخاری کی طرف سے علامہ ذہلی کے سامنے ''لفظی بالقرآن'' مخلوق ہونے کی بے بنیاد خبر اڑائی تو خدشہ اختلاف اختلاف بن گیا۔

۲...... دوسری وجہ یہ لکھی ہے کہ ابتداء میں تو علامہ ذہلی امام بخاریؒ کی آمد سے بڑے خوش تھے لیکن امام بخاریؒ کی مجلس کی طرف لوگوں کی توجہ بڑھتی اور ذہلی کی مجلس کی رونق دھیمی پڑتی گئی تو اس سے حسد کی آفت نے جنم لیا جس کا نتیجہ امام بخاریؒ کو شہر بدر کرنے کی صورت میں ظاہر ہوا۔

خطیب نے تاریخ التہذیب اور مقدمہ بغداد میں، علامہ ذہبی نے سیر اعلام النبلاء میں، حافظ ابن حجر نے تہذیب التہذیب اور مقدمہ الفتح میں دونوں بزرگوں کے اختلاف میں حسد کی یہ وجہ بھی لکھی ہے۔ تاج الدین سبکی نے تو طبقات کبریٰ میں صاف لکھ دیا۔

ولا یرتاب المنصف فی أن محمد بن یحی الذهلی الحقته آفة الحسد التی لم یسلم منها الا اهل العصمة۔ (طبقات کبریٰ)

''انصاف کی نظر سے دیکھنے والے کو اس بات میں شک کی گنجائش نہیں رہتی کہ ذہلی کو حسد کی وہ آفت لاحق ہوگئی تھی جس سے صرف عصمت (انبیاء) محفوظ رہے ہیں۔''

لیکن جس طرح یہ دوسری توجیہ سمجھ میں نہیں آتی کہ بہرحال امام بخاری علامہ ذہلی کے شاگرد تھے، امام کی آمد کے وقت استقبال کے لئے خود گئے، اپنی مجلس میں ان کے استقبال کے بارے میں یہ اعلان کیا کہ جو بخاری کے استقبال کے لئے جانا چاہے جائے ہم تو بہرصورت جائیں گے جس شاگرد کی اتنی محبت وعزت دل میں ہو اس کے ساتھ یکلخت حسد کیونکر؟ ٹھیک اسی طرح اول الذکر بات کی سمجھ میں دشواری یوں پیش آتی ہے کہ امام بخاری کے بارے میں جب لوگوں نے ''لفظی بالقرآن مخلوق'' کہنے کی بے بنیاد خبر اڑائی تو علامہ ذہلی نے اس کی تحقیق کیوں نہ فرمائی؟ بن تحقیق اختلاف پر کیونکہ آمادہ ہوئے جب کہ امام بخاریؒ صاف اعلان کر کے کہتے تھے کہ ''انسانوں کی حرکات، اصوات، ان کا کام کرنا

ہلکھنا سب مخلوق ہیں البتہ قرآن جو مصاحف میں مکتوب اور دلوں میں محفوظ ہے وہ اللہ کا کلام اور غیر مخلوق ہے۔'' (تاریخ بغداد)

ابو عمرو خفاف نے جب امام بخاریؒ سے اس مسئلہ کی صراحت چاہی تو امام نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ ''نیشاپور، قومس، ری، ہمدان، حلوان، بغداد، کوفہ، بصرہ، مکہ اور مدینہ میں جو بھی یہ کہے کہ میں نے ''لفظی بالقرآن مخلوق'' کہا ہے وہ کذاب ہے، میں نے قطعاً یہ نہیں کہا میں نے تو ''افعال العباد مخلوقۃ'' کہا ہے، امام بخاری کا مسلک اس مسئلہ میں عام علمائے اہلسنت کے مطابق تھا۔ (تاریخ بغداد)

غرض ایک طرف علامہ ذہلی کا امام بخاریؒ کے استقبال کے لئے خود جانا اور دوسری طرف محض لوگوں کے کہنے سننے ہی سے ان کو شہر بدر کرانا حیرت کن ہے۔

درحقیقت یہاں کئی چیزیں جمع ہوگئی ہیں اول تو امام بخاری بہر حال علامہ ذہلی کے شاگرد تھے ، ذہلی نے اس مسئلہ میں ان کو کلام کرنے سے منع کیا اس کے ساتھ ساتھ اہل بغداد نے علامہ ذہلی کو امام بخاری کے متعلق لکھا کہ بخاری ''لفظی بالقرآن'' کے خلق میں کلام کرتے ہیں۔ لوگوں نے نیشاپور میں بھی یہی خبر مشہور کی، پھر امام بخاری کے ساتھ اختلاف کی وجہ سے امام مسلم اور احمد بن سلمہ جیسی شخصیتیں علامہ ذہلی کے درس حدیث سے برسر مجلس اٹھیں، یہ تمام عوامل جمع ہوئے تو علاہ ذہلی کے اس اختلافی رویہ کی بنیاد پڑی جس کے بعد انہوں نے یہ تک کہہ دیا۔ **''لایسا کننی ھذا الرجل فی البلد''**

احمد بن سلمہ امام بخاری کے پاس آکر کہنے لگے اس شخص (علامہ ذہلی) کی شہر میں بڑی مقبولیت ہے ہم سے کچھ کرتے دھرتے بن نہیں پڑ رہا، اب آپ کا کیا خیال ہے؟ نیشاپور امام بخاریؒ کا اپنا شہر تو تھا نہیں، یہاں امام مہمان اور غریب الدیار تھے، علامہ ذہلی کا یہ اختلافی رویہ انکو نکلنے پر مجبور کر رہا تھا، بڑے غمگین اور شکستہ خاطر ہو کر کہنے لگے۔

''اے اللہ! تو خوب جانتا ہے کہ میں نیشاپور تکبر و فساد کی نیت سے نہیں آیا اور نہ ہی بڑائی و سیاست کی چاہت لے کر آیا ہوں، میں تو اپنے وطن بخارا اس لئے نہیں گیا کہ وہاں

پہلے سے میرے مخالفین موجود ہیں۔ (مقدمہ فتح الباری)

احمد بن سلمہ سے کہنے لگے میں کل نیشاپور چھوڑ دوں گا تاکہ تم اس شخص سے میرے سلسلہ میں خلاصی پاؤ، امام کی حالت گویا کہہ رہی تھی۔

نہیں اس کھلی فضا میں کوئی گوشۂ فراغت یہ جہاں عجب ہے جہاں ہے نہ قفس نہ آشیانہ

تیری بندہ پروری سے میرے دن گزر رہے ہیں

نہ گلہ ہے دوستوں کا نہ شکایت زمانہ

احمد بن سلمہ کہتے ہیں امام بخاریؒ جب نیشاپور سے جا رہے تھے تو میرے سوا امام بخاریؒ کو الوداع کہنے والا کوئی نہ تھا۔ لوگوں کی عقیدت کی بے ثباتی دیکھئے، انقلاب زمانہ اور قدرت کی نیرنگیاں دیکھئے، کہاں وہ وقت کہ پورا شہر استقبال کے لئے امنڈ آیا اور کہاں اب کہ رخصت ہو رہے ہیں اور الوداع کیلئے ایک آدمی کے سوا کوئی نہیں۔

زمین چمن اگاتی ہے گل کیا کیا بدلتا ہے رنگ آسمان کیسے کیسے

علامہ ذہلی نے دونوں بزرگوں کا اختلاف ذکر کرنے کے بعد لکھا "وما زال کلام الکبار المتعاصرین بعضهم لا یلوی علیه بمفرده رحم الله الجمیع وغفر لهم ولنا آمین" "ہمعصر اکابرین کے ایک دوسرے کے بارے میں کلام کو بنیاد بنا کر کسی ایک جانب جھکاؤ مناسب نہیں اللہ سب پر رحم فرمائیں، ان کی اور ہماری مغفرت فرمائیں آمین۔" نیشاپور سے امام بخاریؒ نے اپنے وطن بخارا کا رخ کیا، اہل بخارا کو جب امام کی آمد کی اطلاع ملی تو شہر کے راستے مزین کئے گئے، قبے لگائے گئے، لوگ شہر سے باہر آئے، امام بخاری جب پہنچے تو ان پر درھم و دنانیر نچھاور کئے گئے اور فاتحین کی طرح اہل بخارا نے امام کا استقبال کیا۔

امام بخاری گلشن علم حدیث کے چہچاتے بلبل تھے، جہاں جاتے اس چمن کی طرف اپنی نغمہ سرائی سے ایک دنیا کو متوجہ کر لیتے، بخارا میں امام کی مجلس حدیث کی رونق سے رونق ہوئی، جس علم کے حامل تھے اس کی قدر و منزلت کا احساس بھی اللہ تعالیٰ نے ان کو عطا کیا تھا،

علم کو فانی دنیا کے حصول کا ذریعہ کبھی نہیں بنایا، جہاں تذلیل علم کا شائبہ ہوتا، وہاں محتاط رہتے، امراء اور دنیا والوں کے ہاں جانے سے گریزاں رہتے۔ اکثر دنیا دار اس استغناء کے سبب ان سے نالاں رہتے۔

امیر بخارا خالد بن احمد ذہلی نے امام کو کہلا بھیجا کہ آپ میرے ہاں آ کر صحیح بخاری اور "تاریخ کبیر" کا درس دیا کریں تا کہ میں اور میرے بچے سنیں، امام بخاریؒ نے کہا "میں بادشاہوں کے دروازوں پر جا کر علم کی تذلیل نہیں کر سکتا امیر کو اتنا ہی شوق ہے تو میرے ہاں مسجد یا گھر پر تشریف لایا کریں اور اگر یہ بات انہیں پسند نہیں تو میری مجلس حدیث کی پابندی لگا دیں تا کہ میرے لئے عذر معقول بن سکے اور اللہ کے ہاں کتمان علم کا میں مجرم نہ قرار پاؤں"

امیر بخارا نے کہا چلو میرے ہاں آمد نہ سہی، میرے بچے آپ کے ہاں آیا کریں گے، آپ ان کے لئے الگ مخصوص مجلس منعقد کر کے انہیں پڑھائیں جسمیں کوئی اور شریک نہ ہو، امام بخاریؒ نے یہ منظور نہ کیا اور کہا کہ "میرے لئے یہ مناسب نہیں کہ علم کی مجلس کسی ایک قوم کے ساتھ مخصوص کر دوں" امام بخاریؒ کے اس پھیکے رویہ سے امیر بخارا کی ناراضگی ایک فطری بات تھی، امام بخاریؒ کا اب بخارا میں رہنا امیر کی امیرانہ طبیعت پر بوجھ ہو رہا تھا، اس نے اپنے ساتھ حریث بن ابی الورقاء اور دوسرے چند علماء کو ملایا، اور امام کے مذہب و عقیدہ کے خلاف پروپیگنڈہ کر کے ان کی جلاوطنی کا پروانہ جاری کیا۔

یہاں یہ بات ملحوظ رہے کہ امام بخاریؒ اس سے قبل بھی بخارا سے جلاوطن کئے گئے، اس آخری مرتبہ سے پہلے ایک دفعہ بخارا سے آپ کا اخراج تو یقینی ہے، بعض حضرات نے اس سے قبل تین بار امام کے جلاوطن ہونیکا ذکر کیا۔

پہلی بار اس وقت جلاوطن کئے گئے جب تاریخ کبیر وغیرہ کی تصنیف سے فارغ ہو کر امام حجاز کے سفر سے لوٹ آئے تھے، بخارا آنے کے بعد امام کے شیخ ابوحفص کبیر نے انکو فتویٰ دینے سے منع کیا اور امام بخاریؒ سے کہا کہ فقہ میں تمہاری مہارت ابھی تشنہ ہے تم فتویٰ

نہ دیا کرو، لیکن امام بخاریؒ فتویٰ دیتے رہے اور بکری کے دودھ سے حرمت رضاعت کے ثبوت کا فتویٰ دیا جس کی وجہ سے آپ جلاوطن کئے گئے۔

یہ واقعہ اگرچہ کئی کتابوں میں ہے، چنانچہ صاحب فوائد بہیۃ نے احمد بن حفص الکبیر کے ترجمہ میں، شارح ہدایہ صاحب عنایہ نے کتاب الرضاعۃ میں جواھر مضیئہ کے مصنف نے ابوحفص کے تذکرہ میں، محمد بن الحسن مالکی نے ''الخمیس'' میں، علامہ ابن حجر مکی نے ''خیرات الحسان'' میں، علامہ سرخی نے ''مبسوط'' میں ان کے حوالہ سے مولانا عبدالرشید نعمانی مدظلہم نے ''دراسات اللبیب'' کے حاشیہ میں اور حضرت مفتی مولانا محمد تقی عثمانی مدظلہم نے تکملۂ فتح الملہم، کتاب الرضاعۃ میں اس کا ذکر کیا ہے۔

لیکن حقیقت یہ ہے کہ امام بخاریؒ کی طرف اس فتویٰ کی نسبت مشکوک اور اس کی صداقت غیر یقینی ہے، ایک معمولی دین کی سمجھ رکھنے والا انسان بھی ایسی حماقت نہیں کرسکتا چہ جائیکہ وہ امام بخاری جن کے بارے میں نعیم بن حماد کہتے ہیں ''محمد بن اسماعیل فقیه هذه الائمة'' جن کے بارے میں ابومصعب زہری فرماتے ہیں: ''البخاری آفقه عند نا .... الا مام مالک و البخاری کلاهما واحد فی الفقه والحدیث ۔ جن کے بارے میں اسحٰق بن راہویہ کا قول ہے ''لو کان البخاری فی زمن الحسن لاحتاج الناس الیه لمعرفته بالحدیث والفقه ، جن کے بارے میں علامہ داری نے کہا، محمد عندی ابصرهم و اعلمهم و افقهم جن کے بارے میں عبداللہ بن عبدالرحمٰن سمرقندی نے فرمایا ''محمد بن اسماعیل اعلمنا ، و افقهنا'' اور جن کے بارے میں محمد بن بشار نے اس وقت جب وہ بصرہ میں داخل ہونے لگے کہا: ''الیوم دخل سید الفقهاء'' اور جنہوں نے اس وقت عبداللہ بن مبارک اور وکیع کی کتابیں حفظ کر لی تھیں جبکہ انکی عمر کی کشتی ابھی سیل شباب میں داخل نہیں ہوئی تھی اور جن کی اجتہادی صلاحیت، تفقہ اور قرآن وحدیث سے براہ راست استنباط پر قدرت کے تمام علماء قائل ہیں۔

یہ بات اپنی جگہ درست ہے کہ بڑے سے بڑی غلطی ہوسکتی ہے لیکن اس کے ثبوت

کے لئے ٹھوس اور نا قابل تردید دلیل کی ضرورت ہوتی ہے احقر کو باوجود تلاش کے اس کی کوئی مضبوط سند نہ مل سکی چنانچہ صاحب فوائد بہیۃ علامہ لکھنوی اس واقعہ کو ذکر کرنے کے بعد لکھتے ہیں **ھی حکایة مشھور ة فی کتب اصحابنا م لکنی استبعد و قوعا بالنسبة الی جلا لة قدر البخاری و دقة فهمه ،وسعة نظر ہ و غور فکرہ.** ''ہمارے اصحاب کی کتابوں میں یہ واقعہ کافی مشہور ہے لیکن امام بخاری کی جلالت شان، دقت رسافہم، وسیع نظر اور عمیق فکر کے پیش نظر مجھے اس واقعہ کا وقوع بعید معلوم ہوتا ہے۔

دوسری بار اس وقت جلاوطن کئے گئے جب ایمان کے مخلوق اور غیر مخلوق ہونے کی بحث چھڑی اس مسئلہ میں اختلاف کی وجہ سے کئی علماء جلاوطن کئے گئے ان میں بخاری بھی تھے۔ بعض علماء نے نیشاپور سے آنے کے بعد جس آخری جلاوطنی میں بخاری کے وفات کا حادثہ پیش آیا اس سے قبل بخارا سے ایک مرتبہ اور امام بخاریؒ کے اخراج کا ذکر کیا ہے کہ علامہ ذہلی سے اختلاف کے بعد جب امام اپنے وطن آئے تو علامہ ذہلی نے شیوخ بخارا کو ان کے عقیدہ کے سلسلہ میں ایک خط لکھا جس کی وجہ سے امام بخاری جلاوطن کئے گئے۔ لیکن یہ درست نہیں نیشاپور سے واپس آنے کے بعد امام بخاری دو مرتبہ نہیں ایک ہی بار جلا وطن کئے گئے اور اسی میں آپ کی وفات کا حادثہ پیش آیا۔

علامہ ذہبی نے سیر اعلام النبلاء میں محمد بن احمد بن حفص کے تذکرہ میں علامہ ذہلی کے شیوخ بخارا کے نام خط لکھنے اور اس کی وجہ سے امام بخاری کے اخراج کا ذکر کیا ہے اسی روایت کو بنیاد بنا کر بعض حضرات نے امام بخاری کی یہ تیسری اور مستقل جلاوطنی شمار کی ہے لیکن علامہ ذہلی کے خط کی وجہ سے امام بخاریؒ کی جلاوطنی کی اس روایت کو اگر صحیح بھی تسلیم کر لیا جائے تب بھی اس سے وہی آخری جلاوطنی اور اخراج مراد ہے جس میں آپ کی وفات کا واقعہ پیش آیا چنانچہ اس روایت کے آخر میں ہے۔ " **فبقی الی ان کتب الی اھل سمرقند یستأ ذنھم فی القد و م علیھم فا متنعوا علیه و ما ت فی قریة**"

ممکن ہے امیر بخارا نے آپ کے خلاف پروپیگنڈا موثر بنانے کے لئے علامہ ذہلی

کا خط بھی حاصل کیا ہوتا ہم اس میں تمام روایات متفق ہیں کہ امام بخاری کی نیشا پور سے واپسی کے بعد ایک مرتبہ اخراج ہوا اور اسی میں آپ انتقال کر گئے ہیں۔

اس لحاظ سے امام بخاریؒ "اس آخری جلاوطنی سے قبل صرف ایک بار مسئلہ خلق ایمان کی وجہ سے جلاوطن کئے گئے ہیں۔" جب امام بخاریؒ کو نیشا پور کی طرح بخارا میں بھی رہنے نہیں دیا گیا اور امیر بخارا نے شہر سے نکلنے کا حکم دیا تو امام نے امیر اور دوسرے مخالفین کے حق میں بددعا کی، ابھی ایک زمانہ بھی نہ گزرا تھا کہ بخارا کا وہ امیر معزول کر دیا گیا، قید میں ڈال کر اس کی جائداد ضبط کی گئی اور اپنے انجام سے غافل اس عظیم محدث کو اپنے وطن سے بلاوجہ نکالنے والے دوسرے لوگوں نے اپنے گھر اور اولاد کے سلسلہ میں وہ رسوائی و ذلت دیکھی جو ناقابل بیان ہے۔

پژمردگئی گل پہ جب ہنسنے لگی کلی ‏ ‏ ‏ آواز دی خزاں نے تو بھی نظر میں ہے

امام بخاریؒ کے اخراج کا علم اہل سمرقند کو ہوا تو انہوں نے اپنے ہاں آنے کی دعوت دی امام دعوت قبول کر کے سمرقند کے لئے روانہ ہو گئے، ابھی سمرقند کے قریب "خرتنگ" نامی بستی پہنچے تھے کہ اطلاع ملی کہ سمرقند میں امام بخاریؒ کی آمد پر لوگوں میں اختلاف ہو گیا ہے کچھ لوگ ان کی آمد پر خوش ہیں اور بعض کو ان سے اختلاف ہے، خرتنگ میں امام کا اپنے ایک عزیز غالب بن جبریل کے ہاں قیام تھا، رات کو اٹھے نماز پڑھی اور دعا کی **اللهم قد ضاقت علي الارض بما رحُبَت ، فا قبضي اليک** (تاریخ بغداد) "اے اللہ! یہ زمین اپنی تمام وسعتوں کے باوجود مجھ پر تنگ ہو گئی ہے اب مجھے اپنی طرف اٹھا لیجئے"

دشت وفا میں جب نہ ملا کوئی آشنا ‏ ‏ ‏ پھروں کرتے رہے دعا ہم افتادگی کے ساتھ

ادھر سمرقند سے امام کی آمد پر اتفاقی فیصلہ کی اطلاع آئی لیکن تقدیر کا پیغام اب کہہ رہا تھا "**يَا أَيَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ ، اِرْجِعِي اِلَى رَبِّكِ رَاضِيَةً مَّرْضِيَّةً**" اب سمرقند نہیں اپنے رب کے پاس جانے کا پروانہ آ گیا تھا جس کی دعا کی تھی اور جو قبول ہو گئی تھی۔ جب یکم شوال ۲۵۶ھ کو خوشیوں کا تحفہ لے کر ماہتاب عید نمودار ہوا اسی رات زمانہ اور اہل

زمانہ کی بے قدری کا داغ لئے حدیث نبوی کی لافانی خدمت کرنے والے اس عظیم انسان کی زندگی کا آفتاب تاباں وہاں غروب ہوا جہاں زندگی کے ہر آفتاب کا مدفن ہے۔

(تہذیب الاسماء واللغات)

کہیں سامان مسرت کہیں ساز غم ہے   کہیں گوہر ہے کہیں اشک کہیں شبنم ہے

عبدالواحد بن آدم کہتے ہیں میں نے نبی کریم ﷺ کو صحابہ کی ایک جماعت سمیت خواب میں دیکھا کہ آپ ﷺ کھڑے ہیں، میں نے کھڑے ہونے کی وجہ دریافت کی، فرمایا میں بخاری کا انتظار کر رہا ہوں بعد میں معلوم ہوا کہ جس وقت خواب دیکھا تھا اسی ساعت امام بخاریؒ کا انتقال ہوا تھا۔ دفن کرنے کے بعد قبر سے خوشبو پھوٹی، قبر کی سیدھ میں آسمان کی جانب ایک روشن خط نظر آنے لگا، لوگ قبر کی مٹی پر ٹوٹ پڑے، بڑے سخت حفاظتی انتظامات کے بعد قبر سے لوگوں کو روکا گیا، امام بخاریؒ کے پہچاننے میں جن مخالفین نے غلطی کی تھی ان میں سے بعض قبر پر آئے اور توبہ کی۔

جان کر منجملہ خاصان میخانہ مجھے   مدتوں رویا کریں گے جام و پیمانہ مجھے

بوئے گل کا باغ سے اور گلچین کا دنیا سے سفر اس عالمگیر قانوں کا اثر ہے جس سے نہ کوئی بچا ہے، نہ بچے گا، امام بخاری کو زندگی میں محبتوں کے جھونکے بھی نصیب ہوئے اور نفرتوں کے طوفان سے بھی سابقہ پڑا، عقیدت کے پھول بھی ملے اور حسد کے کانٹے بھی ہاتھ لگے، امام گئے، امام کے حاسد گئے، وہاں، جہاں سب گئے، سب کو جانا ہے، پر امام کا علم باقی رہا، باقی رہے گا کہ یہ کائنات کی اس بہترین ہستی کے کلام کا علم تھا جس کے فیض عام نے صحرائے عرب کے بدویوں کو اور حبشہ کے گمنام حبشیوں کو حیات جاوداں بخشی۔ امام بخاری نے اپنی ''صحیح'' گلشن کے جن پھولوں سے آباد کیا، تر و تازگی ان پھولوں کے لئے فطرت کا انعام ہے کہ۔

چشم اقوام یہ نظارہ ابد تک دیکھے   رفعت شان ورفعنا لک ذکرک دیکھے

اسی گلشن بندی کا صلہ ہے کی صدیاں گزر گئیں، امام بخاری کی یادیں زندہ رہیں،

زندہ رہیں گئی! ؎

آتی ہی رہے گی تیرے انفاس کی خوشبو گلشن تیری یادوں کا مہکتا ہی رہے گا

(جستہ جستہ عنوانات کی تبدیلی کے ساتھ از متاعِ وقت اور کاروانِ علم)

حجتہ الاسلام حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ

حضرت شاہ ولی اللہ محدّث دہلویؒ کا شمار ان بزرگوں میں ہوتا ہے جن کے علم و فضل، جلالت قدر اور دینی خدمات پر جمہور مسلمانان برصغیر کے قریب قریب سبھی مکاتب فکر کا کامل اتفاق ہے بلکہ بعض کے نزدیک تو وہ بارھویں صدی ہجری کے مجدد ہیں۔ اورنگ زیب عالمگیرؒ کے ۱۱۱۸ ہجری (مطابق سترہ سو سات عیسوی) میں وفات پانے کی دیر تھی کہ برِّ کوچک ہند کو ہولناک سیاسی انتشار نے اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ اس نے دلی کی مرکزی مسلم حکومت کی جڑیں کھوکھلی کر دیں۔ اسی زمانے میں نام نہاد صوفیوں اور جھگڑالو فقیہوں نے اسلام کو بدنام کرنے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔ ہر طرف بدعات، فسق و فجور اور غیر اسلامی معتقدات کا دور دورہ ہو گیا۔ غیر مسلم اقوام بالخصوص مرہٹے اس صورت حال کا پورا فائدہ اٹھا رہے تھے اور وہ مسلمانوں کو اختیار و اقتدار سے یکسر محروم کرنے اور ان پر غلبہ حاصل کرنے کے منصوبے بنا رہے تھے۔ یکا یک رحمت خداوندی جوش میں آئی اور گھٹا ٹوپ اندھیرے میں شاہ ولی اللہ جیسے مرد کامل کا ظہور ہوا جن کی مسیحا نفسی نے ہندوستان میں مسلمانوں کے اکھڑتے قدم ایک مرتبہ پھر جما دیئے۔ شاہ صاحبؒ نے جو مہتم بالشان کارنامے سرانجام دیے، ان کا خلاصہ یہ ہے:

پہلا: مسلمانوں کے عقائد کی اصلاح کرنا بدعات کا رد کرنا اور مسلمانوں کو قرآن حکیم کی طرف رجوع کرنے کی دعوت دینا۔

دوسرا: حدیث و سنت کی اشاعت و ترویج

تیسرا: فقہ اور حدیث میں تطبیق کی مساعی

چوتھا: شریعت اسلامی کی مدلل ومربوط ترجمانی

پانچواں: فقہی اوراجتہادی اختلافات میں اعتدال کی تلقین

چھٹا: حقیقی اسلامی تصوّف کا تعارف

ساتواں: اسلام کا بطور ایک مکمل نظام حیات کے عقلی اوراستدلالی تعارف

آٹھواں: اسلام میں خلافت کے منصب کی تشریح اور خلافت راشدہ کے خصائص اوراس کا اثبات

نواں: سیاسی انتشاراور حکومت مغلیہ کے دورِ زوال میں مجاہدانہ وقائدانہ کردار

دسواں: امت کے مختلف طبقوں کا احتساب اوران کودعوت اصلاح وانقلاب

گیارھواں: علماءِ حق اور مردان کار کی تعلیم وتربیت جوان کے بعد اصلاح امت اور اشاعت دین کا کام جاری رکھیں۔ حضرت شاہ صاحبؒ کے کارناموں کی اس فہرست سے ان کی جدوجہد سے بھرپور ولولہ انگیز زندگی کا بخوبی اندازہ کیا جاسکتا ہے۔ اب ہم ان کے سوانح حیات پر ایک نظر ڈالتے ہیں۔ بیشک آپ اپنے دور کے محدث اعظم مفسر اعلیٰ اورامام علم وفن، عظیم مفکر و مصلح اور بارہویں صدی ہجری کے مجدد تھے۔

حضرت شاہ ولی اللہؒ کی ولادت، نام ونسب

نام ولی اللہ، کنیت ابومحمد، بشارتی نام قطب الدین احمد اور تاریخی نام عظیم الدین ہے، والات سے پہلے ہی آپ کے والد محترم شاہ عبدالرحیم نے خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ کی خواب میں زیارت کی، انہوں نے فرزند کی بشارت دی، اور فرمایا کہ اس کا نام میرے نام پر قطب الدین احمد رکھنا، شاہ صاحبؒ فرماتے ہیں کہ میری ولادت ہوئی تو والد صاحب کے ذہن میں یہ بات نہ رہی، اور انہوں نے ولی اللہ نام رکھا، کچھ مدت کے بعد یاد آیا تو میرا نام قطب الدین احمد تجویز کیا گیا اور شاہ صاحب کے بعض احباب نے ان کی تاریخ پیدائش عظیم الدین سے نکالی ہے، آپ کا سلسلہ نسب والد ماجد کے طرف سے حضرت عمر فاروقؓ تک، اور

والدۂ محترمہ کی طرف سے حضرت موسیٰ کاظم تک پہنچتا ہے، آپ نسلاً عربی ونسباً فاروقی ہیں سلسلہ نسب یہ ہے۔

شاہ ولی اللہ بن الشیخ عبدالرحیم بن الشہید وجیہ الدین بن معظم بن منصور بن محمود بن قوام الدین عرف قاضی خازن بن قاضی کبیر عرف قاضی بدہ بن عبدالملک بن قطب الدین بن کمال الدین بن شمس الدین مفتی بن شیر ملک بن محمد عطا ملک بن ابوالفتح ملک بن عمر حاکم بن عادل مالک بن فاروق بن جرجیس بن احمد بن شہریار بن عثمان بن ہامان بن ہمایوں بن قریش بن سلیمان بن عفان عبداللہ بن محمد بن عبداللہ بن عمر بن خطابؓ۔

اس نسب نامہ میں متعدد جگہ لفظ ''ملک'' ناموں کے ساتھ آیا ہے، جس کے متعلق شاہ صاحب خود تحریر فرماتے ہیں، یہ زمانہ قدیم میں تعظیمی لقب جانا جاتا تھا، جیسے ہمارے زمانے میں ''خان''، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ شاہ صاحب کے آباواجداد قدیم ہی سے دینی و دنیوی وجاہت کے مالک رہے ہیں۔

حضرت شاہ ولی اللہؒ کی ولادت باسعادت

آپ کی ولادت حضرت مجدد الف ثانیؒ کی وفات کے اسی ۸۰ سال اور شہنشاہ اورنگ زیب عالمگیر کی وفات سے چار سال قبل ۴ شوال المکرم ۱۱۱۴ھ مطابق ۱۷۰۲ء بروز چہار شنبہ بوقت طلوع آفتاب آپ کے ننہال قصبہ پھلت ضلع مظفر نگر میں ہوئی۔

حضرت شاہ ولی اللہؒ کے والد ماجد

عارف باللہ شیخ کامل حضرت شاہ عبدالرحیم صاحبؒ آپ کے والد ماجد ہیں، حضرت شاہ ولی اللہ صاحبؒ نے اپنے والد بزرگوار حضرت شاہ عبد الرحیم صاحب سے حالات ،کمالات وکرامات میں خود ایک مفصل کتاب تحریر فرمائی ہے جس کا نام انفاس العارفین ہے، حضرت شاہ عبدالرحیم صاحبؒ سلسلہ نقشبندیہ مجددیہ کے خرقہ خلافت یافتہ ایک عظیم شیخ طریقت تھے، آپ کو شیخ ابوالقاسم اکبر آبادیؒ سے خلافت اور اجازت بیعت حاصل تھی۔

دوسری طرف شاہ عبدالرحیم صاحبؒ جید عالم اور محدث وفقیہ بھی تھے آپ فقہ حنفی کے جید علماء میں شمار کیے جاتے تھے اور فقہی جزئیات پر بڑی گہری نظر رکھتے تھے۔آپ کے ایک دوست شیخ حامد وہ جن کو اورنگزیب نے فتاویٰ عالمگیری کی تدوین کا نگران مقرر کیا تھا، وہ آپ کی تنگدستی سے واقف تھے، ازراہ دوستی فتاوے کی تدوین میں اپنا شریک کار بنانا چاہا اور تنخواہ کی امید دلائی، آپ نے قبول نہ کیا، صاف انکار کردیا، لیکن جب اس کی خبر آپ کی بیوہ ماں کو ہوئی تو وہ برہم ہوئیں اور نوکری کر لینے کا حکم دیا آپ نے محض بیوہ ماں کی دل جوئی اور خاطر داری کے لئے شیخ حامد کا شریک بننا منظور کرلیا، اس ملازمت کی خبر آپ کے مرشد کو ہوئی تو انہوں نے نہ صرف اظہار ناراضگی کیا بلکہ اس کے ترک کردینے پر اصرار کیا، آپ نے والدہ کا عذر کیا، مگر انہوں نے اس کا بالکل خیال نہ کیا اور برابر اصرار کرتے رہے، حتیٰ کہ ملازمت چھوڑ دینے کا حکم دیدیا، آپ نے اس موقعہ پر بڑی عقلمندی کا ثبوت دیا، چنانچہ آپ نے مرشد کی خدمت میں عرض کیا کہ حضرت آپ ہی دعا فرمادیں نوکری خود بخود چھوٹ جائے، کیونکہ میرے چھوڑنے سے والدہ کی آزردگی کا اندیشہ ہے، چنانچہ انہوں نے دعا فرمائی اور وہ دعا اس طرح قبول ہوئی کہ ایک روز عالمگیر نے خلاف معمول اچانک تدوین فتاویٰ کے ملازمین کی فہرست طلب کی، اور بلاوجہ شاہ عبدالرحیم کا نام قلمزد کردیا، اور پھر حکم دیا کہ ''اگر خواستہ باشد ایں قدر زمین بدہید'' یعنی اگر شاہ عبدالرحیم چاہیں تو ان کو اتنی زمین دیدی جائے، گویا نوکری چھوڑ کر اب جاگیردار بنائے جانے کی تجویز ہوئی مگر آپ اس امتحان میں کامیاب ہوئے۔فرمان شاہی کے بموجب جب آپ سے رائے پوچھی گئی تو باوجود تنگی معاش کے جو جواب دیا وہ آپ کی شان توکل کی آئینہ دار ہے، فرماتے ہیں، ''قبول نہ کردم و شکرانہ بجا آوردم حمد خدا تعالیٰ گفتم'' نوکری چھوڑی جاگیر کو نظر انداز کیا اور صبر وشکر کے ساتھ اپنے اسی فقر وفاقہ پر خدمت خلق کرتے ہوئے زندگی گزاردی۱۔حضرت شاہ عبدالرحیم محدث دہلویؒ اگرچہ اپنے نامور اور فخر روزگار صاحبزادے حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کی طرح شہرہ آفاق نہ بن سکے اور وہ خود شاہ ولی اللہ کے والد کی حیثیت سے زیادہ پہچانے

گئے مگر یہ بھی ایک واقعی نا قابل انکار حقیقت ہے کہ حضرت شاہ ولی اللہ کے تمام فضل وکمال اور علم ومعرفت کی بنیاد اور اساس ان کے والد ماجد شاہ عبد الرحیمؒ کی تعلیم وتربیت ہے جیسا کہ مفکر اسلام مولانا عبید اللہ سندھی تحریر فرماتے ہیں کہ۔ ”شاہ ولی اللہؒ کی فکری تربیت اور انکی علمی اساس میں ہم ان کے والد شاہ عبد الرحیم کو اصل مانتے ہیں شاہ عبد الرحیمؒ نے خود اپنے نامور صاحبزادے کو تعلیم دی تھی، چنانچہ انہوں نے شاہ ولی اللہ کو قرآن کا ترجمہ تفسیروں سے الگ کر کے پڑھایا، اور اس طرح قرآن کا اصل متن ان کے لئے قابل توجہ بنایا، پھر آپ نے وحدۃ الوجود کے مسئلہ کو صحیح طریقہ پر حل کیا، اور اسے اپنے صاحبزادے کے ذہن نشین کیا، نیز شاہ عبد الرحیم صاحبؒ ہی نے حکمت عملی کو اسلامی علوم میں ایک باوقار اور اہم مقام دیا اور اپنے صاحبزادے شاہ ولی اللہ کو خاص طور پر تلقین کی، الغرض یہ تین چیزیں قرآن کے متن کو اصل جاننا، وحدۃ الوجود کا صحیح حل اور اسلامی علوم میں حکمت عملی کی غیر معمولی اہمیت شاہ ولی اللہ کے علوم میں بنیادی حیثیت رکھتی ہیں، اور یہ تینوں کی تینوں شاہ عبد الرحیم صاحبؒ کی تربیت کا نتیجہ ہیں۔“ (شاہ ولی اللہ اور انکا فلسفہ) (مصنفہ مولانا عبید اللہ سندھیؒ)

شاہ عبد الرحیم نے اپنے صاحبزادے کو اخلاق وتہذیب کی اعلیٰ تعلیم وتربیت سے بھی آراستہ کیا، آپ اپنے صاحبزادے کو اکثر شیخ سعدی کا یہ شعر سنایا کرتے تھے،

آسائش دو گیتی تفسیر ایں دو حرف است
با دوستاں تلطف با دشمنان مدارا

زندگی کی راحت دو باتوں میں پوشیدہ ہے، ایک یہ کہ دوستوں کے ساتھ لطف وکرم کا برتاؤ کیا جائے اور دشمنوں کے ساتھ خاطر ومدارات کا سلوک کیا جائے۔ اور حضرت شاہ ولی اللہؒ کی والدہ ماجدہ شیخ محمد پھلتی کی صاحبزادی فخر النساء جو شرعی علوم اور آداب طریقت اور اسرار حقیقت سے آراستہ وپیراستہ تھیں، اسم بامسمی عورتوں کے طبقہ میں قابل فخر مقام رکھتی تھیں۔

حضرت شاہ ولی اللہؒ کی تعلیم وتربیت

جب آپ نے اپنی عمر کے پانچویں سال میں قدم رکھا تو والد ماجد نے تعلیم کا سلسلہ

شروع کر دیا اور آپ نے سات سال کی عمر میں حفظ قرآن کے ساتھ ساتھ بقدر ضرورت ارکان وفرائض بھی معلوم کر لئے۔ اسی سال والد بزرگوار نے نماز روزہ شروع کرایا تا کہ پابندی فرائض کی عادت پڑے، شاہ صاحب تحریر فرماتے ہیں کہ رسم سنت بھی اسی سال عمل میں آئی ساتویں سال کے آخر میں آپ نے فارسی اور عربی کے ابتدائی رسائل پڑھنا شروع کر دیئے اور ایک سال کے اندر ان کو مکمل فرمالیا۔ اس کے بعد آپ نے صرف ونحو کی طرف توجہ فرمائی اور دس برس کی عمر میں علم نحو کی معرکتہ الارا کتاب شرح جامی تک پہنچ گئے، اور نہ صرف فارسی کی نوشت وخواند میں مہارت حاصل کر لی بلکہ عربی صرف ونحو پر عبور حاصل کر لیا، شاہ صاحب نے ایک جگہ تحریر فرمایا ہے کہ ''دس سال کی عمر میں ایک حد تک مطالعہ کی راہ کھل گئی تھی صرف ونحو سے فراغت کے بعد آپ نے معقولات کی طرف توجہ فرمائی، اور تھوڑے ہی عرصے میں اس سے فراغت حاصل کر لی، پندرہ سال کی عمر میں تمام متداولہ درسی علوم کی تکمیل کر کے ارباب فضل وکمال کے زمرہ میں شامل ہو کر ایک مقام خاص کے مالک ہو گئے

حضرت شاہ ولی اللہ کی تحصیل علوم کی تفصیل

امام الہند شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کی تعلیم اکثر اپنے والد بزرگوار کے پاس ہوئی، جس کی تفصیل آپ نے اس طرح بیان کی ہے علم حدیث میں مشکوۃ شریف تمام وکمال پڑھی، لیکن چند روز علالت کی وجہ سے کتاب البیع سے کتاب الادب تک کا حصہ چھوٹ گیا، صحیح بخاری شروع سے کتاب الطہارۃ تک شمائل ترمذی اول سے آخر تک پڑھی، علم تفسیر میں بیضاوی اور تفسیر مدارک کے کچھ حصے باقاعدہ پڑھے اور باقی حصہ کا خود مطالعہ کیا، اس کے علاوہ کامل غور وفکر اور مختلف تفاسیر کے مطالعے کے ساتھ والد ماجد کے درس قرآن، اور اس طرح کئی بار میں نے حضرت سے متن قرآن پڑھا، اور یہی میرے حق میں ''فتح عظیم'' کا باعث ہوا، فالحمد للہ علی ذلک۔

علم فقہ میں شرح وقایہ اور ہدایہ کی دو جلدیں تھوڑے حصہ کے علاوہ پوری پڑھیں،

اصول فقہ میں حسامی اور توضیح وتلویح کا درس لیا، منطق میں شرح شمسیہ کامل اور شرح مطالع کا کچھ حصہ پڑھا، علم کلام میں شرح عقائد کامل اور خیالی اور شرح مواقف کا کچھ حصہ پڑھا، علم طب میں موجز فلسفہ میں شرح ہدایۃ الحکمۃ وغیرہ، علم نجوم میں کافیہ، شرح ملا جامی، علم معانی میں مطول کا اکثر حصہ اور مختصر المعانی کا وہ حصہ پڑھا، جس پر ملا زادہ کا حاشیہ ہے، ہیئت وحساب میں بعض رسائل پڑھے، تصوف وسلوک میں عوارف المعارف اور رسائل نقشبندیہ پڑھے، علم الحقائق میں شرح رباعیات مولانا جامی، مقدمہ شرح لمعات، مقدمہ نقد الفصوص، خواص اسماء وآیات میں والد صاحب کا ایک مجموعہ پڑھا، جس کی انہوں نے چندمرتبہ اجازت بھی دی، اثناء تحصیل میں اپنے زمانے کے امام حدیث شیخ محمد افضل سیالکوٹی کی خدمت میں بھی آتے جاتے اور علوم حدیث میں ان سے استفادہ کرتے رہے۔

امام ابوحنیفہؒ کو اجازت تجوید وقرأت

شاہ صاحب نے فن قرأت وتجوید کی تکمیل مشہور قاری مولانا محمد فاضل صاحب سندھی سے کی تھی جو دہلی کے شیخ القراء اور اپنے زمانے کے ماہر فن شمار کئے جاتے تھے، شاہ صاحب تحریر فرماتے ہیں کہ ”میں نے قرآن کو اول سے آخر تک بروایت حفص عن عاصم (صالح ثقہ) حاجی محمد فاضل سندھی سے ۱۱۸۴ھ میں پڑھا اور انھوں نے دار السلطنت دہلی میں شیخ القراء شیخ عبدالخالق سے پڑھا۔

حضرت شاہ ولی اللہؒ کی شادی

شاہ صاحبؒ کی دوشادیاں ہوئیں۔ پہلی شادی چودہ سال کی عمر میں آپ کے ماموں شیخ عبیداللہ پھلتی کی صاحبزادی سے ۱۱۲۸ھ میں ہوئی، ان سے ایک صاحبزادے شیخ محمد پیدا ہوئے، جنہوں نے آپ ہی سے تعلیم پائی، شاہ صاحب نے ان کے لئے ایک ابتدائی رسالہ بھی تصنیف فرمایا تھا، شمائل ترمذی کے درس میں شاہ عبدالعزیزؒ کے شریک تھے، شاہ صاحب کی وفات کے بعد قصبہ بڑھانہ منتقل ہوگئے اور مدت العمر وہیں رہ کر وفات پائی

اور قصبہ بڑھانہ کی جامع مسجد کے صحن میں مدفون ہوئے، اسی بنا پر شاہ صاحب ابومحمد کنیت کرتے تھے، شیخ محمدؒ کے دو صاحبزادوں کا تذکرہ جو ان کے ساتھ ہی مدفون ہیں مقالات طریقت میں آتا ہے، لیکن کتابوں میں ان کو منقطع العقب لکھا ہے۔ شاہ صاحب کی دوسری شادی پہلی اہلیہ کے انتقال کے بعد سید ثناء اللہ سونی پتی کی صاحبزادی بی بی ارادت سے ہوئی جو سونی پتی کے رہنے والے تھے، اور سید ناصر الدین شہیدؒ کی اولاد میں سے تھے، ان زوجہ محترمہ سے آپ کے چاروں نامور صاحبزادے (حضرت شاہ عبدالعزیزؒ، شاہ رفیع الدین، شاہ عبدالقادر، شاہ عبدالغنی) تولد ہوئے جو ہندوستان میں دین کی نشاۃ ثانیہ کے "ارکان اربعہ" ہیں، اور ایک صاحبزادی امۃ العزیز بھی پیدا ہوئیں، ان کا عقد مولوی محمد فائق ابن مولانا محمد عاشق پھلتی سے ہوا، وہ صاحب اولاد تھیں ان کا سلسلہ جاری رہا۔

حضرت شاہ ولی اللہؒ کو اجازت بیعت و وفات والد ماجد

آپ کی عمر کے سترہویں سال والد ماجد سخت بیمار ہوئے اور اسی حالت مرض میں آپ کو بیعت وارشاد کی اجازت مرحمت فرمائی، مدرسہ رحیمیہ اور خانقاہ رحیمیہ کی جو بساط بچھائی تھی اس کا انتظام شاہ صاحب کے سپرد فرمایا اور صفر المظفر ۱۱۳۱ھ مطابق ۱۷۱۹ء بروز بدھ اس مرتاض صوفی اور فقیہ المثال عالم نے درس وارشاد کی مسند اپنے بلند اقبال بیٹے (شاہ ولی اللہ) کے لئے خالی کردی۔

حضرت شاہ ولی اللہؒ اور درس وتدریس

والد ماجد کے انتقال کے بعد آپ نے مستقل طور پر مسند درس وارشاد کو رونق بخشی اور درس وتدریس کا سلسلہ شروع کیا، آپ کے علم وفضل اور کمالات ظاہری وباطنی کا شہرہ دور دور تک پہنچ چکا تھا، ہر طرف سے تشنگان علوم ومعارف جوق در جوق آتے اور زانوئے تلمذ بچھاتے، تقریباً بارہ سال تک آپ کتب دینیہ اور معقولات کا درس دینے میں مشغول رہے۔

حضرت شاہ ولی اللہؒ کا علمی استغراق

دوران درس وتدریس میں آپ کو علم وفن میں غور کرنے کا موقعہ ملا، اسی زمانے میں آپ نے مذاہب اربعہ کی فقہ اوران کے اصول فقہ کی کتابوں کا بنظر غائر مطالعہ کیا، اوران احادیث کو بھی بامعان نظر دیکھا جس سے حضرات ائمہ اپنے اقوال و مذاہب کی سند لاتے ہیں اوراسی وقت سے فقہاء محدثین کا طریقہ بھی آپ کے دل نشین ہوا، آپ کا یہ زمانہ نہایت استغراق اورمحویت کا گزرا، آپ نے نہایت تحقیق کاوش سے کتابوں کا مطالعہ شروع کیا، اور رات دن انتہائی انہماک کے ساتھ کتب بینی میں مشغول رہے، آپ ان دنوں کھانا کم کھاتے اورآرام بھی کم کرتے اور درس وتدریس کے بعد جووقت ملتا اسے صحبت کتب میں صرف کرتے۔

حضرت شاہ ولی اللہؒ کا سفر حجاز

جب شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ نے یہ محسوس کیا تھا کہ اسلام کو ہندوستان آئے صدیاں بیت چکیں مگر علم حدیث آج بھی ضرورت سے کم ہے تو موصوف نے اس کمی کو محسوس کرتے ہوئے مسلسل تین سال حجاز مقدس میں رہ کر علم حدیث حاصل کیا تھا اور پھر ہندوستان واپس آکر انھوں نے اوران کے بعد ان کی اولاد نے اس کی اشاعت میں بڑی کوشش فرمائی تھی مگر نامساعد حالات کی وجہ سے اپنے مقصد میں ناکام ہوئے حضرت شاہ صاحبؒ نے دیکھا کہ شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ کی استوار کردہ بنیادوں کے کچھ مٹے ہوئے نشانات ابھی باقی ہیں اگر جدوجہد کرکے ان بنیادوں پر مضبوط عمارت نہ تعمیر کی گئی تو نہیں کہا جاسکتا کہ وہ قائم بھی رہ سکیں گی، غور وفکر کے بعد آپ اس نتیجہ پر پہنچے کہ علم حدیث اس کے معدن حجاز مقدس سے حاصل کرنا چاہئے، چنانچہ زیارت حرمین شریفین کا شوق دامنگیر ہوا ۱۱۴۳ھ مطابق ۱۷۳۱ء کے اواخر میں حجاز روانہ ہوگئے۔

خانہ کعبہ اور روضہ اطہر ﷺ پر روحانی مشاہدات و مکاشفات کی صورت میں شاہ صاحب پر جو فیضان ہوا اس کو آپ نے فیوض حرمین میں قلمبند کیا ہے، فرماتے ہیں کہ ''اللہ پاک کی سب سے بڑی نعمت جس سے اس نے سرفراز فرمایا وہ یہ ہے کہ ۱۱۴۳ھ اور اس کے بعد کے سال میں بھی مجھے مقدس گھر کے حج کی اور اپنے نبی کریم ﷺ کی زیارت کی توفیق فرمائی، لیکن اس سلسلہ میں اس نعمت سے بھی کہیں زیادہ بڑی نعمت جو مجھے میسر آئی وہ یہ تھی کہ اللہ تعالیٰ نے اس حج کو میرے لئے مشاہدات باطنی اور معرفت حق کا ذریعہ بنایا، اور اسی طرح اس نے نبی علیہ السلام کی اس زیارت کو میرے لئے بصیرت افروز بنایا۔ شاہ صاحب نے حرمین شریفین میں کل چودہ ماہ قیام فرمایا، اور اس زمانہ کے قیام میں آپ نے اپنی اشراقی قوت سے روضہ انور ﷺ سے کسب فیض کیا اور بڑے بڑے علماء و مشائخ سے استفادہ بھی۔

حضرت شاہ ولی اللہؒ کے حجازی اساتذہ

یوں تو شاہ صاحب نے حجاز مقدس میں متعدد علماء و مشائخ سے علم حدیث اور باطنی فیض حاصل کیا مثلاً شیخ سنادی شیخ احمد قشاشی سید عبدالرحمٰن ادریسی، شمس الدین محمد بن علا بابلی، شیخ عیسیٰ جعفری، شیخ حسن عجمی، شیخ احمد علی اور شیخ عبداللہ بن سالم بصری، لیکن اس سلسلہ میں جن مشائخ سے آپ بہت قریب ہوئے وہ یہ ہیں۔

ا۔ شیخ ابو طاہر محمد ابراہیم کردی مدنی، انہوں نے آپ کو سند حدیث بھی عطا فرمائی اور سارے سلاسل کو جامع خرقہ، خلافت و اجازت بھی اپنے دست مبارک سے پہنایا، موصوف حضرت شاہ صاحبؒ کی فطری ذہانت اور خداداد بصیرت کے بڑے مداح تھے، اکثر فرمایا کرتے تھے، ''**ویسندعنی اللفظ و کنت اصحح منه المعنی**'' یہ الفاظ کی سند تو مجھ سے لیتے ہیں مگر ان سے حدیث کے معانی میں حاصل کرتا ہوں۔ جب شاہ صاحب نے حجاز سے واپسی کا ارادہ کیا اور آخری بار خدمت میں حاضر ہوئے تو والہانہ انداز میں یہ شعر پڑھا

نسیت کل طریق کنت اعرفه الا طریقا یودینی الی ربعکم

جن راستوں سے واقف تھا سب بھول گیا، سوائے ایک راستہ کے جو آپ کے دیار تک پہنچتا ہے تو شیخ پر ایک کیفیت طاری ہوئی اور بہت متاثر ہوئے اور نہایت خلوص سے شاہ صاحبؒ کے حق میں دعا کی۔ سراج الہند امام شاہ عبدالعزیز محدث دہلویؒ نے لکھا ہے۔ ''میرے والد صاحب جب مدینہ طیبہ سے رخصت ہونے لگے تو اِستاذ محترم سے عرض کیا ''ہر چہ خواندہ بودم فراموش کردہ ام الاعلم دین'' میں نے جو کچھ پڑھا تھا سب بھلا دیا بجز علم حدیث، تو یہ سنکر شیخ بہت خوش ہوئے اور دعائیں دیں۔

۲۔ شیخ وفد اللہ بن شیخ سلیمانی مغربی، شاہ صاحب نے ان کی مجلس درس میں مؤطا امام مالک بروایت یحییٰ بن یحییٰ اول سے آخر تک پڑھ کر تمام مرویات کی سند نہایت قلیل عرصہ میں حاصل فرمائی۔

۳۔ مفتی محمد مکہ شیخ تاج الدین بن قاضی عبدالمحسن قلعی حنفی، ان کی مجلس درس میں شاہ صاحب نے صحیح بخاری، کتب صحاح کے بعض مشکل مقامات، مؤطا امام مالک، مؤطا امام محمد، کتاب الآثار اور مسند دارمی کی سماعت کی شیخ نے خصوصیت کے ساتھ شاہ صاحب کو تحریری اجازت نامہ عنایت فرمایا۔

حجاز مقدس کے چودہ ماہ قیام میں علمی صحبتوں اور عمیق مطالعہ کتب اور امداد غیبی سے آپ نے حدیث وفقہ میں مجتہدانہ کمال پیدا کیا اور اواخر ۱۱۴۴ھ مطابق ۱۷۳۲ء میں آپ نے دوبارہ ارکان حج ادا فرمائے، اور ۱۱۴۵ھ کے اوائل میں وطن مالوف دہلی کا رخ کیا، پورے چھ ماہ آتے آتے لگ گئے، اور بتاریخ ۱۴ رجب المرجب ۱۱۴۵ھ ٹھیک جمعہ کے دن بصحت وعافیت دہلی رونق افروز ہوئے، واپسی کی خبر سن کر تمام اہل شہر علماء وفضلاء اور صوفیا کرام نے آپ کا خیر مقدم کیا، یہاں کچھ آرام کرنے کے بعد آپ نے سلسلہ درس شروع فرمادیا، مدرسہ رحیمیہ کو آپ نے جدوجہد کا مرکز بنادیا طلباء جوق در جوق اطراف ہند سے

آ آ کر مستفید ہونے لگے، اور اپنے تجدیدی اور اصلاحی کاموں کا آغاز فرمایا۔ اس سلسلہ میں آپ نے سب سے پہلے فتح القرآن کے نام سے قرآن کریم کا فارسی زبان میں ترجمہ فرمایا اور مختصر تفسیری حواشی لکھے، سورۃ بقرہ اور سورۃ نساء کا ترجمہ سفر حجاز سے پہلے ہو چکا تھا اور اس اہم تجدیدی کام کی تکمیل واپس آ کر فرمائی۔

حجۃ الاسلام امام شاہ ولی اللہؒ کے تجدیدی و اصلاحی کارناموں کا خلاصہ

۱......اشاعت قران

۲......اشاعت حدیث

۳......اصلاح عقائد و معاشرت

۴......حقیقی اسلامی تصوف کا تعارف

۵......اخلاقی تربیت کا مسنون طریقہ

۶......فقہی اور اجتہادی اختلافات میں اعتدال کی تلقین

۷......اس وقت کی مسلم حکومت کو اخلاقی زوال اور سیاسی انتشار سے بچانے کی منظم جدوجہد

۸......تحریک اصلاحی و تجدید کو چلانے اور عملی طور پر اسے نافذ کرنے والی جماعت کی تربیت۔

حضرت شاہ ولی اللہؒ اور اشاعتِ قرآن

قرآن کریم امت کے عقائد اور اعمال کی اصلاح کا واحد مؤثر ترین نسخہ ہے، اس کتاب ہدایت سے دوری کے باعث امت میں بگاڑ پیدا ہوتا ہے، شاہ صاحب سے پہلے امت کے اندر عام طور پر یہ خیال پھیلا ہوا تھا کہ قرآن کریم خدا کا کلام ہے اسے کون سمجھ سکتا ہے، اور کون اس کی حقیقت کو پا سکتا ہے، شاہ صاحب نے اس خیال کی تردید میں سب سے پہلا کام یہی کیا کی عام امت کو کلام الٰہی سے قریب کر دیا کہ وہ غور و فکر کر کے اسلام اور صراط مستقیم

کو پا سکے، چنانچہ خود شاہ صاحب رسالہ ''تحفۃ الموحدین'' میں تحریر فرماتے ہیں۔

''بعض لوگ کہہ بیٹھے ہیں کہ قرآن کریم اور حدیث کو وہی شخص سمجھ سکتا ہے جو بہت علوم اور بے شمار کتابیں پڑھا ہو، اور اپنے زمانہ کا علامہ ہو، ان کے جواب میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے هُوَ الَّذِی بَعَثَ فِی الاُمِّیِّینَ رَسُولاً مِّنهُم یَتلُوا عَلَیهِم اٰیَاتِہٖ وَیُزَکِّیهِم وَیُعَلِّمُهُمُ الکِتَابَ وَالحِکمَةَ وَاِنْ کَانُو امِنْ قَبلُ لَفِی ضَلَالٍ مُّبِین. (سورۃ جمعہ)

خدا تعالیٰ وہ ہے جس نے اَن پڑھوں میں پیغمبر بھیجا، پڑھتا ہے وہ پیغمبر ان ان پڑھوں پر خدا کی آیتیں اور ان کو گناہ کے میل سے پاک کرتا ہے اور کتاب اور حکمت سکھاتا ہے، اگرچہ اس سے پہلے یہ لوگ کھلی ہوئی گمراہی میں تھے۔

یعنی رسول خدا ﷺ بھی ان پڑھ اور آپ کے صحابہ بھی ان پڑھ تھے مگر جب رسول خدا ﷺ نے اپنے اصحاب کے سامنے قرآن کی آیتیں پڑھیں تو وہ ان کو سن کر ہر قسم کی برائی اور بگاڑ سے پاک ہو گئے۔ پس اگر ناخواندہ آدمی قرآن وحدیث نہیں سمجھ سکتا اور اس کی سمجھ کی استعداد نہیں رکھتا تو صحابہ برائی اور عیبوں سے کیونکر پاک صاف ہو گئے؟ اس قوم پر سخت افسوس ہے جو صدرہ سمجھے اور قاموس جاننے کا تو دعویٰ کرتے ہیں مگر قرآن وحدیث کو سمجھنے میں اپنے آپ کو محض نادان ظاہر کرتے ہیں، اور بعض یوں کہتے ہیں کہ ہم پچھلے لوگ ہیں رسول اللہ ﷺ کے زمانہ کی برکت اور صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین کے دل کی سلامت کہاں سے لائیں جو قرآن وحدیث کے معنی بخوبی سمجھ سکیں، ان کے جواب میں حق تعالیٰ فرماتا ہے وآخَرِینَ مِنهُم لَمَّا یَلحَقُوا بِهِم وَهُوَ العَزِیزُ الحَکِیم (سورۂ جمعہ) یعنی پچھلے لوگ خواہ پڑھے ہوئے ہوں یا ان پڑھ مگر جب کہ وہ مسلمان ہوں اور اصحاب کے طریقہ کی پیروی کا ارادہ کریں اور قرآن وحدیث کو سنیں تو انھیں بھی پاک کرنے کے لئے یہی قرآن و حدیث کافی ہو سکتی ہے۔ اور قرآن رفرماتا ہے'' وَلَقَد یَسَّرنَا القُرآنَ لِلذِّکرِ فَهَل مِن مُّدَّکِر،'' (القمر ۲۲) اور البتہ ہم نے قرآن کو نصیحت کے لئے آسان کر دیا کیا کوئی نصیحت لینے والا ہے؟ یہ کیونکر ہو سکتی ہے کہ ''کافیہ'' پڑھنے والے اور ''شافیہ'' جاننے والے تو اس کے معنی

سمجھنے سے عجز ظاہر کریں، اور عرب کے جنگلی لوگ اس کی حقیقت سے بہرہ ہوتے ہیں، اس کے علاوہ ایک جگہ قرآن یوں فرماتا ہے کہ "اَفَلاَ یَتَدَبَّرُونَ الْقُرآنَ ." (محمد۲۴) قرآن میں کیوں نہیں فکر کرتے پس اگر قرآن آسان نہ ہوتو اس میں فکر کیوں کر کیا جائے۔ "اَمْ عَلٰی قُلُوبٍ أقْفَالُهَا ." (محمد۲۴) (یا ان کے دلوں پر قفل لگے ہوئے ہوں گے، باوجود یہ کہ دلوں پر قفل نہیں لگے ہوئے ہیں، پھر بھی کیسی گمراہی ہے، قرآن کے فکر میں زور نہیں لگاتے۔

چنانچہ اس زعم باطل کو مٹانے اور ختم کرنے کے لئے شاہ صاحب نے ترجمہ اور تفسیر فتح الرحمٰن کے علاوہ اصول ترجمہ پر ایک مقدمہ بھی لکھا ہے جو مختصر ہونے کے علاوہ بڑا بصیرت افروز اور عالمانہ ہے، ابتداء میں لکھتے ہیں (**یقول الفقیر الی رحمته الله الکریم ولی الله بن عبدالرحیم**) ایں رسالت در قواعد ترجمہ مسماۃ بالمقدمہ فی قوانین الترجمہ کہ دروقت تسوید ترجمہ قرآن قلم بہ ضبط آں جاری شد ترجمہ: اور اصول تفسیر میں "الفوز الکبیر" کی تصنیف بھی دعوت الی القران اور اشاعت علم قرآن کی ایک مضبوط کڑی ہے، اگرچہ مختصر ہے لیکن حقائق و دقائق اور اسرار و حکم پر مشتمل ہے، درحقیقت ایک جلیل القدر عالم کی جس کو فہم قرآن کے مشکلات کا علمی تجربہ ہے ایک قیمتی اور نادر بیاض ہے اس کی قدر وہی لوگ جان سکتے ہیں جن کو ان مشکلات سے واسطہ پڑا ہو بعض بعض اصول جو شاہ صاحب نے اپنے ذوق و وجدان اور فہم قرآن کی بنیاد پر لکھ دیئے ہیں دوسری کتابوں کے سینکڑوں صفحات کے مطالعہ سے حاصل نہیں ہوسکتے۔

شاہ صاحبؒ کے فارسی ترجمہ کے بعد بہت جلد اردو میں ترجمہ قرآن کی ضرورت محسوس ہوئی کہ بارہویں صدی کے آخری ہی حصہ میں اردو نے فارسی کی جگہ لینی شروع کردی تھی، اور اردو میں تحریر و تصنیف کا کام شروع ہوگیا تھا، اس ضرورت اور انقلاب حال کو سب سے پہلے خود شاہ صاحب کے فرزند ارجمند حضرت شاہ عبدالقادر صاحب دہلویؒ نے محسوس کیا، اور شاہ صاحب کے فارسی ترجمہ کے پچاس برس بعد انھوں نے بامحاورہ اردو میں

اس کا ایسا ترجمہ کیا جس کے متعلق یہ کہا جاسکتا ہے کہ قرآن مجید کا کسی غیر عربی زبان میں ایسا کامیاب اور شگفتہ ترجمہ جس میں زیادہ سے زیادہ قرآنی الفاظ کی روح آئی ہو ابھی تک علم میں نہیں۔ شاہ عبدالقادر صاحبؒ کے بعد انھیں کے برادر بزرگ شاہ رفیع الدین صاحبؒ نے قرآن مجید کا تحت اللفظ ترجمہ کیا جو اپنی احتیاطوں اور مصنف کے علمی تجربہ و اخلاص کی وجہ سے بہت مقبول ہوا اور بعض حلقوں میں شاہ عبدالقادر صاحبؒ کا بامحاروہ ترجمہ بعض حلقوں میں شاہ رفیع الدین صاحبؒ کا تحت اللفظ ترجمہ رائج اور قابل ترجیح قرار پایا۔ اور اس کے بعد اردو ترجموں کا ایک سیلاب رواں ہوگیا۔ جس کی تعداد کا استقصاء ایک دشوار کام اور مستقل تحقیقی بحثوں کا طالب ہے۔

حضرت شاہ ولی اللہؒ اور درس قرآن

حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ نے ترجمہ قرآن کے علاوہ درس قرآن کا بھی سلسلہ جاری فرمایا اور شاہ صاحب کے درس قرآن کا آخری دور آیت اَعۡدِلُوا هُوَ أَقۡرَبُ لِلتَّقۡوٰى تک ہوا، ان کے بڑے فرزند شاہ عبدالعزیز صاحبؒ نے یہیں سے درس قرآن شروع فرمایا اور تقریباً ۶۲، ۶۳ سال تک دہلی جیسے مرکزی شہر اور تیرہویں صدی ہجری جیسے اہم زمانہ میں درس قرآن کا سلسلہ جاری رکھا اس کو خواص وعوام میں جو مقبولیت حاصل ہوئی اور اس سے اصلاح عقائد کا جو عظیم الشان کام انجام پایا اس کی کوئی نظیر اور مثال نہیں ملتی ہے۔ شاہ عبدالعزیز صاحبؒ کے درس قرآن کا آخری دور اِنَّ اَكۡرَمَكُمۡ عِنۡدَ اللّٰهِ اَتۡقٰكُمۡ تک ہوا، پھر یہاں سے شاہ محمد اسحاق صاحب نے شروع کیا۔

حضرت شاہ ولی اللہؒ اور اشاعتِ حدیث

شاہ صاحبؒ سے پہلے ہندوستان میں صحاح ستہ کی تدریس کا رواج نہ تھا بلکہ حدیث کا جو سرمایہ ہندوستان میں انہوں نے پڑھا تھا وہ کل یہ تھا، پوری مشکوۃ بجز چند ابواب اور بخاری شریف کا ایک حصہ یعنی کتاب الطہارۃ تک، سب سے پہلے صحاح ستہ کو ہندوستان

میں رواج دینے والے شاہ صاحبؒ ہیں۔ حضرت شاہ عبدالعزیز صاحبؒ فرماتے ہیں ''علم حدیث پدرمن از مدینہ منورہ آوردہ چاردہ ماہ حرمین بسر و بودہ سند کردہ۔ (ملفوظات ۹۳)

میرے والد ہی مدینہ منورہ سے علم حدیث لائے تھے، چودہ ماہ حرمین شریفین میں رہ کر آپ نے سند حاصل فرمائی تھی۔ شاہ صاحب حرمین شریفین سے ارادوں کی تکمیل کے لئے ہندوستان واپس ہوئے تھے، ان میں علم حدیث کی نشر و اشاعت کو سب سے زیادہ اہم رکھا، مدینہ منورہ سے رخصت ہوتے ہوئے اپنے استاذ سے آپ نے ارشاد فرمایا ''ہر چہ خواند بودم فراموش کردہ ام الا علم حدیث'' میں نے جو کچھ پڑھا ہے سب بھلا دیا بجز علم حدیث کے۔

حضرت شاہ ولی اللہؒ کا درسِ حدیث

شاہ صاحبؒ جب حجاز مقدس سے ہندوستان واپس تشریف لائے تو یہاں آکر صرف تین مشغلے اختیار فرمائے۔ (۱) قرآن کریم کے معارف بیان کرتے (۲) تصنیف و تالیف کا کام کرتے (۳) حدیث پاک کا درس دیتے۔

شاہ صاحب فرماتے ہیں۔ حرمین شریفین میں درس حدیث کے تین طریقے ہیں (۱) سرد (۲) بحث و تحقیق (۳) امعان وتعمق، یعنی ہر ہر لفظ اور اس کے متعلقات پر مالہ و ما علیہ پر بحث کی جائے، اس طریقہ کو شاہ صاحبؒ نے واعظوں اور قصہ خوانوں کا طریقہ قرار دیا ہے اور دوسرے طریقہ کو مبتدیوں کے لئے مفید بتلایا ہے، اور پہلا طریقہ دورہ حدیث کے لئے قرار دیا ہے، اس لئے شاہ صاحب کے یہاں مشکوۃ شریف بحث و تحقیق سے اور صحاح ستہ سرداً ہی پڑھائی جاتی تھی، البتہ صحاح ستہ میں ہر کتاب کی کچھ خصوصیات ہیں ان پر طلباء کو متنبہ کیا جاتا تھا، آج ہمارے مدارس میں صحاح ستہ کی تدریس جس کو دورۂ حدیث کہتے ہیں، اس کے بانی اول فی الواقع حضرت شاہ ولی اللہ صاحب ہی کی ذات گرامی ہے۔

حضرت شاہ ولی اللہؒ کے سلسلۂ حدیث کی مقبولیت

آج ہندوستان میں علم حدیث کا جو زور و شور ہے بالواسطہ یا بلا واسطہ اس کی کڑی حضرت حجتہ السلام امام الہند شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کے مخلصانہ جدوجہد پر ختم ہوتی ہے۔ حجتہ الاسلام بانی دارالعلوم دیو بند حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی سے امیر خاں نے ایک واقعہ نقل کیا ہے کہ سفرِ حج میں حضرت کا جہاز یمن کے ساحل کے کسی بندرگاہ پر ٹھہر گیا، معلوم ہوا کہ چند دن ابھی رکا رہے گا۔ حضرت نانوتویؒ کو کسی نے خبر دی کہ اس بندرگاہ کے شہر میں ایک کہنہ سال معمر بزرگ محدث رہتے ہیں، ان کی ملاقات کو حضرت تشریف لے گئے، ان سے مل کر مولانا نانوتویؒ ان کے علم سے بہت متاثر ہوئے اور درخواست کی کہ حدیث کی سند اجازت عطا ہو، اس پر محدث صاحب نے پوچھا کہ تم کس کے شاگرد ہو؟ انھوں نے اپنے استاذ مولانا عبدالغنی مجددی کا نام لیا، محدث صاحب ناواقف تھے، پوچھا مولانا عبدالغنی کس کے شاگرد ہیں، کہا شاہ عبدالعزیز صاحبؒ کے، شاہ عبدالعزیز کا نام سنکر رکے، اور بولے میں ان کو جانتا ہوں، اس کے بعد فرمایا شاہ ولی اللہ طوبیٰ کا درخت ہے، جس طرح جہاں جہاں طوبیٰ کی شاخیں ہیں وہاں جنت ہے اور جہاں اس کی شاخیں نہیں وہاں جنت نہیں ہے، یونہی جہاں شاہ ولی اللہؒ کا سلسلہ ہے وہاں جنت ہے اور جہاں ان کا سلسلہ نہیں ہے وہاں جنت نہیں ہے۔

مصر کے مشہور و معروف عالم علامہ رشید رضا مرحوم ''مفتاح کنوز السنتہ'' کے مقدمہ میں ہندوستانی علماء کا حضرت شاہ ولی اللہ کے بعد حدیث سے جو اشتغال رہا ہے اور اس میدان میں جو ان کی خدمات ہیں جس کا سلسلہ الحمدللہ اب بھی جاری ہے، اس کا اعتراف علامہ موصوف نے ان الفاظ میں کیا ہے، **ولو عنایة اخواننا علماء الهند بعلوم الحدیث فی هذا العصر یقضی علیها بالزوال من امصار الشرف فقد ضعفت فی مصر والشام والحجاز منذ القرون الخ** اور ہمارے ہندوستانی بھائیوں

میں جو علماء ہیں اگر حدیث کے علوم کے ساتھ اس زمانہ میں ان کی توجہ نہ ہوتی تو مشرقی ممالک سے یہ علم ختم ہو چکا ہوتا کیونکہ مصر، شام، عراق، حجاز میں دسویں صدی ہجری سے یہ علم ضعف کا شکار ہو چکا تھا۔ علامہ موصوف درحقیقت حضرت شاہ ولی اللہؒ اور ان کے سلسلوں کا اعتراف کررہے ہیں، شاہ صاحب کے بعد ہندوستانی علماء نے علم حدیث کی کیا خدمات انجام دی ہیں، اس پر مستقل تصنیف کی ضرورت ہے۔

حضرت شاہ ولی اللہؒ کا مقام عظمت

بقول مولانا نسیم احمد فریدی بلاشک وشبہ حضرت شاہ صاحبؒ اپنے وقت کے مجدد حکیم الامۃ، امام علم وفن، مصلح امت اور ہمدرد انسانیت ہیں، وہ بیک وقت ایک عظیم الشان عالم دین بھی ہیں اور درویش باصفا بھی، مفسر ومحدث بھی ہیں اور مفکر ومتکلم بھی، مدرس ومعلم بھی ہیں اور مؤلف ومصنف بھی، ماہر سیاسیات بھی ہیں اور رموز آشنائے معاشیات بھی، دریائے حکمت ومعرفت کے غواص بھی ہیں اور اسرار شریعت کے محرم خاص بھی۔

ولیس علی اللہ بمستنکر ان یجمع العالم فی واحد

آپ کے معاصر علماء نے جو علوم ومعارف میں اپنی مثال آپ تھے آپ کے مقام عظمت کا اعتراف کیا ہے اور بڑی قدر ومنزلت سے آپ کا ذکر کیا ہے۔ حضرت مرزا مظہر جان جاناںؒ فرماتے ہیں۔ مثل ایشاں درمحققان صوفیاء کہ جامع اندر علم ظاہر وباطن وعلم نو بیان کردہ اند چند کس گذشتہ باشند (کلمات طیبات ۸۴)

ترجمہ: ان اہل تحقیق صوفیاء میں جو ظاہری اور باطنی علوم کے جامع ہیں اور نیا علم بیان کیا ہے حضرت شاہ صاحب جیسے بس چند ہی لوگ گذرے ہوں گے۔

مولانا فخر الدین فخر جہاں دہلوی اپنے رسالہ ''فخر الحسن'' میں آپ کو اس طرح یاد فرماتے ہیں۔ ''شیخ صاحب المقامات العالیة والکرامات الجلیلة الشیخ ولی اللہ سلمہ اللہ تعالیٰ وابقاہ.

سراج الہند حضرت شاہ عبدالعزیز صاحبؒ فرماتے ہیں **آیۃ من آیات اللّٰہ و معجزۃ لنبیہ الکریم ﷺ** یعنی شاہ صاحب اللہ کی آیتوں میں سے ایک آیت اور اس کے نبی کریم ﷺ کا معجزہ ہیں۔

نواب صدیق حسن خاں ''اتحاف'' میں تحریر فرماتے ہیں ''اگر وجود او در صدر اول در زمانہ ماضی می بود امام الائمہ و تاج المجتہدین شمردہ می شود، اگر شاہ صاحب کا وجود گذشتہ زمانہ میں صدر اول میں ہوتا تو تمام مجتہدوں کے پیشوا اور مقتداء مانے جاتے۔

علامہ شبلی رقمطراز ہیں کہ ''ابن تیمیہ اور ابن رشد کے بعد بلکہ خود انھیں کے زمانہ میں مسلمانوں میں جو عقلی تنزل ہوا تھا اس کے لحاظ سے یہ امید نہ تھی کہ کوئی صاحب دل و دماغ پیدا ہوگا لیکن قدرت کو اپنی نیرنگیوں کا تماشہ دکھانا تھا کہ اخیر زمانہ میں شاہ ولی اللہ جیسا شخص پیدا ہوا جس کی نکتہ سنجیوں کے آگے غزالی رازی اور ابن رشد کے کارنامے ماند پڑ گئے۔

حضرت شاہ ولی اللہؒ اور تحدیث نعمت و تحمید الٰہی

جس مقام و منصب اور عظمت و رفعت سے آپ کو سرفراز کیا گیا تھا اس سے آپ بخوبی واقف تھے، جس کا اظہار بطور تحدیث نعمت آپ نے متعدد جگہ فرمایا ہے، چند اقتباسات بطور مثال پیش کیے جاتے ہیں۔

۱...... جب میرا دورہ حکمت یعنی علم اسرار دین پورا ہوگیا تو اللہ نے مجھے خلعت مجددیت پہنائی پس میں نے مسائل اختلافی میں جمع (و تطبیق) کو معلوم کرلیا۔

۲...... ایک جگہ اور تحریر فرماتے ہیں، مجھے خدا نے یہ شرف بخشا ہے کہ میں اس زمانے کا مجدد وصی اور قطب ہوں، اگر خدا نے چاہا تو میری کوششوں سے مسلمانوں میں ایک نئی زندگی پیدا ہوجائے گی۔

۳...... مجھ پر اللہ تعالیٰ کے خاص احسانات میں سے ایک یہ ہے کہ اس نے مجھے اس آخری دور کا خالق، حکیم، قائد، اور زعیم بنایا۔

۴.......میرے ذہن میں ڈالا گیا کہ میں لوگوں تک یہ حقیقت پہنچا دوں کہ یہ زمانہ تیرا زمانہ ہے، یہ تیرا وقت ہے، افسوس اس پر جو تیرے جھنڈے کے نیچے نہ ہو۔

۵.......میں نے خواب میں دیکھا کہ میں قائم الزمان ہوں، یعنی اللہ تعالیٰ جب خیر کے کسی کام کا ارادہ فرماتے ہیں تو اپنے اس ارادہ کی تکمیل کے لئے مجھے آلۂ کار بناتے ہیں۔

اس قسم کے بیسوں اقوال آپ کی تصانیف میں ملتے ہیں جو نہ بطور تعلّی وخودستائی ہیں نہ بطریق فخر وغرور بلکہ یہ بطور تحدیث نعمت وتحمید الٰہی ہیں جیسا کہ ارشاد ہے۔ ''وَ اَمَّا بِنِعمَۃِ رَبِّکَ فَحَدِّث''

حضرت شاہ ولی اللہؒ کی وفات حسرت آیات

آپ بڈھانہ ضلع مظفر نگر میں قیام پذیر تھے کہ مرض الموت میں گرفتار ہوگئے، قلت غذا کی وجہ سے ضعف ونقاہت پہلے ہی لاحق تھی اب اس میں اور اضافہ ہوگیا، ۹ ذی الحجہ ۱۱۸۵ھ کو بغرض علاج دہلی تشریف لائے، لیکن تقدیر تدبیر پر غالب ہوئی اور ۲۹ محرم ۱۱۸۶ھ مطابق ۱۷۶۳ء کو بوقت ظہر یہ علم ومعرفت کا آفتاب جہاں تاب افق دہلی میں ہمیشہ کے لئے غروب ہوگیا اور اپنے پیچھے بے شمار کواکب ونجوم کو چمکتا دمکتا چھوڑ گیا جو اس کی مستعار روشنی سے اب تک منور ہیں، حضرت شاہ عبدالرحیم کے مزار سے متصل ''مہندیان'' کے قبرستان میں آپ کے جسد خاکی کو سپرد خاک کیا گیا۔

ارباب چمن مجھ کو بہت یاد کریں گے   ہر شاخ پہ اپنا ہی نشاں چھوڑ دیا ہے

حضرت شاہ ولی اللہؒ کے اخلاق وعادات

شاہ صاحبؒ نہایت سادہ طبیعت، منکسر المزاج، نفیس الطبع، بلند ہمت، فراخ حوصلہ، جفاکش، بہادر وشجاع، مستقل المزاج، ہمدرد غرباء، ریا ونمود سے خالی، ظاہری نمائش و شان وشوکت سے گریزاں اور بڑے مہمان نواز وفیاض تھے، متمول ہونے کے باوجود نہایت سادہ زندگی بسر کرتے تھے، اکثر اوقات آپ کے دسترخوان پر سادہ روٹی اور بعض اوقات

معمولی سبزی ہوتی تھی، شان بے نیازی کا اندازہ اس سے ہوتا ہے کہ آپ نے کبھی شاہان وقت کی طرف چشم ارادت سے نہ دیکھا،

کیا خدا نے نہ محتاج باغباں مجھ کو نظر ہے ابر کرم پہ درخت صحرا ہوں

حضرت شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ کا فقہی مسلک

شاہ صاحبؒ کا مسلک فقہاء محدثین کے طرز پر توسط واعتدال تھا آپ روایت ودرایت کی روشنی میں طریقہ کار متعین فرماتے، اور جمہور علماء کے متفقہ طریقوں سے وابستہ رہتے علوم دینیہ اور امور شرعیہ میں آپ درجہ اجتہاد پر فائز تھے، اس لئے مذہب حنفی وشافعی میں رہتے ہوئے دونوں مذاہب کا خیال رکھتے تھے۔

ہندوستان میں مسلمانوں کا سواد اعظم مسلک حنفی سے وابستہ تھا، شاہ صاحبؒ نے ان کی مخالفت نہیں کی بلکہ ہندوستان کے مزاج اور یہاں کے فکر وتمدن دیکھتے ہوئے ائمہ فقہ کی تقلید کا درس دیا، چنانچہ حجۃ اللہ البالغہ میں فرماتے ہیں۔

''ساری امت یا امت کا معتدبہ حصہ ان چاروں مذاہب حنفی، شافعی، حنبلی، مالکی، پر متفق ہو چکا ہے کہ آج ہمارے زمانہ میں ان کی تقلید جائز ہے، اور اس میں کئی مصلحتیں ہیں جو مخفی نہیں ہیں خصوصاً اس زمانہ میں جب کہ ہمتیں پست ہو چکی ہیں اور لوگوں کے دلوں میں خواہشات نے گھر کرلیا اور ہر آدمی اپنی رائے پر فخر کر رہا ہے۔'' (حجۃ اللہ البالغہ)

خدابخش لائبریری پٹنہ بہار میں بخاری شریف کا ایک قلمی نسخہ موجود ہے جو شاہ صاحب کے درس میں رہا ہے، اس میں آپ کے تلمیذ محمد بن پیر محمد بن شیخ ابوالفتح نے پڑھا ہے، تلمیذ مذکور نے درس بخاری کے ختم کی تاریخ ٦، شوال المکرم ١١٥٩ھ لکھی ہے اور جمنا کے قریب جامع فیروزی میں ختم ہونا لکھا ہے، حضرت شاہ صاحبؒ نے اپنے دست مبارک سے اپنی سند امام بخاری تک تحریر فرما کر تلمیذ کے لئے سند اجازت تحدیث لکھی اور آخر میں اپنے نام کے سات یہ کلمات تحریر فرمائے۔ ''العمری نسبًا الدھلوی وطناً الأشعری

عقیدۃً ، الصوفی طریقۃ ،الحنفی عملاً والشافعی تدریساً خادم التفسیر والحدیثِ والفقہِ والعربیۃِ والکلام ۲۳ شوال ۱۱۵۹ھ اس تحریر کے نیچے شاہ رفیع الدین صاحبؒ نے یہ عبارت لکھی ہے ''بیشک یہ تحریر بالا میرے والد محترم کی لکھی ہوئی ہے، نیز شاہ عالم کی مہر بھی بطور تصدیق ثبت ہے۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ شاہ صاحبؒ مجتہدانہ شان رکھنے کے باوجود تقلید حنفی فرماتے تھے، اور عبارت مذکورہ شاہ صاحبؒ کے حنفی ہونے کا واضح اور بین ثبوت ہے۔ اور اسی طرح باب طریقت میں آپ چاروں سلسلوں سے مساوی نسبت رکھتے تھے اور طرق اربعہ نقشبندیہ قادریہ چشتیہ اور سہروردیہ میں اجازت دیتے تھے۔ (بحوالہ جستہ جستہ از ملت اسلامیہ کی محسن شخصیات)

حضرت شاہ ولی اللہؒ کی بعض وصیتیں اور نصیحتیں

حضرت شاہ ولی اللہؒ بہت سے دینی مسائل و معاملات میں عامۃ المسلمین کے لیے جو وصیتیں اور نصیحتیں معرض تحریر میں لائے ان میں کچھ یہ ہیں۔

۱......عقائد میں قدماء اہل سنت کی راہ اختیار کی جائے۔

۲......کتاب وسنت پر پختہ اعتقاد رکھا جائے اور اس کے مطابق عمل کیا جائے۔

۳۔......سلف نے جس بات کی کرید نہیں کی اس کے پیچھے نہ پڑا جائے (اس کے بارے میں خواہ مخواہ قیاس آرائی نہ کی جائے)

۴......فروع میں ان علماء محدثین کی پیروی کی جائے جو فقہ و حدیث کے جامع ہوں۔

۵......خام معقولی جو شبہات پیدا کرتے ہیں، ان سے صرف نظر کیا جائے۔

۶......اجتہادات فقہاء کو کتاب وسنت کی روشنی میں جانچا جائے۔

۷......اسلامی معاشرے کی بنیادیں اوامر کی پابندی اور نواہی سے اجتناب پر قائم ہیں۔ اس سے بے اعتنائی برتنا ملت دشمنی کے مترادف ہے۔

۸......قوم کے انحطاط اور زوال کے زمانے میں ہر شخص (اہل اور نہ اہل) اجتہاد کرنے کے لیے آمادہ نظر آتا ہے۔ کسی ایک مسئلہ میں مختلف اجتہادات، ملت میں انتشار کا سبب بن جاتے ہیں۔ ان حالات میں تقلید ہی ملت میں اتحاد اور نظم و ربط قائم کر سکتی ہے۔ بالخصوص یہ دیکھتے ہوئے کہ لوگ کم ہمت بھی ہیں اور خواہش پرست بھی اور ہر شخص اپنی اپنی رائے پر مغرور ہو رہا ہے۔ (مطلب یہ کہ بھانت بھانت کی بولیاں بولنے کے بجائے دینی معاملات میں سلف صالحین کی تحقیق اور طریقے پر اعتماد اور عمل کیا جائے۔

حضرت شاہ ولی اللہؒ کی تصنیفات و تالیفات

ایک مصنف کی حیثیت سے بھی شاہ صاحب کا درجہ بہت بلند ہے، آپ نے مروجہ طرز نگارش کو جو محض نامانوس اور پر شکوہ الفاظ کے طلسم اور فضول قافیہ پیمائی کے افسوں میں گھرا ہوا تھا وسعت بخشی اور اس قابل کر دیا کہ وہ ان لفظی گورکھ دھندوں اور بیجا ثقالت کی پابندیوں سے آزاد ہو کر حکیمانہ خیالات اور علمی مضامین کو بطریق احسن پیش کر سکے۔ زمانہ ماضی میں سب سے پہلے ابن خلدون نے یہ خدمت انجام دی تھی، انکے بعد آپ ہی ایک ایسے مصنف ہیں جنھوں نے اس اسلوب کو زندہ کیا۔

باوجود عجمی اور ہندوستانی ہونے کے آپ نے عربی فصاحت و بلاغت کا بے نظیر نمونہ پیش کیا جس کی عظمت کا اعتراف اہل قلم نے بھی کیا ہے، مولانا مناظر احسن گیلانی اسی کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ ”عربی زبان میں انہوں نے جتنی کتابیں لکھی ہیں ان میں ایک خاص قسم کی انشاء کی جوان کا مخصوص اسلوب ہے پوری پابندی کی ہے، شاہ صاحبؒ پہلے آدمی ہیں جنھوں نے اپنی عبارتوں میں زیادہ تر ”جوامع الکلم“ النبی الخاتم ﷺ کے طرز گفتگو کی پیروی کی ہے، حتی الوسع وہ اس کی کوشش کرتے ہیں کہ اپنے مدعا کا اظہار انہی لغات اور انہی محاورات سے کریں جو لسان نبوت اور زبان رسالت سے خاص تعلق رکھتے ہیں، انکی بے شمار تصانیف ہیں، بعض مؤرخین دوسو سے زائد بتاتے ہیں مصنف ”حیات ولی“ نے ان

کی تعداد ۵۱ بیان کی ہیں، مولانا علی میاں صاحب نے ۵۳ کی تعداد تحریر کی ہے، لیکن یہ اختلاف محض اس سبب سے ہے کہ شاہ صاحبؒ کے مختلف رسائل الگ الگ بھی شائع ہوئے ہیں اور کئی کئی رسالے ساتھ بھی چھپے ہیں۔ شاہ صاحبؒ کی تصنیفات کے سلسلے میں ایک عجیب بات یہ ہے کہ آپ نے یہ تمام کام جیسا کہ حساب لگانے سے معلوم ہوتا ہے کل ستائیس اٹھائیس یا تیس برس سے کم مدت میں انجام دیا ہے، اور وہ بھی نہایت پر آشوب اور پر فتن زمانے میں جو آپ کی منزلت علمی اور نمایاں فن کا ایک واضح ثبوت ہے، آپ کی چند مشہور اور متداول تصنیفات حسب ذیل ہیں۔

۱......**فتح الرحمن فی ترجمة القران :**

قرآن پاک کا فارسی زبان میں ترجمہ ہے جو سب سے پہلے ہندوستان میں طبع ہوا، یہ نہایت جامع، مانع اور مطلب خیز ترجمہ ہے، ترجمہ کے ساتھ جابجا فوائد بھی ہیں جو نہایت مختصر مگر جامعیت اور اشکال کی گرہ کشائی میں بے مثل ہیں، اتنی مدت گزر جانے کے باوجود اب تک اسکے مقابل کا کوئی ترجمہ نہیں ہوسکا۔

۲......**فتح الخبیر بمالا بد من حفظه فی علم التفیسر:**

یہ عربی زبان میں قرآن پاک کی تفسیر کا نہایت مختصر اور بے نظیر رسالہ ہے جس میں شرح غریب القرآن اور اسباب نزول پر جابجا روشنی ڈالی گئی ہے۔

۳......**الفوزالکبیر فی اصول التفسیر :**

فارسی زبان میں اصول کا ایک مختصر مگر نہایت جامع رسالہ ہے جس میں قرآن مجید کے علوم خمسہ تاویل حروف مقطعات، رموز قصص انبیاء اور اصول ناسخ ومنسوخ پر نہایت مفید اور بصیرت افروز مقالات جس خوش اسلوبی سے بیان کئے ہیں وہ حضرت شاہ صاحبؒ ہی کا حق ہے، علماء نے اس رسالے کی اہمیت وافادیت کے پیش نظر دینی مدارس کے نصاب میں داخل کیا ہے یہ فارسی رسالہ اردو اور عربی میں منتقل ہوگیا ہے۔

۴......**حجة اللہ البالغه:**

حضرت شاہ صاحب کو یقین تھا کہ کچھ عرصہ کے بعد دور ''عقلیت'' شروع ہونے والا ہے جس میں احکام شریعت کے متعلق اوہام وشکوک کی گرم بازاری ہوگی، اسی خطرہ کے سدباب کرنے کے لیے شاہ محمد عاشق پھلتیؒ کے اصرار پر آپ نے بالہام ربانی یہ بے نظیر کتاب ایسے عالم میں تحریر فرمائی جو محو استغراق کا عالم تھا، اکثر درمیان کتاب میں ''علّمنی ربی'' ''الھمنی ربی'' فرماتے ہیں، یہ کتاب جس محدثانہ، متکلمانہ، فقیہانہ اور فلسفیانہ انداز میں تصنیف ہوئی وہ حضرت شاہ صاحبؒ ہی کا حق ہے، جس میں آپ نے تعلیمات اسلام کو مطابق فطرت اور دینی احکام کو مبنی برعدل ہونا ثابت کیا ہے، ہر حکم الٰہی اور امر شریعت کے اسرار ومصالح نہایت بلیغ اور مدلل انداز میں بیان کئے ہیں جس سے ایک طرف تو متشکک ومتردد حضرات کے شکوک وشبہات کا ازالہ ہوتا ہے، اور دوسری طرف معترضین کے احکام اسلام پر معاندانہ اعتراضات کا منہ توڑ جواب مل جاتا ہے۔ حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ فرماتے ہیں کہ شاہ صاحب کی یہ مایہ ناز تصنیف آنحضرت ﷺ کے ان معجزات میں سے ہے جو آنحضرت ﷺ کی وفات کے بعد آپ کے امتیوں کے ہاتھوں پر ظاہر ہوئے، اور جن سے اپنے وقت میں رسول کریم ﷺ کا اعجاز نمایاں اور اللہ کی حجت تمام ہوئی

افسوس یہ ہے کہ حضرت مولانا عبید اللہ سندھیؒ اور حضرت اقدس حکیم الاسلام مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ کے بعد یہ کتاب یتیم ہوگئی ہے، اور اسکے درس کا سلسلہ دارالعلوم دیوبند جیسے ادارے میں بھی موقوف ہوگیا ہے حالانکہ اس کتاب کی زبان بہت ہی آسان ہے اور معمولی غور وخوض کے بعد مطلب سمجھ میں آجاتا ہے۔

۵......تاویل الاحادیث فی امور قصص الانبیاء:

مکذبین انبیاء پر جو عذاب الٰہی آئے اور رسولوں اور نبیوں کے ذریعہ جن معجزات کا ظہور ہوا اس کتاب میں ان کو مطابق فطرت ثابت کیا گیا ہے۔

۶......المسویٰ من المؤطا

مؤطا امام مالک کی مبسوط عربی شرح ہے، حقیقت تو یہ ہے کہ اس شرح میں شاہ

صاحب کا مجتہدانہ رنگ نمایاں ہوتا ہے، ہندوپاک اور مکہ مکرمہ سے شائع ہوچکی ہے۔

۷......المصفیٰ شرح المؤ طا

یہ امام مؤطا مالک کی فارسی کی شرح ہے، اس میں آپ نے احادیث اور آثار کو الگ کردیا ہے اور احادیث پر مجتہدانہ انداز سے بحث کی ہے۔

۸......شرح تراجم ابواب صحیح بخاری

شاہ صاحبؒ نے امام بخاری کے تراجم ابواب کی اس طرح شرح کی ہے کہ تراجم ابواب اور احادیث میں مناسبت پیدا ہوجاتی ہے، یہ رسالہ عربی میں ہے ہمارے یہاں کے صحیح بخاری کے شروع میں ملحق ہے۔

۹......ازالة الخفاء عن خلافة الخلفاء:

یہ شاہ صاحب کی دوسری شہرۂ آفاق تصنیف ہے، اس میں آپ نے خلفائے راشدین کی خلافت کا حق ہونا آیات واحادیث اور تاریخ سے دلائل وبراہین دے کر ثابت فرمایا ہے، اور شیعہ وسنی کے باہمی نزاعات واختلافات کو نہایت عدل وانصاف کے ساتھ حل کیا ہے، یہ کتاب فارسی میں ہے۔

۱۰......التفهيمات الالٰهية

آپ نے اس کتاب میں معاشرے کے ہر طبقہ کو مخاطب کرکے اصلاح پر ابھارا ہے، اس میں تصوف وسلوک کی باتیں بھی ہیں، بعض مقالات فارسی میں ہیں اور بعض عربی میں، پوری کتاب دو جلدوں میں ہے، مجلس علمی ڈابھیل گجرات کے زیر اہتمام شائع ہوئی ہے۔

۱۱......الخير الكثير :

یہ تصوف اور علم اسرار وحکم میں ایک معیاری کتاب ہے، یہ بھی مجلس علمی ڈابھیل گجرات سے شائع ہوئی ہے، اصل کتاب عربی زبان میں ہے اور ترجمہ بھی شائع ہوا ہے۔

۱۲......فيوض الحرمين :

قیامِ حرمین شریفین کے دوران جو فیوض و برکات بصورت خواب والقاء شاہ صاحب کو حاصل ہوئے یہ بھی ان ہی کا مجموعہ ہے، اصل عربی زبان میں ہے اور ترجمہ کے ساتھ شائع ہوا ہے۔

۱۳......الانصاف فی بیان سبب الاختلاف:

اس کتاب میں فقہی اختلافات کے اسباب پر محققانہ بحث کی گئی ہے اور ہر طبقہ کے افراط وتفریط پر تنقید کی گئی۔ نہایت مفید کتاب ہے اور ترجمہ کے ساتھ کئی بار چھپ چکی ہے۔

۱۴......عقد الجیدفی بیان احکام الا جتھا د و التقلید .

اس عربی رسالہ میں شاہ صاحب نے اجتہاد اور تقلید کے مسائل پر نہایت محققانہ اور منصفانہ بحث کی ہے۔

۱۵......البلاغ المبین:

یہ رسالہ رد بدعت وشرک اور دعوت توحید پر مشتمل ہے۔

۱۶......رۃ العینین فی تفضیل الشیخین:

تفضیل شیخین کے متعلق فارسی زبان میں اہم رسالہ ہے۔

۱۷......انسان العین فی مشائخ الحرمین :

یہ رسالہ شاہ صاحب کے عربی شیوخ واساتذہ پر مشتمل ہے۔

۱۸......الدر الثمین فی مبشرات النبی الامین :

شاہ صاحب کے اس رسالہ میں ان بشارتوں کو ذکر فرمایا ہے جو آپ کو اور آپ کے نسبی یا روحانی بزرگوں کو نبی کریم ﷺ سے ہوئیں۔ یہ رسالہ عربی میں ہے۔

۱۹......انفاس العارفین :

شاہ صاحب نے اس کتاب میں اپنے والد بزرگوار اور دوسرے خاندانی بزرگوں کے حالات واقعات بیان کئے ہیں۔

۲۰......القول الجمیل :

یہ رسالہ وظائف واذکار اور طریقت کے چاروں سلسلوں کے بیان پر مشتمل ہے۔

۲۱......الطاف القدس

۲۲......همعات

۲۳......لمعات

۲۴......سطعات :

یہ چاروں رسالے تصوف میں ہیں، بقیہ کتابوں کے نام بغیر تعارف کے لکھے جاتے ہیں۔

۲۵......مکتوبات مع مناقب امام بخاری و ابن شیبه.

۲۶......مکتوبات المعارف مع مکاتیب ثلثه

۲۷......المقالة الوصية فی النصیحه و الو صية

۲۸......چهل حدیث ۲۹. اطیب النعم

۳۰......الزهرادین ۳۱. شفاء القلوب

۳۲ ......الوامع شرح حزب البحر

۳۳...... سرور المحزون فی ترجمه نور العین

۳۴......رسائل تفهیمات ۳۵ المسلسلات

۳۶......الذكر الميمون ۳۷ النشر المكتوم

۳۸......اعراب القرآن

۳۹......الفضل المبین فی السلسل من حدیث البنی الامین

۴۰......العقيدة الحسنه

۴۱......المقدمة السنيه فی انتصار الفرقة السنية

۴۲......شرح رباعیتین ۴۳ العطية الصمدية

۴۴......فتح الودود فی معرفة الجنود

۴۵......الارشاد الیٰ مهمات الاسنا د

۴۶......رسائل اوائل

۴۷......مایجب حفظ للناظر

۴۸......تأثر الاجداد

۴۹......الاشباه فی سلاسل اولیاء الله

۵۰......رسائل تفهیمات

۵۱......رسائل دانشمندی

۵۲......النوادر من احادیث سید الاو ائل والاواخر.

حضرت شاہ ولی اللہؒ بحیثیت ادیب وشاعر

حضرت شاہ ولی اللہؒ فضل وکمال کے اعتبار سے یکتائے روزگار تھے اور علم وعمل کا کوئی گوشہ ایسا نہ تھا جس میں ان کی بے پناہ (خداداد) صلاحیتوں نے اپنے جھنڈے نہ گاڑے ہوں۔ ارباب فکر ونظر کے نزدیک ان پر اس شعر کا اطلاق ہوتا ہے۔

یک چراغ ست دریں خانہ کہ از پرتو آں کجامی نگری، انجمنے ساختہ اند

اللہ تعالیٰ نے شاہ صاحبؒ کو کمال درجے کے فضل وکمال کے ساتھ ادب اور شعروسخن کے میدان کا شہسوار بنایا تھا۔ وہ عربی اور فارسی کے نہ صرف بلند پایہ نثر نگار تھے بلکہ ان زبانوں کے نغز گو شاعر بھی تھے۔ دارالمصنفین اعظم گڑھ (بھارت) کے ایک فاضل رفیق جناب محمد نعیم ندوی صدیقی نے شاہ صاحبؒ کی عربی اور فارسی تحریروں کا تجزیہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ: ''شاہ صاحبؒ نے اپنے عہد کی مروجہ زبانوں (عربی اور فارسی) میں بکثرت کتابیں تصنیف کیں لیکن ان پر ظہوری اور بیدل کے طرز تحریر کی چھاؤں بھی نہیں پڑسکی بلکہ اس (شاہ صاحبؒ کے طرز تحریر) میں ایجاز کے ساتھ وسعت نظر، سلامتی فہم، سلامت زبان، قوت انشاء رفعت خیال اور دقت نظر کی کارفرمائی پورے عروج پر ملتی ہیں جو ایک اعلیٰ نثر کی

خصوصیات ہیں۔ (ماہنامہ فاران کراچی نومبر ۶۸ء) بلاشبہ عربی اور فارسی میں شاہ صاحبؒ کی تحریر ادیبانہ رفعت شان کی مظہر ہیں۔ شاہ صاحبؒ اگر چہ فطری شاعر نہ تھے لیکن قدرت کی طرف سے ان کو ذوق شعر و سخن کا بہرہ وافر عطا ہوا تھا۔ انہوں نے عربی اور فارسی میں خاصہ کلام اپنی یادگار چھوڑا عربی میں ان کا زیادہ تر کلام نعتیہ قصیدوں پر مشتمل ہے ان کے مجموعے کا نام اطیب النغم ہے فارسی میں شاہ صاحبؒ امین تخلص کرتے تھے ان کا فارسی کلام بہت سی غزلوں رباعیوں اور قطعات پر مشتمل ہے۔ نمونہ کلام ملاحظہ ہو۔

رباعی

درصحبت اہل دل رسیدم بسے — بس دریوزہ کناں زما کسے یک نفسے
از چشمہ آب زندگانی قدحے — آتش وادی مقدس قبسے

رباعی

دائم دل پیش تو حاضر باشد — چشم برخ خوب تو ناظر باشد
درمذہب ماشرک جل ہست وصرے — گر روئے دگر خطرۂ خاطر باشد

ایک غزل کے تین اشعار

من ندانم بادہ ام یابادہ راپیانہ ام — عاشق شوریدام یاعشق باجانا نہ ام
مبتلائے حیرتم جاں گویمت یاجان جاں — اصطلاح شوق بسیارست ومن دیوانہ ام
باجمال ذاتش حسن دگر درکار شد — چشم اور اسرمہ ام یازلف اوراشانہ ام

کچھ اور اشعار

توئی اول توئی آخر توئی ظاہر توئی باطن — توئی مقصود اہل دل توئی مشتاق وہمدم ہم
تابکے محنت ومہجوری ودوری بکشم — نازنیں وطنم سوئے عدن بازروم
تابکے ہمدمئے سنگ بودشیوۂ من — گوہرے ازعدنم سوئے عدن بازروم
تابکے بستہ زنجیر تعلق باشم — آہوئے ازختنم سوئے ختن بازروم
گربگشن بگزری گل بررخت مفتوں شود — ورنمائی قامت خودسرو راموزوں شود

کار با معنی ست دانا را نہ با نام و نشاں ۔۔۔ جذبۂ لیلیٰ ندا در بید اگر مجنوں شود

مرد مفلس را جہاں یکسر محل آفت ست ۔۔۔ شیشہ خالی ست گر بارش رسد واژن شود

شعراء کے بعض تذکروں سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت شاہ ولی اللہؒ اردو میں بھی اشتیاق تخلص کے ساتھ طبع آزمائی کیا کرتے تھے۔ ان تذکروں میں شاہ صاحبؒ کی کچھ اردو غزلیں بھی ملتیں ہیں۔ ان میں سے ایک غزل بطور نمونہ کلام یہاں درج کی جاتی ہے۔

خیال دل کو ہے اس گل سے آشنائی کا ۔۔۔ نہیں صبا کو ہے دعویٰ جہاں رسائی کا

کہیں وہ کثرت عشاق سے گھمنڈ میں آ ۔۔۔ ڈروں ہوں کہ نہ دعویٰ کرے خدائی کا

مجھے تو ڈھو کے تھا زاہد پر اک نگاہ سے آج ۔۔۔ غرور کیا ہوا وہ تیری پارسائی کا

جہاں میں نہ دل لگانے کا لیوے پھر کوئی نام ۔۔۔ بیان کروں میں اگر تیری بے وفائی کا

نہ چھوڑا مار بھی کھا کر گزر گلی کا تری ۔۔۔ رقیب کو مرے دعویٰ ہے بے حیائی کا

نہیں خیال میں لاتے وہ سلطنت جم کی ۔۔۔ غرور ہے جنہیں در کی تری گدائی کا

جفائے یار سے مت اشتیاق پھیر کے منہ ۔۔۔ خیال کی جیو کہیں اور جبہ سائی کا

(ماہنامہ فاران کراچی جنوری ۵۲ھ بحوالہ تذکرہ گلزار ابراہیم مرتبہ ڈاکٹر سید محی الدین زور)

حضرت شاہ ولی اللہؒ کی اولاد امجاد

حضرت شاہ ولی اللہؒ کے صاحبزادوں کی تعداد عموماً چار بتائی جاتی ہے جبکہ یہ تعداد فی الحقیقت پانچ ہے۔ ان صاحبزادوں کے اسماء گرامی یہ ہیں۔

۱......شاہ محمد محدث دہلویؒ

۲......شاہ عبد العزیز محدث دہلویؒ

۳......شاہ رفیع الدین محدث دہلویؒ

۴......شاہ عبد القادر محدث دہلویؒ

۵......شاہ عبد الغنی محدث دہلویؒ

یہ پانچوں صاحبزادے آسمان علم وفضل پر آفتاب بن کر چمکے (بالخصوص بڑے چار صاحبزادے)۔ ان کے حالات زندگی بیان کرنے کے لئے ایک ضخیم کتاب درکار ہے ۔ یہاں ہم ان بزرگوں کا تذکرہ نہایت اختصار کے ساتھ ہی کر سکتے ہیں۔

ا......شاہ محمد محدث دہلویؒ، حضرت شاہ ولی اللہؒ کی پہلی شادی ۱۱۲۸ھ میں پھلت (پہلت) میں اپنے ماموں کی صاحبزادی سے ہوئی تھی۔ انہی کے بطن سے شیخ محمد پیدا ہوئے۔ شاہ ولی اللہؒ کی کنیت اپنے ان (سب سے بڑے) صاحبزادے کے نام پر ابو محمد تھی۔ شیخ محمد کی تعلیم وتربیت شاہ صاحبؒ ہی کی نگرانی میں ہوئی اور وہ علوم دینیہ کی تکمیل کے بعد مسند درس وتدریس پر رونق افروز ہوئے۔ صاحب ''نزہتہ الخواطر'' مولانا عبدالحیؒ کا بیان ہے کہ شاہ عبدالعزیز نے شمائل ترمذی اپنے ان بڑے بھائی (شیخ محمد) کی قراءت ہی سے پڑھی تھی۔ ایک روایت کے مطابق شیخ محمد نے شاہ ولی اللہؒ کی دوسری شادی کے بعد پہلت (پھلت) میں مستقل سکونت اختیار کر لی تھی۔ (بحوالہ دہلی اور اس کے اطراف از سید ظہیر الدین احمد)

لیکن مولانا عبدالحیؒ کا بیان ہے کہ: ''شیخ محمد اپنے والد کی وفات کے بعد بڈھانہ منتقل ہو گئے تھے اور بڈھانہ کی جامع مسجد کے متصل دفن کیے گئے''۔ (بڈھانہ اور پہلت ضلع مظفرنگر (یوپی، بھارت) کے دو گاؤں ہیں) (ماہنامہ فاران کراچی جون ۱۹۶۵ء مقالہ سید محمود احمد برکاتی)

تذکرہ نگاروں نے یہ وضاحت نہیں کی کہ شیخ محمدؒ گمنام کیوں ہے، وہ کیا اسباب تھے جن کی بناء پر شیخ محمدؒ نے والد گرامی سے علیحدگی اختیار کی اور دلّی کو ہمیشہ کے لئے چھوڑ دیا۔

شاہ ولی اللہؒ کی وفات کے وقت دوسری اہلیہ سے انکے چاروں صاحبزادے دلی میں موجود تھے۔ اکثر تذکرہ نگاروں نے لکھا ہے کہ شاہ صاحبؒ نے وفات سے پہلے ان چاروں میں سے بڑے شاہ عبدالعزیزؒ کو اپنا جانشین (خلیفہ) بنایا لیکن خود شاہ عبدالعزیز کا بیان ہے کہ حضرت شاہ ولی اللہؒ نے وفات سے تھوڑی دیر پہلے چاروں فرزندوں کے سروں پر دستار مبارک رکھ دی تھی یا باندھ دی تھی۔'' گویا انہوں نے چاروں فرزندوں کو اپنا خلیفہ یا جانشین

قرار دیا تھا۔ ان چاروں بھائیوں کے باہمی تعلقات ہمیشہ نہایت خوشگوار رہے۔

(تذکرہ شاہ ولی اللہؒ از سید مناظر احسن گیلانی)

ان چاروں بھائیوں کے مختصر حالات یہ ہیں:۔

حضرت شاہ ولی اللہؒ کے چار صاحبزادوں کے مختصر حالات

حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلویؒ

یہ ۱۱۵۹ھ ہجری مطابق ۱۷۵۶ء عیسوی میں پیدا ہوئے، تاریخی نام غلام حلیم تھا۔ والد گرامی نے ان کی تعلیم و تربیت بڑے اہتمام سے کی اور انہوں نے پندرہ سال کی عمر میں تمام علوم دینی تفسیر حدیث فقہ ہیت ریاضی، اصول، عقائد، منطق، تاریخ وغیرہ میں مہارت تامہ حاصل کرلی۔ سترہ سال کی عمر میں والد گرامی کا سایہ سر سے اٹھ گیا اور انہوں نے والد گرامی کے شروع کیے ہوئے کام کو آگے بڑھایا۔ تاحیات درس و تدریس اور وعظ و خطابات کا سلسلہ جاری رکھا۔ علم حدیث کو فروغ دیا، قرآن مجید کی تفسیر فارسی زبان میں ''فتح العزیز'' کے نام سے لکھی۔ علاوہ ازیں مختلف دینی موضوعات پر متعدد بلند پایہ کتابیں تصنیف کیں ۱۲۳۹ھ ہجری مطابق ۱۸۲۴ء عیسوی میں وفات پائی۔

شاہ رفیع الدین محدث دہلویؒ

ان کی ولادت ۱۱۶۳ھ مطابق ۱۷۵۰ء میں ہوئی۔ بچپن میں قرآن مجید حفظ کیا پھر تمام علوم متداولہ اپنے والد گرامی اور بڑے بھائی شاہ عبدالعزیز سے حاصل کیے۔ پھر درس و تدریس اور وعظ و نصیحت کے ولی اللہی چشمہ فیض کو جاری رکھنے کے لیے اپنے آپ کو وقف کردیا۔ ان کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ سب سے پہلے قرآن پاک کا ترجمہ ملکی زبان اردو میں کیا۔ بقول سید سلیمان ندوی اس شہرہ آفاق ترجمے نے لاکھوں کڑوروں مسلمانوں کو دین و ایمان کی راہ بتائی۔ ترجمہ قرآن کے علاوہ انہوں نے کئی اور کتابیں (قیامت نامہ، دفع باطل، العروض والقافیہ، اسرار المحبہ وغیرہ) بھی تصنیف کیں ۱۲۳۳ھ مطابق ۱۸۱۸ء

میں انتقال کیا۔

شاہ عبدالقادر محدث دہلویؒ

۱۱۶۷ھ مطابق ۱۷۵۳ء میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم والد گرامی سے اور پھر شاہ عبد العزیزؒ سے تمام دینی علوم حاصل کیے۔ روحانی فیض بھی کئی بزرگوں سے حاصل کیا، نہایت عابد و زاہد، متواضع اور منکسر المزاج تھے، زندگی کا بیشتر حصہ دلی کی اکبر آبادی مسجد میں گزارا۔ انہوں نے قرآن حکیم کا بامحاورہ اور سلیس اردو میں ترجمہ کیا۔ ۱۲۳۰ھ مطابق ۱۸۱۵ میں سفر آخرت اختیار کیا۔

شاہ عبدالغنی محدث دہلویؒ

۱۱۷۱ھ مطابق ۵۸۔۱۷۵۷ء میں پیدا ہوئے، یہ حضرت شاہ ولی اللہؒ کے سب سے چھوٹے فرزند تھے۔ خرد سالی میں کچھ تعلیم والد گرامی سے حاصل کی پھر دوسرے تمام علوم متداولہ شاہ عبدالعزیزؒ اور دوسرے بھائیوں سے حاصل کئے کیونکہ پانچ سال کی عمر ہی میں سایہ پدری سے محروم ہو گئے تھے۔ نہایت ذہین فطین، صابر، قانع، عابد و زاہد اور متبع سنت تھے۔

چہرے مہرے اور وضع قطع میں اپنے والد گرامی شاہ ولی اللہؒ سے کمال درجے کی مشابہت رکھتے تھے۔ وقت کا بیشتر حصہ درس و تدریس دعوت و ارشاد اور طلبہ کی تربیت میں صرف کرتے تھے۔ محدث، مفسر، فقیہ اور معلم ہونے کے ساتھ روحانی شیخ بھی تھے۔ افسوس کہ انہوں نے بہت تھوڑی عمر پائی اور ۱۶ رجب ۱۲۰۳ھ مطابق ۱۲ اپریل ۱۷۸۹ کو اس جہان فانی سے رخصت ہو گئے۔ اولاد میں دو صاحبزادیاں اور ایک فرزند شاہ محمد اسماعیل اپنی یادگار چھوڑے۔ اللہ کی قدرت کہ شاہ ولی اللہؒ کے مذکورہ بالا چاروں بھائیوں کی وفات عجیب ترتیب سے ہوئی۔ پہلے سب سے چھوٹے پھر ان سے بڑے، پھر ان سے بڑے اور آخر میں سب سے بڑے اس دنیا سے رخصت ہوئے۔ شاہ رفیع الدینؒ کی وفات کے بعد شاہ

عبدالعزیز نے فرمایا: ترتیب معکوس در رحلت برادران واقع شد یعنی اول مولوی عبدالغنی کہ خرد ترین ہمہ بودند، بعدازاں مولوی عبدالقادر از اوشاں بعد مولوی رفیع الدین کلاں سال از واشاں اکنوں بار یاست یعنی الٹی ترتیب بھائیوں کی رحلت میں ہوئی۔ اول مولوی عبدالغنی کہ سب سے چھوٹے تھے، اس کے بعد مولوی عبدالقادر اور ان کے بعد مولوی رفیع الدین سب سے بڑا میں ہوں اب میری باری ہے۔ (بحوالہ تذکرہ حضرت شاہ ولی اللہؒ)

حجۃ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ

حضرت مولانا قاسم نانوتویؒ کا تاریخی نام خورشید حسن ہے۔ آپ ۱۲۴۸ھ میں پیدا ہوئے مولاناؒ کے والد ماجد شیخ اسد علی صاحب تھے۔ جو بات مروت اور صاحب اخلاق، کنبہ پرور، مہمان نواز، نمازی و پرہیز گار تھے۔ مولانا مملوک علی صاحب کے ساتھ دہلی جا کر شاہنامہ وغیرہ بھی پڑھی تھیں۔ ان کی عمر کا زیادہ حصہ کھیتی باڑی ہی میں گزرا۔ حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کے دادا شیخ غلام شاہ تھے۔ ان کی بھی تعلیم زیادہ نہ تھی۔ مگر بڑے ذاکر و شاغل بزرگ تھے۔ درویشوں کی خدمت کرتے تھے۔ خواب کی تعبیر دیکھنے میں مشہور تھے۔ حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کا سلسلہ نسب حضرت ابوبکر صدیقؓ سے ملتا ہے۔ مختصر نسب نامہ یہ ہے۔ محمد قاسم بن اسد علی بن غالم شاہ بن محمد بخش بن علاؤالدین بن فتح محمد بن مفتی بن عبدالسمیع بن مولوی ہاشم نانوتوی۔

حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ بچپن ہی سے ذہین، طباع، بلند ہمت، تیز وسیع حوصلہ، جفاکش، جری اور چست تھے۔ مکتب میں اپنے ساتھیوں میں ہمیشہ اول رہتے تھے۔ قرآن مجید بہت جلد ختم کر دیا تھا۔ خط بھی سب ساتھیوں میں اچھا تھا۔ شاعری کا بچپن ہی سے شوق تھا۔ اپنے کھیل اور بعض قصے نظم کر لیا کرتے تھے۔ حضرت حاجی امداد اللہؒ کا ننہیالی رشتہ حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کے خاندان سے ملتا تھا اور حضرت کی بہن نانوتہ میں بیاہی ہوئی تھی۔ آپ اسی وجہ سے اکثر اپنی بہن سے ملنے نانوتہ تشریف لے جایا کرتے

تھے اسی زمانے میں حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ اور مولانا محمد یعقوب نانوتویؒ نے جلد سازی سیکھی تھی اپنی اپنی کتابوں کی جلد خود باندھ لیا کرتے تھے۔ نانوتہ میں آپ کے خاندان میں ایک ایسا قضیہ پیدا ہوگیا تھا۔ جس کی وجہ سے حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کو نانوتہ سے دیوبند بھیجا گیا۔ شیخ کرامت حسین کے گھر پر شیخ نہال احمد صاحب پڑھتے تھے۔ مولوی صاحب کو انہوں نے عربی پڑھائی۔ پھر سہارنپور اپنے نانا کے پاس آگئے۔ وہاں مولوی محمد نواز صاحب سہارنپوری سے کچھ پڑھا۔

طالب علمی میں خواب

ایام طالب علمی میں حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ نے خواب دیکھا تھا کہ میں خانہ کعبہ کی چھت پر کھڑا ہوں اور مجھ سے نکل کر ہزاروں نہریں جاری ہورہی ہیں۔ اپنے استاد حضرت مولانا مملوک علیؒ سے ذکر کیا۔ انہوں نے فرمایا کہ تم سے علم دین کا فیض بکثرت جاری ہوگا۔ اور اس میں ذرہ برابر شک نہیں کہ دارالعلوم دیوبند نے برصغیر پاک وہند میں خصوصاً پورے علم اسلام میں عموماً جو کتاب وسنت وفقہ کی اشاعت کی ہے اس کی مثال پیش نہیں کی جاسکتی۔ توحید ورسالت، خدا خوفی اور فکر آخرت پیدا کر کے لاکھوں نہیں بلکہ کروڑوں انسانوں کو باخدا بنادیا۔ معاشرتی اور تمدنی زندگی حقوق العباد کا صحیح جزبہ پیدا کیا اور سب سے بڑی بات یہ کہ کسی بھی حال میں اسلام کے تیرہ سوسالہ تسلسل اور اسلاف کی وابستگی میں سرمو فرق نہیں آنے دیا۔ دارالعلوم دیوبند اور اس کی شاخوں سے کسب فیض کرنے والے علماء وفضلاء کی اگر فہرست تیار کی جائے تو اس کے لئے ایک ضخیم جلد درکار ہوگی۔ علم ظاہر اور باطن دونوں میں یکساں ماہر افراد تیار کئے۔

حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کی علمی قابلیت اور تقویٰ بے مثال وبے نظیر تھا۔ حضرت حاجی امداد اللہؒ نے حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کے بارے میں فرمایا تھا کہ ایسے لوگ کبھی پہلے زمانے میں ہوا کرتے تھے۔ اب مدتوں سے نہیں ہوتے۔ ایک دفعہ حضرت

حاجی صاحب نے یہ بھی فرمایا تھا کہ اللہ تعالیٰ اپنے بعض بندوں کو ایک لسان عطا فرماتا ہے۔ چنانچہ حضرت شمس تبریز کے واسطے مولانا رومؒ کو لسان بنایا تھا۔ اور مجھ کو حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ لسان عطا ہوئے ہیں اور جو میرے قلب میں آتا ہے بیان کر دیتے ہیں۔

ایک اور خواب

ارواح ثلاثہ میں ہے کہ حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ نے خواب میں دیکھا کہ ''میں خانہ کعبہ کی چھت پر کسی اونچی جگہ پر بیٹھا ہوں اور کوفہ کی طرف میرا منہ ہے اور ادھر سے ایک نہر ہے جو میرے پاؤں سے ٹکرا کر جاتی ہے''۔ اس خواب کو انہوں نے مولانا محمد یعقوب صاحبؒ (المتوفی ۱۲۸۲ھ برادر شاہ محمد اسحاق صاحب المتوفی ۱۲۶۲ھ) سے اس عنوان سے بیان فرمایا کہ حضرت ایک شخص نے اس قسم کا خواب دیکھا ہے تو انہوں نے یہ تعبیر دی کہ اس شخص سے مذہب حنفی کو بہت تقویت ہوگی اور وہ بہت پکا حنفی ہوگا اور اس کو خوب شہرت ہوگی۔ لیکن شہرت کے بعد اس کا جلد انتقال ہو جائے گا۔ اور اس خواب کی تعبیر پر دلیل لانے کی ضرورت نہیں۔ یہ بات اظہر من الشّمس ہے کہ حضرت نانوتویؒ، ان کے تلامذہ اور دارالعلوم دیوبند نے فقہ حنفی کی جو خدمت کی ہے اس کا کوئی انکار نہیں کر سکتا۔ خود حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ نے بعض کتابیں فاتحہ خلف الامام پر توثیق الکلام اور الدلیل الحکم اور بیس رکعات تراویح پر مصباح التراویح وغیرہ اور اسی طرح دیگر مسائل مختلف فیہا جو مضامین اور دلائل لکھے ہیں۔ وہ علمی دینا میں ہمیشہ یادرہیں گے۔

سادگی وکسر نفسی

حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ بہت خوش مزاج اور عمدہ اخلاق تھے۔ مزاج تنہائی پسند تھا اور اول عمر سے ہی اللہ تعالیٰ نے یہ بات عنایت فرمائی تھی کہ اکثر ساکت رہتے۔ اس لئے ہر کسی کو کچھ کہنے کا حوصلہ نہ ہوتا تھا۔ ان کے حال سے بھلا ہو یا برا۔ کسی کو اطلاع ہوتی نہ آپ کہتے یہاں تک کہ بیمار بھی ہوتے۔ تب بھی شدت کے وقت کسی نے جان لیا تو جان لیا

۔ورنہ خبر بھی نہ ہوتی۔اور دوا کرنا تو کہاں حضرت مولانا احمد علی محدث سہار نپوریؒ کے چھاپہ خانہ میں جب کام کیا کرتے تھے۔ مدتوں یہ لطیفہ رہا کہ لوگ مولوی صاحب کہہ کر پکارتے ہیں اور آپ بولتے نہیں کوئی نام لے کر پکارتا تو خوش ہوتے۔تعظیم سے نہایت گھبراتے بے تکلف ہر کسی سے رہتے جو شاگرد یا مرید ہوتے ان سے دوستوں کی طرح رہتے علماء کا وضع عمامہ یا کرتہ کچھ نہ رکھتے۔ایک دن حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ نے فرمایا کہ اس علم نے خراب کیا۔ ورنہ اپنی وضع کو ایسا خاک میں ملاتا کہ کوئی بھی نہ جانتا۔ میں کہتا ہوں۔اس شہرت پر بھی کسی نے کیا جانا۔جو کمالات تھے وہ کس قدر تھے۔کیا ان میں سے ظاہر ہوئے اور آخر سب کو خاک میں ملا دیا۔اپنا کہنا کر دکھایا مسئلہ کبھی نہ بتلاتے۔کسی کے حوالے فرماتے۔فتویٰ پر نام لکھنا اور مہر لگانا تو در کنار۔اول امامت سے بھی گھبراتے آخر کو اتنا ہوا وطن میں نماز پڑھا دیتے وعظ بھی نہ کہتے۔جناب مولوی مظفر حسین صاحب مرحوم کاندھلوی (جو اس آخری زمانہ میں قدماء کے نمونہ تھے) نے اول وعظ کہلوایا اور خود بھی بیٹھ کر سنا۔اور بہت خوش ہوئے۔

سخاوت و مہمان نوازی

حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کے والد ماجد کو بڑی فکر تھی کہ کچھ ذریعہ معاش اختیار نہیں کرتے اور نہ ہی نکاح کرتے ہیں۔ بالآخر حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کے پیر و مرشد حاجی امداد اللہ صاحب سے ذکر کیا۔حاجی صاحب نے حکم دیا تو ناچار نکاح پر راضی ہو گئے ۔مگر شرط یہ لگائی کہ میرے ساتھ جیسی حالت میں ہونگا بیوی رہے گی۔غربت ہو یا تنگدستی۔ سسرال نے یہ شرط قبول کی ایک چھاپہ خانہ میں پانچ روپے ماہوار تصحیح کا کام کرنے لگے مزاج میں مہمان نوازی اور سخاوت، بچے کیا؟ جب گھر آتے تو مہمان بہت آتے۔ بالآخر بیوی کی اجازت سے اس کا زیور فروخت کر دیا۔ وہ بھی نہایت تابعدار تھیں۔ پہلے والدین کی بے حد خدمت کی بعد میں شوہر کی آخر میں اللہ جل شانہ، نے کشادگی عنایت فرمائی تو جو کچھ ہوتا بیوی

کولا کر دیتے۔اور بیوی بھی ایسی کشادہ دست کہ حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کا کوئی مہمان آیا۔اسی وقت کھانا پکا کر کھلایا۔کبھی ایسا نہیں ہوا کہ مہمان آیا اور فوراً کھانا نہ ملا۔

حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ خود فرمایا کرتے کہ ہماری سخاوت احمد کی والدہ کی بدولت ہے۔جو میں قصد کرتا ہوں۔وہ مہمان نوازی میں بڑھ جاتی ہے۔آپ نے لڑکپن میں ایک خواب دیکھا تھا کہ میں مر گیا ہوں اور لوگ مجھے دفن کر آئے تب قبر میں حضرت جبرائیلؑ تشریف لائے اور کچھ سامنے رکھا اور کہا یہ تمہارے اعمال ہیں۔ان میں ایک نگین بہت خوشنما اور کلاں ہے۔اس کو فرمایا کہ یہ عمل حضرت ابراہیمؑ خلیل اللہ کا ہے۔اس خواب کی تعبیر یہی سخاوت تھی۔

جہادِ آزادی کا آغاز

انگریزوں کے ہندستان میں قدم رکھنے کے بعد علماء کے طبقے یعنی حضرت شاہ ولی اللہؒ نے یہ دیکھ کر کہ یہ دوسروں کے مذہبوں کو پامال کرنے اور عیسائی مذہب کو پھیلانے کے لئے شرم ناک ہتھکنڈے استعمال کر رہے ہیں۔ان کے انسداد کی تدبیریں شروع کر دیں اور ایک انقلابی جماعت کی داغ بیل ڈالدی۔چنانچہ اس جماعت کے تیسرے امام حضرت شاہ عبدالغنیؒ کے 1846ء میں انتقال کے بعد حاجی امداد اللہ مکیؒ چوتھے امام مقرر ہوئے۔جنگ آزادی 1857ء کی ابتدا ہوئی یہ حضرات بھی تیار تھے۔حضرت حاجی صاحب کے شریک کار مولانا رشید احمد گنگوہیؒ ، حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ، مولانا عبدالغنیؒ، اور مولانا محمد یعقوب نانوتویؒ، مولانا شیخ محمد تھانوی سے جہادِ حریت کے سلسلے میں تبادلہ خیال ہوا مولانا شیخ محمد تھانوی نے بے سروسامانی کا ذکر فرما کر جہادِ حریت کی مخالفت کی۔حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ نے فرمایا کہ ہم اصحاب بدر سے بھی بے سروسامان زیادہ ہیں۔حضرت امیر امداد اللہؒ نے طرفین کی گفتگو سنی۔فرمایا کہ الحمدللہ انشراح ہوگیا اور جہاد کی تیاری شروع کردی امیر امداد اللہؒ نے امامت قبول کی اور حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ سپہ سالار مقرر ہوئے اور

مولانا رشید احمد گنگوہیؒ قاضی مقرر ہوئے اسی طرح قصبہ تھانہ بھون دارالاسلام قرار پایا۔

میرٹھ کے بعد دہلی اور ہندستان کے مختلف مقامات پر جنگ آزادی چھڑ گئی تھی۔ ان حضرات نے بھی مورچہ لگا لیا۔ قاضی عنایت اللہ خان اور ان کے بھائی عبدالرحیم ان کے ساتھ سہارنپور پہنچے اور سہرائے میں ٹھہرے۔ ایک بنیئے نے بتکھی صاحب سے جو انتظام سہارنپور پر مامور تھا۔ مخبری کی کہ تھانہ کا رئیس بھی کمپنی سے باغی ہو گیا ہے، اس کا بھائی دہلی میں کمک بھیجنے کے لئے ہاتھی خریدنے آیا ہے اور کئی دن سے سہرائے میں ٹھہرا ہوا ہے۔ چنانچہ ایک کارو بسمت سرائے روانہ کیا گیا اور عبدالرحیم اور اس کے ساتھیوں کو قید کر کے جیل خانہ بھیج دیا اور ان لوگوں کو پھانسی پر لٹکا دیا اگلے دن قاضی عنایت اللہ خان کو اپنے بھائی کی پھانسی کی اطلاع ہوئی۔ یہ اپنے رفقاء اور رعایا کو چند فوجی سوعار کہاروں کے کندھوں پر کارتوسوں کی کئی بہنگیاں لدوائے سہارنپور سے کرانہ کی طرف جا رہے تھے کہ قاضی صاحب کو اس کی اطلاع ہوئی وہ اپنے رفقاء اور رعایا کو ساتھ لے کر شیر علی باغ کی سمت سڑک پر جا پڑے اور جس وقت وہ سوار سامنے سے گزرے ان پر حملہ کر کے میگزین چھین لیا۔ ایک سوار اس میں زخمی ہو کر بسمت جنگل بھاگا۔ مگر تھوڑے ہی فاصلے پر گھوڑے سے گر کر مر گیا۔ اس واقعہ کی خبر مظفر نگر پہنچی تو حاکم ضلع کی طرف سے تھانہ پر فوج کشی کا حکم ہو گیا جس پر عنایت علی خان اور اس کے ساتھیوں نے انگریزی فوج کا مقابلہ کیا۔ ایک معرکہ میں حاجی امداد اللہؒ مولانا رشید احمد گنگوہی، حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ اور حافظ ضامن ہمراہ تھے۔ بندوقچیوں سے مقابلہ ہوا یہ نبرد آزما جتھہ بھاگ جانے والا یا ہٹ جانے والا نہ تھا۔ اس لئے پہاڑ کی طرح مقابلے پر ڈٹ گئے۔ اور دوسرا اگروہ ہاتھوں میں تلواریں لیے بندوقچیوں کے سامنے ایسے جارہا تھا گویا زمین نے پاؤں پکڑ لئے۔ چنانچہ ان حضرات پر فائر ہوئے اور حضرت ضامنؒ نے زیر ناف گولی کھائی اور شہید ہوئے حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ یکا یک سر پکڑ کر بیٹھ گئے جس نے دیکھا جانا کہ کنپٹی پر گولی لگی ہے اور دماغ پار کر کے نکل گئی۔ حضرت حاجی صاحب نے لپک کر زخم پر ہاتھ رکھ کر فرمایا کہ کیا ہوا میاں۔ عمامہ اتار کر سر جو دیکھا

۔کہیں گولی کا نشان تک نہیں تعجب یہ تھا کہ خون سے تمام کپڑے تر تھے معرکہ جنگ جاری ہے ۔اسی گھمسان کے میدان میں حضرت حافظ ضامن شہیدؒ نے مولانا رشید احمد گنگوہیؒ کو پاس بلایا اور فرمایا کہ میاں رشید! میرا دم نکلے تو میرے پاس ضرور ہونا۔تھوڑی دیر گزری تھی کہ حافظ ضامن صاحب دھم سے زمین پر گر پڑے۔معلوم ہوا کہ گولی گہری لگی اور خون کا فوارہ بہنا شروع ہو گیا۔حافظ صاحب زخمی ہو کر گرے کہ حضرت مولانا گنگوہی نے لپک کر نعش کو کندھے پر اٹھالیا اور قریب کی مسجد میں لائے اور حضرت کا سر اپنے زانوں پر رکھ کر تلاوت قرآن مجید میں مشغول ہو گئے۔آنکھوں میں آنسو تھے۔یہاں تک کہ حافظ ضامن صاحبؒ کا آپ کے زانو پر وصال ہو گیا اہل کارانِ تحصیل اس جنگ میں کام آئے اور خزانہ پر مجاہدین نے قبضہ کر لیا جب کچھ سکون ہوا تو تھانہ بھون کو انگریزی فوج نے گھر لیا اور مشرقی انب سے گولا باری شروع کر دی۔دن نکلنے پر فوج قصبہ میں داخل ہوئی اور قتل وغارت گیری کا بازار گرم ہو گیا رات کی تاریکی چھانے سے پہلے شہر پناہ کے چاروں دروازے کھول دیئے گئے اور مکانات پر مٹی کا تیل ڈال کے آگ لگا دی گئی اس کس برسی کے عالم میں لوٹ مار خوب ہوئی غرض یہ کہ رات کی تاریکی ختم ہونے سے پہلے تھانہ بھون مٹی کا ڈھیر بن گیا تھا۔

گرفتاری کے وارنٹ

ان تینوں حضرات۔حضرت حاجی صاحبؒ حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ مولانا رشید احمد گنگوہیؒ کے وارنٹ گرفتاری جاری ہو گئے تھے کہ تھانہ بھون کے فساد میں شاملی کی تحصیل پر حملہ کرنے والے یہی لوگ تھے تھانہ کی بستی کی دکانوں کے چھپراتیوں نے تحصیل کے دروازے پر چھپر جمع کئے اور ان پر آگ لگا دی یہاں تک کہ جس وقت آدھے کواڑ جل گئے ابھی آگ بجھنے نہ پائی تھی ان نڈر مولویوں نے جلتی آگ میں گھس کر خزانہ لوٹ لیا۔

حضرت حاجی امداد اللہؒ نے حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ مولانا گنگوہیؒ کو الوداع کہا اور حجاز جانے کے لئے روانہ ہو گئے ان ایام میں مولانا قاسم مرحوم احباب کے اصرار پر

تین دن تک روپوش رہے۔

اتباع سنت وروپوشی

تین دن پورے ہوتے ہی ایک دم باہر نکل آئے اور کھلے بندوں چلنے پھرنے لگے لوگوں نے پھر نسبت روپوشی کے لئے عرض کیا تو فرمایا تین دن سے زائد روپوش رہنا سنت کے خلاف ہے کیونکہ جناب نبی کریم ﷺ ہجرت کے وقت غار ثور میں تین ہی دن تک رو پوش رہے۔

داد دیجئے اس جزبہ اتباع سنت کی کہ ظالم انگریز ان دنوں اہل ہند عموماً اور مسلمانوں پر خصوصاً سفاکانہ اور قاتلانہ حربے استعمال کر رہا تھا اور نہایت بے دردی کے ساتھ مظلوموں کے ناحق خون سے ہولی کھیلتا تھا اور وہ کونسی حیا سوز اور دل آزار حرکت تھی جو اس ظالم نے مجاہدوں کے خلاف روانہ رکھی تھی اور وہ کونسی غیر انسانی کاروائی تھی جو اس نے چھوڑی تھی؟ اس وقت انگریز کا ظلم و جور اور تعدی وستم اپنے نقطہ عروج پر تھا۔ لیکن حجۃ السلامؒ اپنی حیات سے بے نیاز ہوکر اس موقع پر بھی آنخضرت ﷺ کی سنتِ اضطراری کو ترک کرنے پر باوجود شدید اصرار کے آمادہ نہ ہوئے اور تین دن کے بعد فوراً باہر نکل آئے اور کھلے بندوں پھرنے لگے اور اس روپوشی کی حالت میں بھی آقائے نامدار ﷺ سے اپنے عشق کا تعلق اور رابطہ مستحکم ہی رکھا اور اس نازک حالت میں بھی سنت پر نگاہ جمی رہی۔

دارالعلوم دیوبند کا قیام

1857ء میں حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ نے اپنے مرشد حضرت حاجی امداد اللہؒ کی قیادت میں ہندستان سے غیر ملکیوں کا قبضہ اٹھانے کے لئے جنگ لڑی۔ لیکن جنگ میں شکست ہوگئی اور ملک پر انگریزوں کا اقتدار قائم ہوگیا۔ اس سے تمام ہندوستانیوں اور بالخصوص مسلمانوں کے دل ٹوٹ گئے اور ان میں احساسِ کمتری کے ساتھ ایک عام مایوسی پھیل گئی۔ ادھر مشنریوں نے عیسائی اقتدار کے زیر سایہ صاف صاف یہ اعلان کرنا شروع کر

دیا کہ انگریزوں کے لئے یہ ملک (ہندوستان) عیسیٰ مسیح کا عطیہ اور امانت ہے۔ اسی لئے اس میں مسیح مذہب ہی کی اشاعت اور ترویج ہمارا نصب العین ہے اور ساتھ ہی کھلے بندوں ہندوستان کے تمام مذاہب اور خصوصیت سے اسلام پر اعتراضات اور تواہمات کی بوچھاڑ بھی شروع کر دی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ یہاں کے باشندے مایوسی میں مبتلا ہو کر اور بالخصوص مسلمان اس ابھرتی ہوئی مغربی تہذیب و تعلیم سے الحاد دہریت کی ضد میں بہنے لگے اور صاف نظر آنے لگا کہ اگر یہی لیل و نہار رہے تو وہ دن دور نہیں کہ آئندہ نسلیں خواہ وہ کسی بھی دور کی ہوں خود اپنے اخلاقی نظام اور تہذیب و کلچر سے بیگانہ محض ہو کر رہ جائیں گی۔

حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ نے اپنے نور معرفت سے وقت کی رفتار اور اس کے خطرناک نتائج کا اندازہ لگایا اور بارشادات غیب ہندوستان کے تمام باشندوں کو بجائے آپس میں الجھنے کے ایک عالمی نقطہ نظر میں ڈال دینے اور قوم میں ایک ذہنی انقلاب لانے کی ضرورت محسوس فرمائی۔ تاکہ یہ احساسِ کمتری دور ہو۔ اس لئے حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ نے تعلیم و تربیت کا راستہ اختیار فرمایا۔ جو بے ضرر اور رسمی سیاست سے دور تھا۔ چنانچہ **1857ء** کے انقلاب کے بعد حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ نے اپنی ایمانی فراست سے چھپے ہوئے اقتدار کا نعم البدل تعلیمی راہ سے حریت فکر کے بقاء وارتقاء کو قرار دیا اور اپنا یہ عظیم مقصد ۱۲۸۳ھ (**1866ء**) میں دارالعلوم دیوبند کا قیام فرما کر بآسانی حاصل کر لیا۔ اس الہامی نقطہ فکر کے تحت دارالعلوم دیوبند محض ایک مدرسہ نہیں بلکہ حریت فکر اور استقلال وطن کے جذبات کو زندہ رکھنے کی ایک ہمہ گیر مکتب فکر اور عظیم تحریک ہے۔ دارالعلوم دیوبند کے قیام کے بعد حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ نے مقصد کی اہمیت کے تحت ملک گیر پیمانہ پر مدارس قائم فرمانا شروع کئے اور بنفس نفیس خود جا کر، مرادآباد، گلاؤٹھی، امروہہ، مظفر نگر وغیرہ میں مدارس قائم فرمائے اور جابجا اپنے متوسلین کو زبانی اور خطوط کے ذریعہ قیام مدارس کی ہدایت فرمائی چنانچہ بہت سے مدارس، ہندوستان میں حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کی زندگی میں قائم ہوئے اور پھر حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کے حریت فکر کے امین فضلاء نے

پورے ملک میں حتیٰ کہ انہیں فضلاء نے ایشیاء افریقہ اور یورپ کے ممالک میں بھی اسی قاسمی طرزِ فکر پر تعلیم گاہیں قائم کی اور میرا اپنا مشاہدہ ہے کہ آج انگلستان میں یہ قاسمی فکر فروغ پارہا ہے۔ عالمی پیمانہ پر ہندوستان میں مفت تعلیم کا سب سے پہلا عوامی مرکز مدرسہ دارالعلوم دیوبند ہے جس کے لئے حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کو صاحب دل علماء اور صداقت شعار رفقاء کار حضرت مولانا رشید احمد صاحب، حضرت مولانا ذوالفقار علی، صاحب حضرت مولانا فضل الرحمٰن صاحب اور حضرت حاجی محمد عابد صاحبؒ وغیرہ کا مخلصانہ تعاون حاصل رہا۔ یہ ہی دارالعلوم دیوبند آج ایشیاء کی سب سے بڑی اسلامی مرکزی اور اقامتی یونیورسٹی بن کر ایک خاص مکتب فکر کی حیثیت سے بین الاقوامی شہرت و عظمت کا حامل ہے۔

عشق محمدی ﷺ پر چند واقعات

حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ اور آپ کے رفقاء کار اور عقیدت مندوں کی جس درجہ اور جس قدر والہانہ عشق و محبت اور اخلاق و عقیدت جناب رسول اللہ ﷺ کے ساتھ ہے اس کا انکار بغیر کسی متعصب اور سوائے کسی معتصب کے اور کوئی نہیں کر سکتا۔ رومانی افسانوں میں مجنوں بنی عامر کے عشق و محبت کے بڑے بڑے افسانے زبان زدِ خلائق ہیں۔ لیکن اگر مجنوں سگ کوچہ لیلیٰ پر فدا تھا تو حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ اور اس کے رفقاء کار مدنیہ طیبہ کی مبارک گلیوں کے ذرات پر قربان و نثار تھے۔ اگر مجنوں لیلیٰ کے عشق میں مجبور و مقہور تھا تو یہ حضرات عشق محمد ﷺ میں بے چین و بے قرار تھے۔ اگر مجنوں لیلیٰ کی اداؤں پر مفتون تھا تو یہ حضرات اپنے آخر الزماں نبی ﷺ کی پیاری سنتوں کے شیدائی تھے اگر مجنوں لیلیٰ کے انس والفت میں گرفتار تھا تو یہ حضرت آنحضرت ﷺ کے تعلق وعلاقہ پر نثار تھے اور آپ کے لگاؤ اور آپ کی پسند کو جان عزیز سے بھی زیادہ قیمتی سمجھتے تھے کیونکہ وہ یہ جانتے تھے اور دل سے مانتے تھے دینی اور دنیوی تمام لذتوں کا سر چشمہ ہی اس برگزیدہ ہستی ۔ کے ساتھ مؤدت اور عقیدت ہے جن کے ارشاد و فرمودہ ایک جملے کے مقابلے میں دنیا بھر کے لعل و گوہر اور ہفت

اقلیم کی دولت اور خزانے قطعاً کوئی رقعت اور حیثیت نہیں رکھتے اور جن کے پیارے اقوال وافعال اور اسوۂ حسنہ کے مقابلے میں کوئی لذیذ سے لذیذ اور خوش آئند سے خوش آئند چیز بھی ایک رتی بھر کا وزن نہیں رکھتی جن کے اسم گرامی دنیا کی تمام شیرینیوں اور شربتوں سے میٹھا اور جن کی ایک ادنیٰ سنت بھی جوہرات سے مرصع تاج شاہی سے بھی زیادہ مرغوب وپسندیدہ ہے کیا ہی خوش قسمت ہے وہ قوم جس کو جناب رسول اللہ ﷺ جیسا افضل المخلوقات نبی اور آپ کی شریعت جیسی بیش بہا شریعت مل گئی جس کے بعد کسی اور خوبی کی سرے سے کوئی حاجت باقی ہی نہیں رہتی۔ حجتہ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کے عشق نبویؐ کے واقعات قولی اور فعلی تو بہت کچھ ہیں جن کے بیان کرنے کے لئے دفتر درکار ہیں۔ ہم صرف چند واقعات بطور نمونہ پیش کرتے ہیں۔ ملاحظہ فرمائیں۔

(۱) ہندوستان میں بعض حضرات سبز رنگ کا جوتا بڑے شوق سے پہنتے تھے۔ اور اب بھی پہنتے ہیں لیکن حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ نے ایسا جوتا مدت العمر کبھی نہیں پہنا اور اگر کوئی تحفۃً لا دیتا تو اس کے پہننے سے اجتناب وگریز کرتے اور آگے کسی کو ہدیہ دے دیتے اور سبز رنگ کا جوتا پہننے سے محض اس لئے گریز کرتے کہ سرور کائنات آقائے دو جہاں حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کے گنبد خضرا کا رنگ سبز ہے۔ پھر بھلا ایسے رنگ کے جوتے پاؤں پر کیسے اور کیوں استعمال کئے جا سکتے ہیں؟ چنانچہ شیخ العرب والعجم حضرت استادنا المکرم مولانا حسین احمد مدنیؒ (المتوفی ۱۳۷۷ھ 1958ء) حجتہ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کے حالات بیان کرتے ہوئے رقم فرماتے ہیں کہ:۔ ''تمام عمر سبز رنگ کا جوتا اس وجہ سے کہ قبہ مبارک سبز رنگ کا ہے نہ پہنا اگر کوئی ہدیہ لے آیا تو کسی اور کو دے دیا۔'' اندازہ کیجئے اس نظر بصیرت کا گنبد خضراء کے ظاہری رنگ کے ساتھ کس قدر عقیدت والفت ہے۔ جس کے اندر عظیم المرتبت مکین آرام فرما ہیں۔ جن کی نظر جن کی مثال اور جن کا ثانی خدا کی ساری مخلوق میں نہ آج تک وجود میں آیا اور نہ قیامت تک آسکتا ہے علامہ اقبال مرحوم نے شاید اسی کی ترجمانی کی ہے۔

رُخِ مصطفےٰ ہے وہ آئینہ کہ اب ایسا دوسرا آئینہ
نہ ہماری بزمِ خیال میں نہ دکانِ آئینہ ساز میں

(۲) حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ جب حج کے لئے تشریف لے گئے تو مدینہ طیبہ سے کئی میل دور ہی سے پابرہنہ چلتے رہے۔ آپ کے دل اور ضمیر نے یہ اجازت نہ دی کہ دیارِ حبیب ﷺ میں جوتا پہن کر چلیں حالانکہ وہاں سخت نوکیلے سنگر اور چبھنے والے پتھروں کی بھرمار ہے چنانچہ حضرت مولانا سید مناظر حسین گیلانیؒ جناب مولانا حکیم منصور علی خان صاحب حیدرآبادیؒ کے حوالے سے نقل کرتے ہیں جو اس سفر حج میں حجۃ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کے رفیق سفر تھے:۔ ''مولانا مرحوم مدینہ منورہ تک کئی میل آخری شب تاریخ میں اسی طرح چل کر پابرہنہ پہنچ گئے۔

اور نیز حکیم صوفؒ کے حوالہ ہی سے رقم فرماتے ہیں کہ:۔ ''جب منزل بہ منزل مدینہ شریف کے قریب ہمارا قافلہ پہنچا، جہاں روضہ پاک صاحب لولاک نظر آتا تھا۔ فوراً جناب حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ نے اپنے نعلین اتار کر بغل میں دبا لئے اور پابرہنہ چلنا شروع کردیا''۔

ملاحظہ فرمایئے: کہ حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ مدینہ طیبہ اور گنبد خضراء کے ساتھ کس قدر عقیدت اور کیسی فریفتگی تھی دیکھئے کہ تادّب حسن کا کیا ہی بہترین طریقہ اختیار فرما کر اپنی فرط محبت کا اظہار فرمایا اور یہ ساری عقیدت ومحبت جناب امام الانبیاء خاتم الرسل حضرت محمد مصطفےٰ احمد مجتبیٰ ﷺ کی وجہ سے ہے۔ ورنہ اس سنگلاخ رقبہ اور پتھریلی زمین کی فی نفسہٖ کیا قدر ہے؟ جو کچھ بھی ہے اور جتنی کچھ بھی ہے وہ حبیب کبریا ﷺ ہی کی بدولت ہے۔ اور آپ ہی کے واسطہ سے ہے۔

زندگی کے آخری ایام

حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ جب ۱۲۹۵ھ (1878ء) میں حج کے لئے

تشریف لے گئے تھے جس سفر حج میں جلیل القدر اور اس دور کے مشاہدہ علماء کی ایک جماعت شریک تھی، اس حج سے واپسی میں جہاز کے اندر حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ سخت بیمار ہو گئے، جہاز میں علاج کی سہولتیں نہ ہونے کی وجہ سے مرض بڑھتا چلا گیا، جہاز میں وبائی بیماری انتہائی تشویش ناک تھی، ہمارے ملک کی آب وہوا اور مزاج کے لحاظ سے جو علاج ہونا چاہیئے تھا وہ میسر نہ آسکا، اس لئے کمزوری اور نکاہت اس درجہ بڑھ گئی کہ اٹھنے بیٹھنے سے معزوری ہو گئی، جہاز کے ڈاکٹر نے بعض دوائیں دیں اور مرغ کا جوس پلانے کے لئے کہا اور خود ہی مرغ بھی فراہم کر دیا جس کی وجہ سے قدرے افاقہ رہا۔ عدن کے مقام پر جہاز روک دیا گیا مگر جہاز والوں کو جہاز سے اترنے اور شہر جانے سے منع کر دیا گیا، اسی لئے یہاں بھی ضرورت کی دوائیں میسر نہیں ہوئیں البتہ کچھ لیموں اور کچھ سنترے مل گئے جب اس کا استعمال ہوا تو طبیعت قدرے سنبھلی۔ آپ کی بیماری کی حالت میں جہاز بمبئی پہنچا۔ اس سفر میں مولانا محمد یعقوب نانوتویؒ، مولانا محمد منیر نانوتویؒ اور حکیم منصور آبادیؒ خصوصی تیماردار تھے، ہمہ وقت ایک شخص آپ کے پاس ضرور رہتا تھا بمبئی پہنچ کر قدرے افاقہ ہوا اور بدن میں اتنی طاقت آگئی کہ اٹھنے بیٹھنے لگے تھے۔ لیکن ضعف ونقاہت کہ وجہ سے جہاز سے اترنے کے فوراً بعد ہی ٹرین کا سفر نہیں کیا اور یہ فیصلہ کیا گیا کہ یہاں کچھ دن ٹھہر کر بہتر علاج معالجہ کے بعد جب جسم میں کچھ طاقت آجائے جب ٹرین میں سفر کیا جائے۔ تقریباً تین چار دن آپ حضراتؒ حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کا علاج بمبئی میں کراتے رہے۔ طبیعت صحت کی طرف لوٹ رہی تھی جسم میں طاقت بھی کچھ آنے لگی تھی تب ٹرین کا سفر شروع ہوا، اور اپنے وطن کے لئے بمبئی سے روانہ ہوئے۔ وطن آنے کے بعد اصل مرض تو ختم ہو گیا لیکن ضیق النفس اور کھانسی جم گئی، اور دورے پڑنے لگے، جب بھی گفتگو فرماتے کھانسی بڑھ جاتی مگر اسی علالت میں آپ نے اسباق شروع کر دیئے اور ترمذی شریف طلباء کی ایک جماعت کو پڑھانے لگے، مولانا عبدالرحمن محدث امروہویؒ نے اس دور میں حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ سے شرف تلمذ حاصل کیا اور آپ کے اس درسِ ترمذی میں وہ

شریک تھے۔ حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کے ایک مخلص عقیدت مند ڈاکٹر عبدالرحمٰن تھے جو مظفر نگر جیل کے سرکاری ڈاکٹر تھے۔ ان کو حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کی بیماری کی تفصیل معلوم ہوئی تو انہوں نے از خود اپنی خدمات پیش کیں، حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ نے جب منظور فرمالیا تو ڈاکٹر صاحب آپ کو مظفر نگر لے گئے، اب معالج بھی وہی تھے اور تیمار دار بھی وہی، بلکہ ساری خدمت وہی انجام دیتے تھے مظفر نگر جانے کے بعد علاج کے ابتدائی مرحلہ میں افاقہ ہوا اور آرام کی صورت نظر آئی مگر اصل مرض باقی رہا اور ہر وقت خفیف سے حرارت رہا کرتی تھی، یونانی ایلوپیتھی، اور آیورویدک طریقہ علاج اختیار کیا جاتا رہا، مہنگی سے مہنگی اور بیش قیمت سے بیش قیمت دوائیں فراہم کی گئیں لیکن کوئی فائدہ نظر نہیں آرہا تھا۔ سانس کا دورہ بڑھتا ہی جارہا تھا جس کی وجہ سے لاغری اور ضعف اپنی انتہا کو پہنچ چکا تھا، اب اٹھنا بیٹھنا بھی دشوار ہوتا جارہا تھا لیکن قوت ارادی اب بھی پہلے جیسی ہی تھی، تحمل اور جو آپ کا امتیازی وصف تھا وہ بیماری میں بھی اپنی جگہ قائم رہا۔

وفات...... ۴ جمادی الاولیٰ ۱۲۹۷ھ (اپریل 1879ء) کی تاریخ اور جمعرات کا دن تھا کہ بعد نماز ظہر حجۃ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ بانی دارالعلوم دیوبند نے اس دار فانی سے رخ مبارک موڑ لیا ''انا للہ وانا الیہ راجعون'' ہر طرف صف ماتم بچھ گئی، جاں نثار اور عقیدت مندوں میں کہرام مچ گیا، ہر چہرہ آنسوؤں سے تر ہوگیا، انتقال کے وقت آپ کی عمر ۴۹ سال تھی۔

تدفین...... حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ نے وصیت فرمائی تھی کہ مجھے گورِ غریباں میں دفن کیا جائے، حکیم مشتاق احمد دیوبندیؒ نے ایک زمین خرید کر اس کو قبرستان کے لئے وقف کر دیا تھا، اسی زمین میں قبر کی جگہ تجویز کی گئی۔ عصر کے وقت جنازہ تیار ہوگیا اور مدرسہ کے صحن میں لاکر رکھ دیا گیا، نماز جنازہ میں شرکت کرنے والوں کی کثرت کی وجہ سے یہاں نماز جنازہ کی گنجائش نہیں تھی اس لئے قصبہ کے باہر میدان میں نماز جنازہ ادا کی

گئی اور مغرب کے بعد تدفین عمل میں آئی۔ (سوانح قاسمیؒ)

قطب الارشاد حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ

دارالعلوم دیوبند کی داغ بیل اور ان علمائے ربانین نے ڈالی تھی جو سراپہ خلوص وللمیت تھے۔ ان کا دل ودماغ ملت اسلامیہ کے شاندار مستقبل کے لئے بے چین تھا ۔انہوں نے اپنے کو اشاعت دین اور ترویج علوم دینیہ کے لئے وقف کر دیا تھا۔رب العالمین نے دارالعلوم اور اس کی خدمت کو مقبولیت عطا فرمائی اور اس نے ملک اور بیرون ملک کی دینی علمی، اخلاقی اور اصلاحی جو خدمات عظیمہ انجام دی ہیں وہ کبھی بھلائی نہیں جاسکتی ہیں۔ یہاں سے ہزاروں علماء اور صوفیاء پیدا ہوئے جن میں بہترین محدثین، فقہاء، مصنفین اور مبلغین کا جم غفیر بھی ہے۔اور رشد وہدایت اور تزکیۂ باطن کرنے والوں کی ایک لمبی جماعت بھی ہے بلکہ ان میں وہ لوگ بھی بڑی تعداد میں ہیں جنہوں نے ملک کی آزادی اور یہاں کے باشندوں کی اصلاح کے لئے بے مثال قربانیاں پیش کی ہیں۔

حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کے بعد حضرت سید احمد شہیدؒ، حضرت شاہ اسماعیل شہیدؒ، حضرت مولانا قاسم نانوتویؒ اور قلب الارشاد حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ نے اسلامی روح کی حفاظت کی ۔اور اسلامی تحریک کو آگے بڑھانے کی کامیاب کوشش فرمائی ۔حضرت نانوتوی اور حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ نے اعتقادی اور معاشرتی اصلاح کی زبردست جدوجہد کی ۔انہوں نے اسلامی مسائل کو عقلی دلائل سے مستحکم کیا۔تباہ کن رسم ورواج کی مخالفت کی ۔ان اکابرین نے اسلامی عقائد، سماجی رسوم، دینی تعلیم وتربیت اور سیاسی جدوجہد کے گوناگوں مقاصد بروئے کار لانے کے لئے دینی مدارس کے قیام کو ضروری قرار دیا۔اس سلسلے میں سب سے پہلے دارالعلوم دیوبند منصۂ شہود پر جلوہ گر ہوا ۔اللہ تعالیٰ نے دارالعلوم کی تحریک کو شرف قبول عطا فرمایا۔ملک کے طول وعرض میں ہر طرف لوگوں نے اس کی آواز پر لبیک کہا۔اوہام ورسوم اور شرک و بدعت کے جو گھرے بادل

ہندوستان کی فضاؤں میں چھائے ہوئے تھے، رفتہ رفتہ چھٹنے شروع ہو گئے اور ان کی جگہ کتاب وسنت کے احکام پر عمل کیا جانے لگا۔ دار العلوم کا قیام جن مقاصد کے لئے عمل میں لایا گیا ان میں قرآن مجید، تفسیر، حدیث، عقائد وکلام اور ان کے علوم کے متعلقہ ضروری اور مفید فنون عالیہ کی تعلیم دینا اور مسلمانوں کو مکمل طور پر اسلامی معلومات بہم پہنچانا، رشد وہدایت اور تبلیغ کے ذریعے اسلام کی خدمت انجام دینا اور اعمال واخلاق کی اصلاح وترتیب کرنا شامل ہے۔

حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ بانی دار العلوم دیوبند کے وصال کے بعد دار العلوم کے سرپرست ثانی قلب الارشاد حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ نے قاسمی طرز فکر کے ساتھ دار العلوم کی تعلیمات میں فقہی رنگ بھرا جس سے اصول پسندی کے ساتھ فروغ فقیہہ اور جزئیاتی تربیت کا قوام بھی پیدا ہوا اور اس طرح فقہ اور فقہاء کے سرمایا کا بھی اس میراث میں اضافہ ہو گیا۔ قلب الارشاد حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ کو علم حدیث، فقہ اور تصوف سے بہت زیادہ شغف رہا۔ ہزار ہا انسانوں نے حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ سے استفادہ کیا ۔حضرت گنگوہیؒ نے علماء وفقہاء کی تربیت فرمائی اور انہیں دین کے بارے میں اتنا راسخ اور مستحکم بنا دیا کہ ان افراد پر کوئی بھی فتنہ اثر انداز نہ ہو سکا۔ قلب الارشاد حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ اپنے وقت کے امام ملت، قطب عالم، نمونہ علم وعمل، رشد وہدایت کا مرکز، عظیم مصلح ،مربی اخلاق اور قومی وملکی امور میں مسلمہ قائد تسلیم کئے گئے۔ 1875ء کے انقلاب میں قلب الارشاد حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ نے حضرت مولانا محمد قاسم صاحبؒ کے دوش بدوش قائدانہ حصہ لیا تھا۔ اور نو ماہ تک اسیر فرنگ رہے تھے۔ جن لوگوں نے ان سیاسی اور جہادی خدمات پر پردہ ڈالنا چاہا ہے خواہ اپنی لاعلمی اور معاملات کی بے خبری کی بناء پر یا اپنی کسی مصلحت کی وجہ سے ان کی مصلحت اندیشی باخبر لوگوں کے نزدیک لغو ہے۔ مولانا عاشق الٰہی میرٹھی لکھتے ہیں کہ

”1857ء میں خانقاہ قدوسی سے مردانہ وار نکل کر انگریزوں کے خلاف صف آراء

ہو گئے اور اپنے مرشد حضرت حاجی امداد اللہ صاحب اور دوسرے رفقاء کے ساتھ شاملی کے معرکہ جہاد میں شامل ہو کر خوب داد وشجاعت دی۔ جب میدان جنگ میں حضرت حافظ ضامن شہید ہو کر گرے تو قلب الارشاد حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ ان کی لاش اٹھا کر قریب کی مسجد میں لے گئے اور پاس بیٹھ کر قرآن شریف کی تلاوت شروع کر دی۔ معرکہ شاملی کے بعد گرفتاری کا وارنٹ جاری ہوا۔ اور قلب الارشاد حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ کو گرفتار کر کے سہارنپور کی جیل بھیج دیا گیا پھر وہاں سے مظفر نگر منتقل کر دیا گیا۔ چھ ماہ جیل میں گزرے۔ وہاں بہت سے قیدی قلب الارشاد حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ کے معتقد ہو گئے اور جیل خانے میں جماعت کے ساتھ نماز ہونے لگی۔ رہائی کے بعد گنگوہ میں آپؒ نے درس وتدریس کا سلسلہ شروع فرمایا ۱۲۹۹ھ میں تیسرے حج کے بعد حضرت گنگوہیؒ نے یہ التزام کیا کہ ایک سال کے اندر اندر پوری صحاح ستہ ختم کرا دیتے تھے۔ معمول یہ تھا کہ صبح سے بارہ بجے تک طلباء کو پڑھاتے تھے۔ آپ کی درس کی شہرت سن سن کر طلباء حدیث دور دور سے آتے تھے۔ کبھی ان کی تعداد ستر اسی تک پہنچ جاتی تھی۔ جن میں ہند وبیرون ہند کے طلباء شامل ہوتے تھے۔ قلب الارشاد حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ طلباء کے ساتھ نہایت محبت وشفقت کے ساتھ پیش آتے تھے۔ درس کی تقریر ایسی ہوتی تھی کہ ایک عامی بھی سمجھ لیتا تھا۔ آپ کے درس حدیث میں ایک خاص خوبی یہ بھی تھی کہ حدیث کے معمول کو سن کر اس پر عمل کرنے کا شوق پیدا ہو جاتا تھا۔ جامع ترمذی کی درسی تقریر، الکوکب الدری، شائع ہو چکی ہے۔ جو مختصر ہونے کے باوجود ترمذی کی نہایت جامع شرح ہے۔

۱۳۱۴ھ تک قطب الارشاد حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ کا درس جاری رہا۔ سو سے زائد حضرات نے آپ سے دورہ حدیث کی تکمیل کی۔ درس حدیث میں آپ حضرت گنگوہیؒ کے آخری شاگرد حضرت شیخ الحدیث مولانا زکریا کاندھلویؒ کے والد ماجد حضرت مولانا محمد یحییٰ صاحب کاندھلویؒ تھے۔ آخر میں نزول الماء کی وجہ سے درس بند ہو گیا تھا مگر ارشاد وتلقین اور فتویٰ کا سلسلہ برابر جاری رہا۔ ذکر اللہ کی تحریص وترغیب پر بڑی توجہ تھی جو

لوگ خدمت میں حاضر ہوتے رغبت آخرت کا کچھ نہ کچھ حصہ ضرور لے کر جاتے تھے ۔اتباع سنت کا نہایت احترام فرماتے تھے۔ ۱۲۹۷ھ میں حضرت نانوتویؒ کی وفات کے بعد دارالعلوم دیوبند کے سرپرست ہوئے۔مشکل حالات میں دارالعلوم کی گھتیوں کو سلجھا دینا حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ کی بڑی خصوصیت تھی۔ ۱۳۱۴ھ میں مدرسہ مظاہر علوم سہارنپور کی سرپرستی بھی قبول فرمائی تھی۔فقہ اور تصوف میں تقریباً چودہ (۱۴) کتابیں تصنیف فرمائیں۔

قطب الارشاد حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ نے شیخ المشائخ حضرت حاجی امداداللہ صاحب مہاجر مکی قدس سرہٗ کی خدمت میں رہ کر بیعت کا شرف حاصل کیا۔اس سلسلے میں حضرت مولانا یعقوب صاحبؒ نے ''سوانح عمری مولانا محمد قاسم نانوتویؒ'' میں لکھا ہے کہ:۔

''جناب مولوی رشید احمد گنگوہیؒ اور مولوی محمد قاسم صاحب سے اسی زمانے میں ہم سبق اور دوستی رہی ہے۔آخر میں حدیث جناب شاہ عبدالغنی صاحبؒ کی خدمت میں پڑھی اور اسی زمانے میں دونوں صاحبوں نے جناب قبلہ حضرت حاجی امداداللہ صاحب دام ظلہ سے بیعت کی اور سلوک شروع کیا۔'' چنانچہ انہوں نے بڑی تیزی سے سلوک کی منزلیں طے کر لیں اور صرف چالیس دن کی قلیل مدت میں خلافت سے سرفراز ہو گئے اور گنگوہ واپس آ کر حضرت شیخ عبدالقدوس گنگوہیؒ کے حجرے میں اپنا قیام گاہ بنایا۔اس دوران میں مطب ذریعہ معاش رہا، ہزاروں افراد کی اصلاح فرمائی۔اور بڑے بڑے نامور علماء ان کے حلقہ ارادت میں شامل ہوئے اسی طرح سے ان کی تلامذہ اور خلفاء ایک وسیع حلقہ بن گیا جن میں سے کئی حضرات تو رشد وہدایت کے آفتاب وماہتاب بن کر چمکے اور پھر ساری عمر اصلاح وتربیت مخلوق خدا میں مصروف رہے۔

حضرت حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی قدس سرہ حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ قدس سرہ کے بارے میں فرماتے ہیں کہ ''قطب الارشاد حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ علم وفضل میں یگانہ روزگار ہونے کے ساتھ زہد وتقویٰ اور سادگی وتواضع وفنائیت میں

بھی انتہا کو پہنچے ہوئے تھے۔ایک مرتبہ قلب الارشاد حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ حدیث کا سبق پڑھا رہے تھے کہ بارش آ گئی۔سب طلباء کتابیں لے کر اندر کو بھاگے مگر حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ سب طلباء کی جوتیاں جمع کر رہے تھے۔کہ اٹھا کر لے چلیں۔لوگوں نے یہ حالت دیکھی تو کٹ گئے۔حضرت تھانوی فرماتے ہیں کہ مولانا رشید احمد گنگوہیؒ کی صحبت میں یہ اثر تھا کہ کیسی ہی پریشانی یا وساوس کی کثرت کیوں نہ ہو۔جوں ہی آپ کی صحبت میں بیٹھے قلب میں ایک خاص قسم کا سکون اور جمعیت حاصل ہوئی۔جس سے سب کدورتیں رفع ہو گئیں اور قریب آپ کے کل مریدوں میں عقائد کی اصلاح، دین کی پختگی، خصوصاً حب فی اللہ و بغض فی اللہ بدرجہ کمال مشاہدہ کیا جاتا۔یہ سب برکت قلب الارشاد حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ کی صحبت کی ہے''۔

حضرت مولانا قاسم نانوتویؒ قدس سرہ نے قطب الارشاد حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ کے تفقہ کے مقام بلند کی بناء پر ''ابو حنیفہ عصر'' کا لقب تھا اور وہ اپنے عہد میں اس لقب سے معروف تھے۔اسی طرح استاد المکرّم امام والعصر علامہ محمد انور شاہ صاحب کشمیری قدس سرہ جیسے بلند پایہ عالم و محقق جو علامہ شامیؒ کو ''فقیہ النفس'' کا مرتبہ دینے کے لئے تیار نہ تھے۔قلب الارشاد حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ کو فقیہ النفس فرمایا کرتے تھے۔بہر حال حضرتؒ کے مقام و مرتبہ اور علم و فضل کا کیا ٹھکانہ؟ قطب الارشاد حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ نے ۹،۸ جمادی الثانی ۱۳۲۳ھ بروز جمعہ ازان کے بعد ۷۸ سال کی عمر میں رحلت فرمائی۔حضرت مولانا قاسم نانوتوی کی وفات کے بعد دار العلوم دیوبند میں یہ سب سے بڑا حادثہ تھا۔حق تعالیٰ شانہ قلب الارشاد حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ کے درجات بلند فرمائیں۔

چند واقعات و کرامات

نماز کا شوق اور غیبی حفاظت

ساڑھے چھ سال کی عمر تھی کہ آپ سے ایک ایسی کرامت حسّیہ اور استقلال و توکل کا

ظہور ہوا کہ جس سے آپ کے مقبول بار کہ احدیت ہونے کا پتا چلتا ہے۔آپ بچپن ہی میں نماز کے پابند تھے۔جمعہ کا قصہ تو گزر ہی چکا۔عام نمازوں کے اوقات کا بھی خیال رکھتے۔ایک دن شام کو ٹہلتے ٹہلتے قصبہ سے باہر نکل گئے وہاں غروب آفتاب کا وقت ہو گیا تو احساس ہوا کہ مغرب کی نماز کا وقت آ گیا۔عباس کے پھولوں کی دو جھڑیاں ہاتھ میں لے کر بسرعت پلٹے پہلے گھر آئے اور والدہ کو جھڑیاں پکڑائیں کہ یہ رکھو میں نماز پڑھنے جاتا ہوں۔جھپٹتے ہوئے مسجد میں داخل ہوئے تو جماعت کھڑی تھی۔وضو کے لئے لوٹوں کی طرف بڑھے تو خالی تھے۔دیر میں اور دیر ہوئی گھبرا کر پانی کھینچنے کے لئے کنویں میں ڈول ڈالا ڈول وزنی تھا گھبراہٹ میں رسی پاؤں میں الجھ گئی تھی ہاتھ پاؤں جماعت کے فوت ہونے کے خدشہ سے پھولے ہوئے ذرا سا جھٹکا لگا اور دھڑام سے کنویں میں گر گئے نمازیوں کو نماز میں احساس ہوا کہ کوئی کنویں میں گر گیا امام صاحب نے جلدی نماز پوری کرائی۔اور تمام نمازی جلد کنویں کی طرف لپکے اب ہر ایک کنویں میں جھانکنے لگا اندر سے آواز آتی ہے...... ”گھبراؤ نہیں میں بہت آرام سے بیٹھا ہوں“ ......قدرت حق تعالیٰ یہ ہوئی کہ ڈول الٹا پانی میں گرا آپ جب گرے تو حواس مجتمع کر کے فوراً اس پر بیٹھ گئے جب آپ کو باہر نکالا گیا تو معلوم ہوا کہ پاؤں کی چھوٹی انگلی میں خفیف سے خراش آئی ہے اور بس ......اب اس قصہ سے استقامت و استقلال اور مصیبت میں نہ گھبرانا۔اطمنان سے نماز ختم ہونے تک بیٹھے رہنا کشائش و فرج من اللہ کا انتظار دوسروں کو اطمینان دلانا خدا پر توکل و اعتماد اور مقدمات نماز میں تکالیف کا ایسا تحمل کہ کلمہ شکایت زبان پر نہ آئے یہ سب باتیں ظاہر کرتیں ہیں کہ ابتداء ہی سے آپ اللہ کی حفاظت و رہنمائی میں فطرت کی راہوں پر چلتے ہوئے عمدہ خصائل و عادات کے حامل تھے۔ (تزکرۃ الرشید)

طلبہ کے جوتے اٹھائے

ایک دفعہ درس حدیث میں بارش شروع ہو گئی طلبہ نے جلدی جلدی کتابیں اور

تپائیاں، کتابیں رکھنے والے چھوٹے چھوٹے میز اٹھائے اور چل دیئے۔اس کے بعد طلبہ نے دیکھا حضرت مولاناؒ نے اپنے کندھے کی چادر میں طلبہ کی جوتیاں ڈالی ہوئی ہیں اور اٹھائے چلے آرہے ہیں۔طلبہ بہت نادم اور حیرت زدہ ہوئے فرمایا کہ:اس میں کون سی بری بات ہے۔تمہاری خدمت کرنا تو میری نجات کا باعث ہے طلبائے دین کے لئے تو حدیث شریف کے الفاظ میں مچھلیاں سمندر میں چونٹیاں بلوں میں دعا کرتی ہیں اور فرشتے تمہارے قدموں کے نیچے اپنے پر بچھاتے ہیں اور تم تو مہمان رسول اللہ ﷺ ہو۔کہ حدیث پڑھنے آئے ہو

حضرت طلبہ کی مدارات اور عزت وتکریم میں ہر وقت کوشاں رہتے اگر کسی کو کوئی غم یا فکر لاحق ہوتا تو صبر وتسلی کے کلمات سے تسکین بخشتے جس طرح ان کے اپنے دل میں طلبہ دین کی عزت تھی چاہتے تھے کہ دوسرے بھی ان کی اسی طرح عزت کریں۔قلب الارشاد حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ کو یہ ہرگز گوارہ نہ تھا کہ کوئی ان کو بانظر حقارت دیکھے۔ایک طالب علم کا کھانا کسی جگہ لگایا ہوا تھا اس کو دیکھا کہ کھانا کھلا ہوا بغیر کسی کپڑے وغیرہ کے لا رہا ہے پوچھا کھانا کہاں مقرر ہے،اس نے آپ کے کسی رشتے دار کا نام لیا فرمایا کہ اچھا وہاں سے کھانا نہ لانا ہمارے گھر سے آیا کرے گا۔ادھر اپنے رشتہ دار سے ناراضگی کے کلمات کہلا بھیجے کہ اس وجہ سے اس کو اس طرح کھانا دیتے ہو کہ یہ پردیسی ہیں ان کو دروازے کا فقیر سمجھا گیا سو کیا مضائقہ ہے''ملک خدا تنگ نیست پائے گدا لنگ نیست''،تم اپنی روٹی اپنے پاس رکھو خدا ان کا اور جگہ انتظام کر دے گا۔وہ عفت مآب عورت جن کے گھر سے کھانا آتا تھا حاضر ہو کر معذرت خواہ ہوئیں اور خطا معاف کروائی اور کہا آئندہ دستر خوان میں کھانا ڈھک کر تعظیم کے ساتھ پیش کیا کروں گی۔آپ نے منظور فرمالیا۔

قطب الارشاد حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ بیک وقت طلبہ کے استاد بھی تھے اور شیخ بھی۔اگر چہ طلبہ آپ سے رسمی بیعت نہ کرتے ہوں تاہم آپ دونوں چیزوں کو ملحوظ رکھ کر طلبہ کی ہر طرح اصلاح وتربیت فرماتے تھے حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ کی زندگی کا مشن

ہی یہ تھا کہ لوگوں کے عقائد و اعمال درست کیے جائیں۔ شرک و بدعت کی رد کی جائے تاہم سبق پڑھتے وقت اس کا بہت زیادہ اہتمام تھا شرک و بدعت کا جگہ جگہ قلع قمع فرماتے۔ توحید واتباع سنت کی ترغیب دیتے صرف زبانی نصیحت پر اکتفا نہ فرماتے بلکہ ضرورت پڑنے پر تیزی اور سختی بھی فرماتے اور اس کے توجہ قلبی اور روحانی فیضان سے تاریک دلوں کو منور کرتے اور زنگ دور فرماتے۔ بعض اوقات طلبہ کا پورے کا پورا حلقہ محو حیرت ہوتا کہ جلسہ کا جلسہ آسمانی سکینت کے نزول کا احساس کر رہا ہے سلوک و معرفت کے حقائق دوران درس بیان فرماتے کہ طلبہ کو وجد آجاتا غرض یہ کہ طلبہ کی ہر طرح دیکھ بھال کرتے ان کی نشست برخاست چال ڈھال گفتار و کردار وضع قطع ہر چیز کا خیال رکھتے۔ اگر کسی طالب علم کو دیکھتے کہ وہ اپنے پڑھے ہوئے عمل پر پیرا نہیں ہے تو جب تک اس میں خوشگوار تبدیلی پیدا نہ ہو جاتی حضرت گنگوہیؒ بے چین رہتے۔

حدیث شریف میں آتا ہے کہ مومن کی فراست سے بچو کہ وہ اللہ کے نور سے دیکھتا ہے حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ طلبہ کی ہر وقت کڑی نگرانی رکھتے تھے۔ اگر کوئی طالب علم ایسا نظر آتا کہ اس کے متعلق یہ محسوس فرماتے کہ اس میں کچھ کجی ہے جو درست نہیں ہو سکتی اور یہ پڑھ لکھ کر لوگوں کو گمراہ کرے گا یا پھر سلسلہ کی بدنامی کا باعث بنے گا تو اس کا سبق شروع نہ کرتے لطائف الحیل سے ٹال دیتے یا روکھا پن دکھاتے کہ وہ خود ہی چلا جائے۔ ہاں جس طالب علم کو سعید پاتے تو اس کی دلداری فرماتے۔ بیٹوں کی طرح عزیز رکھتے۔

پہلا حج اور کرامات کا ظہور

قطب الارشاد حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ کے دن بڑی غربت اور تنگ دستی میں گزرے تھے۔ لیکن حرمین شریفین کی حاضری کے لئے آب ماہی بے آب کی طرح تڑپتے رہے لیکن صورت حال یہ تھی کہ آپ کی اقتصادی حالت اس قدر کمزور تھی کہ بمشکل اہل وعیال کی گزران ہوتی تھی بلکہ یہاں تک کہ حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ کی خواہش یہ ہوتی کہ جس

حال میں پڑا ہوں اسی گمنامی و گوشہ نشینی کی حالت میں پڑا رہوں کسی آنکھ یا کان کو اس کی خبر نہ ہو ۔ان حالات میں حرمین شریفین تک آنا جانا کیسے ہو؟ لیکن جب طلب سچی ہو تو اللہ تعالیٰ اسباب پیدا فرما دیتے ہیں، ڈپٹی عبدالحق رامپوری کا قصد حج ہوا اور انہوں نے اپنے اہل وعیال اور متعلقین و وابستگان کا ایک جم غفیر ساتھ لے جانا چاہا حکیم ضیاء الدین صاحب رامپوری جو حضرت حافظ شہید سے خلیفہ مجاز تھے ۔ڈپٹی صاحب کے احباب میں سے تھے ۔ڈپٹی صاحب نے حکیم صاحب کو بھی ساتھ لیا حکیم صاحب قلب الارشاد حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ کے عشاق میں سے تھے۔ کیونکہ انہیں علم تھا کہ میرے پیر و مرشد نے حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ کے زانوں پر جام شہادت نوش فرمایا تھا حکیم صاحب نے قلب الارشاد حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ کا ذکر کیا تو ڈپٹی صاحب بلا ادنیٰ تامل مان گئے بلکہ اس پر خوشی کا اظہار کیا کہ یہ تو ہماری خوش قسمتی ہے کہ حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ جیسا محبّ رسول متبع سنت ہمارے قافلے میں شریک ہو۔ مولوی ابو النصر حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ کے ماموزاد بھائی جو حضرت کے بچپن کے ساتھ اور جان نثار رفیق تھے ان کو جب علم ہوا کہ مولانا سفر حج پر جا رہے ہیں تو انہوں نے اپنا اثاثہ اونے پونے بیچ کر معہ اہلیہ معیت اختیار کی ۔ان دنوں سفر حج انتہائی دشوار تھا۔اور فرائض حج کی ادائیگی سب فرائض سے مشکل تھی ۔ایسا بھی ہوتا کہ دخانی کشتیاں تین تین چار چار ماہ سمندر میں ہچکولے کھاتی رہتیں۔قطب الارشاد حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ کے سفر میں سخت طوفان آیا تمام مسافر گھبرا گئے ۔مگر حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ نہایت پرسکون تھے لوگوں کی گھبراہٹ پر انہیں یہ کہہ کر تسلی دی کہ ''بھئی کوئی مرے گا تو ہے نہیں، ہم تو کسی کے بلائے ہوئے جا رہے ہیں خود نہیں جا رہے'' اور جہاز جب اصلی حالت پر آیا تو کپتان نے گھڑی دیکھ کر بتایا کہ اللہ تعالیٰ نے اس طوفان کی وجہ سے ہمیں آٹھ دن کی مسافت تین دن میں طے کرا دی ہے۔

دوسرا حج ......قطب الارشاد حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ نے دوسرا حج ۱۲۹۴ھ بھی کیا۔اور اس سفر حج میں اللہ کے ایسے ایسے نیک بندوں نے شرکت کی کہ شاید

ہندوستان میں اس سے پہلے اور اس کے بعد کی نظیر نہ مل سکے حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ حضرت مولانا محمد یعقوب نانوتویؒ، حضرت مولانا محمد رفیع الدین صاحب مہتمم دورالعلوم دیوبند، شیخ الہند مولانا محمد حسن حکیم ضیاء الدین صاحب، مولانا محمد مظہر صاحبؒ، بانی مظاہر العلوم سہارنپور کے علاوہ تقریباً سو بڑے بڑے عالم وفاضل اس قافلے میں شریک تھے۔اس سفر کی پورے ملک میں شہرت ہوگئی۔لہٰذا گھر سے لے کر ساحل تک ہر جگہ فقید المثال استقبال ہوا۔ایسے صلحاء علماء کے سفر حج پر اللہ تعالیٰ کے انوار وتجلیات کی جو بارش ہوئی ہوگی اس کی کون اندازہ لگا سکتا ہے حضرت حاجی صاحب کو اطلاع مل چکی تھی۔لہٰذا اعلیٰ حضرت باوجود ضعف ونقاہت اور پیرانہ سالی کے مکہ معظمہ سے باہر استقبال کے لئے نجانے کتنی دیر سے انتظار کر رہے تھے۔قافلے کے آنے پر ہر ایک سے مصافحہ کیا۔اور سب کو تقریباً اپنے پاس ٹھہرایا ۱۲۹۵ھ میں واپسی ہوئی۔

تیسرا حج ......۱۲۹۹ھ میں قطب الارشاد حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ نے تیسرے حج کا دفعۃً ارادہ کیا اور ایسے وقت میں کیا کہ بظاہر حج کے دنوں میں پہنچنا مشکل تھا ۴ ذی قعدہ کو گنگوہ سے روانہ ہوئے بمبئی سے جب جہاز چلا ہے تو چودہ روز حج میں باقی تھے خدا کا فضل شامل حال تھا۔نویں دن جدہ پہنچ گئے حالانکہ آج کے تیز رفتار وقت میں بھی چھ روز میں کراچی سے جدہ پہنچا جاتا ہے اور بمبئی سے کراچی کی نسبت جدہ زیادہ دور ہے۔کامران میں قرنطینہ کے لئے جہاز کا ٹھہرنا اشد ضروری تھا لیکن غیبی کشش کی بناء پر جہاز کشاں کشاں چلتا رہا اور باوجود کامران میں رکنے کی ہدایت کے نہ رکا جس کی وجہ سے جہاز کو تین ہزار روپے جرمانہ ادا کرنا پڑا۔قلب الارشاد حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ جب مکہ پہنچتے ہیں تو اگلے دن ارکانِ حج شروع ہوگئے۔

ایک گنگوہ کے شخص اس سال کے حج کے لئے روانہ ہوئے مگر قلب الارشاد حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ کو خواہش کے باوجود پہلے چل دئے اور واپس میں بھی جلد نکلے نتیجہ یہ نکلا ایک ماہ قرنطینہ کے لئے راستے میں ٹھہرنا پڑا خرچ بھی زیادہ ہوا اور وقت بھی زیادہ لگا

قلب الارشاد حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ کا جہاز نہ آتے ہوئے رکا اور نہ جاتے ہوئے، حضرت گنگوہیؒ کا تیسرا حج آخری حج تھا۔اس کے بعد سفر حج کا اتفاق نہیں ہوا بالاستقلال تعلیم و تعلم میں مشغول ہو گئے۔

حوادثات اور صدمات پر صبر

دنیاوی حوادثات وصدمات قلب الارشاد حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ صبر کرنے میں کوہ استقلال تھے۔ایک دفعہ تھوڑے ہی عرصہ میں آپ کے پانچ عزیز آپ کا نواسہ، بیٹا ،مرحوم بیٹے کی بیوی شیر خوار بچہ چھوڑ کر اور نواسی کے بعد دیگرے فوت ہو گئے لیکن قلب الارشاد حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ نے ایسا کمال صبر کا مظاہرہ کیا کہ لوگ انگشت بدنداں تھے۔ان کا کبھی تزکرہ نہ کرتے۔زندگی میں تین واقعات ایسے ہیں کہ جن سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے جانے والوں کا ذکر کیا ہے ایک مرتبہ مولانا یحییٰ کاندھلوی (قلب الارشاد حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ ان کے نہایت درجہ مشفق ومہربان تھے) سے ایک موقع کی مناسبت سے فرمایا''مولوی یحییٰ،تمہاری عقل کو ہیضہ تو نہیں ہو گیا''ان کے جانے کے بعد حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ دوسرے ساتھیوں سے فرمانے لگے کہ میں نے مولوی یحییٰ کو ویسے ہی کہہ دیا ورنہ ہمارے گروہ میں سبھی ان کو عقل مند مانتے ہیں۔انہوں نے اسباتاً جواب دیا تو فرمایا......مزاج دانی تو مسعود احمد کی ماں ہی کو تھی......اس سے قارئین یہ خیال نہ فرمائیں کہ شاید حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ کو ان حوادث کا صدمہ ہی نہیں ہوا۔صدمہ تو ہر انسان کو ہوتا ہے مگر حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ اظہار نہیں فرماتے تھے۔بس اتنا ہی اظہار ہوتا جتنا سنت سے ثابت ہوتا ہے......ورنہ صدمہ تو بہت ہوتا تھا۔ایک مرتبہ فرمایا کہ......محمود احمد (بیٹے کی وفات) نے میری کمر توڑ دی......حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ کے ایک خادم مولوی رحمت اللہ پانی پتیؒ اپنے خطوں میں ہمیشہ محمود احمد کو سلام لکھتے۔آخر دو سال کے بعد امام ربانی نے ان کے خطوط کے جواب میں یوں تحریر فرمایا'' آپ خط میں حافظ مسعود احمد کو

سلام لکھا کریں۔ حافظ محمود احمد مرحوم دو (۲) سال ہوئے کہ اس عالم سے رحلت فرما کر مجھ ناکارہ کو پریشان وحیران کر گئے ہیں۔ جب تم اس کو سلام لکھتے ہو مجھ کو بے قراری ہو جاتی ہے۔ آئندہ اس کا نام مت لکھنا۔"

حرمین اور اس کے متعلقات سے محبت

انسان کو جس کسی کے ساتھ محبت ہوتی ہے اس کے تمام متعلقات سے محبت ہو جاتی ہے۔ حضرت امام ربانیؒ کے دل میں حق تعالیٰ شانہ اور جناب رسول اللہ ﷺ کی محبت از حد راسخ تھی۔ اس لئے حرمین شریفین کے خس وخاشاک تک کو آپ محبوب سمجھتے اور سر آنکھوں پر رکھتے تھے۔ مدینے کی کھجوروں کی گٹھلیاں پسوا کر رکھتے اور ان کو کبھی کبھی پھانکا کرتے تھے۔ ایک مرتبہ فرمایا کہ "لوگ زمزم کے ٹینوں اور گٹھلیوں کو یونہی پھینک دیتے ہیں یہ نہیں خیال کرتے کہ ان چیزوں کو مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ کی ہوا لگی ہے"۔ ایک مرتبہ مدنی کھجور کی گٹھلی پسی ہوئی حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ نے مولانا عاشق الٰہی کو دی اور فرمایا کہ اس کو پھانک لو۔ اور ایک دفعہ مدینۃ الرسول کی مٹی عطا فرمائی کہ اسے کھالو۔ انہوں نے عرض کیا کہ حضرت مٹی کھانا تو حرام ہے آپ نے فرمایا "میاں وہ مٹی اور ہوگی۔" اگر کوئی مدینہ منورہ یا مکہ معظمہ سے آپ کے لئے کوئی تبرک یا تحفہ لاتا تو حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ اس کو اس قدر خوشی سے قبول کرتے کہ ہدیہ دینے والے کا جی خوش ہو جاتا اور آپ فوراً ہی تمام حاضرین میں اس کو تقسیم فرما دیتے اور اگر کوئی شخص کوئی چیز مانگ لیتا تو فوراً ہی اسے عطا فرما دیتے اور خوش ہوتے۔ ایک دفعہ ایک شخص نے تسبیح مانگی۔ حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ کے پاس بیش قیمت تسبیح تھی۔ ان کے حوالے کی اور فرمایا "پڑھتے رہنا ایسا نہ ہو کہ ویسے ہی رکھی ہوئی سجے"۔ حضرت امام ربانی کا جی چاہتا تھا ہر شخص حرمین شریفین سے اور وہاں سے آئی ہوئی چیزوں سے اسی طرح محبت و پیار رکھے جس طرح خود ان کو تھا۔ ایک مرتبہ مولانا محمد اسماعیل کو موم بتی کا ذرا سا ٹکڑا عنایت فرما کر کہا کہ اسے نگل جاؤ اور ایک بار غلاف کعبہ کے ریشم کا

ایک تار ایثار کیا اور کہا اس کو کھالو۔

نماز میں خشوع وخضوع کا منظر

حق تعالیٰ کی عظمت اور جلالۃ شان چونکہ آپ کی رگ رگ میں پیوست تھی اس لئے قرآن مجید کی تلاوت کے وقت حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ پر اکثر حالت کا غلبہ ہوتا، اور اگر اغیار سے مجلس خالی ہوتی تو اس کا اظہار بھی ہو جاتا تھا، آخری شب میں خالی مکان کے اندر حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ آقا کے حضور میں دست بستہ کھڑے ہوتے اور نوافل میں قرآن مجید شروع فرماتے تو عموماً آپ پر گریہ طاری ہو جاتا اور پڑھتے پڑھتے رک جاتے تھے سسکیاں آپ کا حلق تھام لیتیں اور بکاء پر مجبور کرنے والی حالت حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ ساکت وصامت بنا دیا کرتی تھی، آنکھوں سے آنسو بہتے ہیں اور رخسار ولحیہ پر گزرتے ہوئے موتیوں کی طرح مصلے پر گرا کرتے تھے، مولوی عبد الرحمٰن صاحب خورجوی کہتے تھے کہ ایک مرتبہ میں گنگوہ میں حاضر ہوا۔ رمضان کا مہینہ تھا اور تراویح میں کلام اللہ حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ ہی سنایا کرتے تھے، ایک شب آپ نے تراویح شروع کی ، میں بھی جماعت میں شریک تھا، قرآن مجید پڑھتے پڑھتے آپ اس رکوع پر پہنچے جس میں خوف وخشیت دلایا گیا تھا، جماعت میں حالانکہ نصف سے کم عربی زبان سمجھنے والے تھے ، اور باقی سب ناواقف، مگر آپ کے اس رکوع کی قرأت پر خوف کا اثر سب پر پڑ رہا تھا، کوئی روتا تھا اور کسی کے بدن پر لرزہ، اس رکوع کے بعد جب آپ نے دوسرا رکوع شروع کیا تو اس میں رحمت خداوندی کا بیان تھا، اس وقت دفعۃً تمام جماعت پر سرور طاری ہو گیا اور پہلی حالت یکلخت منقلب ہو گئی فرحت وانبساط کے ساتھ یہاں تک کہ بعض مقتدی ہنسی ضبط نہ کر سکے۔ (تذکرہ الرشید)

نماز بیٹھ کر کبھی نہیں پڑھی

اپنے معاملہ میں آپ کا تقویٰ واحتیاط اس قدر تھا کہ مسئلہ مختلف فیہا میں قول راجح

اور اقرب الی الاحتیاط کو اختیار فرمایا کرتے تھے باوجود ضرورت کے احتیاط کو ہرگز نہیں چھوڑتے تھے، حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ کی احتیاط کی ادنیٰ مثال یہ ہے کہ آپ نے اپنے امراض میں کیسا ہی شدید مرض کیوں نہ ہو کبھی بیٹھ کر نماز نہیں پڑھی۔ مرض الموت میں جب تک اس قدر حالت رہی کہ دو آدمیوں کے سہارے سے کھڑے ہو کر پڑھ سکیں اس وقت اس طرح پڑھی کہ دو تین آدمیوں کو بمشکل اٹھایا اور دونوں جانبوں سے کمر میں ہاتھ ڈال کر لیکر کھڑے ہو گئے اور قیام، رکوع اور سجود ان ہی کے سہارے نماز ادا کی، ہر چند خدام نے عرض کیا کہ حضرت بیٹھ کر نماز ادا کر لیجئے، مگر نہ کچھ جواب دیا نہ قبول فرمایا، ایک روز مولوی محمد یحییٰ صاحب نے عرض کیا کہ حضرت! اگر اس وقت بھی جائز نہیں تو پھر وہ کون سا وقت اور کون سی حالت ہوگی جس میں بیٹھ کر نماز پڑھنا شرعاً جائز ہے؟ حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ نے فرمایا کہ امام صاحب کے نزدیک قادر بقدرۃ الغیر قادر ہوتا ہے، اور جب میرے دوست ایسے ہیں کہ مجھ کو اٹھا کر نماز پڑھاتے ہیں تو میں کیونکر بیٹھ کر نماز پڑھ سکتا ہوں، آخر نوبت ضعف اس قدر پہنچ گئی کہ دوسروں کے سہارے بھی کھڑے ہونے کی قدرت نہ رہی تو اس وقت چند وقت کی نمازیں حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ نے بیٹھ کر پڑھیں۔ (تذکرۃ الرشید)

حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ

حکیم الامت مجدد ملت حضرت اقدس مولانا اشرف علی تھانویؒ قدس اللہ سرہ کی شخصیت اور ذات گرامی کسی تعارف کی محتاج نہیں ہے۔ حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ کی ذات والا صفات یگانہ روزگار اور ''آفتاب آمد دلیل آفتاب'' مصداق ہے۔

حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ شریعت و طریقت کے مجمع البحرین، جامع علم و عرفان اور دینی بصیرت و فقاہت، تقویٰ و طہارت کے درجہ کمال پر فائز تھے۔ حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ کے علم و فضل اور زہد و تقویٰ کو دیکھ کر اسلاف کرام کی یاد تازہ ہو جاتی تھی۔ حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ بجا طور پر سلف صالحین کے

علوم وفیوض کے امین اور وارث تھے ۔حضرتؒ کی کیمیا اثر صحبت اور بابرکت تعلیمات سے ہزارہا بندگان خدا کو یقین ومعروف کی لازوال دولت میسر آئی اور بہت سے تشنگان معروف کو اس چشمہ عرفان سے سیرابی وشادابی ہوئی۔

معاملات ومعاشرات ،سیاست عقائد وعبادات غرض کہ دین کا کوئی شعبہ ایسا نہیں جس میں حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ قدس سرہ کی گراں قدر تجدیدی خدمات موجود نہ ہوں اور دین کا کوئی گوشہ ایسا نہیں ہے جس کے بارے میں حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ نے تجدید واصلاح نہ کی ہوں ۔ ہر شعبہ میں حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ کی تصانیف موجود ہیں ۔تفسیر ،حدیث ،فقہ،تصوف وسلوک ،قرآت ومجموعہ،منطق وفلسفہ وغیرہ تمام علوم وفنون میں حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ حکیم الامت قدس سرہ کی مجددانہ اور حکیمانہ تحقیقات عصر حاضر کا بے مثال منفردانہ ،مصلحانہ عظیم الشان کارنامہ ہے۔ حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ قدس سرہ کی ذکاوت وذہانت کے آثار بچپن ہی سے نمایاں تھے۔ حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ نے ۱۲۹۹ھ میں دارالعلوم دیوبند سے فراغت حاصل کی تھی اور حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب سے حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ زیادہ مستفید ہوئے ہیں ۔ پھر حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ ۱۳۰۱ھ میں مدرسہ فیض عام کانپور میں صدر مدرس مقرر ہوئے اور پھر مدرسہ جامع العلوم کی مسند صدارت کی زینت بخشی۔ کانپور میں حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ کے درس حدیث کی شہرت سن کر دور دراز سے طلبہ کھنچے چلے آتے تھے ۔ ۱۳۱۵ھ میں اپنے شیخ حضرت حاجی امداداللہ تھانوی مہاجر مکی قدس سرہ کی خانقاہ امدادیہ تھانہ بھون میں توکلا علی اللہ قیام فرمایا۔ جہاں تادم واپسیں ۴۷ سال تک تبلیغ دین ،تزکیہ نفس اور تصنیف وتالیف ایسی شاندار اور گراں قدر خدمات انجام دیں جس کی مثال اس دور کے کسی دوسری شخصیت سے نہیں ملتی۔ علم نہایت وسیع اور گہرا تھا جس کا ثبوت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ کی تصانیف کا ہر ہر صفحہ دے سکتا ہے ۔ حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ کی تصانیف مواعظ سے لاکھوں افراد کی علمی وروحانی فیض پہنچا۔ اس کے ساتھ ساتھ

بیعت وارشاد کی راہ سے عوام وخواص کا جتنا بڑا حلقہ حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ سے مستفیض ہوا اس کی مثال بھی کم ہی ملے گی۔ حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ کی رفعت وبلندی کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ ہندو پاک کے بڑے بڑے صاحب علم وفضل اور اہل کمال وتقویٰ حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ کے حلقہ بیعت میں شامل تھے۔ حضرت والاؒ کی ذات اقدس علم وحکمت اور معرف وطریقت کا ایک ایسا سرچشمہ تھی جس سے نصف صدی تک برصغیر کے مسلمان سے سیراب وشاداب ہوتے رہے۔ دین کا کوئی شعبہ ایسا نہیں جس میں حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ کی عظیم خدمات تقریری وتحریری صورت میں نمایاں نہ ہوں۔

حضرت مولانا سید سلیمان ندویؒ کے الفاظ میں اصلاح امت کی کوشش میں علمی و عملی زندگی کے ہر گوشے پر حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ کی نظر تھی۔ بچوں سے لے کر بوڑھوں تک، عورتوں سے لے کر مردوں تک، جاہلوں سے لے کر عالموں تک، عامیوں سے لے کر صوفیوں تک، درویشوں اور زاہدوں تک، غریبوں سے لے کر امیروں تک، حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ کی نظر مصروف اصلاح وتربیت رہی۔ پیدائش، شادی بیاہ، غمی اور خوشی، اور دوسری تقریبوں پر اور اجتماعوں تک کے احوال پر ان کی نظر پڑی اور شریعت کے معیار پر جانچ کر ہر ایک کھرا کھوٹا الگ کیا۔ رسوم وبدعات اور مفاسد کے ہر روڑے اور پتھر کو ہٹا کر صراطِ مستقیم کی راہ دکھائی۔ تبلیغ، تعلیم، سیاست، معاشرت، اخلاق وعبادات اور عقائد میں دین خالص کے معیار سے جہاں کوتاہی نظر آئی، اس کی اصلاح کی، فقہ کے نئے نئے مسائل اور مسلمانوں کی نئی نئی ضرورتوں کے متعلق اپنے نزدیک پورا سامان مہیا کر دیا اور خصوصیت کے ساتھ احسان وسلوک کی جس کا مشہور نام تصوف ہے تجدید فرمائی۔ حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ کے سامنے دین کی صحیح تمثال تھی۔ اسی کے مطابق مسلمانوں کی موجودہ زندگی کی تصویر میں جہاں جہاں نقائص تھے ان کے درست کرنے میں عمر بھر مشغول رہے۔ انہوں نے اپنی زندگی اس میں صرف کر دی کہ مسلمانوں کی تصویر حیات کو اس شعبہ

کے مطابق بنادیں جو دین حق کے مرقع میں نظر آتی ہے۔

میری زندگی کی ساخت و پرواخت میں بھی حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ قدس سرہ کا بہت بڑا حصہ ہے۔ احقر کی عمر کا بڑا حصہ حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ کے ہاں آتے جاتے گزرا۔ مسائل دینیہ میں ان کی بیدار مغزی، حکیمانہ تنقیحات، معاشرتی معاملات میں غیر معمولی ضبط و نظم ان کا وسیع عمیق علم، ان کی سینکڑوں تصانیف، ان کی محبت و برکت اور حکیمانہ انداز تربیت نے زندگی کے بہت بڑے بڑے سبق سکھائے۔ حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ کو اللہ رب العزت نے مرجع خلائق بنایا تھا آج بھی ان کی تصانیف اور ان کے خلفائے کرام، شریعت وطریقت کے میدان میں ایسی ایسی خدمات انجام دے رہے ہیں۔ اس دور میں حرام وحلال کا اور جائز وناجائز کا اہتمام، کم ہی ملتا ہے۔ جتنا کہ حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ کے یہاں تھا۔ حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ کے والد مرحوم کے انتقال کے بعد جائیداد ملی اس کے متعلق حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ نے سرکاری کاغزات ودستاویزات ترکہ سے اپنے از سر نو تحقیقات فرمائی اور اپنے شہر اور دوسرے شہر کے رہنے والے جس شخص کے متعلق ذرا سا بھی معلوم ہوا کہ اس کا ذرا سا بھی کوئی حق اس جائیداد میں ہے پورے اہتمام کے ساتھ اس کا حق پہنچا دیا۔ غرضیکہ حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ نے اپنی تحریر، تعلیم وتبلیغ سے لاکھوں مسلمانوں کو علمی وعملی فیض پہنچایا اور ہزاروں مسلمانوں کی باطنی اصلاح فرمائی۔ حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ اور ان کے تلامذہ خلفاء ملک کے ہر ہر خطے میں پھیلے اور ہدوستان کا کوئی گوشہ نہیں چھوڑا کہ سفر کر کے وعظ وتبلیغ نہ فرمایا ہو، تصنیف وتالیف کے ذریعے ہر علم وفن میں حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ نے ہزار سے زائد تصانیف ورثہ میں چھوڑی اور اصلاح وتربیت کا کام اپنے خلفاء ومتوسلین کے حوالے کر کے ۱۶ رجب المرجب ۱۳۶۲ھ کی شب میں تھانہ بھون میں اس جہاں فانی کو خیر باد کہا اور حافظ ضامن تھانوی شہیدؒ کے مزار کے قریب انہیں کے باغ میں جسے انہوں نے خانقاہ امداد یہ کے نام سے وقف کر دیا تھا محو آرام ہوئے۔ حق تعالیٰ حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ کے

درجات بلند فرمائے۔

حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ کا ضبط اوقات و تنظیم کار

ایک سچے مومن ہی کی زندگی نظم وضبط کا بہترین نمونہ ہوسکتی ہے۔ حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ کی مجدّدانہ شان کا یہ وصف بھی بہت ممتاز ہے۔ حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ نے خارجی زندگی اور داخلی زندگی کا ایسا نمونہ پیش کیا کہ دنیا نے دیکھ لیا کہ اہل حق ایسے بھی ہوتے ہیں اور اہل فہم نے سمجھ لیا کہ مصلحانِ دین ایسے ہی ہوتے ہیں۔ بعض کم عقلوں نے اعتراض کیا کہ یہ تو بالکل انگریزیت ہے کہ ملنے کے اوقات مقرر ، گفتگو کے طریق متعیّن۔ لیکن ان کے متعلق اس کے سوا کیا کہا جائے۔

ع بریں عقل ودانش بباید گریست

کیونکہ بغیر اس اصولی زندگی کے نہ خود کو راحت میسر آسکتی ہے نہ غیر کو۔ نہ اپنی صلاحیتوں سے استفادہ ممکن ہے نہ غیر کی تربیت واصلاح نہ اپنی صحت وتوانائی برقرار رہ سکتی ہے نہ اس کی افادیت۔ اسی لئے خانقاہ امدادی میں ان زریں اصولوں کو جن کے ماخذ بہر حال اسوۂ وارشادات رسول کریم ﷺ ہی تھے پائمال نہیں کیا جاسکتا تھا۔

خارجی زندگی

حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ کے اوقات اس طرح بٹے ہوئے تھے۔ صبح سے بارہ بجے تک اور نماز عصر سے عشاء تک کے اوقات اپنی انفرادی امور مثلاً تصنیف وتالیف وغیرہ کے لئے مختص تھے۔ البتہ اس میں یہ استثنیٰ تھی کہ نو وارد جو پہلی بار ملاقات کرنا چاہے، جو رخصتی ملاقات کا طالب ہو۔ وہ جس کو کوئی فوری ضرورت لاحق ہو۔ ۱۲ بجے سے نماز ظہر تک بالکل تنہائی اور قیلولہ کا وقت تھا اور اس میں کوئی استثنا نہ تھا۔ نماز ظہر وقیلولہ سے فراغت کے بعد نماز عصر تک عام مجلس ہوتی تھی جس میں ہر شخص شریک ہوسکتا تھا اور بات چیت کرسکتا تھا۔ پھر بعد نماز عشاء کسی سے نہ ملتے لیکن یہ تو ان کے لئے ہوا جو برملا اپنا مدعا ظاہر کرسکتے

تھے .راز اور تنہائی کے طالبوں کے لئے اصول یہ تھا کہ سہ دری میں آویزاں لیٹر بوکس کے اندر یا تو اپنا مدّ عا لکھ کر ڈال دیں یا اس کے عرض کرنے کے لئے تعیّن وقت چاہیں ۔اور ہر دوصورتوں میں اپنا پتہ ضرور لکھ دیں (یعنی خانقاہ کے کس کمرے میں مقیم ہیں) تا کہ جواب بآسانی وہاں پہنچ جائے ۔نہ سائل کو تکلیف ہو نہ مسئول کو۔خانقاہ امدادیہ کا یہ بھی اصول تھا کہ کوئی شخص بلا اجازت صاحبِ خانقاہ کی خدمت نہ کرے کوئی اس کے ہمراہ اور نہ راستے میں ان سے مصافحہ کرے۔خود اپنے کام میں مشغول رہے اور حضرت شیخ کو اپنے امور مشاغل میں آزاد رکھے۔

چونکہ پڑھے لکھے اور غیر تعلیم یافتہ ،آداب سے واقف اور بے ادب سب ہی طرح کے لوگ آتے تھے اور ہر ایک کو بار بار تنبیہ میں کافی وقت ضائع ہونے کا امکان تھا۔اس لئے صحیح تعارف حاصل کرنے کے لئے حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ نے ایک جدول بنا رکھا تھا تا کہ اس کے مطابق خانہ پُری کر کے حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ کو دے دیں ۔اس کے عنوان یہ تھے :۔(۱) نام ،(۲) وطن اصلی ،(۳) اس وقت کس مقام سے آنا ہوا ،اور وہاں کی مدت قیام ،(۴) شغل وذریعہ معاش ،کوئی موروثی زمین کے مالک تو نہیں ،(۵) علمی استفادہ اردو.عربی.انگریزی کس قدر ہے ،(۶) آنے کا اصلی مقصد کیا ہے محض ملاقات یا کچھ کہنا بھی ،لکھ کر دینا یا زبانی ،مجمع میں یا تنہائی میں ،(۷) کسی سے بیعت ہیں یا نہیں ،اگر ہیں تو کس سے؟ (۸) اگر مجھ سے بیعت ہیں تو کتنا عرصہ ہوا؟ تعلیم کس سے متعلق ہے ۔(۹) میرے مواعظ ورسائل کیا کیا دیکھتے ہیں؟ اگر (۱۰) مجھ سے کچھ خط وکتابت ہوئی ہے وہ پاس ہیں یا نہیں؟ اگر ہے تو دکھائیں ،(۱۱) کتنا قیام ہوگا (۱۲) کہاں قیام ہوگا ۔(۱۳) خانقاہ میں پہلی مرتبہ آنا ہوا یا پہلے بھی آئے ہیں (۱۴) یہاں کے انتظام طعام کی خبر ہے یا نہیں (۱۵) باہر والا بڑا قلمی اعلان دیکھ لیا یا نہیں ؟ (یہ وہی اعلان ہے جس میں حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ کے اوقات فراغت ومصروفیت کی تفصیل ہے) اس کے علاوہ ہر ہر طبقہ کے افراد کے لئے اصول وضوابط متعین تھے اور سب میں یہی روح کارفرما تھی کہ مرشد ومرید

دونوں کو راحت حاصل رہے۔ تضیع اوقات نہ ہو اور بے جا اختلاط نہ رہے۔ اب کوئی بتائے کیا بغیر اس نظم وضبط کے مجدد الملت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ وہ کچھ کر سکتے تھے جو انہوں نے کر دکھایا۔ سینکڑوں کتابوں اور رسالوں میں حقائق ومعارف کے ذخائر جمع فرماتے ہزاروں خطوط کے گراں بہا جواب لکھے سینکڑوں مواعظ کے ذریعے رشد وہدایت کے دریا بہائے ان گنت ملفوظات کے ذریعہ طریقت کے عقدے کھولے۔ ہزاروں تشنگان حبِ الٰہی کو سیراب کر گئے یہ سب اسی اصول زندگی کا نتیجہ تھا۔

داخلی زندگی

وعظ وپند، اصول وضوابط صرف اغنیاء کے لئے نہ تھے۔ گھر کی نجی زندگی میں بھی حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ پر نگاہ رکھی جاتی تھی۔ البتہ ہر موقع ومقام کے لحاظ سے اصول بھی جدا تھے اور ہونے بھی چاہئیں۔ حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ کی دو (۲) ازدواج مطہرات تھیں۔ اس لئے جو بھی نقد یا جنس کی صورت میں آتا مساوی مساوی کر کے اپنے ہاتھ سے تقسیم فرماتے غیرت کا یہ عالم تھا کہ دونوں کے مہر ادا کر دئے تھے اور باوجود فریق ثانی کی طرف سے واپس لینا گوارہ نہ فرمایا۔ حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ سخت گیر نہ تھے۔ کبھی گھر والوں سے تکلف وتحکم کا برتاؤ نہ کرتے بلکہ ہمیشہ لطف وکرم سے پیش آتے اور بہت ہشاش بشاش رہتے تھے۔ اپنی ازواج کے مہمانوں کی پوری مدارت کرتے اور ان کے بچوں سے خوب مزاح فرماتے تھے۔ اہل خانہ پر حتی الامکان کوئی بوجھ نہ ڈالتے تھے حتیٰ کہ کسی خاص کھانے کی فرمائش نہ کرتے البتہ جب خود ادھر سے فرمائش کرنے کا اصرار ہوتا تو اس میں بھی ایسا اسلوب اختیار کرتے کہ ان کی دل شکنی نہ ہو، نہ ان پر بار پڑے۔ فرماتے "تم ہی چند کھانوں کے نام لو جو بآسانی پک سکیں ان میں سے جو مرغوب ہوگا بتا دوں گا"۔ باوجود کثرت مشاغل کے گھر پابندی سے تشریف لے جاتے تھے تاکہ ان کی دل آزاری نہ ہو۔ ان کی بیماریوں پر پوری فراغ دلی سے روپیہ خرچ فرماتے اور ضرورت ہوتی تو دور دراز

مقامات پر خود لے جا کر علاج کرواتے تھے۔ اس طرح تعلق مع اللہ کے بہانے حقوق تلفی کبھی نہ ہونے دیتے تھے یہ تو ان لوگوں کا شعار ہے جو سنت رسول ﷺ سے نا آشنا ہوتے تھے جن کے نزدیک عبادت و تعلق مع اللہ کا رشتہ اتنا نازک ہے کہ مسجد خانقاہ کے باہر قدم رکھتے ہی تار تار ہو جاتا ہے۔ حالانکہ اتباع سنت کے تحت ہر فعل جو مسجد و خانقاہ میں ہو یا گھر اور بازار میں ہو عین عبادت اور ترقی قرب کا موجب ہے اور یہی صفت ''بے ہمہ و باہمہ'' کمال کی دلیل ہے۔

حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ نے تو دو عقد کر کے عدل و انصاف کی وہ نظیر قائم کی کہ اب لوگوں کے لئے عقد ثانی کی جرأت مشکل ہو گئی۔ حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ خود فرماتے تھے۔ ''میں تو ایک کی باری میں دوسری کا خیال لانا بھی خلاف عدل سمجھتا ہوں۔ کیونکہ اس سے اس طرف توجہ میں کمی ہو گی۔ اور وہ اس کی حق تلفی ہے۔ اب میں اپنے کپڑے خانقاہ ہی میں رکھتا ہوں۔ کیونکہ اگر میں ایک گھر میں کپڑے رکھتا تو دوسرے گھر والوں کو شکایت ہوتی کہ ہمارے ساتھ اتنی خصوصیت نہیں جتنی دوسری کے ساتھ ہے''۔ حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ کے اس شعار کو غور سے دیکھو اور جان لو کہ دین داری میں معاشرت ،معاملات و اخلاق اتنے ہی مہتم بالشان ہیں جتنے عقائد و عبادات، تکمیل دین کے لئے ان پانچوں پہلوؤں پر یکساں عمل ضروری ہے۔ حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ کو رنج ہوتا جب شوہروں کے ظلم و ستم کی روایتیں حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ تک پہنچتیں۔ حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ ہر ایک کو اپنی بیویوں پر مہر و کرم، عضوو درگزر اور پاس مروت کی تلقین فرماتے تھے۔

کچھ واقعات و کرامات

جہاں تم جاؤ گے، وہاں تم ہی تم ہو گے

حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ نے فرمایا کہ ہمارے زمانہ میں چودہ

طلبہ دورۂ حدیث میں تھے۔ دستار بندی کی تجویز ہوئی یہ دارالعلوم دیوبند کا دوسرا جلسہ تھا ہمیں بھی پگڑی باندھنے کا اردہ کیا۔ تو ان چودہ طالب علموں نے آپس میں مشویہ کیا کہ جلسہ کو رکوانے کی کوشش کرنی چاہیے کیونکہ ہم امیوں کو پگڑی بندھوائی جائے گی اور ہم اہل نہیں ہیں جس سے مدرسہ کی بدنامی ہوگی غرض ان چودہ طالب علموں نے حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ کو اپنا نمائندہ بنا کر بھیجا کہ جا کر مولانا محمد یعقوب نانوتویؒ سے جلسہ رکوانے کی درخواست پیش کریں حضرت مولانا موصوف دارالعلوم دیوبند کے اول مدرس تھے حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ جب ان کی خدمت میں پہنچے آپ کتابوں کے مطالعہ میں مصروف تھے اور انتہائی انہماک کا عالم تھا۔ رعب کا یہ عالم تھا کہ ہر آدمی بات کرنے کی جرأت نہیں کر سکتا تھا۔ اچانک نگاہ اٹھائی تو دیکھا کہ حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ کھڑے ہیں۔ آپ نے پوچھا خیر تو ہے کیسے آنا ہوا۔ حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ نے فرمایا کہ:

''میں نے درخواست پیش کی کہ دارالعلوم دیوبند کی طرف سے جلسہ دستار بندی ہو رہا ہے۔ حکم کی تکمیل سے تو انکار نہیں لیکن اگر عرض کرنے کا موقع دیں تو ہماری درخواست ہے کہ ہم اس کے اہل نہیں! نالائق ہیں۔ پورا مدرسہ ہمارے اکابر اساتذہ بدنام ہو جائیں گے جلسہ روک دیا جائے اور ہماری نالائقیوں سے پردہ نہ اٹھایا جائے ہم چاہتے ہیں کہ ہمارے عیب پر پردہ پڑا رہے''۔...... یہ سن کر حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب کو جوش آ گیا اور فرمایا:۔ ''یہ تمہاری نالائقی کا احساس تمہاری سعادت مندی ہے اور جب آدمی میں اپنی نالائقی کا احساس آ جائے تو یہ اس کے کمال اور اس کی فضیلت وسعادت مندی کی دلیل ہوتی ہے اور ہم جو یہ جلسہ کر رہے ہیں تو وہاں ہم اعلان کر دیں گے کہ ''فیما بیننا و بین الله ''ہم نے فیصلہ کیا ہے کہ یہ لوگ ہمارے نزدیک اہل ہیں اور قابل ہیں جس کی مرضی ہو ان کا کسی بھی فن میں امتحان لے لے:۔ حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ نے فرمایا کہ ہم لوگ اور بھی ڈر گئے کہ آئے تھے جلسہ رکوانے کو اور یہاں امتحان دینے کا الگ کہہ دیا گیا۔ بہر حال ہم وہاں سے چلے آئے چلتے وقت حضرت مولانا محمد یعقوب صاحبؒ نے ایک جملہ فرمایا تھا کہ

:۔''دنیا گدھوں سے بھری پڑی ہے جہاں تم جاؤ گے وہاں تم ہی تم ہو گے اور تمہارا ہی غلبہ ہو گا''۔ حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ نے فرمایا کہ:۔ ہم نے یہ تجربہ کیا کہ، جہاں گئے ہم ہی نظر آئے جہاں گئے غالب ہی رہے کہ حق ہی کو غلبہ ہے۔''**الحق یعلوا ولا یعلی**'' غالبیت کے لئے حق ہے اور مغلوبیت باطل کے لئے ہے''۔

تفسیر لکھنے میں آپ کو کتنا روپیہ ملا؟

حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ ایک مرتبہ دہلی تشریف لے گئے وہاں ایک انگریز نے حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ سے ملاقات کی اور اول سوال اس نے یہ کیا کہ:۔ میں نے سنا ہے کہ آپ نے کوئی تفسیر لکھی ہے حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ نے فرمایا ہاں لکھی ہے اُس نے دریافت کیا:'' آپ کو اس میں کتنا روپیہ ملا؟'' حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ نے جواب دیا ایک بھی نہیں۔ وہ سن کر بہت حیران ہوا اور دریافت کیا کہ پھر آپ نے اتنی محنت کیوں کی؟ حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ نے فرمایا کہ:۔'' آخرت کے ثواب کے لئے۔'' وہ انگریز کہنے لگا کیا ابھی مسلمانوں میں ایسے خیال کے لوگ موجود ہیں حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ نے جواب دیا۔''بہت کثرت سے''۔

دین اور دنیا، دونوں میں عزتیں ہونگی

حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ نے فرمایا کہ میں بچپن میں خواب بہت دیکھا کرتا تھا۔ اب تو بالکل نظر نہیں آتے۔ اور تعبیر حضرت مولانا محمد یعقوب صاحبؒ سے لیا کرتا تھا مولانا نے بعض اوقات استخارہ تک مجھ سے کرایا ہے کہ تجھے خواب سے مناسبت ہے۔ ایک دفعہ میں نے دیکھا کہ مولانا دیو بندی کے مردانہ مکان میں دروازے کے سامنے جو چبوترہ ہے اس کے کنارے پر ایک چارپائی بچھی ہوئی ہے اور اس پر ایک بزرگ بیٹھے ہوئے ہیں جو بہت نازک پتلے دبلے، قد بھی اچھا، کپڑے نہایت نفیس بڑے قیمتی تھے۔ انہوں نے مجھے ایک کاغذ دیا جس پر لکھا ہوا تھا کہ (ہم نے تم کو عزت دی) اور اس کاغذ پر بہت سی مہریں ہیں

جونہایت صاف تھیں اور مہر میں صاف لکھا ہوا تھا (محمد ﷺ آپ کو حلیہ شریف میں دیکھنا کچھ ضروری نہیں) اسی خواب میں پھر یوں دیکھا کہ تھانہ بھون میں شادی لال تحصیل دار کے مکان میں پھاٹک کے متصل جو مکتب تھا اس کے اندر کے درجہ میں ایک انگریز اجلاس کر رہا ہے لباس اس کا بالکل سیاہ ہے (یہ معلوم نہیں مکان میں کیونکر پہنچا) اس میں بھی مہریں بہت مگر صاف نہ تھیں۔ میں نے مولانا محمد یعقوب صاحبؒ سے عرض کیا تو فرمایا کہ تم کو دین اور دنیا کی دونوں عزتیں نصیب ہوں گی (جامع کہتا ہے کیسی برجستہ تعبیر ہے کہ آج جس کو ایک عالم اپنی نظر سے دیکھ رہا ہے۔ اللھم زدفزد)

تین چیزوں کی پابندی سے سلوک طے ہوجائے گا

حضرت محمد شفیع صاحبؒ نے حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ قدس سرہ سے عرض کیا کہ:۔ ''حضرت میری تمنا ہے کہ تصوف وسلوک کے مراحل طے کروں مگر سنتا ہوں کہ بڑے مجاہدوں اور ریاضتوں اور محنت اور فرصت کا کام ہے میں خلقۃً ضعیف بھی ہوں زیادہ محنت برداشت کرنے کے قابل نہیں اور فرصت بھی کم ہے اور وقت تمام درس وتدریس اور مطالعہ کے کاموں میں گزرتا ہے، کیا ان حالات میں بھی مجھے کوئی حصہ نصیب ہوسکتا ہے؟'' حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ نے بڑی شفقت سے فرمایا:۔ ''یہ تم نے کیا کہا؟ کیا اللہ کا راستہ صرف اقویاء کے لئے ہے ضعفاء کے لئے نہیں؟ فارغ البال لوگوں کے لئے ہے کم فرصت لوگوں کے لئے نہیں؟ حقیقت یہ ہے کہ راستہ سب کے لئے کھلا ہوا ہے۔ ہاں ہر ایک کے لئے عمل کا طریقہ مختلف ہے، بزرگوں نے فرمایا ہے۔ ''طرق الوصل الی اللہ بعد النفس لاخلائق'' یعنی اللہ تک پہنچنے کے راستے اتنے ہی ان گنت ہیں جتنے انسان'' یہاں کوئی عطائی کی دکان نہیں کہ سب کو ایک ہی گولی دے دی جائے ہم آپ کو ایسا طریقہ بتائیں گے جس میں نہ قوت کی ضرورت ہوگی نہ فرصت کی''۔ اس کے بعد حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ نے فرمایا کہ:۔ فرائض وواجبات اور سنن وغیرہ جو سب

مسلمان ادا کرتے ہیں وہ تو اپنی جگہ ہیں آپ صرف تین چیزوں کی پابندی کر لیں انشاء اللہ سارا سلوک اسی سے طے ہو جائے گا۔ ''تقویٰ اختیار کریں اس کا مفہوم آپ کو بتلانے کی ضرورت نہیں۔ البتہ تقویٰ صرف نماز روزہ اور ظاہری معاملات کا نہیں باطنی اعمال میں بھی اتنا ہی ضروری ہے۔'' جتنا ظاہر میں ہے۔ ''دوسرے ہر لایعنی (بے فائدہ) کام، کلام، مجلس اور ملاقات سے پرہیز کریں اور فرمایا لایعنی سے مراد وہ کام ہے جس میں نہ دین کا کوئی فائدہ ہو نہ دنیا کا، غور کرو گے تو معلوم ہوگا کہ ہمارے اعمال، اقوال مجالس میں بہت سا وقت ایسا گزرتا ہے کہ کام کی بات تھوڑی سی اور بے فائدہ زیادہ، بس ان سے پرہیز کرنا''۔ ''تیسرا بقدر ہمت و فرصت کچھ تلاوت قرآن روزانہ کیا کریں''۔

''اب بتلاؤ اس نسخہ میں کون سی چیز محنت یا فرصت کے بغیر نہیں ہو سکتی اگر غور کرو گے تو اس میں قوت اور زیادہ محفوظ رہے گی کیونکہ تقویٰ ایسی چیز ہے کہ بہت سے ایسے کاموں سے روکتا ہے جو انسان کی قوت ضائع کرتے ہیں اور جب لایعنی کاموں، ملاقاتوں، مجلسوں سے پرہیز کرو گے تو تمہاری فرصت علمی مشاغل کے لئے اور بڑھ جائے گی۔'' حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ نے آخر میں فرمایا کہ:۔ ''نسخہ تو آپ کے لئے اتنا ہی ہے کہ اگر دل چاہے اور فرصت بھی ہو تو صبح و شام سبحان اللہ، الحمد اللہ، لا الہ الا اللہ، سو سو مرتبہ اور استغفار درود شریف سو سو مرتبہ پڑھ لیا کرو اور نمازوں کے بعد تسبیح فاطمہ کا التزام کر لو''۔

نومسلم کا جھوٹا پی کر کایا پلٹ دی

حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ ایک مرتبہ کالپی تشریف لے گئے، وہاں ایک شخص نہایت صاف ستھرے اجلے کپڑے پہنے ہوئے جامع مسجد میں نماز کو آیا، اس کے گاؤں والوں سے معلوم ہوا کہ یہ پہلے بھنگی تھا اب مسلمان ہو گیا ہے لیکن وہاں کے چودھری ساتھ کھلانا پلانا تو درکنار اس کے ہاتھ کا برتن بھی نہیں لیتے تھے، وہاں جلسہ تھا اس میں وہ بھی موجود تھا اور وہاں کے رئیس بھی جمع تھے، بعض لوگوں نے حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ

سے خواہش کی کہ آپ اس موقع پر ان لوگوں کو سمجھا دیں کہ ایسا پرہیز نہ کیا کریں، اس کی سخت دل شکنی ہے حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ نے دل میں سوچا کہ نرے سمجھانے سے کچھ کام نہیں نکلے گا سمجھانے سے تو اس وقت ہاں ہاں کہہ دیں گے پھر بعد کو کون پرواہ کرتا ہے؟

حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ نے ایک بدھنے میں پانی منگوایا، جب پانی آ گیا تو حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ نے اس نو مسلم سے فرمایا کہ ٹونٹی ہی سے منہ لگا کر پانی پیئے ،چناچہ اس نے پیا، پھر آپؒ نے اس کے بچے ہوئے پانی سے پیا پھر حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ نے سب سے فرمایا کہ سب لوگ پانی پئیں، اس وقت سوا مان لینے کے کسی سے کوئی عذر بن نہ پڑا۔ سب نے جیسے تیسے پانی پیا، پھر حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ نے فرمایا کہ دیکھو بھائی اب اس سے پرہیز نہ کرنا، کہنے لگے اجی بس اب منہ کی کیا رہا پرہیز کرنے کا، آپ کی تربیت ہی ایسی ہے کہ ہمارا سارا دھرم ہی لے لیا۔ اب آپ اطمینان رکھیں۔ اب ہم اسے اپنے ساتھ کھائیں پلائیں گے، اس سے پرہیز ہی کیا رہ گیا۔ جب اس کا جھوٹا پانی ہی آپ نے پلا دیا۔

حکیم الامتؒ کے ایک مستجاب الدعوات شاگرد کا واقعہ

حضرت مولانا حاجی محمد شفیع بجنوریؒ حضرت مولانا فضل رحمٰن گنج مراد آبادیؒ کے مرید اور حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ کے شاگرد رشید تھے صاحب کشف و کرامت بزرگ تھے، مدرسہ جامع العلوم کانپور میں تعطیل تھی باہر سے ایک رفیق درس کا خط حاجی محمد شفیع صاحب کے نام آیا پتہ پر انتہائی تعظیمی القاب ''قطب وقت'' وغیرہ درج تھے، مدرسہ کی ڈاک صدر مدرس کی حیثیت سے حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ کے پاس آتی تھی حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ نے حاجی صاحب کو بلا کر طنز سے ارشاد فرمایا کہ:۔ ''لیجئے اب تو آپ ''قطب وقت'' ہو گئے''۔ اور وہ خط ہاتھ میں دیا حاجی صاحب جھنجھلا کر بولے:۔ ''ایسے لوگوں کا دماغ بھی خراب ہو جاتا ہے خواہ مخواہ مجھ کو رسوا کرتے ہیں۔'' دو ہی

چار دن گزرے تھے کہ اس طالب علم کے بھائی کا خط آیا کہ:۔ ''فلاں تاریخ، فلاں وقت وہ طالب علم دفعتہً مجنون ہوگیا، خدا کے لئے دعائے صحت فرمائیں۔'' اب حاجی صاحب بڑے ہی قلق واضطرب میں مبتلا ہوگئے اور حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ کی خدمت میں حاضر ہوکر آنسوؤں کے ساتھ بڑے الحاح واضطرار کے عالم میں بولے کہ:۔ ''حضرت! آخر کیا کروں وہ فقرے میں نے کچھ دشمنی میں اور جان کے تھوڑے ہی کہے تھے بس جھنجھلاہٹ میں زبان سے نکل گئے تھے، میں تو اس نعمت سے عاجز آگیا ہوں''۔ دشواریاں عوام ہی کو نہیں، خواص اکابر کو بھی پیش آتی رہتی ہیں اور ایسے ورطہ سے نکلنے کا کام حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ ہی جیسے دقیقہ سنج مصلحین کا ہوسکتا ہے کسی محض بزرگ کا نہیں ،حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ نے فرمایا:۔ ''اس کا علاج بھی آپ ہی کے ہاتھ میں ہے ،اسی حربہ سے کام لیجئے جو آپ کے پاس موجود ہے دعا کیجئے کہ اے اللہ اس نعمت عظیم کے بار کا تحمل اب مجھ ناتواں سے نہیں ہوتا، اسے بدل کر کسی دوسری نعمت سے سرفراز فرمایا جائے، دعا آپ اپنی زبان سے کیجئے، جس کی مقبولیت کے یہ سب کرشمے ہیں، آمین میں بھی کہتا جاؤں گا۔'' حاجی صاحب اس تشخیص اور معالجہ کو سن کر باغ باغ ہوگئے، عمل اسی وقت کیا اور یہ دعا بھی اسی وقت قبول ہوگئی، یعنی اسی وقت سے وہ خاص کیفیت سلب ہوگئی، مرض بھی ٹھیک ہوگیا۔

حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ کے نزدیک اہل علم کی شان

حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ قدس سرہ اپنے ایک اہل علم دوست کی فرمائش پر تشریف لے گئے، سات ہی روز گزرے تھے کہ ایک نواب فلاں نواز جنگ کا پرچہ آیا، جو نواب صاحب حیدر آباد (دکن) مرحوم کی ناک کا بال اور ارکان سلطنت میں سے لکھا تھا کہ:۔ ''عرصہ سے مجھے زیارت کا اشتیاق تھا، مگر بدقسمتی سے 'تھانہ بھون' کی حاضری نصیب نہیں ہوئی، برائے زیارت حاضر ہونا چاہتا ہوں بفلاں فلاں وقت اپنے فرائض منصبی سے

فرصت ملتی ہے''۔ حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ نے جواب لکھا کہ:۔''بے حد مسرت ہوئی کہ آپ کے دل میں دین اور اہل دین کی محبت اور عظمت ہے مگر نیچے کی سطر پڑھ کر افسوس کی بھی کوئی حد نہ رہی کہ اس میں فہم سے کام نہ لیا گیا جس کے ملنے کو زیارت سے تعبیر کیا گیا اس کو تو اپنے اوقات فرصت بتلا کر پابند کیا گیا اور خود آزاد رہے، یہ کون سی فہم و تہذیب کی بات ہے''؟ اس پر نواب صاحب نے اپنی کج فہمی کی معافی چاہی اور لکھا کہ:۔ حضرت والا ہی اپنی ملاقات تحریر فرمائیں۔ اس پر حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ نے ان کو ایک اور سبق دیا کہ :۔''اب بھی پورے فہم سے نہیں لیا گیا مردہ بدست زندہ کی طرح مہمان میزبان کے ہاتھ میں ہوتا ہے اس لئے سفر میں اوقات کا ضبط غیر اختیاری ہوتا ہے، آپ ساتھ رہیں جس وقت مجھ کو فارغ دیکھیں ملاقات کرلیں''۔ اس پر انہوں نے لکھا:۔ بدفہمی پر بدفہمی ہوتی چلی جارہی ہے میں نہ اب اپنے اوقات کو ظاہر کرتا ہوں نہ حضرت سے معلوم کرتا ہوں جس وقت فرصت ہوگی حاضر خدمت ہوکر زیارت سے مشروف ہوجاؤں گا اگر فرصت نہ ہوئی تو لوٹ آؤں گا''۔ جب حضرت مولانا تھانویؒ نے دیکھا کہ اصلاح پزیر ہوگئے ہیں تو دل جوئی کے طور پر لکھا:۔''اب پورے فہم سے کام لیا گیا ہے جس سے اس قدر مسرت ہوئی کہ آپ کا میری زیارت کو جی چارہا تھا اب میرا آپ کی زیارت کو جی چاہنے لگا، اگر فرصت ہو تو آپ تشریف لے آیئے، ورنہ مجھے اجازت فرمایئے کہ میں خود حاضر ہوجاؤں''۔

غرض یہ کہ خود آئے، حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ نے فرمایا کہ میرا یہ طرز عمل اس لئے تھا، کہ دنیا کے جس قدر بڑے لوگ ہیں اہل دین کو بیوقوف سمجھتے ہیں ان کو یہ دکھانا تھا کہ اہل علم کی یہ شان ہے کہ پہلے تو تذلل سے بچنا مقصود تھا، مگر جب وہ اپنی کوتاہی تسلیم کرچکے تو اب کھنچنا تکبر ہے، اللہ کا شکر ہے کہ اس نے محفوظ رکھا، ملاقات کے دوران میں وہ نواب صاحب حیدر آباد دکن کی بیدار مغزی اور انتظام سلطنت کے واقعات بیان کرتے رہے، اس کے بعد کہا کہ نواب صاحب سے ملاقات ہوجائے تو بہت مناسب ہے۔ آپؒ نے پوچھا،'' یہ آپ کی خواہش ہے یا نواب صاحب کی''۔'' کچھ سکوت کے بعد کہا کہ میری خواہش ہے

''۔حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ نے سوال کیا کہ ''جس وقت آپ نے مناسب اور غیر مناسب ہونے پر غور فرمایا ہوگا۔اس پر بھی غور فرمایا ہوگا کہ ملاقات سے نفع کس کا ہے؟'' کہا: ''نواب صاحب کا''۔حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ نے فرمایا،''نفع نواب صاحب کا، اور ملاقات کی ترغیب مجھ کو دی جارہی ہے۔مطلوب کو طالب اور طالب کو مطلوب بنایا جارہا ہے ''۔اس پر کوئی جواب نہ دیا:۔حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ نے فرمایا کہ،''اب میں خود عرض کررہا ہوں کہ اس صورت میں کہ میں خود ملاقات کو جاؤں، مضرت ہی مضرت ہے نفع کچھ بھی نہیں، اگر میں ملاقات کو گیا تو وہ مطلوب اور میں طالب ہوں گا اس صورت میں ان کو مجھ سے کچھ نفع ہوگا ہاں اس سے مجھ کو نفع ہوسکتا ہے اس لئے کہ اس کے پاس جو چیز ہے وہ مجھے ملے گی یعنی دنیا وہ بقدر ضرورت بھی ان کے پاس نہیں یعنی دین۔اگر میں گیا بھی جو ان کے پاس ہے یعنی دنیا، منصب، وظیفہ (وغیرہ) وہ مل بھی گیا تو اس صورت میں ایک خاص ضرر بھی ہے اگر قبول کرتا ہوتو اپنے مسلک کے خلاف، اگر قبول نہیں کرتا تو آداب شاہی کے خلاف، کیونکہ قبول نہ کرنے میں ان کی سبکی اور اہانت ہوگی، اور چونکہ اس وقت میں اس کی حدود میں ہوں اس کی پاداش میں اخراج وغیرہ جو چاہیں میرے لئے تجویز کرسکتے ہیں تو نواب صاحب کو کوئی نفع نہ ہوگا اور میرا نقصان ہوگا، یہ امر بھی شان سلاطین کے خلاف ہے وہ اپنی رعایا کے مدعو کئے ہوئے شخص سے ملاقات کریں''۔یہ سن کر......نواز جنگ صاحب کی آنکھیں کھل گئیں اور کہا کہ:۔''ان چیزوں پر تو ہم لوگوں کی نظر بھی نہیں پہنچ سکتی''۔غرض کہ استغناء اور توکل کی وجہ سے حضرت تھانویؒ ہر جگہ غالب ہی رہتے تھے'' (تلخیص از بیس بڑے مسلمان)

بانی تبلیغی جماعت حضرت مولانا محمد الیاس دہلوی رحمۃ اللہ علیہ

مولانا کا وطن اور خاندان

حضرت مولانا محمد الیاس دہلویؒ کا دادھیالی اور نانہیالی شجرہ نسب حضرت ابو بکر صدیق ؓ سے جا ملتا ہے حضرت مولانا محمد الیاس دہلویؒ کے والد ماجد مولانا محمد اسماعیل

صاحب ؒ جھنجھانہ ضلع مظفر نگر کے رہنے والے تھے۔ آخر میں جھنجھانہ کی سکونت ترک کر کے دہلی میں آکر قیام پزیر ہو گئے تھے۔ حضرت مولانا محمد الیاس دہلویؒ کی والدہ مولانا مظفر حسین صاحب کاندھلویؒ کی نواسی تھیں، مولانا مظفر حسین صاحب ؒ مفتی الٰہی بخش کے حقیقی بھتیجے، حضرت شاہ اسحٰق صاحبؒ کے عزیز شاگرد اور حضرت شاہ محمد یعقوب کے مجاز تھے، ان کے تقویٰ کا یہ حال تھا کہ آپ کے معدہ نے عمر بھر کوئی مشتبہ چیز قبول نہیں کی۔ حضرت مفتی الٰہی بخش صاحبؒ حضرت شاہ عبدالعزیز صاحبؒ کے ممتاز شاگرد صاحب فتویٰ۔ صاحب تصنیف حکیم حاذق۔ بے مثل ادیب اور عربی، فارسی اور اردو کے بلند پایا شاعر تھے۔ مولانا محمد اسماعیل صاحب کا شجرہ نسب چھٹی پشت پر مفتی صاحب کے شجرہ نسب سے مل جاتا ہے۔ حضرت مولانا محمد الیاس دہلویؒ کی ولادت ۱۳۰۳ھ میں ہوئی۔ آپ کا تاریخی نام اختر الیاس ہے۔

مولانا کی اہم خصوصیات

افسوس ہے کہ اس مختصر مقالہ میں حضرت مولانا محمد الیاس دہلویؒ کی زندگی کے تمام پہلوؤں پر روشنی نہیں ڈالی جاسکتی۔ چونکہ اس کی گنجائش نہیں اس لئے مختصر طور پر یہاں حضرت مولانا محمد الیاس دہلویؒ کے چند خصوصی صفات کی طرف اشارہ کیا جائے گا۔ حضرت مولانا محمد الیاس دہلویؒ کی سب سے بڑی خصوصیت مولانا کا آخرت پر کامل یقین اور ہر وقت اس کا استحضار ہے، جن لوگوں نے حضرت مولانا محمد الیاس دہلویؒ کو قریب سے دیکھا ان کا زبانی اور تحریری بیان یہی ہے کہ حضرت مولانا محمد الیاس دہلویؒ کی تمام حرکات وسکنات سے واضح ہوتا تھا کہ جنت اور دوزخ حضرت مولانا محمد الیاس دہلویؒ کی آنکھوں کے سامنے ہیں۔

مولانا محمد منظور صاحب نعمانی لکھتے ہیں کہ:

''حضرت مولانا محمد الیاس دہلویؒ جسمانی لحاظ سے اگر چہ نہایت نحیف وناتواں تھے مگر اس مقدس مقصد کے لئے ایسی ان تھک اور اس قدر بے پناہ جدوجہد کر کے دکھا گئے کہ میرا اندازہ ہے کہ اگر بالفرض کسی شخص کے سامنے جنت اپنی ساری نعمتوں اور دل فریبیوں

کے ساتھ اور جہنم اپنی ساری ہولناکیوں سمیت منکشف کر دی جائے اور اس سے کہا جائے کہ اگر یہ کام کرو گے تو یہ جنت ملے گی اور نہیں کرو گے تو اس جہنم میں ڈالے جاؤ گے تو شاید اس کی سعی و جہد اس سے زیادہ نہ ہو سکے گی جو حضرت مولانا محمد الیاس دہلویؒ کی بالخصوص آخری زمانہ میں تھی۔''

یہ تو حضرت مولانا محمد الیاس دہلویؒ کا حال تھا اب قال کی بات سُنئے۔ مولانا نعمانی حضرت مولانا محمد الیاس دہلویؒ کے ملفوظات میں لکھتے ہیں:

''فرمایا ہائے! اللہ کے وعدوں پر یقین نہیں رہا۔ اللہ کے وعدوں پر یقین اور اعتماد پیدا کرو اور پھر اس یقین اور اعتماد ہی کی بناء پر کام کرنے کی مشق کرو۔ اور اللہ کے وعدوں کے معنی بھی خود نہ گھڑو۔ تمہارا علم اور تجربہ بہت محدود ہے اس کے وعدوں کا مطلب اس کی شان کے مطابق سمجھو اور اس سے یوں ہی مانگو کہ اپنی شان اور قدرت کے شایان اور وعدوں کو پورا فرمائے۔

حضرت مولانا محمد الیاس دہلویؒ کی دوسری اہم صفت مولانا دہلوی کا سوز دروں اور بلند ہمتی ہے۔ حضرت مولانا محمد الیاس دہلویؒ کا دل اس زمانے کی دینی ویرانی کو دیکھ دیکھ کر جلتا تھا اور اور مخلوق خدا کی عام گمراہی اور جہالت و بد عملی کی ہمہ گیری کا تصور کر کے آپ ماہی بے آب کی طرح تڑپتے تھے۔ گویا اس شعر کی مجسم تفسیر تھے ۔

خنجر چلے کسی پہ تڑپتے ہیں ہم امیر سارے جہاں کا درد ہمارے جگر میں ہے

مولانا ابوالحسن علی ندوی لکھتے ہیں کہ: ''کبھی کبھی دین کے اس درد اور اس فکر میں بستر پر کروٹیں بدلتے اور بے چینی بڑھتی تو اُٹھ اُٹھ کر نہانے لگتے۔ ایک رات والدہ مولانا محمد یوسف صاحب نے پوچھا کہ آخر کیا بات ہے کہ نیند نہیں آتی فرمایا...... کیا بتاؤں اگر تم کو وہ بات معلوم ہو جائے تو جاگنے والا ایک نہ رہے دو ہو جائیں''۔

اسی سوزِ دروں کا نتیجہ تھا کہ حضرت مولانا محمد الیاس دہلویؒ نے ساری زندگی کا اوڑنا بچھونا دین اور اشاعت دین ہی کو بنالیا تھا اور حضرت مولانا محمد الیاس دہلویؒ کی ساری زندگی

کی دلچسپیاں اسی تبلیغی کام میں سمٹ کر رہ گئی تھیں۔ حتیٰ کہ اپنی جان کو اس راہ میں قربان کر دینا اپنے لئے بڑی سعادت سمجھتے تھے اور اس راہ کی تمام تکلیفوں اور مشقتوں کو نہایت عالی حوصلگی اور بلند ہمتی سے برداشت کرتے تھے۔ مئی 1936ء کے ایک سفر میوات کے موقع پر مولانا محمد ذکریا صاحب اور مولانا محمد یوسف صاحب کو تحریر فرمایا:۔ "اس قدر ضعف ہے کہ خلاف طبع الجھی ہوئی بات سے اختلاج اور خفقان ہوتا ہے اور آرام کے ساتھ موٹر کی دہلی تک کی سواری سے بخار آتا ہے اس پر ! الحمد للہ ایک مہینہ کی مسافت کیلئے میوات کی سخت ترین باد سموم اور جہال کی باتوں کے الجھاؤ کا نشانہ بن کے موت کے لئے اپنی جان کو پیش کرنے کی نیت سے اس سفر کو کارزار کا میدان تصور کرتے ہوئے مصمم ارادہ سفر ہے۔ گویا یہ سفر جہاد ہے۔ مگر اپنے ضعف سے اور اپنی مجربہ کم ہمتی سے نہایت خوف ہے کسی جگہ یہ نفس شریر کرب وشدائد کے مقابلہ سے فرار کر کے نامردی سے واپس ہوگا دعا کرو جان کے جانے تک تحمل حق تعالیٰ شانہ شدائد و کرب کا نصیب کریں

" وما ذالک علی اللہ العزیز " اور یا کام کو پورا کر کے سلامتی کے ساتھ بغنیمت عود نصیب فرما دیں۔ اپنے اس سفر کو اہم فریضہ اور صحت کی رعایت کو سنگین ترین مصیبت سمجھ کر اپنی زندگی سے مایوس ہو کر سفر کر رہا ہوں۔"

حضرت مولانا محمد الیاس دہلویؒ کی تیسری خصوصیت حضرت مولانا محمد الیاس دہلویؒ کی وسیع القلبی ہے۔ جس کی وجہ سے ملت اسلامیہ کے ہر مکتب خیال اور ہر دائرہ فکر کے لوگ حضرت مولانا محمد الیاس دہلویؒ کے قریب ہو گئے اور اس تحریک کے ساتھ جڑ گئے۔ تمام اہل حق کی طرح حضرت مولانا محمد الیاس دہلویؒ کو بھی حق تعالیٰ نے ایسی وسیع نظری اور عالی ظرفی عطا فرمائی تھی کہ جس مسلمان کے دل میں رائی کے دانہ کے برابر بھی ایمان تھا اس کی بھی حضرت مولانا محمد الیاس دہلویؒ عزت کرتے تھے اس کا نتیجہ تھا کہ ہند و پاکستان کے تقریباً تمام مشہور دینی مدارس و مکاتب کے لوگوں کے دوش بدوش انگریزی کالجوں اور یونیورسٹیوں کے لوگوں کو اس جماعت میں کام کرتے ہوئے پایا گیا۔

اسی طرح مختلف اذواق اور مختلف طرق کے مشائخ کے منتسبین نے اس جماعت میں برابر کا حصّہ لیا۔ کیونکہ حضرت مولانا محمد الیاس دہلویؒ کے دل میں ہر ایک کی قدر اور عزت تھی۔ مدارس، یونیورسٹیوں، اداروں اور خانقاہوں سے تعلق رکھنے والے لوگوں کے علاوہ ہر قسم کے کاروباری اور ملازمت پیشہ لوگ بھی حضرت مولانا محمد الیاس دہلویؒ کی تحریک میں منسلک ہو گئے اور ہر ایک نے اپنی اپنی استعداد کے مطابق اس سے نفع اٹھایا۔ اکرام مسلم حضرت مولانا محمد الیاس دہلویؒ کی دعوت کا اہم اصول تھا اور تمام تبلیغی کارکنوں کو بھی اس کی تاکید کی جاتی تھی۔

اس زمانہ کی تمام دینی جماتوں اور مذہبی اداروں کے ایک دوسرے سے بعد ونفرت اور عام مسلمانوں کی افتراق وتشتت کا ایک بڑا سبب یہ بھی ہے کہ ہر جماعت اور ہر شخص اپنے کو سب سے افضل اور تمام خوبیوں کا مجموعہ سمجھتا ہے اور دوسرے شخص اور دوسری جماعت کو تمام خوبیوں سے محروم اور تمام خرابیوں کا سرچشمہ خیال کیا جاتا ہے۔ حضرت مولانا محمد الیاس دہلویؒ نے فتنوں کی اس بنیاد پر اس طرح تیشہ چلایا کہ جماعت کے بنیادی اصولوں میں اکرام مسلم کو داخل کر دیا اور ہر اُس شخص پر اس کی پابندی لازمی قرار دے دی گئی جو جماعت میں شامل ہو کر تبلیغی کام کرنا چاہتا ہو۔

زمانہ کے اس دستور کے برعکس کہ لوگ اپنی ذات کو مجموعہ محاسن اور دوسروں کو مجموعہ معائب سمجھتے ہیں۔ حضرت مولانا محمد الیاس دہلویؒ نے اس بات پر زور دیا کہ اپنے عیب کا تو محاسبہ کیا جائے اور دوسروں کی خوبیوں پر نظر رکھی جائے۔ ایک کارکن کو ایک مکتوب میں تحریر فرمایا: ''کوئی شخص اور کوئی مسلم ہرگز ایسا نہیں کہ کچھ خوبیوں اور کچھ خرابیوں سے خالی ہو۔ ہر شخص میں یقیناً کچھ خوبیاں اور کچھ خرابیاں ہوتی ہیں۔ اگر خرابیوں کے ساتھ نظر اندازی اور ستر (پردہ پوشی) کا اور خوبیوں کی پسندیدگی اور ان کے اکرام کا ہم مسلمانوں میں رواج ہو جائے تو بہت سے فتنے اور بہت سی خوبیاں اپنے آپ دنیا سے اُٹھ جائیں اور ہزاروں خوبیوں کی اپنے آپ بنیاد پڑ جائے۔'' حضرت مولانا محمد الیاس دہلویؒ کی یہی وہ اہم

خصوصیات اور ذریں اصول ہیں جنہوں نے حضرت مولانا محمد الیاس دہلویؒ کو چشتی سلسلہ کے جلیل القدر مشائخ کی صف میں لاکر کھڑا کر دیا ہے۔ پروفیسر خلیل احمد نظامی نے بالکل ٹھیک لکھا ہے کہ: ''حضرت مولانا محمد الیاس دہلویؒ مولانا رشید احمد گنگوہی کے مرید تھے جو دینی بصیرت اور جذبہ اللہ نے انہیں عنایت فرمایا تھا اس کی مثال اس عہد میں مشکل ملے گی۔ گزشتہ صدی میں کسی بزرگ نے چشتیہ سلسلہ کے اصلاحی اصولوں کو اس طرح جزب نہیں کیا جس طرح حضرت مولانا محمد الیاس دہلویؒ نے کیا تھا۔ (تلخیص از بیس بڑے مسلمان)

شیخ العرب والعجم حضرت مولانا حسین سید احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ

حضرت مولانا حسین سید احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ کی ولادت ۱۹ شوال ۱۲۹۶ھ بمطابق 16 اکتوبر 1879ء کو دوشنبہ اور سہ شنبہ کی درمیانی شب میں بوقت ۱۱ بجے بانگرمؤ ضلع اناؤ میں ہوئی۔ جہاں حضرت مولانا حسین سید احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ کے والد ماجد مولانا حبیب اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ مدرس تھے۔ تاریخی نام چراغ محمد رکھا گیا۔ حضرت مولانا حسین سید احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ نسبتاً حسینی سید ہیں۔ آپؒ کے والد ماجد بڑے پایا کے بزرگ تھے۔ ذاکر شاغل، بڑے پاک باز و باخدا انسان تھے۔

کچھ اوصاف اور واقعات و کرامات

ذوقِ عبادت

رسول اللہ ﷺ کی امتیازی شان بندگی اور عبادت تھی۔ اسی لئے عبدہٗ و رسولہٗ کے ممتاز خطاب سے آپ ﷺ کو نوازا گیا۔ جیسا کہ اللہ رب العزت اپنی شان ربوبیت اور معبودیت میں یکتا اور بے مثال ہے۔ اسی طرح رسول اللہ ﷺ اپنی شان عبدیت اور بندگی میں کامل اور بے مثال تھے۔ اسی کمال عبدیت نے کمال رسالت اور رسولوں کی سیادت کے اعلیٰ مقام پر پہنچایا۔ باوجود یہ کہ آپ ﷺ اللہ کے محبوب ترین بندے تھے۔ لیکن اس کے باوجود ساری ساری رات قیام و سجود میں گزار دیتے۔ پاؤں پر ورم آجاتا۔ سوال کرنے پر ارشاد ہوتا۔ ''افلا

اکون عبدًاشکورا" ترجمہ کیا میں اللہ کا شکر گزار بندہ نہ بنوں؟

اس بیسویں صدی میں محبّ رسول اور متبع سنت نبویہ ﷺ حضرت مولانا حسین سید احمد مدنی ؒ کے ذوق عبادت کا وہ لوگ بخوبی اندازہ کر سکتے ہیں۔ جنہوں نے حضرت مولانا حسین سید احمد مدنی ؒ کی نماز کو دیکھا ہے۔ ان کی نماز حقیقی نماز ہوتی تھی۔ جس کو حدیث پاک میں معراج المؤمنین کے نام سے فرمایا گیا ہے۔ اور جس کو احسان کے لفظ سے یاد کیا گیا ہے کہ: "اللہ کی اس طرح عبادت کر گویا تو اسے دیکھ رہا ہے اور اگر یہ نہ ہو سکے تو یہ خیال کر کہ وہ تجھے دیکھ رہا ہے۔" (بخاری شریف)

جب حضرت مولانا حسین سید احمد مدنی ؒ نماز میں مشغول ہوتے تو صاف معلوم ہوتا تھا کہ یہ بندہ سارے عالم سے دستبردار ہو کر اپنے معبود کے ساتھ سرگوشی میں مشغول ہے اور بارگاہ خداوندی میں باریاب ہے۔ جو آیت بھی نماز میں تلاوت ہوتی تھی سننے والوں کو یوں محسوس ہوتا تھا۔ گویا وحی نازل ہو رہی ہے اور وہ کیفیت ورقت طاری ہوتی کہ جس کا بیان دشوار ہے بارہا دیکھنے والوں نے دیکھا کہ حضرت مولانا حسین سید احمد مدنی ؒ سفر میں ہیں۔ یا سفر کی مشقت برداشت کر کے آئے ہیں اور پھر سفر کرنا ہے۔ مگر جب نماز کے لئے کھڑے ہو جاتے تو ایسی شان کے ساتھ پڑھتے کہ گویا نہ پہلے تعب تھا۔ نہ آئندہ کوئی سفر کرنا ہے۔

حضرت مولانا حسین سید احمد مدنی ؒ ہر وقت ذکر اللہ میں مشغول رہتے تھے اس کا اندازہ اس وقت ہوتا تھا۔ جب انتہائی سوز وگداز کے ساتھ "یا حیی یا قیوم برحمتک استغیث" بار بار پڑھتے تھے۔ وصال سے ایک روز قبل کوئی صاحب دم کروا رہے تھے کہ حضرت مولانا حسین سید احمد مدنی ؒ نے انتہائی بے قراری سے بار بار یہی پڑھا۔ حاضرین میں سے کسی نے پوچھا کہ حضرت کیا کوئی تکلیف یا درد ہے؟ حضرت مولانا حسین سید احمد مدنی ؒ نے ارشاد فرمایا کہ یہی کیا تکلیف کم ہے کہ آپ حضرات مشغول ہیں اور میں بے کار پڑا ہوں عرض کیا گیا حضرت آپ نے تو بہت کام کیا ہے۔ اتنا کام تو ایک جماعت بھی نہیں کر سکتی۔ حضرت مولانا حسین سید احمد مدنی ؒ نے ارشاد فرمایا۔ میں نے تو کچھ بھی نہیں کیا۔

رمضان کے مہینے میں ۱۲ بجے تک حضرت مولانا حسین سید احمد مدنی ؒ خود تراویح پڑھاتے۔اس کے بعد آدھا گھنٹا آرام فرماتے اور پھر تہجد میں مشغول ہو جاتے اور سارا دن تلاوت قرآن کریم میں بسر ہوتا تھا۔

اتباع شریعت وسنت

ایک مکتوب میں حضرت مدنیؒ فرماتے ہیں۔''آپ ذکر اور اتباع شریعت وسنت پر مداومت کرتے رہیئے انشاءاللہ تعالیٰ اصلاح رفتہ رفتہ ہو جائے گی۔''

حضرت مولانا حسین سید احمد مدنی ؒ کی زندگی اس دور میں شریعت محمدی اور سنت نبوی کا بہترین نمونہ تھی۔اس لئے ان کی ہرادا سے انسانیت نمایاں تھی۔کیونکہ اصل انسانیت دنیا کے سب سے بڑے انسان کے نقش قدم پر چلنے میں ہے۔جو آدمی دنیا کے سب سے بڑے انسان کی جتنی اتباع کرے گا۔وہ اتنا انسانیت سے قریب ہوگا۔حضرت مولانا حسین احمد مدنی ؒ چونکہ متبع سنت تھے۔لہٰذا دیکھنے والا پہلی نگاہ میں بھانپ لیتا تھا کہ واقعی انسان ایسے ہوتے ہیں یہی وجہ ہے کہ غیر مسلم بھی آپؒ سے ملتا تھا۔تو وہ آپ کا گرویدہ ہو جاتا تھا۔

عزم واستقلال

کوئی شخص سوائے انبیاء علیہم السلام ماں کے پیٹ سے بڑا بن کر نہیں آتا۔البتہ بڑا بننے کی صلاحیت وقابلیت ہر ایک میں موجود ہوتی ہے۔پھر جوان صلاحیتوں کو بروئے کار لاتا ہے اور عزم واستقلال اور ہمت وحوصلہ سے کارنمایاں انجام دیتا ہے۔وہی بڑا انسان شمار ہوتا ہے۔حضرت مولانا حسین سید احمد مدنی ؒ کی زندگی پر جب نظر ڈالی جاتی ہے تو عزم واستقلال اور ہمت وحوصلہ کے کوہ ہمالیہ نظر آتے ہیں۔جو کام بھی انجام دیا پورے عزم واستقلال اور انتہائی ہمت وحوصلے کے ساتھ انجام دیا۔جس کی نظیر دوسری جگہ نہیں مل سکتی۔وہ بوڑھے اور ضعیف ہو جانے کے باوجود ہمت وحوصلے میں جوان مرد تھے۔جو تمام جوان مردوں سے سبقت لے گئے تھے۔برطانیہ کا جس شان سے مقابلہ کیا۔وہ اپنی نظیر آپ

ہے۔ حصول آزادی کے لئے جو جدوجہد کی اس کا کوئی نمونہ پیش نہیں کر سکتا۔

پھر ہندستان میں مسلمانوں کی حیثیت ووقعت برقرار رکھنے کے لئے جو کارنامے انجام دیئے وہ حضرت مولانا حسین سید احمد مدنی ؒ ہی کا حصہ تھا اور ابھی کچھ اور زندہ رہتے تو بہت کچھ کرتے۔ جو برطانیہ کی سنگینوں سے ڈرنے والا نہیں تھا۔ وہ ہندوستانی حکومت سے کسی طرح مرغوب نہیں ہوسکتا تھا۔ حصول آزادی کے بعد ایک ساتھی نے عرض کیا کہ اب تو حکومت اپنی بن گئی! تو حضرت مولانا حسین سید احمد مدنی ؒ نے ہنس کر فرمایا:۔

''ہمارے لئے تو پہلے بھی جیل خانہ تھا اب بھی جیل خانہ ہے۔''

ہندوستان میں مسلمانوں کی موجودہ حیثیت بھی حضرت مولانا حسین سید احمد مدنی ؒ کے عزم واستقلال کا ایک ادنیٰ کرشمہ ہے ۔ ورنہ مظلوم مسلمانوں کی تباہی ، مسجدوں، خانقاہوں اور مدرسوں کی بربادی کس حد تک پہنچتی اور نقشہ کیا سے کیا ہو جاتا۔

سادگی اور بے تکلفی

سادگی اور بے تکلفی بھی اعلیٰ انسانی جوہر ہے۔ حضرت مولانا حسین سید احمد مدنی ؒ سادگی اور بے تکلفی میں یکتائے روزگار تھے۔ شیخ طریقت عالم ربانی ہونے کے علاوہ حضرت مولانا حسین سید احمد مدنی ؒ کی ظاہری شخصیت ایک بڑے سیاسی رہنما کی تھی۔ اور ہر سیاسی لیڈر مسلم ہو یا غیر مسلم ملکی ہو یا غیر ملکی حضرت مولانا حسین سید احمد مدنی ؒ کے آستانہ پر حاضری کو ضروری اور باعث فخر سمجھتا تھا۔ اس ظاہری عزت ووقار کے باوجود اپنی درویشانہ شان اور بوریہ نشینی اور سنت نبوی کے موافق سادگی کے ساتھ زندگی گزارنا! صرف حضرت مولانا حسین سید احمد مدنی ؒ کا ہی حوصلہ تھا۔ یہاں بڑوں بڑوں کے قدم ڈگمگا جاتے ہیں اور اپنی راہ سے بھٹک جاتے ہیں۔

حضرت مولانا حسین سید احمد مدنی ؒ لباس وضع قطع ، رہائش ، بودوباش سب لطیف اور سادہ تھا اور سنت نبوی کا بہترین نمونہ ، حضرت مولانا حسین سید احمد مدنی ؒ سنت کے موافق

چمڑے کا تکیہ استعمال کرتے تھے اور چمڑے کا گول دستر خوان استعمال ہوتا تھا۔ جس پر ہمیشہ ایک سالن ہوتا تھا اور دائرے کی شکل میں کم از کم دس بارہ آدمی دستر خوان کے گرد بیٹھ کر ایک ہی برتن میں کھاتے تھے ان میں سے ایک حضرت مولانا حسین سید احمد مدنیؒ بھی ہوتے تھے۔ اور ساتھ کھاتے تھے۔ صبح کو ناشتے کے ساتھ باسی روٹی اور مرچ کا اچار ہوتا تھا۔ یہی حضرت مولانا حسین سید احمد مدنیؒ کا ناشتہ تھا اور یہی تمام مہمانوں کا، ایک دفعہ حضرت مولانا حسین سید احمد مدنیؒ نے کھانے والوں کو مخاطب کر کے فرمایا: ''ہم آپ حضرات کے یہاں جاتے ہیں تو آپ مرغ اور حلوے لاتے ہیں اور یہاں باسی روٹی اور مرچ کھانا پڑتی ہے۔'' اس پر حضرت مولانا احتشام الحسن کاندھلویؒ (جو ان تمام باتوں کے راوی اور محرر ہیں) نے فرمایا کہ: ''حضرت باسی روٹی اور اچار مرغ سے زیادہ مزیدار ہے۔''

تواضع اور انکساری

انسان کی انسانیت اور برتری و سربلندی کا اصلی راز تواضع اور انکساری میں مضمر ہے۔ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے: ''جو شخص بھی اللہ تعالیٰ کے لئے تواضع اختیار کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ اس کو ضرور رفعت اور سربلندی عطا فرماتے ہیں''۔ یہی تواضع و انکساری اصل شان عبدیت ہے۔ جو شخص بھی اپنی حقیقت کا شناسا ہوگا۔ وہ مجسمہ تواضع ہوگا اور کبر و غرور سے بالکل مبرّا ہوگا۔ جو عبدیت کے بالکل منافی اور متضاد ہے۔

حضرت مولانا حسین سید احمد مدنیؒ تواضع اور انکساری کا ایک مجسمہ تھے کبھی صدر مقام پر نہ بیٹھتے تھے اور ہمیشہ نشست کے لئے مجلس کا گوشہ اختیار فرماتے تھے۔ ہر ایک چھوٹے بڑے کو ''آپ'' کے لفظ سے خطاب فرماتے تھے اور ہمیشہ اس انداز سے گفتگو فرماتے کہ گویا چھوٹا اپنے بڑے سے گفتگو کر رہا ہے۔ اور ہر ایک کے ساتھ گفتگو کا یہی انداز تھا۔ گویا حضرت مولانا حسین سید احمد مدنیؒ کی نظروں میں سب بزرگ تھے اور یہ خورد۔ ہر کام کے لئے خود سبقت کرتے اور ہر محنت و مشقت کے لیے حضرت مولانا حسین سید احمد

مدنی ؒ اپنے آپ کو پیش کرتے۔

عنایتِ تواضع اور انکساری کی وجہ سے اپنے مخالفین ومعاندین کا بھی ہمیشہ اچھے الفاظ میں ذکر کرتے اور کسی کو برے لفظ سے یادنہیں کرتے تھے حتیٰ کہ گونمنٹ برطانیہ جس کی عداوت ونفرت حضرت مولانا حسین سید احمد مدنی ؒ کی فطرت بن چکی تھی۔اس کو بھی ہمیشہ ہماری مہربان گورنمنٹ فرماتے تھے۔اگر چہ اس لفظ ''مہربان گورنمنٹ'' میں پورا طعنہ ہوتا تھا اور بعض تقاریر میں گورنمنٹ برطانیہ کی تمام مہربانیوں کا راز فاش ہوتا تھا۔حضرت مولانا حسین سید احمد مدنی ؒ کی یہی خاکساری اور انکساری تھی جس نے مخلوق خدا کو اپنا گرویدہ اور شیدائی بنا رکھا تھا حضرت مولانا حسین سید احمد مدنی ؒ ہر ایک کے سردار اور سرتاج بنے ہوئے تھے۔

قناعت واستغفار

حضرت مولانا کو برٹش حکومت ڈھاکہ یونیورسٹی کے شعبہ دینیات کے لئے کثیر مشاہدہ پر (اس وقت کے پانچ سوروپے) ماہوار بلاتی ہے مگر حضرت مولانا حسین سید احمد مدنی ؒ اسے قبول نہیں کرتے۔حکومت مصر جامع از ہر میں شیخ الحدیث کی جگہ دے کر ایک ہزار روپے ماہوار مشاہرہ، مکان، موٹر اور سال میں ایک دفعہ ہندوستان آنے کا کرایہ دینے کی پیش کش کرتی ہے۔مگر حضرت مولانا حسین سید احمد مدنی ؒ وہاں تشریف لے جانے سے صاف انکار فرما دیتے ہیں۔اور دارالعلوم دیو بند کی معمولی سی تنخواہ پر قناعت کرتے ہیں۔

حضرت مولانا حسین سید احمد مدنی ؒ کے پاس مال آتا تو مستحقین کے پاس پہنچ جاتا۔کہا جاتا ہے حضرت مولانا حسین سید احمد مدنی ؒ اس دنیا سے رخصت ہو گئے اور ان کی زندگی میں کبھی اتنا مال جمع نہیں ہوا کہ اس پر زکوۃ فرض ہو۔

قاضی ظہور الحسن ناظم سیو ہاروی فرماتے ہیں کہ میں نہ حضرت مولانا حسین سید احمد مدنی ؒ کا شاگرد ہوں، نہ مرید، نہ پیر، بھائی ان کے مجاہدانہ کارناموں سے مجھے ان سے محبت

وعقیدت ہوگئی تھی۔ میں ایک مرتبہ لکھنؤ سے میری طبیعت خراب تھی۔ چادر اوڑھ کر سیٹ پر لیٹ گیا۔ بخار تھا، اعضا شکنی تھی، اس لئے میں کراہتا بھی تھا۔ مجھے معلوم نہیں کہ کون سا اسٹیشن آیا اور کون سا مسافر سوار ہوا۔ بریلی کے اسٹیشن کے بعد ایک شخص نے مرے پاؤں اور کمر دبانا شروع کی۔ مجھے بہت راحت ہوئی۔ چپکا لیٹا رہا اور وہ دباتا رہا۔ مجھے پیاس لگی پانی مانگا تو اس نے اپنی صراحی سے گلاس پانی دیا اور کہا لیجئے میں نے اٹھ کر دیکھا تو حضرت مولانا حسین سید احمد مدنی ؒ تھے۔ مجھے ندامت ہوئی اور معذرت کی، لیکن انہوں نے اس درجہ مجبور کیا کہ میں لیٹ گیا اور حضرت مولانا حسین سید احمد مدنی ؒ رام پور تک برابر مجھ کو دباتے رہے۔ پھر میں اٹھ کر بیٹھ گیا۔ (قاضی ظہور الحسن ناظم سیوہاروی)

یہ حضور کی بندہ نوازی ہے جو سمجھ سے باہر ہے

حضرت مولانا احمد علی لاہوری ؒ سے روایت ہے کہ جب حضرت مولانا حسین سید احمد مدنی ؒ آخری حج سے تشریف لا رہے تھے تو ہم لوگ سٹیشن پر شرف زیارت کے لئے گئے۔ حضرت مولانا حسین سید احمد مدنی ؒ کے متوسلین میں سے ایک صاحبزادہ محمد عارف ضلع جھنگ دیو بند تک ساتھ گئے۔ ان کا بیان ہے کہ ٹرین میں ایک ہندو جنٹلمین، بھی تھے جس کو ضرورت فراغت لاحق ہوئی۔ وہ رفع حاجت کے لئے گئے اور الٹے پاؤں بادل نہ خواستہ واپس ہوئے۔ حضرت مولانا حسین سید احمد مدنی ؒ سمجھ گئے فوراً چند سگریٹ کی ڈبیاں ادھر ادھر سے اکٹھی کیں اور لوٹا لے کر پخانہ میں گئے اور اچھی طرح صاف کر دیا اور ہندو دوست سے فرمانے لگے کہ جایئے پاخانہ تو بالکل صاف ہے۔ نوجوان نے کہا مولانا میں نے دیکھا ہے پاخانہ بالکل بھرا ہوا ہے۔ قصہ مختصر وہ اٹھا اور جا کر دیکھا تو پاخانہ بالکل صاف تھا۔ بہت متاثر ہوا۔ اور بھرپور عقیدت کے ساتھ عرض کرنے لگا۔ ”یہ حضور کی بندہ نوازی ہے جو سمجھ سے باہر ہے“۔

راقم الحروف کو یہ بات بھی پہنچی ہے اسی واقعہ کو دیکھنے پر یا اسی طرح کے کسی دوسرے

موقعہ پر اسی ڈبے میں خواجہ نظام الدین تونسوی مرحوم نے اس ڈبے میں ایک ساتھی سے پوچھا کہ یہ کھدر پوش کون ہے جواب ملا یہ حضرت مولانا حسین سید احمد مدنی ؒ ہیں تو خواجہ صاحب مرحوم بے اختیار ہو کر حضرت مولانا حسین سید احمد مدنی ؒ کے پاؤں سے لپٹ گئے اور رونے لگے۔ حضرت مدنی نے جلد پاؤں چھڑائے اور پوچھا کیا بات ہے تو خواجہ صاحب نے کہا: ''سیاسی اختلافات کی وجہ سے میں نے آپ کے خلاف فتوے دیئے اور برا بھلا کہا۔ اگر آج آپ کے اس اعلیٰ کردار کو دیکھ کر تائب نہ ہوتا تو شاید سیدھا جہنم میں جاتا۔'' حضرت مولانا حسین سید احمد مدنی ؒ نے فرمایا: میرے بھائی میں نے تو حضور ﷺ کی سنت پر عمل کیا ہے۔ اور وہ سنت یہ ہے کہ حضور ﷺ کے ایک یہودی مہمان نے بستر پر پاخانہ کر دیا تھا۔ صبح جلدی اٹھ کر چلا گیا جب اپنی بھولی ہوئی تلوار لینے واپس آیا تو دیکھا کہ حضور ﷺ بہ نفسِ نفیس اپنے دست مبارک سے بستر دھو رہے ہیں۔ یہ دیکھ کر وہ یہودی مسلمان ہو گیا۔ (تلخیص بیس بڑے مسلمان)

قارئین سے ایک گزارش

محترم قارئین! گزشتہ صفحات میں آپ نے امت محمدیہ ﷺ کے صرف اور صرف دس علماء کرام کی حیات کے کچھ درخشاں پہلو ملاحظہ فرمائے، جو کہ بطورِ نمونہ کے آپ کے سامنے پیش کئے گئے۔ خاتم النبیین محمد مصطفیٰ ﷺ کی امت میں اللہ نے بلند پایہ اور عظیم علماء پیدا فرمائے، بے شک جب ہم پچھلی امتوں کے حالات پر نظر ڈالتے ہیں تو ایسے اہل علم تاریخ میں نہیں ملتے، تو معلوم ہوا کہ آپ ﷺ کی امت میں ایسے عظیم علماء کا پیدا ہونا بھی آپ ﷺ کی خصوصیت ہے، اور اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ اس امت کو اس طرح کی تمام خصوصیات حضور ﷺ کے صدقے ہی ملی ہیں، دعا کیجئے اللہ تعالیٰ ہم سب کو اپنے پیارے نبی ﷺ کی صحیح صحیح قدردانی کرنے کی توفیق عطا فرمائے اور آپ ﷺ کا سچا امتی بن کر آپ ﷺ کے دین کو ساری دنیا میں پھیلانے کی توفیق عطا فرمائے آمین یارب العٰلمین۔

يَا رَبِّ صَلِّ وَسَلِّمْ دَائِمًا اَبَدًا عَلٰى حَبِيْبِكَ خَيْرِ الْخَلْقِ كُلِّهِم

خصوصیت نمبر ۷۱

رسولِ اکرم ﷺ کو اللہ تعالیٰ نے امی بنا کر مبعوث فرمایا

قابل احترام قارئین! رسولِ اکرم ﷺ کی امتیازی خصوصیات میں سے اکترہویں خصوصیت شروع کی جارہی ہے جسکا عنوان ہے ''رسولِ اکرم ﷺ کو اللہ تعالیٰ نے امی بنا کر مبعوث فرمایا'' اور بحمد اللہ دیگر خصوصیات کی طرح اس خصوصیت کو بھی میں نے اپنے آقا ﷺ کے روضے کے سامنے بیٹھ کر ترتیب دیا ہے، حالانکہ اس سے قبل بھی میں نے کئی کتابیں لکھی ہیں لیکن جو سرور اور لطف مسجد نبوی میں رسولِ اکرم ﷺ کے روضے مبارک کے سامنے بیٹھ کر آرہا ہے، اس سے قبل کبھی بھی ایسا سرور محسوس نہیں ہوا اس لئے کہ میرے آقا ﷺ کے مدینے کی بات ہی کچھ اور ہے، اور پھر میرے آقا ﷺ کی مسجد کی بات ہی نرالی ہے، پھر اس سے بھی بڑھ کر میرے آقا ﷺ کے روضہ کی بات سب سے نرالی اور انوکھی اور ایمان میں اضافہ کرنے کا ذریعہ ہے، خداوند قدوس میری اس کاوش کو اپنے بارگاہ میں مقبول و منظور فرمائے، آمین یارب العالمین۔

بہرحال محترم قارئین! ہمارے نبی ﷺ کی یہ بھی ایک امتیازی خصوصیت ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کو امی بنایا لیکن ہمارے نبی ﷺ نے اپنی زندگی میں جو کارنامے سرانجام دیئے، وہ بڑے سے بڑے علم والوں سے ممکن نہیں ہیں، چنانچہ دیگر انبیاء کرام کو اللہ نے علم دیکر مبعوث فرمایا لیکن ہمارے نبی ﷺ کو امی بنا کر کائنات کا سب سے بڑا معلم بنایا تو معلوم ہوا کہ آپ ﷺ کا امی بنکر مبعوث ہونا اور پھر دنیا والوں کو علوم الٰہی سے روشناس کرانا آپ ﷺ کی عظیم خصوصیت ہے، جیسا کہ تفصیل آپ آنے والے اوراق میں ملاحظہ فرمائیں گے جسے ہم نے عین قرآن وحدیث کی روشنی میں مرتب کیا ہے، بے شک اب ہماری نجات اسی میں

ہے کہ ہم اپنے نبی امی ﷺ کی تعلیمات کو اپنے سینے سے لگائیں اور زندگی کے ہر موڑ پر تعلیمات نبوی ﷺ ہی پر عمل پیرا ہوں، دعا گو ہوں کہ خداوند قدوس ہم سب کو اپنے محبوب نبی ﷺ کی سیرت وصورت اور تعلیمات وسنت کو اپنانے کی توفیق عطا فرمائے، آمین یارب العالمین۔ چنانچہ اب لیجئے آنے والے اوراق میں اس خصوصیت کی تفصیل ملاحظہ کیجئے:۔

اکترہویں خصوصیت کی وضاحت قرآن واحادیث کی روشنی میں

قرآن مجید میں رسولِ اکرم ﷺ کو ''النبی الامی'' کہہ کر پکارا گیا ہے۔ چنانچہ سورۂ اعراف میں ارشاد ہوتا ہے۔ اَلَّذِینَ یَتبعُونَ الرسولَ النَّبِیَّ الاُمِّیَّ ''یہ وہ لوگ ہیں یعنی مسلمان جو اللہ تعالیٰ کے بھیجے ہوئے ناخواندہ پیغمبر کی متابعت کرتے ہیں۔''

بعض لوگوں نے ''امی'' کے معنی ''ناخواندہ'' کرنے کی بجائے اس کی مختلف تاویلیں کی ہیں۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ ''امی'' کے معنی محاورۂ عرب کے مطابق ''ان پڑھ'' ہی ہیں یعنی وہ شخص جو لکھا پڑھا نہ ہو۔ اور اس نے ظاہری تعلیم حاصل نہ کی ہو۔

رسولِ اکرم ﷺ کا ''امی'' ہونا فی الحقیقت ایک بہت بڑا معجزہ تھا اور اللہ کے نشانوں میں ایک عظیم نشان تھا۔ آپ ﷺ کا ''امی'' ہونا مصلحت الٰہی کے عین مطابق تھا اور مصلحت الٰہی یہ تھی کہ قرآن حکیم ایک ''امی'' کی زبان سے ادا ہوا۔ وہ قرآن جو اپنی فصاحت وبلاغت میں لاجواب ہے۔ جو اسرار ونکات، حقائق ومعارف اور احکام ومواعظ کا خزینہ ہے۔ اور جو ماضی اور مستقبل کے حالات وواقعات کا آئینہ ہے۔

اگر کسی ایسے شخص کی زبان سے ادا ہوتا جس نے اپنے وقت کے علماء وفضلاء کے سامنے زانوئے تلمذ تہہ کیا ہوتا اور دنیوی تعلیم حاصل کی ہوتی تو کفار کہہ سکتے تھے کہ یہ سب کمال اس کی تعلیم اور استادوں کا ہے۔ لیکن جب وہ دیکھتے تھے کہ یہ بات اس شخص کی زبان سے ادا ہو رہی ہے جو انہی کی قوم میں پیدا ہوا جو انہی کے درمیان پلا بڑھا اور ظاہری تعلیم اور نوشت وخواند کے داغ سے بالکل پاک ہے تو ان کی زبانیں گنگ ہو جاتی تھیں۔ تاہم بعض

بعض باطل پرست اپنی خفت مٹانے کے لئے نہایت ڈھٹائی کے ساتھ قرآن اور حامل قرآن پر کوئی نہ کوئی اعتراض جڑتے رہتے تھے۔

اللہ تعالیٰ نے ان کے اعراضات کا جواب اس طرح دیا ہے:۔اے نبیؐ نزول قرآن سے پہلے نہ تو آپ نے کوئی کتاب پڑھی تھی، اور نہ آپ کو اپنے ہاتھوں سے لکھنا ہی آتا تھا۔ اگر ایسا ہوتا تو باطل پرست شبہ کرتے۔ بلکہ یہ کھلی آیتیں ہیں، جو ان لوگوں کے سینوں میں ہیں، جن کو علم عطا کیا گیا ہے، اور ہماری آیت سے صرف گناہ گار ہی انکار کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اس (پیغمبر ﷺ) پر خدا کی طرف سے نشانیاں کیوں نہیں اتریں ہیں؟ کہہ دیجئے کہ نشانیاں اللہ کے قبضہ میں ہیں، میں تو کھلا ڈرانے والا ہوں، کیا ان کے لئے یہ نشانی کافی نہیں ہے کہ ہم نے آپ پر کتاب اتاری جو ان کو پڑھ کر سُنائی جاتی ہے۔ اس میں ایمان داروں کے لئے رحمت اور نصیحت ہے۔ (سورۂ عنکبوت، ع ۵)

ان آیات کا مفہوم بالکل واضح ہے، یعنی اگر آپ (ﷺ) پڑھے لکھے ہوتے تو مشرکین ضرور شک کرتے کہ رسولِ اکرم ﷺ نے پہلی کتابوں سے مضامین کا اقتباس کر کے قرآن بنالیا ہے۔ لیکن رسولِ اکرم ﷺ کے ناخواندہ ہونے کی وجہ سے ان کا شک کرنا یا اعتراض کرنا نری ہٹ دھرمی تھی۔

یہاں یہ امر ملحوظ خاطر رہے کہ انسانوں کے لئے تکبر وانانیت جائز نہیں لیکن اللہ تعالیٰ کے لئے تکبر وانانیت صفت مدح ہے۔ اسی طرح ناخواندہ ہونا عام انسانوں کے لئے تو عیب کا باعث ہے لیکن رسولِ اکرم ﷺ کے لئے صفت مدح اور باعث ستائش ہے کہ باوجود ناخواندہ ہونے کے رسولِ اکرم ﷺ کی ذات اقدس میں ایسے علمی اور عملی کمالات ودیعت کئے گئے تھے کہ ان کی مثال کائنات کی کسی بڑی سے بڑی ہستی میں بھی نہیں مل سکتی۔

"یہ رسولِ اکرم ﷺ کے برگزیدہ رسول اور برحق ہونے کی ایک زندہ اور دائمی شہادت تھی۔" ایک دفعہ ایک عیسائی نے (جو مشرکین سے ملا ہوا تھا) بظاہر اسلام قبول کرلیا اور رسولِ اکرم ﷺ سے سورۂ بقرہ اور آل عمران پڑھی۔ رسولِ اکرم ﷺ نے اس کو کتابت وحی

کی خدمت تفویض کی۔

کچھ عرصہ بعد وہ مرتد ہو گیا اور کہنے لگا کہ میں نے محمد (رسولِ اکرم ﷺ) کو جو کچھ لکھ کر دیا ہے اس کے سوا (نعوذ باللہ) وہ کچھ نہیں جانتے۔ اس کی افترا پردازی پر اللہ کا غضب نازل ہوا اور فرشتۂ اجل نے اس کو مزید شرانگیزی کی مہلت نہ دی۔ مرنے کے بعد اس کی لاش کو زمین بھی قبول نہ کرتی تھی۔ دوسری طرف مشرکین نے دیکھ لیا کہ اس بدبخت کے مرنے کے بعد بھی فیضانِ نبوت کا بحرِ زخار اسی طرح موجزن ہے۔

ایک دفعہ کفار نے اس شبہ کا اظہار کیا کہ مکہ کا ایک نصرانی غلام رسولِ اکرم ﷺ کو سکھاتا پڑھاتا ہے۔ حالانکہ بات صرف اتنی تھی کہ یہ نصرانی غلام کبھی کبھی اپنی زبان میں کتب مقدسہ پڑھتا تھا اور رسولِ اکرم ﷺ راستہ چلتے چلتے کبھی اس کے پاس کھڑے ہو جاتے تھے۔ رسولِ اکرم ﷺ نہ تو ان کتابوں کی زبان سمجھتے تھے اور نہ وہ غلام عربی جانتا تھا۔ کفار کے اس بے جا شبہ کا جواب اللہ تعالیٰ نے اس طرح دیا: "اور ہم کو بالتحقیق یہ علم ہے کہ یہ مشرکین کہتے ہیں کہ محمد (رسولِ اکرم ﷺ) کو کوئی آدمی تعلیم دیتا ہے، جس شخص کی طرف یہ منسوب کرتے ہیں اس کی زبان عجمی ہے اور یہ قرآن فصیح عربی زبان میں ہے۔ (سورۂ نحل۔ ع ۱۴)

غرض یہ کہ رسولِ اکرم ﷺ کا "امی" ہونا ایک عظیم الشان معجزہ تھا۔ رسولِ اکرم ﷺ "امی" تھے لیکن اتنا بلند معیارِ اخلاق (اسوۂ حسنہ) پیش کیا کہ قیامت تک اس کی مثال نہیں مل سکتی ہے۔ رسولِ اکرم ﷺ نے فلسفۂ اخلاق کے وہ مسائل حل کئے کہ ارسطو اور افلاطون کا طائرِ خیال بھی وہاں تک نہ پہنچا تھا۔ رسولِ اکرم ﷺ کی روحانی اور اخلاقی تعلیمات نے ظلمت کدہ جہاں میں ایسی شمع روشن کی جو ابدالآباد تک نور افشاں رہے گی۔ اسے معجزہ کے سوا کچھ اور کہنا ناممکن ہے۔ (بحوالہ حسنت جمیع خصالہ)

اور رسولِ اکرم ﷺ کے معجزہ "امیت" سے متعلق علامہ شبلی نعمانیؒ اپنی کتاب سیرت النبیؐ میں لکھتے ہیں کہ:۔ یہ واقعہ محتاجِ بیان نہیں کہ رسولِ اکرم ﷺ ظاہری تعلیم اور نوشت وخواند کے داغ سے پاک تھے۔ قرآن مجید نے متعدد موقعوں پر اس واقعہ کا اظہار کیا

ہے۔ چنانچہ سورہ اعراف میں ہے کہ: ﴿اَلَّذِينَ يَتَّبِعُونَ الرَّسُولَ النَّبِيَّ الأُمِّيَّ﴾ ''یہ مسلمان وہ ہیں جو ان پڑھ پیغمبر اور فرستادۂ الٰہی کی پیروی کرتے ہیں۔''

اسی سورت میں پھر اس کے بعد ہی ہے: ﴿فَآمِنُوا بِاللّٰهِ وَرَسُولِهِ النَّبِيِّ الأُمِّيِّ﴾ ''تو لوگو! خدا پر اور اس کے ان پڑھ پیغمبر اور فرستادہ پر ایمان لاؤ۔''

سورۂ جمعہ میں نہ صرف رسولِ اکرم ﷺ کے ''امی'' بلکہ اغلب آبادی کی حالت کے لحاظ سے تمام قریش اور عرب کے ''امی'' ہونے کا اظہار ہے۔ ﴿هُوَ الَّذِي بَعَثَ فِي الأُمِّيِّينَ رَسُولًا مِّنْهُمْ.﴾ (جمعہ) ''اسی خدا نے امیوں کے درمیان ان ہی میں سے ایک پیغمبر بنا کر بھیجا۔''

دوسری جگہ سورۂ عنکبوت میں ارشاد ہوتا ہے کہ: ''اور قرآن کے نزول سے پہلے اپنے پیغمبر نہ تو تم کوئی کتاب پڑھ سکتے تھے اور نہ اپنے ہاتھ سے اس کو لکھ سکتے تھے، اگر ایسا ہوتا تو یہ باطل پرست شک کر سکتے تھے۔'' (عنکبوت)

اس سے معلوم ہوا کہ رسولِ اکرم ﷺ کا انسانی تعلیم سے پاک ہونا بھی مصلحتِ الٰہی کا ایک خاص منشاء تھا، اسی لئے اس کے بعد ارشاد ہوتا ہے کہ: ''اور معترضین کہتے ہیں کہ اس پیغمبر پر اس کے پروردگار کی طرف سے کوئی نشانیاں کیوں نہیں اتریں، کہہ دے کہ نشانیاں خدا کے قبضۂ قدرت میں ہیں اور میں تو صرف خدا سے ڈرانے والا ہوں، کیا ان معترضین کو یہ نشانی کافی نہیں کہ ہم نے تجھ پر (جو ''امی'' ہے) کتاب اتاری جو ان کو پڑھ کر سنائی جاتی ہے۔'' (عنکبوت)

قرآن مجید کی مختلف صورتوں میں اس کا اظہار ہے کہ: ''اے محمدؐ! تمہاری زبان سے آج گزشتہ پیغمبروں، اگلی، امتوں اور عہد ماضی کے واقعات ادا ہوتے ہیں ان واقعات اور حالات سے واقفیت حاصل کرنے کے تین ہی ذریعے انسان کے ہاتھ میں ہیں۔ ایک یہ کہ وہ اس واقعہ کے وقت موجود ہو۔ دوسرا یہ کہ ان حالات کو کتابوں میں پڑھے۔ تیسرا یہ کہ اوروں سے سنے۔

رسولِ اکرم ﷺ اطلاع کے ان ذرائع سے نا آشنا تھے۔ اول ذریعہ تو ظاہر ہے کہ مفقود تھا۔ قرآن مجید سے آدم سے مولدِ محمدی تک تمام واقعات بیان کئے گئے ہیں۔ رسولِ اکرم ﷺ کی پیدائش سے پہلے وقوع پزیر ہوئے تھے اور رسولِ اکرم ﷺ کے پاس ان کے علم کا کوئی ظاہری ذریعہ نہ تھا اسی لئے قرآن مجید نے متعدد مواقع مثلاً حضرت مریمؑ اور حضرت زکریاؑ کے قصہ میں کہا ہے کہ: ''یہ گزشتہ زمانہ کی خبروں میں سے ہے۔ جس کو ہم تیری طرف وحی کر رہے ہیں۔ تو ان کے پاس اس وقت موجود نہ تھا جب وہ اپنا اپنا پانسہ ڈال رہے تھے کہ کون مریم (علیہ السلام) کی کفالت کرے گا اور نہ تو ان کے پاس اس وقت تھا جب وہ جھگڑ رہے تھے۔'' (سورۂ آلِ عمران)

حضرت موسیٰؑ کے قصہ میں ارشاد ہوتا ہے کہ: ''جب ہم نے موسیٰؑ کو اپنا فیصلہ دیا تو تو اس وقت مغربی گوشہ میں موجود نہ تھا بلکہ ہم نے صدیاں اس پر گزار دیں، قومیں پیدا کی گئیں جن کی بڑی بڑی عمریں ہوئیں اور نہ تو اہل مدین میں قیام پزیر ہو کر آیات الٰہی ان کو پڑھ پڑھ کر سناتا تھا بلکہ ہم آئندہ تم کو بھیجنے والے تھے اور نہ تو اس وقت گوشۂ طور میں تھا جب ہم نے موسیٰ کو آواز دی بلکہ (اس قصہ کا علم جو تجھ کو حاصل ہو رہا ہے یہ) محض تیرے پروردگار کی رحمت ہے۔'' (سورۂ قصص)

حضرت یوسفؑ کے قصہ میں فرمایا کہ: ''یہ اس گزشتہ زمانہ کا قصہ کا علم ہم تم کو اپنی وحی سے عطا کر رہے ہیں، تو اس وقت ان میں موجود نہ تھا، جب وہ باہم مشورہ سے بات کر رہے تھے۔'' (سورۂ یوسف)

علم کا دوسرا ذریعہ یہ تھا کہ کتابوں کو پڑھ کر اطلاع حاصل ہو۔ قرآن مجید نے اس کی بھی نفی کی: ﴿وَمَا كُنتَ تَتْلُوا مِن قَبْلِهِ مِن كِتٰبٍ وَّلَا تَخُطُّهُ بِيَمِينِكَ﴾ (سورۂ عنکبوت)

''نہ تو تو اس سے پہلے کوئی کتاب پڑھ کر سناتا تھا اور نہ اپنے ہاتھ سے تو اس کو لکھ سکتا تھا۔'' ﴿مَا كُنتَ تَدْرِي مَا الْكِتٰبُ وَلَا الْاِيْمَانُ﴾ (سورۂ شوریٰ۔۵)

''تجھ کو تو یہ بھی معلوم نہ تھا کہ کتاب کیا چیز ہے اور ایمان کس کو کہتے ہیں۔''

تیسری صورت یہ تھی کہ دوسروں سے سن کے یہ علم حاصل کیا جائے۔ سب کو معلوم ہے کہ نبوت سے پہلے رسولِ اکرم ﷺ کی زندگی تمام تر مکہ معظمہ میں گزری۔ بجز اس کے کہ چند مہینے بصریٰ وغیرہ کے سفر تجارت میں گزرے ہوں اور خود مکہ معظمہ میں نہ ان واقعات کا کوئی واقف کار تھا اور نہ قریش کو ان سے آگاہی تھی۔ اس لئے یہ ذریعۂ علم بھی ثابت نہیں۔ چنانچہ قرآن مجید نے علی الاعلان کہا کہ: ''یہ گزشتہ زمانہ کی باتیں ہیں جن کی بذریعہ وحی ہم تجھ کو تعلیم کرتے ہیں، تو خود اور تیری قوم اس سے پہلے آگاہ نہ تھی۔'' (سورۂ ھود)

رسولِ اکرم ﷺ کی جو زندگی مکہ معظمہ میں گزری اور سفر تجارت میں قریش کے شامی قافلوں کے ساتھ جو زمانہ بسر ہوا، اس کا ایک ایک واقعہ قریش کے سامنے تھا، جب رسولِ اکرم ﷺ مکہ میں تھے تب بھی رسولِ اکرم ﷺ قریش کے مجمع میں تھے اور جب کبھی مکہ سے باہر گئے تو بھی قریش ہی کے جھرمٹ میں رہے۔ اس لئے رسولِ اکرم ﷺ کی زندگی کا کوئی لمحہ ان سے مخفی نہ تھا۔ اگر رسولِ اکرم ﷺ نے کوئی ظاہری تعلیم پائی ہوتی تو شاعر و مجنون وساحر کی طرح وہ اس الزام کا اظہار بھی کر سکتے تھے۔ مگر انہوں نے نہیں کہا۔

اس سے معلوم ہوا کہ ان کو اس بات کا یقین تھا کہ محمد کا سینہ ظاہری تعلیم کے عیب سے داغدار نہیں۔ چنانچہ قرآن مجید نے بآواز بلند کہا کہ: ''اگر خدا کو منظور ہوتا تو میں تم کو نہ یہ قرآن پڑھ کر سناتا اور نہ خدا تم کو اس قرآن سے آگاہ کرتا۔ اس سے پہلے میں مدتوں تم میں رہ چکا ہوں کیا تم نہیں سمجھتے۔'' (سورۂ یونس)

قرآن مجید نے ان تمام شکوک اور الزامات کو دہرایا ہے۔ ان کو یہ شک تھا کہ رسولِ اکرم ﷺ کسی دوسروں سے سن کر یہ قرآن پیش کرتے ہیں۔ چنانچہ قرآن مجید نے ان کے اس اعتراض کو نقل کیا، اور اس کا جواب دیا کہ: ''اور ہم کو بہ تحقیق معلوم ہے کہ کفار کہتے ہیں کہ محمد کو کوئی آدمی سکھاتا ہے، اس شخص کی زبان جس کی طرف یہ منسوب کرتے ہیں عجمی ہے اور یہ فصیح عربی ہے۔'' (سورۂ نحل)

سورۂ فرقان میں چند آدمیوں کی شرکت کا شبہ مذکور ہے۔ فرمایا کہ: ''اور کافر کہتے

ہیں کہ یہ قرآن من گھڑت چیز ہے جس کو محمدؐ نے گھڑ لیا ہے اور اس افتراء پرداز ی میں چند اور آدمی بھی شریک ہیں۔ وہ یقیناً غلط اور جھوٹ کہتے ہیں۔'' (سورۂ فرقان)

یہ سب شبہات کئے گئے مگر کفار نے کبھی یہ شبہ نہیں ظاہر کیا کہ محمد نے چپکے سے پڑھنا سیکھ لیا ہے اور دوسری آسمانی کتابیں پڑھ کر یہ قرآن بنا لیتے ہیں۔ اس سے ثابت ہوا کہ رسولِ اکرم ﷺ کی امیت پر ان کو یقین تھا۔ مدینہ آکر یہودیوں سے معاملہ پڑا۔ روایات میں بکثرت اس قسم کے واقعات مذکور ہیں کہ یہود رسولِ اکرم ﷺ سے وہ سوالات کرتے تھے جو ان کی کتابوں میں مذکور تھے اور کہتے تھے کہ ان کے جواب پیغمبر ہی دے سکتا ہے۔ رسولِ اکرم ﷺ ان کے صحیح جواب دیتے تھے۔ اور وہ متحیر رہ جاتے تھے۔

اس واقعہ سے یہ امر پایۂ ثبوت کو پہنچتا ہے کہ یہود کو بھی یہ یقین تھا کہ محمد رسول اللہؐ امّی محض ہیں، اور ہماری کتابوں کو انہوں نے نہیں پڑھا ہے اور نہ پڑھ سکتے ہیں۔ اور نہ اس جرأت کے ساتھ وہ اپنی کتابوں کے سوالات اس شخص کے سامنے جس کی نسبت ان کو معلوم ہوتا کہ وہ ان کو پڑھ چکا ہے یا پڑھ سکتا ہے نہ پیش کرتے اور نہ اس کو حق و باطل کا معیار قرار دیتے۔ قریش کو جس شخص کی نسبت شبہ تھا کہ وہ رسولِ اکرم ﷺ کو سکھاتا ہے، اس کے متعلق امام طبری نے تفسیر میں مختلف روایتیں نقل کی ہیں جن سے اس شخصیت اور نام کے متعلق کوئی صحیح فیصلہ نہیں کر سکتا، تاہم مجموعی حیثیت سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ مکہ معظمہ میں کوئی نصرانی غلام تھا جو اپنی زبان میں کتبِ مقدسہ پڑھتا تھا اور رسولِ اکرم ﷺ راستہ چلتے اس کے پاس کبھی کبھی کھڑے ہو جاتے تھے۔ اسی پر کفار نے کہا کہ محمد کو یہی قرآن کی آیتیں سکھاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے جواب دیا کہ: ''اس غلام کی، اور جو کتابیں وہ پڑھتا ہے ان کی زبان عربی نہیں اور نہ وہ عربی جانتا ہے اور رسولِ اکرم ﷺ عربی کے سوا کوئی اور زبان نہیں جانتے اور قرآن کی زبان فصیح عربی ہے۔ یہ کیونکر ممکن ہے کہ رسولِ اکرم ﷺ غیر عربی کو سمجھ لیں اور وہ عجمی غلام قرآن جیسی فصیح زبان میں کلام کرے۔''

رسولِ اکرم ﷺ کے بچپن کے واقعات میں سے ایک واقعہ یہ بیان کیا جاتا ہے۔ کہ

رسولِ اکرم ﷺ کو آپ ﷺ کے چچا ابو طالب اپنے ساتھ شام لے جارہے تھے۔ راستہ میں بحیرا نام کے ایک راہب نے رسولِ اکرم ﷺ کو دیکھ لیا اور آثار سے پہچان لیا کہ آپ ﷺ ہی پیغمبر آخر الزمان ہیں۔ چنانچہ اس نے ابو طالب کو مشورہ دیا کہ ''ان کو مکہ واپس بھیج دو ورنہ اگر یہود دیکھ لیں گے تو قتل کر ڈالیں گے۔''

اگر چہ یہ واقعہ جیسا کہ سیرت نبویؐ جلد اول (شام کا سفر) میں بہ تفصیل لکھا جا چکا ہے تفصیل کے لئے وہاں مراجعت کی جاسکتی ہے کہ صحیح نہیں ہے۔ تاہم ہمارے عیسائی احباب اس ضعیف روایت پر اپنے شکوک وشبہات کی عظیم الشان عمارت قائم کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ پیغمبر اسلامؐ نے اسی راہب کی صحبت سے فیض حاصل کیا ہے۔

اگر یہ صحیح ہے تو دنیا کے لئے اس سے بڑا معجزہ رسولِ اکرم ﷺ کا اور کیا چاہئیے کہ ایک ابجد ناشناس طفل دوازدہ سالہ نے چند گھنٹوں میں حقائق واسرار دین، اصول عقائد، نکات اخلاق، مہمات قانون اور ایک ''شریعت عظمیٰ'' کی تکمیل وتاسیس کے طریقے سب کچھ سیکھ لئے۔ کیا ہمارے عیسائی دوست اس معجزہ کو تسلیم کرتے ہیں؟ سب سے بڑی بات یہ ہے کہ رسولِ اکرم ﷺ کی پیغمبرانہ زندگی پورے ۲۳ برس تک قائم رہی، اگر رسولِ اکرم ﷺ کسی انسانی معلم سے فیض پاتے تو ضرور تھا کہ وہ اس پورے زمانہ تک یا بڑی حد تک خلوت وجلوت میں رسولِ اکرم ﷺ کے ساتھ رہتے کہ وقت ضرورت (نعوذ باللہ) رسولِ اکرم ﷺ اس سے قرآن بنواتے۔ احکام ومواعظ سیکھتے۔ اسرار نکات معلوم کرتے اور یہ شخص یقیناً مسلمان نہ ہوتا۔ کیونکہ جو شخص خود مدعی نبوت کو تعلیم دے رہا ہو وہ کیوں کر اس کی نبوت کو تسلیم کرسکتا تھا اور پھر اس شہرتِ عام، ذکر جمیل، رفعت مقام کو دیکھ کر جو مدعی نبوت کو حاصل ہو رہی تھی وہ خود پردہ کے پیچھے گمنامی پسند کرتا اور صحابہ کرامؓ کی نگاہوں سے اس کا وجود ہمیشہ مستور رہتا۔ جس کی نسبت قریش کو شبہ تھا۔

اگر حقیقت میں رسولِ اکرم ﷺ اس سے تعلیم حاصل کرتے تو قریش جو رسولِ اکرم ﷺ کی تکذیب، تذلیل اور رسولِ اکرم ﷺ کو خاموش کرنے کی ہر تدبیر پر عمل پیرا ہو رہے تھے

کہ اس غلام عجمی کو الگ کر دیتے، کہ رسولِ اکرم ﷺ کی وحی اور قرآن کا تمام کاروبار دفعتاً درہم برہم ہو جاتا۔

علاوہ ازیں زیادہ سے زیادہ اس کا وجود مکہ میں تھا، پھر مدینہ میں فیضان الٰہی کا سرچشمہ کیوں ابلتا رہا۔ قرآن مجید، شریعت اسلام اور احکام کا بڑا حصہ یہیں وحی ہوا ہے مکہ میں تو نسبتاً بہت کم صورتیں نازل ہوئی ہیں۔ جب مدینہ منورہ میں اسلام کا چرچہ پھیلا تو یہود ونصاریٰ نے اسلام کو بدنام اور بے اثر کرنے کی ایک تدبیر یہ سوچی کہ لوگ جھوٹ موٹ آکر پہلے مسلمان اور پھر چند روز کے بعد مرتد ہو جائیں، تاکہ رسولِ اکرم ﷺ کی بدنامی ہو اور لوگوں کا خیال ہو کہ اگر یہ مذہب سچا ہوتا تو اس کو قبول کر کے کوئی کیوں چھوڑ دیتا؟

سورہ اٰل عمران میں ارشاد باری تعالیٰ ہے کہ ”اور اہل کتاب میں سے ایک گروہ کہتا ہے کہ مسلمانوں پر جو اترا ہے اس پر صبح کو ایمان لاؤ اور شام کو اس سے پھر جاؤ، شاید وہ لوگ (مسلمان) بھی پھر جائیں۔“ چنانچہ اسی سازش کے مطابق ایک عیسائی نے اسلام قبول کیا اور سورۂ بقرہ اور سورۂ اٰل عمران پڑھی، رسولِ اکرم ﷺ نے کتابت وحی کی خدمت اس کی سپرد کی، چند روز کے بعد وہ مرتد ہو گیا اور کہنے لگا کہ میں نے محمد (رسولِ اکرم ﷺ) کو جو کچھ لکھ دیا ہے وہ اس کے سوا اور کچھ نہیں جانتے۔ خدا نے اپنی نشانی ظاہر کی اور موت نے بہت جلد اس کی افترا پردازی کا ہمیشہ کے لئے خاتمہ کر دیا، اور دنیا نے دیکھ لیا کہ رسولِ اکرم ﷺ کے فیضان نبوت کا چشمہ اب بھی اسی طرح جوش زن ہے۔

صلح حدیبیہ کا ایک واقعہ یہ ہے کہ قریش اور مسلمانوں کے درمیان عہد نامہ مرتب ہو رہا تھا، حضرت علیؓ عہد نامہ لکھ رہے تھے، عہد نامہ کی عبارت یہ تھی کہ ”یہ شرائط جن کو خدا کے رسولِ محمد ﷺ نے منظور کیا۔“ قریش نے کہا: اگر آپ کو خدا کا رسول مانتے تو اس لڑائی کی نوبت ہی کیوں آتی؟ اس لفظ کو مٹا کر اپنا اور اپنے باپ کا نام لکھیئے۔

رسولِ اکرم ﷺ نے حضرت علیؓ کو فرمایا: ”حسب خواہش ترمیم کرو۔“ حضرت علیؓ نے کہا: ”مجھ سے یہ گستاخی نہیں ہو سکتی۔ رسولِ اکرم ﷺ نے پوچھا وہ الفاظ کہاں ہیں؟

حضرت علیؓ نے انگلی رکھ کر بتایا، تو رسولِ اکرم ﷺ نے خود اپنے دستِ مبارک سے رسولِ اللہ ﷺ کا لفظ مٹادیا اور محمد بن عبداللہ لکھ دیا۔

یہ واقعہ بخاری، مسلم نسائی، مسند ابن حنبل اور تمام کتب سیر میں مذکور ہے، اسی کے ساتھ بخاری میں یہ تصریح ہے کہ "ولیس یحسن یکتب" اور مسند احمد میں بروایت اسرائیل یہ الفاظ ہیں "ولیس یحسن ان یکتب" یعنی رسولِ اکرم ﷺ لکھنا نہیں جانتے تھے، لیکن باوجود اس کے تمام احادیث وسیر میں یہ ہے کہ: ''رسولِ اکرم ﷺ نے محمد بن عبداللہ کے الفاظ لکھ دیئے۔''

روایت کے ظاہری معنی سے بعضوں کو یہ شبہ ہوا کہ رسولِ اکرم ﷺ نے خود اپنے دستِ مبارک سے یہ الفاظ لکھے اور رسولِ اکرم ﷺ نے شائد اخیر زمانہ میں لکھنا سیکھ لیا تھا۔ ابن ابی شیبہ نے مجاہد کے واسطہ سے روایت کی ہے کہ: رسولِ اکرم ﷺ نے اس وقت تک وفات نہیں پائی جب تک رسولِ اکرم ﷺ کو پڑھنا لکھنا نہ آ گیا۔''

اور ایک اور روایت (بواسطہ یونس بن میسرہ عن ابی کیشۃ السلول عن سہل بن الحنظلیہ) نقل کی ہے کہ رسولِ اکرم ﷺ نے حضرت امیر معاویہؓ سے ایک فرمان لکھوا کر اقرع اور عیینہ کو عنایت فرمایا۔ انہوں نے رسولِ اکرم ﷺ سے آ کر کہا کہ معلوم نہیں اس میں کیا لکھا ہے؟ رسولِ اکرم ﷺ نے اس پر ایک نظر ڈال کر فرمایا: ''وہی لکھا ہے جو میں نے حکم دیا ہے۔''

اگر یہ روایتیں صحیح ہیں تو رسولِ اکرم ﷺ کا ایک اور معجزہ ہوگا کہ انسانی تعلیم کے بغیر اللہ تعالیٰ نے رسولِ اکرم ﷺ کو یہ فن بھی اپنی بارگاہ سے عنایت کیا، مگر واقعہ یہ ہے کہ یہ روایتیں تمام تر موضوع یا نہایت ضعیف ہیں۔ اس لئے رسولِ اکرم ﷺ کی اُمیّت کے متعلق جو متواتر روایتیں ہیں ان سے ان کی تنسیخ نہیں ہو سکتی۔

یہ ممکن ہے کہ اُمی سے اُمی آدمی کے ہاں جب شب و روز لکھنے پڑھنے کا کام لگا رہے تو وہ کسی قدر حرف شناس ہو جائے۔ خصوصاً اپنے نام اور دستخط کو پہچان لینا اور ان کو لکیر کھینچ کر لکھ دینا تو معمولی بات ہے۔ لیکن اصل یہ ہے کہ فاعل مجازی و حقیقی فرامین اور مراسلات

لکھاتے ہیں، محاورۂ علم میں ان کو لکھنا ہی کہتے ہیں۔

آپ کہتے ہیں کہ ''عالمگیر نے یہ فرمان لکھ دیا، شاہجہان نے جامع مسجد بنوائی، فلاں بادشاہ نے یہ قلعہ تعمیر کیا۔'' حالانکہ لکھنے والے، بنانے والے اور تعمیر کرنے والے کاتب اور معمار تھے، مگر چونکہ ان سلاطین کے حکم اور ان ہی کی طرف سے وہ لکھایا بنایا گیا، اس لئے بولنے والے خود سلاطین اور امراء کی طرف فعل کی نسبت کر دیتے ہیں۔ چنانچہ اسی محاورہ کے مطابق اس موقع پر جب رسولِ اکرم ﷺ نے سلاطین عالم کے نام دعوت نامے بھیجے ہیں، تو وہاں عام طور پر یہ الفاظ ہیں کہ ﴿و کتب الیٰ قیصر و کتب الیٰ کسریٰ.﴾

''رسولِ اکرم ﷺ نے قیصر کو یہ خط لکھا۔ کسریٰ کو یہ خط لکھا۔'' مگر سب کو معلوم ہے کہ رسولِ اکرم ﷺ نے دست خاص سے یہ خطوط لکھ کر نہیں بھیجے۔ مگر چونکہ رسولِ اکرم ﷺ ہی نے لکھوائے تھے، اس لئے ان کی نسبت رسولِ اکرم ﷺ ہی کی طرف کی گئی ہے۔

قرآن پاک نے رسولِ اکرم ﷺ کو بار بار برملا ''اُمی'' کہا ہے، اس سے زیادہ ثبوت اس کا اور کیا چاہئے، لیکن رسولِ اکرم ﷺ امی ہو کر، امیوں میں پل کر کتب سابقہ کی ظاہری تعلیم سے نا آشنا ہو کر بھی سب کچھ جانتے تھے۔ اور یہ رسولِ اکرم ﷺ کا معجزہ تھا۔ اور آپ ﷺ کی خصوصیت ہے۔

کفار کو خطاب کر کے قرآن کہتا ہے کہ محمد (ﷺ) کی صداقت کی یہ دلیل کافی نہیں کہ وہ نا آشنائے تعلیم ہو کر بھی وہ سب کچھ جانتا ہے جس کی علمائے بنی اسرائیل کے سوا اور کسی کو خبر نہیں ہے۔ **انہ لفی زبر الا ولین اولم یکن لھم اٰیۃ ان یعلمۂ علماء بنی اسرائیل .** (سورۃ الشعراء-١١) ''یہ باتیں گزشتہ پیغمبروں کی کتابوں میں ہیں، کیا ان کافروں کے لئے یہ نشانی نہیں کہ ان باتوں کو (جو ایک اُمی کی زبان سے ادا ہو رہی ہیں) بنی اسرائیل کے عالم جانتے ہیں۔'' (بحوالہ سیرت النبیؐ از علامہ شبلی نعمانیؒ و سید سلیمان ندویؒ)

اور آپ ﷺ کی اس خصوصیت کے حوالے سے مولانا قاضی سلیمان منصور پوریؒ اپنی کتاب رحمۃ اللعالمین (ﷺ) میں لکھتے ہیں کہ:- ''اُمی'' یہ محقق ہے کہ رسولِ اکرم ﷺ کے سوا

"الرسول النبی الامی" اور کسی نبی کا لقب نہ تھا۔ رسولِ اکرم ﷺ کا یہی لقب انبیائے کرام کو اور سابقہ امم کو بتایا گیا ہے۔ علماء نے اسم اُمی کے متعلق جو پاکیزہ خیالات ظاہر فرمائے ہیں۔ ناظرین کے لئے ان پر عبور موجب فرح و سرور ہوگا۔

(الف) اُمی ...... امّ القریٰ کی نسبت سے ہے، اللہ تعالیٰ نے مکہ معظّمہ کا نام ام القریٰ فرمایا ہے:۔ ﴿ولِتُنذِرَ اُمَّ القُریٰ ومَن حَولَهَا.﴾ "کہ تو ام القریٰ کو اور اس کے ارد گرد کی بستی کو ڈرائے۔" مشہور قدیم جرمن مورخ سپر ینجر اور سکر بدر کا قول ہے کہ ان محققین کی رائے بالکل درست ہے جو اولاد سام کا اصلی وطن ملک عرب کو قرار دیتے ہیں۔

اسلامی روایات صحیحہ سے بھی یہی ثابت ہوتا ہے کہ عرب میں سب سے پہلی آبادی "بلدہ مکہ معظّمہ ہے" جہاں خانہ بدوشوں نے قیام کیا اور بربریت و توحش کو چھوڑ کر عمران و تمدن کی زندگی میں داخل ہوئے۔ الغرض تاریخ اور روایات کے مجموعی اتفاق سے ثابت ہے کہ مکہ ام القریٰ ہے۔ اب سیدنا ابراہیم علیہ الصلوٰۃ السلام کی دعا کی طرف توجہ کرنا چاہئے، انہوں نے بنائے مکہ کے وقت یہ دعا کی تھی:۔ ﴿رَبِّ اجْعَلْ هٰذا بَلَدًا اٰمِنًا وَّارْزُقْ اَهْلَهٗ مِنَ الثَّمَرَاتِ﴾ (بقرہ) "اے رب! اس جگہ کو امن والا شہر بنائیو، اور یہاں والوں کو میوہ جات کھلایا کیجیو۔" دعا کے یہ الفاظ بھی ہیں: ﴿وَابعَثْ فِيهِم رَسُولاً مِّنهُم﴾ (بقرۃ) "ان میں ایک شاندار رسول بھی جو انہی میں سے ہو مبعوث کی جیو۔"

دعائے خلیل میں دو باتیں عجیب ہیں: (ا) اس بستی کے رہنے والوں کے لئے جہاں کی زمین نا قابل زراعت ہے، میوہ جات و ثمرات بکثرت ملنے کی استدعا۔ چنانچہ ان الفاظ کی برکت آج تک نظر آرہی ہے کہ مکہ کے بازار سبزیوں اور گوناگوں میوہ جات سے بھرے نظر آتے ہیں۔ یہ علامت ظاہری اس امر پر دال ہے کہ رب العالمین نے فی الواقع اپنے خلیل کی دعا کو من وعن شرفِ قبولیت بخشا۔

(۲)...... اور یہی دعا بوضوح بتلا رہی ہے کہ صرف خوراک جسمانی یا لذائذ کام و دہن تک ہی اس کا اثر محدود نہ تھا۔ بلکہ روحانیت کے لئے دعا کے الفاظ زیادہ پر زور تھے۔

وعدہ کا رسول اور دعائے خلیل کا رسول مبعوث ہوا اور بڑی شان کے ساتھ مبعوث ہوا اس کے جنسی ونسبی تعلقات انہی لوگوں کے ساتھ تھے جو اس بستی کے سردار تھے۔ لہٰذا ام القریٰ کی نسبت سے اسے امی کہنا درست ٹھہرا۔

اسم امی، ام کی طرف منسوب ہے، اس اعتبار سے کہ رسولِ اکرم ﷺ بوجہ پاکی فطرت وعصمت منجانب رب العزت جملہ عیوب نقائص سے ایسے ہی پاک وصاف ہیں جیسا کہ ماں کے پیٹ سے پیدا شدہ بچہ ہوتا ہے۔ ام المؤمنین حضرت عائشہ طیبہؓ نے انہیں معانی پر نظر رکھتے ہوئے اشعار ذیل رسولِ اکرم ﷺ کی شان میں پڑھے تھے اور ان اشعار کو سنکر رسولِ اکرم ﷺ نہایت مسرور ہوئے تھے۔

ومبرء من کل غیر حیضة .... وفساد مرضعة وداءِ مخیل

واذا نظرت الیٰ اسرة وجهه .... برقت بروق العارض المتهلل

اور امی ام کی طرف منسوب ہے، اس اعتبار سے کہ رسولِ اکرم ﷺ نے ولادت کے بعد اکتساب علوم وفنون کی جانب کوئی رغبت نہ کی تھی اور رسولِ اکرم ﷺ کی لوح قلب پر تقریراً یا تحریراً کسی ایک حرف کا نقش بھی ثبت نہ ہوا تھا۔

ملک عرب کی حالت بھی یہی تھی کہ وہ لکھنے پڑھنے سے عاری ہوتے تھے، وہ اپنی تمام عمر اسی حالت میں پوری کردیا کرتے، جو ایک ایسے بچہ کی ہوتی ہے جو نہ مکتب گیا، نہ درس، نہ قلم ہاتھ میں پکڑا نہ سبق زبان پر جاری ہوا۔ یہودیوں نے اسی لئے اہل عرب کا نام ''امیون'' رکھ دیا تھا۔ ﴿ذٰلِکَ بِاَنَّھُم قَالُوا لَیسَ عَلَینَا فِی الاُمِّیِّینَ سَبِیل﴾

''یہودی کہتے ہیں کہ ہم ان امی لوگوں کے ساتھ خواہ کچھ ہی برتاؤ کریں، ہم پر کچھ مواخذہ نہ ہوگا۔'' یہی نام اہل عرب کے لئے معرفہ بن گیا تھا۔

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: ﴿ھُوَ الَّذِی بَعَثَ فِی الاُمِّیِّینَ رَسُولاً﴾ (سورۂ جمعہ)

''اللہ وہ ہے جس نے امیوں کے اندر شاندار رسول کو مبعوث فرمایا۔''

یہ ہی لفظ اہل کتاب کے ناخواندہ اشخاص کے لئے بھی اللہ تعالیٰ نے استعمال فرمایا

ہے: ﴿ومِنهُم اُمِّیُّونَ لَا یَعلَمُونَ الکِتٰبَ﴾ ''یہودیوں میں ایسے ناخواندہ بھی ہیں، جن کو کتاب کا کچھ علم نہیں۔ الغرض لفظ امی سے ثابت ہوتا ہے کہ رسولِ اکرم ﷺ طرز وطریق خواندگی میں اہل دنیا سے بالاتر تھے۔ اللہ تعالیٰ نے اس مضمون کو دوسری جگہ اس طرح ظاہر فرمایا ہے: وما کنت تتلوا من قبلہٖ من کتاب ولا تخطہٗ بیمینک اذاً لارتاب المبطلون. اے رسول قرآن سے پہلے تو تم نہ کسی کتاب کو پڑھا کرتے تھے اور نہ تمہارے دست راست نے کبھی کوئی خط کھینچا تھا، تب تو یہ بطلان والے شک بھی کر سکتے۔

معنی بالا کے لحاظ سے اسم نبی الامی رسولِ اکرم ﷺ کا ایک بڑا معجزہ ہے۔ واضح ہو کہ نبی، نباء سے ہے اور نباء واقعہ عظیم اور اعلام ذوالاہتمام کو کہتے ہیں۔ یعنی نبی وہ ہے جو علوم عالیہ اور وقائع کی اطلاع اہل عالم کو دیتا ہو اور جب یہ لفظ اللہ کی طرف سے مضاف ہوتا ہے تب اس کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ نبی وہ جو علوم عالیہ اور شرائع عالیہ اور نوامیس ربانیہ کی اطلاع براہ راست اللہ تعالیٰ سے کرتا ہو۔

نبی کو نباوۃ سے بھی مشتق بتایا گیا ہے، نباوت کے معنی مقام مرتفع ہیں اور نبی وہ ہے جو اس مقام علیا پر فائز ہو۔ جہاں کوئی انسان اکتساب ومحنت وریاضت سے نہیں پہنچ سکتا اور اس مقام پر اس کے فائز ہونے کا سبب محض اصطفائے ربانی ہوتا ہے۔ نبی الامی کے وصف نے بتلا دیا کہ حضور حرف شناسی وخط کشی سے تو دور رہیں اور با ایں ہمہ علوم عظیمہ وآیات کاملہ کا صدور رسولِ اکرم ﷺ سے برابر ہوتا رہا۔

اہل سیرت جانتے ہیں کہ آپ ﷺ کو نبی الامی کے لقب سے یاد کیا جاتا، اور بلایا جاتا اور آپ ﷺ اسی طرز خطاب سے خرسند ومسرور ہوا کرتے تھے۔ اب اہل زمانہ کا حال دیکھو کہ جونہی کسی شخص کو ذرا شدبد کہنے کی لیاقت پیدا ہوئی تو وہ اپنے لئے فاضل اکمل، لوذعی اور المعی، علامہ وغیرہ الفاظ سننا اور کہلانا پسند کرتے ہیں۔ اور یہ ہر ایک صاحب قلم وزبان آور کا فطری خاصہ سا ہو گیا ہے، کہ وہ چاہتا ہے کہ اصلیت سے بڑھ کر اس کے علم وفضل کا اندازہ لگایا جائے، لیکن ایک سیدنا رسولِ اکرم ﷺ ہیں، جن کو ہر وقت ناخواندگی کا اعتراف اور امی

ہونے کا اقرار ہے۔

اس اعتراف واقرار پر بھی ہزاروں علماء سینکڑوں فلاسفر حاضر ہوتے، زانوئے ادب تہہ کرتے اور اقرار کرتے کہ ان لوگوں کا علم وفہم اور حضور کا عرفان قطرہ وقلزم کی مثال رکھتے ہیں۔ غور کیجئے کہ جو شخص دنیا میں کسی کا شاگرد نہیں بنا وہ تمام دنیا کا استاد بنا ہوا ہے، محاسن اخلاق، محامد اعمال، تدبیر منزل، سیاستِ مدن، اقتصادیات، سیاسیات، عمرانیات کے درس اور دماغ کو روشن، قلب کو مجلی، روح کو منور بنانے والی تعلیم دے رہا ہے، اس کی درس گاہ قدس کے دروازے کبھی بند نہیں ہوتے وہاں داخلہ کی کوئی فیس نہیں ہے وہاں ایک صحرائی نشین اور ایک شہری، ایک فلاسفر اور ایک بدوی پہلو بہ پہلو بیٹھے ہوئے ہیں اور یہ آن واحد اپنی اپنی استعداد وقابلیت کے موافق مستفیض ومستفید ہو رہے ہیں۔ اندریں صورت امی لقب سے ''عَلَّمَنِی ربی فاحسن تادیبی کا نور ظہور بخش ہے اور وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَاب کا دعویٰ متحقق ہو رہا ہے۔

لقب امی کی وجہ یہ بھی ہے کہ اول انبیاء ابوالبشر حضرت آدم (علیہ السلام) سے لے کر آخر الانبیاء بنی اسرائیل عبداللہ عیسیٰ بن مریمؑ تک جملہ انبیاء ومرسلین نے رسولِ اکرم ﷺ کے نعوت عالیہ اور اوصاف جلیہ بیان کئے۔ الف سے آدمؑ میم سے مسیحؑ مراد ہے اور یائے نسبت اس راز کی کاشف ہے۔ (بحوالہ رحمۃ للعالمین ج۳)

يَا رَبِّ صَلِّ وَسَلِّمْ دَائِمًا اَبَدًا عَلٰى حَبِيْبِكَ خَيْرِ الْخَلْقِ كُلِّهِم

خصوصیت نمبر۲۷

رسولِ اکرم ﷺ کی سیرت عالمگیر اور دائمی نمونہ عمل ہے

قابل احترام قارئین! رسولِ اکرم ﷺ کی امتیازی خصوصیات میں سے یہ بہتر ویں خصوصیت ہے، جسکا عنوان ہے"رسولِ اکرم ﷺ کی سیرت عالمگیر اور دائمی نمونہ عمل ہے" الحمدللہ دیگر خصوصیات کی طرح اس خصوصیت کو ترتیب دینے کے لئے بھی اللہ تعالیٰ نے روضہ رسول ﷺ کا قرب عطا فرمایا اور روضہ رسول ﷺ کے سائے میں بیٹھ کر میں نے اس خصوصیت کو فائنل ترتیب دیا، اس سعادت کے ملنے پر میں اپنے اللہ تعالیٰ کا جتنا زیادہ شکر ادا کروں کم ہے، اور اسی اللہ کی ذات سے امید بھی ہے کہ اس رحیم اللہ کے حکم سے میری اس کاوش کی بدولت میرے گناہوں کی بخشش بھی ہوگی اور انشاء اللہ اللہ کی توفیق سے روز قیامت رسولِ اکرم ﷺ کی شفاعت بھی نصیب ہوگی، بس اسی امید پر باوجود لوگوں کے اژدھام ہونے کے آقا ﷺ کی محبت میں لکھ رہا ہوں زبان پر درود جاری ہے، اور جس قدر روضہ مبارک کے سائے میں درود پڑھتا ہوں ایمانی کیفیت میں اضافہ نظر آتا ہے اور قلم چلاتے ہوئے ایک روحانی سرور نصیب ہوتا ہے، اللہ تعالیٰ ہم سب میں سے ہر ایک کو بار بار آقا ﷺ کے روضے کی زیارت کرنے کی توفیق عطا فرمائے، آمین یارب العالمین۔

بہر حال محترم قارئین! رسولِ اکرم ﷺ کی یہ خصوصیت جو آپ کی خدمت میں پیش کی جارہی ہے عظیم خصوصیت ہے کہ ہمارے نبی ﷺ کی سیرت عالمگیر اور دائمی نمونہ عمل ہے، جبکہ ہم دیگر انبیاء کرام کی سیرتوں کا مطالعہ کرتے ہیں تو انکی سیرت عالمگیر بھی نہیں کہ وہ محدود علاقے اور محدود لوگوں کی طرف اور محدود زمانے کے لئے آتے رہے لیکن ہمارے نبی ﷺ عالمگیر نبوت کا تاج پہن کر آئے اس لئے کہا کہ ہمارے نبی ﷺ کی سیرت عالمگیر ہے، اور اسی

طرح ہمارے نبی ﷺ کی سیرت دائمی بھی ہے دیگر انبیاء کرامؑ کی سیرت دائمی نہیں کہ آج ان کی سیرت پر عمل کرنے والا کوئی نہیں، کیونکہ جیسا کہ عرض کیا کہ وہ محدود علاقہ وزمانہ تک کے لئے آتے تھے، اس لئے ان کی سیرت ان ہی کے زمانے تک رہی اور بعد میں لوگوں نے ان کی کتابوں تک کو بدل ڈالا، اور ہمارے نبی ﷺ دائمی سیرت لیکر آئے کہ بے شک آج اربوں کھربوں لوگ ان کی سیرت پر عمل کرنے والے لوگ موجود ہیں تو معلوم ہوا کہ اس خصوصیت کا مظہر بھی صرف اور صرف ہمارے نبی ﷺ ہیں، لیکن جیسا کہ ہم پہلے بھی وضاحت کرتے آئیں ہیں کہ ہمارا مقصد دیگر انبیاء کرامؑ کی تنقیص نہیں ہے ۔ (اعاذنا الله منه) بیشک تمام انبیاء کرامؑ کی تعظیم ہمارے ایمان کا لازمی حصہ ہے بلکہ ہمارا اصل مقصد اپنے نبی ﷺ کے مقام کو واضح کر کے امت کے دل میں نبی کی محبت کو اجاگر کرنا اور عمل کے شوق کو ابھارنا ہے بہر حال آپ آنے والے اوراق میں انشاء اللہ اس خصوصیت سے متعلق تفصیل ملاحظہ کریں گے، دعا کیجئے کہ اللہ تعالیٰ ہم سب کو اپنے نبی ﷺ کی سیرت وصورت پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے، آمین یارب العالمین ۔تو لیجئے قارئین تفصیل ملاحظہ فرمایئے:۔

بہترہویں خصوصیت کی وضاحت قرآن واحادیث کی روشنی میں

انسان کے حال و مستقبل کی تاریکی کو چاک کرنے کے لئے ماضی کی روشنی سے فیض حاصل کرنا ضروری ہے، جن مختلف انسانی طبقوں نے ہم پر احسان کئے ہیں، وہ سب شکریہ کے مستحق ہیں، لیکن سب سے زیادہ ہم پر جن بزرگوں کا احسان ہے وہ انبیائے کرام علیہم السلام ہیں، ان میں سے ہر ایک نے اپنے اپنے وقت میں اپنی اپنی قوموں کے سامنے اس زمانہ کے مناسب حال اخلاق عالیہ اور صفات کاملہ کا ایک نہ ایک بلند ترین معجزانہ نمونہ پیش کیا، کسی نے صبر، کسی نے ایثار، کسی نے جوش توحید، کسی نے ولولۂ حق، کسی نے تسلیم، کسی نے عفت، کسی نے زہد، غرض ہر ایک نے دنیا میں انسان کی پُر پیچ زندگی کے راستہ میں ایک ایک منار قائم کردیا ہے، جس سے صراط مستقیم کا پتہ لگ سکے۔ مگر ضرورت تھی ایک ایسے رہنما اور

رہبر کی جو اس سرے سے لے کر اس سرے تک پوری راہ کو اپنی ہدایات اور عملی مثالوں سے روشن کر دے۔ گویا ہمارے ہاتھ میں اپنی عملی زندگی کا پورا گائڈ بک دے دے، جس کو لے کر اسی کی تعلیم و ہدایت کے مطابق ہر مسافر بے خطر منزل مقصود کا پتہ پا لے۔ یہ راہنما سلسلۂ انبیاء کے آخری فرد محمد مصطفیٰ احمد مجتبیٰ ﷺ ہیں، قرآن نے کہا۔ یآ ایُّھا النبیُّ اِنَّا اَرسلنکَ شاھداً وَّمُبَشِّراً وَّنذیراً ۔ وَدَاعِیاً اِلَی اللہ بِاِذْنِہٖ وسِراجاً مُّنیراً. (احزاب۔ ع٦)

اے پیغمبر ہم نے تجھ کو گواہی دینے والا اور (نیکوں کو) خوشخبری سنانے والا اور (غافلوں کو) ہوشیار کرنے والا، اور خدا کی طرف اس کے حکم سے پکارنے والا، اور ایک روشن کرنے والا چراغ بنا کر بھیجا ہے۔

آپ ﷺ عالم میں خدا کی تعلیم و ہدایت کے شاہد ہیں، نیکوکاروں کو فلاح و سعادت کی بشارت سنانے والے مبشر ہیں، ان کو جو ابھی تک بے خبر ہیں، ہوشیار اور بیدار کرنے والے نذیر ہیں، بھٹکنے والے مسافروں کو خدا کی طرف پکارنے والے داعی ہیں، اور خود ہمہ تن نور اور چراغ ہیں، یعنی آپ کی ذات اور آپ کی زندگی راستہ کی روشنی ہے، جو راہ کی تاریکیوں کو کافور کر رہی ہے، یوں تو ہر پیغمبر خدا کا شاہد، داعی، مبشر اور نذیر وغیرہ بن کر اس دنیا میں آیا ہے، مگر یہ کل صفتیں سب کی زندگیوں میں عملاً یکساں نمایاں ہو کر ظاہر نہیں ہوئیں، بہت سے انبیاء تھے جو خصوصیت کے ساتھ شاہد ہوئے جیسے حضرت یعقوب علیہ السلام، حضرت اسحاق علیہ السلام، حضرت اسماعیل علیہ السلام وغیرہ، بہت سے تھے جو نمایاں طور پر مبشر بنے، جیسے حضرت ابراہیم علیہ السلام، حضرت عیسیٰ علیہ السلام، بہت سے تھے جن کا خاص وصف نذیر تھا جیسے حضرت نوح علیہ السلام، حضرت موسیٰ علیہ السلام، حضرت ہود علیہ السلام، وحضرت شعیب علیہ السلام، بہت سے تھے جو امتیازی حیثیت سے داعی حق تھے، جیسے حضرت یوسف علیہ السلام، حضرت یونس علیہ السلام، لیکن جو شاہد مبشر، نذیر، داعی، سراج منیر، سب کچھ بیک وقت تھا، اور جس کے مرقع حیات میں یہ سارے نقش و نگار عملاً نمایاں تھے، وہ صرف محمد رسول اللہ علیہ الصلوٰۃ والتحیات تھے اور یہ اس لئے ہوا کہ آپ دنیا کے آخری پیغمبر بنا کر بھیجے گئے تھے، جس کے بعد کوئی دوسرا آنے والا نہ

تھا۔ آپ ایسی شریعت لے کر بھیجے گئے جو کامل تھی، جس کی تکمیل کے لئے پھر کسی دوسرے کو آنا نہ تھا۔

آپ کی تعلیم دائمی وجود رکھنے والی تھی، یعنی قیامت تک اس کو زندہ رہنا تھا، اس لئے آپ کی ذات پاک کو مجموعۂ کمال اور دولتِ بے زوال بنا کر بھیجا گیا۔

محترم قارئین! یہ جو کچھ ہم نے کہا، یہ ہمارے مذہبی عقیدہ کی بنیاد پر محض کوئی دعویٰ نہیں ہے، بلکہ یہ وہ واقعہ ہے جس کی بنیاد دلائل اور شہادتوں پر قائم ہے۔

وہ سیرت یا نمونۂ حیات جو انسانوں کے لئے ایک آئیڈیل سیرت کا کام دے اُس کے لئے متعدد شرطوں کی ضرورت ہے جن میں سب سے پہلی اور اہم شرط تاریخیت ہے۔

تاریخیت سے مقصود یہ ہے کہ ایک کامل انسان کے جو سوانح اور حالات، پیش کئے جائیں، وہ تاریخ اور روایت کے لحاظ سے مستند ہوں، ان کی حیثیت قصوں اور کہانیوں کی نہ ہو، روزمرہ کا تجربہ ہے کہ انسان کی ایک سائیکالوجی یہ ہے کہ کسی سلسلۂ حیات کے متعلق اگر یہ معلوم ہو جائے کہ فرضی اور خیالی ہے، یا مشتبہ ہے تو خواہ وہ کسی قدر موٴثر انداز میں ''کیوں نہ پیش کیا جائے طبیعتیں اس سے دیرپا اور گہرا اثر نہیں لیتیں اس لئے ایک کامل سیرت کے لئے ضروری ہے کہ پہلے اس کے تمام اہم اجزا کی تاریخیت پر یقین ہو، یہی سبب ہے کہ تاریخی افسانوں سے جو اثر طبیعتوں میں پیدا ہوتا ہے، وہ خیالی افسانوں سے نہیں ہوتا۔

دوسرا سبب تاریخی سیرت کے ضروری ہونے کا یہ ہے کہ آپ اس سیرت کاملہ کا نقشہ محض دلچسپی یا فرصت کے گھنٹوں کی مشغولی کے لئے نہیں پیش کرتے، بلکہ اس غرض سے پیش کرتے ہیں کہ اپنی زندگی اس نمونہ پر ڈھالیں، اور اس کی پیروی وتقلید کریں، لیکن وہ زندگی اگر تاریخی اور واقعی طور سے ثابت نہیں، تو آپ کیونکر اس کے قابل عمل اور پیروی تقلید کے لائق ہونے پر زور دے سکتے ہیں، کہا جاسکتا ہے کہ یہ فرضی اور میتھالوجیکل قصے ہیں جن پر کوئی انسان اپنی عملی زندگی کی بنیاد نہیں ڈال سکتا اس لئے کیا پُر اثر ہونے کے لئے سب سے پہلے ضروری یہ ہے کہ اس کامل انسان کی سیرت تاریخی اسناد کے معیار پر پوری اترے۔

ہم تمام انبیائے کرام علیہم السلام کا ادب اور احترام کرتے ہیں، اور ان کے سچے پیغمبر ہونے پر یقین رکھتے ہیں، لیکن قرآن کے مطابق ذٰلِکَ فَضْلُ اللّٰہِ یُؤْتِیْہِ مَنْ یَّشَآءُ ''کہ یہ پیغمبر ہیں جن میں سے بعض کو بعض پر ہم نے فضیلت دی ہے'' دوام بقاء، ختم نبوت اور آخری کامل انسانی سیرت ہونے کی حیثیت سے محمد رسول اللہ ﷺ کو جو خاص شرف عطا ہوا ہے، وہ دیگر انبیاء کو اس لئے نہیں مرحمت ہوا، کہ ان کو دائمی، آخری اور خاتمِ نبوت نہیں بنایا گیا تھا، ان کی سیرتوں کا مقصد ایک خاص قوم کو ایک خاص زمانہ تک نمونہ دینا تھا، اس لئے اس زمانہ کے بعد بتدریج وہ دنیا سے مفقود ہو گئیں۔

غور کرو کہ ہر ملک میں، ہر زمانہ میں، ہر زبان میں کتنے لاکھ انسان خدا کا پیغام لے کر آئے ہوں گے، ایک اسلامی روایت کے مطابق ایک لاکھ ۲۴ ہزار پیغمبر آئے، مگر آج ان میں سے کتنوں کے نام ہم جانتے ہیں، اور جتنوں کے نام جانتے بھی نہیں ہیں، اُن کا حال کیا جانتے ہیں؟ دنیا کی تمام قوموں میں سب سے زیادہ قدیم، اور پرانے ہونے کا دعویٰ ہندوؤں کو ہے، گو وہ مسلم نہیں، لیکن بغور دیکھو کہ اُن کے مذہب میں سینکڑوں کیرکٹروں کے نام ہیں، مگر اُن میں سے کسی کو ''تاریخی'' ہونے کی عزت حاصل نہیں ہے، ان میں سے بہت سے کے تو نام کے سوا کسی اور چیز کا ذکر تک نہیں اور میتھالوجی سے آگے بڑھ کر تاریخ کے میدان میں اُن کا گزر نہیں، ان میں بہتر سے بہتر معلوم کیرکیٹر وہ ہیں جو مہا بھارت اور رامائن کے ہیرو ہیں، مگر اُن کی زندگی کے واقعات میں سے تاریخ کس کو کہہ سکتے ہیں، یہ بھی معلوم نہیں کہ یہ زمانہ کے کس دور، اور دور کی کس صدی، اور صدی کے کس سال کے واقعے ہیں، اب یورپ کے بعض علماء بیسیوں قیاسات سے کچھ کچھ تقریبی تاتخمینی زمانوں کی تعیین کرتے ہیں، اور انہی کو ہمارے ہندو تعلیم یافتہ اصحاب اپنے علم کی سند جانتے ہیں، لیکن یورپ کے محققین میں سے زیادہ تر تو ان کو تاریخ کا درجہ ہی نہیں دیتے اور یہ تسلیم نہیں کرتے کہ یہ فرضی داستانیں کبھی عالمِ وجود میں بھی آئی تھیں۔

ایران کے پرانے مجوسی مذہب کا بانی زرتشت اب بھی لاکھوں آدمیوں کی عقیدت کا

مرکز ہے مگر اس کی تاریخی شخصیت بھی قدامت کے پردہ میں گم ہے، یہاں تک کہ اس کے تاریخی وجود کے متعلق بھی بعض شکّی مزاج امریکی اور یوروپین علماء کو شبہ ہے، مستشرقین میں سے جو لوگ اس کے تاریخی وجود کو تسلیم کرتے ہیں، سینکڑوں قیاسات سے اس کے حالات زندگی کی کچھ کچھ تعیین کرتے ہیں، تاہم وہ بھی مختلف محققین کی باہمی متضاد رایوں سے اس قدر مشکوک ہیں کہ کوئی انسان اُن کے بھروسہ پر عملی زندگی کی بنیاد نہیں قائم کرسکتا، زرتشت کی جائے پیدائش، سال پیدائش قومیت، خاندان، مذہب، تبلیغ مذہب، مذہبی صحیفہ کی اصلیّت، زبان، سال وفات، جائے وفات ان میں سے ہر ایک مسئلہ سینکڑوں اختلافات کا مرجع ہے، اور صحیح روایتوں کا اس قدر فقدان ہے کہ بجز تخمینی قیاسات کے اور کوئی روشنی ان سوالات کی تاریکیوں کو دور نہیں کرسکتی، بااین ہمہ پارسی اصحاب ان مشکوک قیاسی باتوں کا علم براہ راست اپنی روایتوں سے نہیں رکھتے بلکہ یورپین اور امریکن اسکالرس کی تلقینات سے وہ ابھی سمجھنے کی کوشش کررہے ہیں، اور جو ان کے ذاتی ذرائع علم ہیں وہ فردوسی کے ''شاہنامہ'' سے آگے نہیں بڑھے، یہ عذر بیکار ہے، کہ یونانی دشمنوں نے ان کو مٹادیا، یہاں بہر حال ہم کو صرف اتنا بتانا ہے کہ وہ مٹ گئے، خواہ وہ کسی طرح سے مٹے ہوں، اور یہی اس بات کی دلیل ہے کہ اُن کو دوام اور بقاء کی زندگی نہ ملی، اور کرن اور ڈرامٹیٹر جیسے محققین کو زرتشت کی شخصیت تاریخی سے انکار کرنا پڑا۔

قدیم ایشیا کا سب سے زیادہ وسیع مذہب بودھ ہے جو کبھی، ہندوستان، چین، اور تمام ایشیائے وسطی، افغانستان، ترکستان تک پھیلا ہوا تھا۔ اور اب بھی برما سیام، چین، جاپان، اور تبت میں موجود ہے، ہندوستان میں تو یہ کہنا آسان ہے کہ برہمنوں نے اس کو مٹادیا۔ اور ایشیائے وسطی میں اسلام نے اس کا خاتمہ کردیا، مگر تمام ایشیائے اقصیٰ میں تو اس کی حکومت، اس کی تہذیب، اس کا مذہب تلوار کی قوت کے ساتھ ساتھ قائم ہے اور اس وقت سے اب تک غیر مفتوح ہے، لیکن کیا یہ چیزیں بودھ کی زندگی اور سیرت کو تاریخی روشنی میں برقرار رکھ سکیں اور ایک مورخ اور سوانح نگار کے تمام سوالات کا وہ تشفی بخش جواب دے سکتی

ہیں؟ خود بدھ کے زمانۂ وجود کی تعیین مگدھ دیس کے راجاؤں کے واقعات سے کی جاتی ہے ورنہ کوئی دوسرا ذریعہ نہیں ہے اور ان راجاؤں کا زمانہ بھی اس طرح متعین ہو سکا ہے کہ اُن کے سفارتی تعلقات اتفاقاً یونانیوں سے قائم ہو گئے تھے، جینی مذہب کے بانی کا حال اس سے بھی زیادہ غیر یقینی ہے اور چین کے بانی مذہب کنفیوشش کی نسبت ہم کو بودھ سے بھی کم واقفیت ہے، حالانکہ اس کے ماننے والوں کی تعداد کروڑوں سے بھی زیادہ ہے۔

سامی قوم میں سینکڑوں پیغمبر آئے، لیکن نام کے سوا تاریخ نے اُن کا اور کچھ حال نہ جانا ، حضرت نوح علیہ السلام، حضرت ابراہیم علیہ السلام، حضرت ہود علیہ السلام، حضرت صالح علیہ السلام، حضرت اسماعیل علیہ السلام، حضرت اسحاق علیہ السلام، حضرت یعقوب علیہ السلام، حضرت زکریا علیہ السلام، حضرت یحییٰ علیہ السلام کے حالات اور سیرتوں کے ایک ایک حصہ کے علاوہ کیا ہم کو کوئی کچھ بتا سکتا ہے؟ ان کی سیرتوں کے ضروری اجزاء تاریخ کی کڑیوں سے بہر حال گم ہیں، اب اُن کی مقدس زندگیوں کے ادھورے اور نامربوط حصے کیا ایک کامل انسانی زندگی کی تقلید اور پیروی کا سامان کر سکتے ہیں؟ قرآن مجید کو چھوڑ کر یہودیوں کے جن اسفار میں ان کے حالات درج ہیں، ان میں سے ہر ایک کی نسبت محققین کو مختلف شکوک ہیں، اور اگر ان شکوک سے ہم قطع نظر بھی کر لیں تو ان کے اندر بزرگوں کی تصویریں کس درجہ ادھوری ہیں۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کا حال ہمیں تورات سے معلوم ہوتا ہے، مگر خود وہ تورات جو آج موجود ہے، اہل تحقیق کے بیان کے مطابق جیسا کہ خود مصنفینِ انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا تسلیم کرتے ہیں حضرت موسیٰ علیہ السلام کے صدہا سال کے بعد عالمِ وجود میں آئی ہے اس پر بھی اب جرمن اسکالرس نے پتہ لگایا ہے، کہ موجودہ تورات میں پہلو بہ پہلو ہر واقعہ کے متعلق دو مختلف صورتوں یا روایتوں کا سلسلہ ہے، جو باہم کہیں کہیں متضاد ہیں، اور یہی سبب ہے کہ تورات کے سوانح واقعات میں ہر قدم پر ہم کو تضاد بیان سے سابقہ پڑتا ہے اس تھیوری کی تفصیل انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا کے اخیر اڈیشن کے آرٹکل ''بائبل'' میں موجود ہے، اب ایسی صورت میں حضرت موسیٰ علیہ السلام بلکہ حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر حضرت موسیٰ علیہ السلام تک کے واقعات

کی تاریخی حیثیت کیا رہ جاتی ہے۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے حالات انجیلوں میں درج ہیں، مگر ان بہت سی انجیلوں میں سے آج عیسائی دنیا کا بڑا حصہ صرف چار انجیلوں کو تسلیم کرتا ہے، باقی انجیل طفولیت انجیل برناباس وغیرہ نامستند ہیں، ان چار انجیلوں میں سے ایک انجیل کے لکھنے والے نے بھی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو خود نہیں دیکھا تھا، انہوں نے کسی سے سن کر یہ حالات کا مجموعہ لکھا ، یہ بھی معلوم نہیں ، بلکہ اب تو یہ بھی مشکوک سمجھا جاتا ہے کہ ان چار آدمیوں کی طرف اُن کی نسبت کی جاتی ہے، وہ نسبت صحیح بھی ہے، یہ بھی واضح طور سے ثابت نہیں کہ وہ کن زبانوں میں اور کن زمانوں میں لکھی گئیں ۶۰ ءسے لے کر بعد کے متعدد مختلف سالوں تک مختلف مفسرین ،اناجیل ،اُن کی تصنیف کا زمانہ بتاتے ہیں ،حضرت عیسیٰ کی پیدائش وفات اور تثلیث کی تعلیم ان سب کو سامنے رکھ کر اب بعض امریکن نقاد اور رشینلسٹ یہ کہنے لگے ہیں ، کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا وجود محض فرضی ہے اور اُن کی پیدائش ،اور تثلیث کا بیان یونانی ورومی متھالوجی کی محض نقالی ہے، کیونکہ اس قسم کے خیالات ان قوموں میں مختلف دیوتاؤں اور ہیروؤں کے متعلق پہلے سے موجود تھے چنانچہ چکاگو کے مشہور رسالہ روپن کورٹ میں مہینوں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے فرضی وجود ہونے پر بحث رہی ہے، اس بیان سے عیسائی روایتوں کے ذریعہ سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی زندگی کی تاریخی حیثیت کتنی کمزور معلوم ہوتی ہے۔

اور اسی طرح کسی انسانی سیرت کے دائمی نمونۂ عمل بننے کے لئے تاریخیت کے ساتھ کاملیت کا ہونا بھی ضروری ہے یعنی یہ بھی ضروری ہے کہ اس کے صحیفۂ حیات کے تمام حصّے ہماری نگاہوں کے سامنے ہو کوئی واقعہ پردۂ راز ،اور ناواقفیت کی تاریکی میں گم نہ ہو، بلکہ اس کے تمام سوانح اور حالات روزِ روشن کی طرح دنیا کے سامنے ہوں تاکہ معلوم ہو سکے کہ اس کی سیرت کہاں تک انسانی سوسائٹی کے لئے ایک آئیڈیل زندگی کی صلاحیت رکھتی ہے۔اس معیار پر اگر شارعین ادیان اور بانیانِ مذاہب کے سوانح اور سیرتوں پر نظر ڈالو تو معلوم ہوگا کہ محمد رسول اللہ ﷺ کے سوا اور کوئی ہستی اس معیار پر پوری نہیں اترتی ،اسی سے

معلوم ہوتا ہے کہ آپ خاتم الانبیاء ہو کر دنیا میں تشریف لائے تھے ہم کہہ چکے ہیں کہ ہزاروں ،لاکھوں انبیاء علیہم السلام اور مصلحین دین کے زمرہ میں سے صرف تین چار ہی ہستیاں ایسی ہیں جو تاریخی کہی جاسکتی ہیں۔ لیکن کاملیت کی حیثیت سے وہ بھی پوری نہیں ہیں ،غور کرو کہ مردم شماری کے لحاظ سے آج بودھ کے پیرو دنیا کی آبادی کے چوتھائی حصہ پر قابض ہیں ،مگر بااین ہمہ تاریخی حیثیت سے بدھ کی زندگی صرف چند قصوں اور کہانیوں کا مجموعہ ہے،لیکن اگر ہم انہی قصوں اور کہانیوں کو تاریخ کا درجہ دے کر بودھ کی زندگی کے ضروری سے ضروری اور اہم سے اہم اجزاء تلاش کریں تو ہم کو ناکامی ہوگی ،ان کہانیوں اور قصوں سے ہم کو زیادہ سے زیادہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ کسی زمانہ میں نیپال کی ترائی کے کسی ملک میں ایک راجہ کا لڑکا تھا ،جس نے فطرۃً سوچنے والی طبیعت پائی تھی ،جوان ہونے اور ایک بچہ کا باپ بننے کے بعد اتفاقاً اس کی نظر چند مصیبت زدہ انسانوں پر پڑی ،اس کی طبیعت بے حد متاثر ہوئی اور وہ گھر بار چھوڑ کر دیس سے نکل گیا ،اور بنارس ،گیا پاٹلی پتر (پٹنہ) اور راجگیر (بہار) کے کبھی شہروں میں اور کبھی جنگلوں میں اور پہاڑوں میں پھرتا رہا اور خدا جانے عمر کی کتنی منزلیں طے کرنے کے بعد اُس نے گیا کے ایک درخت کے نیچے انکشاف حقیقت کا دعویٰ کیا۔ اور بنارس میں سے بہار تک اپنے نئے مذہب کا وعظ کہتا رہا ،پھر اس دنیا سے رخصت ہو گیا ،یہ خلاصہ ہے بودھ کے متعلق ہماری معلومات کا۔

زرتشت بھی ایک مذہب کا بانی ہے ،مگر ہم بتا چکے ہیں کہ قیاسات کے سوا اس کی زندگی اور سیرت کا بھی سراغ نہیں ملتا ،ان قیاسات سے بھی جو کچھ معلوم ہوا ہے اُس کو ہم بجائے اپنی زبان سے کہنے کے بیسویں صدی کے مستند خلاصۂ معلومات انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا کے آرٹیکل زراسٹر سے نقل کرتے ہیں۔

''زرتشت کی جس شخصیت سے (گاتھا کے) ان اشعار میں ہماری ملاقات ہوئی ہے ،وہ نئے اوستا کے زرتشت سے بالکل مختلف ہے ،وہ ٹھیک متضاد ہے ،اس دوسرے افسانہ کی معجزانہ شخصیت سے (اس کے بعد گاتھا کے کچھ واقعی حالات نقل کر کے مضمون نگار لکھتا

ہے) تاہم ہم یہ توقع نہ کریں، کہ ہم گاتھا سے زرتشت کے فیصلہ کن حالات جان سکتے ہیں ،وہ ہم کو زرتشت کی لائف کا کوئی تاریخی بیان نہیں دیتی اور جو کچھ ملتا بھی ہے، اس کے معنی یا تو صاف نہیں ہیں یا غیر مفہوم ہیں۔" زرتشت کے متعلق موجودہ زمانہ کی تصنیفات کا باب شروع کرتے ہوئے یہ مضمون نگار لکھتا ہے۔

"اس کی جائے پیدائش کی تعیین کے متعلق شہادتیں متضاد ہیں۔" اس کے زمانہ کے تعین کے متعلق بھی یونانی مؤرخین کے بیانات، نیز موجودہ، محققین کے قیاسات مختلف ہیں ،مضمون نگار لکھتا ہے۔" زرتشت کے زمانہ سے ہم قطعاً ناواقف ہیں۔"

بہر حال جو کچھ ہم کو معلوم ہے وہ یہ ہے کہ آذربائیجان کے کسی مقام میں پیدا ہوا، بلخ وغیرہ کی طرف تبلیغ کی ہشتاسپ بادشاہ نے اس کے مذہب کو اختیار کیا، کچھ اُس نے غیر معمولی معجزے دکھائے، اس نے شادی بیاہ کیا، اولادیں ہوئیں، اور پھر کہیں مرگیا، ایسی نامعلوم ہستی کے متعلق کوئی کاملیت کا گمان بھی کرسکتا ہے، اور اس کی زندگی انسانی سوسائٹی کے لئے چراغ راہ بن سکتی ہے، یا بنائی جاسکتی ہے؟

انبیائے سابقین میں سب سے مشہور زندگی حضرت موسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام کی ہے ،موجودہ تورات کے مستند یا غیر مستند ہونے کی بحث سے قطع نظر کر کے ہم اس کے بیانات کو بالکل صحیح تسلیم کیے لیتے ہیں، تاہم تورات کی پانچوں کتابوں سے ہم کو حضرت موسیٰؑ کی زندگی کے کس قدر اجزاء ہاتھ آتے ہیں؟ جو کچھ ہے وہ یہ ہے کہ حضرت موسیٰ پیدا ہو کر فرعون کے گھر پرورش پاتے ہیں، جوان ہو کر فرعونیوں کے مظالم کے خلاف بنی اسرائیل کی ایک دو موقعوں پر مدد کرتے ہیں، پھر مصر سے بھاگ کر مدین آتے ہیں، یہاں شادی ہوتی ہے، اور معتد بہ زمانہ تک یہاں زندگی بسر کر کے مصر واپس جاتے ہیں، راہ میں نبوت سے سرفراز ہوتے ہیں ،فرعون کے پاس پہنچتے ہیں معجزات دکھاتے ہیں، اور بنی اسرائیل کو مصر سے لے جانے کی رخصت چاہتے ہیں، رخصت نہیں ملتی بالآخر غفلت میں مع اپنی قوم کے نکل جاتے ہیں، خدا کے حکم سے سمندر میں اُن کو راہ مل جاتی ہے، فرعون غرق ہو جاتا ہے اور وہ اپنی قوم کو لے کر

عرب اور شام میں داخل ہوتے ہیں، کافر باشندوں سے لڑائیاں پیش آتی ہیں۔ اسی حالت میں جب وہ بہت بوڑھے ہوجاتے ہیں تو ایک پہاڑی پر ان کی وفات ہوجاتی ہے، تورات استثناء کے اختتامی فقرے میں ہے، سو خداوند کا بندہ موسیٰ خداوند کے حکم کے موافق مواب کی ایک وادی میں مرگیا اور اس نے اس مواب کی ایک وادی میں بیتِ فغور کے مقابل گاڑا، پر آج کے دن تک کوئی اس کی قبر کو نہیں جانتا، اور موسیٰ اپنے مرنے کے وقت ایک سو بیس کا تھا ، اور اب تک بنی اسرائیل میں موسیٰ کے مانند کوئی نبی نہیں ہوا۔

ا:۔ یہ تورات کی پانچویں کتاب کے فقرے ہیں جس کی تصنیف بھی حضرت موسیٰ علیہ السلام کی طرف منسوب ہے، ان فقروں میں سب سے پہلے آپ کی نظر اس پر پڑنی چاہئیے کہ پوری کتاب یا اس کے آخری اجزاء حضرت موسیٰ علیہ السلام کی تصنیف نہیں، لیکن باایں ہمہ دنیا حضرت موسیٰ علیہ السلام کے اس سوانح نگار سے واقف نہیں ہے۔

۲:۔ ان درسوں کے الفاظ ”کہ آج تک اس کی قبر کو کوئی نہیں جانتا، اور اب تک ویسا کوئی نبی بنی اسرائیل میں نہیں ہوا۔“ ظاہر کرتے ہیں کہ سوانح موسوی کے تکمیل اجزاء اتنی مدت دراز کے بعد لکھے گئے ہیں، جس میں ایک مشہور یادگار کو لوگ بھول جاسکتے ہیں، اور ایک نئے پیغمبر کے ظہور کی توقع کی جاسکتی ہے۔

۳:۔...... حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ایک سو بیس برس کی عمر پائی، مگر غور سے دیکھو کہ اس (۱۲۰) برس کی عمر کے طویل زمانہ کی وسعت کو بھرنے کے لئے ہم کو حضرت موسیٰ علیہ السلام کے کیا واقعات معلوم ہوئے ہیں اور اُن کے سوانح کے ضروری اجزاء ہمارے ہاتھ میں کیا ہیں، پیدائش، جوانی میں ہجرت، شادی اور نبوت کے واقعات معلوم ہیں، پھر چند لڑائیوں کے بعد بڑھاپے میں ۱۲۰ برس کی عمر میں اُن سے ملاقات ہوتی ہے، ان واقعات کو جانے دیجئے یہ تو شخصی حالات ہیں جو ہر شخص کی زندگی میں الگ الگ پیش آتے ہیں، انسان ، کو اپنی سوسائٹی کی عملی نمونہ کے لئے جن اجزاء کی ضرورت ہے وہ اخلاق و عادات اور زندگانی کے طور وطریق ہیں، اور یہی اجزاء حضرت موسیٰ علیہ السلام کی پیغمبرانہ سوانح عمری سے گم ہیں

،ورنہ عام جزئی حالات یعنی اشخاص کے نام ونسب،مقامات کے پتے،مردم شماریاں اور قانونی قال واقوال بہت کچھ تورات میں مذکور ہیں،مگر یہ معلومات خواہ جغرافیہ،کرانولوجی ،نسب ناموں اور قانون دانی کے لئے کسی قدر ضروری کیوں نہ ہوں،مگر عملی حیثیت سے بالکل بیکار اور اجزائے سوانح کی کاملیّت سے معرّا ہیں:۔

اسلام سے سب سے قریب العہد پیغمبر حضرت عیسیٰ علیہ السلام ہیں جن کے پیرو آج یورپین مردم شماری کے مطابق تمام دوسرے مذاہب کے پیروؤں سے زیادہ ہیں،مگر یہ سُن کر آپ کو حیرت ہوگی کہ اسی مذہب کے پیغمبر کی زندگی کے اجزاء تمام دوسرے مشہور مذاہب کے بانیوں اور پیغمبروں کے سوانح سے سب سے زیادہ کم معلوم ہیں،آج عیسائی یورپ کے تاریخی ذوق کا یہ حال ہے،کہ وہ بابل واسیریا،عرب وشام،مصروافریقہ،ہندوستان وترکستان کے ہزار ہا برس کے واقعات کتابوں اور کتبوں کو پڑھ کر اور کھنڈروں،پہاڑوں،اور زمین کے طبقوں کو کھود کر منظرِ عام پر لا رہا ہے،اور دنیا کی تاریخ کے گمشدہ اوراق ازسرِنو ترتیب دے رہا ہے،مگر اس کا مسیحائی معجزہ جس چیز کو زندہ نہیں کرسکتا وہ خُود عیسیٰ علیہ السلام کی زندگی کی مدفون واقعات ہیں،پروفیسر رینان نے کیا کیا نہ کیا،مگر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے واقعاتِ زندگی نہ ملنا تھے،نہ مل سکے،انجیل کے بیان کے مطابق حضرت عیسیٰ کی زندگی ۳۳ برس کی تھی،موجودہ انجیلوں کی روایتیں اولاً نامعتبر ہیں،اور جو کچھ ہیں بھی وہ صرف اُن کے آخری تین سالوں کی زندگی پر مشتمل ہیں،ہم کو اُن کی تاریخی زندگی کے صرف یہ حصّے معلوم ہیں،وہ پیدا ہوئے اور پیدائش کے بعد مصر لائے گئے،لڑکپن میں ایک دو معجزے دکھائے،اس کے بعد وہ غائب ہوجاتے ہیں،اور پھر یک بیک تیس ۳۰ برس کی عمر میں پہاڑیوں اور دریاؤں کے کنارے ماہی گیروں کو وعظ کہتے نظر آتے ہیں،چند شاگرد پیدا ہوتے ہیں،یہودیوں سے چند مناظرے ہوتے ہیں یہودی اُن کو پکڑوا دیتے ہیں،رومی گورنر کی عدالت میں مقدّمہ پیش ہوتا ہے اور سولی دے دی جاتی ہے،تیسرے دن اُن کی قبر اُن کی لاش سے خالی نظر آتی ہے تیس برس اور کم از کم پچیس برس کا زمانہ کہاں گزرا اور کیونکر گزرا؟ دنیا اس سے ناواقف ہے

اور رہے گی ان تین آخری برسوں کے واقعات میں بھی کیا ہے؟ چند معجزے اور مواعظ اور آخر سولی!

اور اسی طرح کسی سیرت کے عملی نمونہ بننے کے لئے تاریخیت اور کاملیت کے ساتھ ساتھ تیسری ضروری شرط، جامعیت، ہے جامعیت سے مقصود یہ ہے کہ مختلف طبقاتِ انسانی کو اپنی ہدایت اور روشنی کے لئے جن نمونوں کی ضرورت ہوتی ہے یا ہر فرد انسان کو اپنے مختلف تعلقات وروابط اور فرائض وواجبات کو ادا کرنے کے لئے جن مثالوں اور نمونوں کی حاجت ہوتی ہے۔ وہ سب اس "آئیڈیل زندگی" کے آئینہ میں موجود ہوں، اس نقطہ نگاہ سے بھی دیکھئے تو معلوم ہوگا کہ سوائے خاتم الانبیاء علیہ الصلوٰہ والسلام کے کوئی دوسری شخصیت اس معیار پر پوری نہیں اترتی، مذہب کیا چیز ہے، خداداد بندوں اور باہم بندوں، کے متعلق جو فرائض اور واجبات ہیں اُن کو تسلیم کرنا اور ادا کرنا، دوسرے لفظوں میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ وہ حقوق اللہ اور حقوق العباد کے بجالانے کا نام ہے لیے ہر مذہب کے پیروؤں کا فرض ہے کہ وہ اپنے اپنے پیغمبروں اور بانیوں کی سیرتوں میں ان حقوق، فرائض اور واجبات کی تفصیلات تلاش کریں۔ اور اُن کے مطابق اپنی زندگی کو اس قالب میں ڈھالنے کی کوشش کریں، حقوق اللہ اور حقوق عباد دونوں حیثیتوں سے جب آپ تفصیلات ڈھونڈیں گے تو وہ پیغمبر اسلام کے سوا آپ کو کہیں نہیں ملیں گی۔

مذاہب دو قسم کے ہیں، ایک وہ جن میں یا تو خدا تسلیم ہی نہیں کیا گیا ہے، جیسا کہ بودھ اور جین مذہب کے متعلق کہا جاتا ہے، اس لئے ان مذہبوں کے پیغمبروں اور بانیوں کی زندگیوں میں بھی خدا طلبی کے واقعات مفقود ہیں، خدا کے متعلق ہم کو کیا اعتقادات رکھنے چاہئیں اور اُن کے کیا کیا اعتقادات تھے، اور ان اعتقادات پر اُن کو کس حد تک عملاً یقین تھا، اس کی تفصیل سے اُن کی سیرتیں خالی ہیں، پوری تورات پڑھ جاؤ، خدا کی توحید اور اس کے احکام اور قربانی کے شرائط کے علاوہ تورات کی پانچ کتابوں میں کوئی ایسا فقرہ نہیں جس سے یہ معلوم ہو کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے تعلقاتِ قلبی، اور اطاعت وعبادت، اور خدا پر توکل

ویقین ،خدا کے صفات کاملہ والٰہیہ کی جلوہ گری اُن کے قلبِ اقدس میں کہاں تک تھی ،حالانکہ اگر موسوی مذہب ہمیشہ کے لئے اور آخری مذہب کے طور پر آیا ہوتا تو اس سے پیروؤں کا فرض تھا کہ وہ اُن واقعات کو قیدِ تحریر میں لاتے ،مگر خُدا کی مصلحت یہ نہ تھی ،اس لئے اُن کو اس کی توفیق نہ ملی۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی زندگی کا آئینہ انجیل ہے،انجیل میں اس ایک مسئلہ کے علاوہ کہ خدا حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا باپ تھا،ہم کو یہ معلوم نہیں ہوتا کہ اس دنیاوی زندگی میں اس مقدس باپ اور بیٹے میں کیا تعلقات اور روابط تھے،بیٹے کے اقرار سے یہ تو معلوم ہوتا ہے ،کہ باپ کو بیٹے سے بڑی محبت تھی ،مگر یہ نہیں معلوم ہوتا کہ بیٹے کو باپ سے کس درجہ محبت تھی ،وہ کہاں تک اپنے باپ کی اطاعت اور فرمانبرداری میں مصروف تھا،وہ اُس کے آگے شب وروز میں کبھی جھکتا بھی تھا،اور ''آج کی روٹی کے علاوہ کوئی اور چیز بھی اس نے کبھی اس سے مانگی،گرفتاری کی رات سے پہلے کوئی ایک رات بھی اس پر ایسی گزری جب وہ باپ کے حضور میں دعا مانگ رہا ہو پھر ایسی سیرت سے ہم روحانی حیثیت سے کیا فائدہ اُٹھا سکتے ہیں ،اگر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی سیرت میں خدا اور بندہ کے تعلقات واضح ہوتے تو ساڑھے تین سو برس کے بعد پہلے عیسائی بادشاہ کو تین سو عیسائی علماء کی مجلس اس کے فیصلے کے لئے فراہم کرنی نہ پڑتی اور وُہ اب تک ایک ناقابل فہم راز نہ بنے رہتے۔

اب حقوق عباد کی حیثیت کو لیجئے تو اس سے بھی حضرت خاتم النبیین ﷺ کے سوا تمام دیگر انبیاء علیہم السلام اور بانیان مذاہب کی سیرتیں خالی ہیں،بودھ نے اپنے تمام اہل وعیال اور خاندان کو چھوڑ کر جنگل کا راستہ لیا اور پھر کبھی اپنی پیاری بیوی سے،جس سے اس کو محبت تھی، اور اپنے اکلوتے بیٹے سے کوئی تعلق نہ رکھا،دوستوں کے جھرمٹ سے علیحدہ ہوگیا،حکومت اور سلطنت کے بارِگراں سے سبکدوشی حاصل کی اور نروان یا موت کے حصوں کو انسانی زندگی کا آخری مقصد قرار دیا،ان حالات میں کیا کوئی انسان یہ سمجھ سکتا ہے کہ اس دنیا کے بسنے والوں کے لئے جن میں حکومت ورعیت ،شاہ وگدا،آقا ونوکر،باپ بیٹے، بھائی بہن ،اور

دوست احباب کے تعلقات ہیں، بودھ کی سیرت کچھ کار آمد ہو سکتی ہے؟ کیا بودھ کی زندگی میں کوئی ایسی جامعیّت ہے جو تاریک الدنیا بھکشوؤں اور کاروباری انسانوں دونوں کے لئے قابلِ تقلید ہو؟ اسی لئے اس کی زندگی کبھی بھی اس کے ماننے والے کاروباریوں کے لئے قابلِ تقلید نہ بنی اور نہ چین وجاپان، سیام وانام، تبت وبرما کی تمام سلطنتیں، تجارتیں صنّاعیاں اور دیگر کاروباری مشاغل فوراً بند ہو جاتے، اور بجائے آباد شہروں کے صرف سنسان جنگلوں کا وجود رہ جاتا۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کی زندگی کا ایک ہی پہلو نہایت واضح ہے، اور وہ جنگ اور سپہ سالاری کا پہلو ہے، ورنہ اس کے علاوہ ان کی سیرت کی پیروی کرنے والوں کے لئے دنیاوی حقوق، واجبات فرائض اور ذمہ داریوں کا کوئی نمونہ موجود نہیں ہے، میاں بیوی، باپ بیٹے، بھائی بھائی دوست واحباب کے متعلق ان کا کیا طرزِ عمل تھا، صلح کے فرائض میں اُن کا کیا دستور تھا، اپنے مال ودولت کو کن مفید کاموں میں انہوں نے لگایا، بیماروں، یتیموں، مسافروں اور غریبوں کے ساتھ ان کا کیا برتاؤ تھا، اور اُن کے ماننے والے ان اُمور میں ان کی زندگی کی مثالوں سے کیونکر فائدہ اُٹھائیں۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام بیوی رکھتے تھے، بچے رکھتے تھے، بھائی رکھتے تھے، دوسرے اعزہ اور متعلقین رکھتے تھے، اور ہمارا اعتقاد ہے کہ ان کا پیغمبرانہ طرزِ عمل یقیناً ہر حرف گیری سے پاک ہوگا، مگر ان کی موجودہ سیرت کی کتابوں میں ہم کو یہ ابواب نہیں ملتے، جو ہمارے لئے قابلِ تقلید اور نمونہ ہوں۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ماں تھیں، اور انجیل کے بیان کے مطابق اُن کے بھائی بہن بھی تھے، بلکہ مادی باپ تک بھی موجود تھے، مگر ان کی زندگی کے واقعات ان عزیزوں اور رشتہ داروں کے ساتھ اُن کا تعلق، طرزِ عمل، سلوک اور برتاؤ نہیں ظاہر کرتے، حالانکہ دنیا ہمیشہ ان ہی تعلقات سے آباد رہی ہے اور رہے گی، مذہب کا بڑا حصہ انہی کی متعلقہ ذمہ داریوں کے ادا کرنے کا نام ہے، علاوہ ازیں حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے محکومی کی زندگی بسر کی اس لئے اُن کی سیرت تمام حاکمانہ فرائض کی مثالوں سے خالی ہے وہ متاہل نہ تھے، اس لئے

ان دو جوڑوں کے لئے جن کے درمیان تورات کے پہلے ہی باب نے ماں باپ سے زیادہ مضبوط رشتہ قائم کیا ہے، حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی زندگی تقلید کا کوئی سامان نہیں رکھتی اور چونکہ دنیا کی بیشتر آبادی متاہلانہ زندگی رکھتی ہے۔اس لئے اس کے معنی یہ ہیں کہ دنیا کے بیشتر حصہ آبادی کے لئے اُن کی سیرت نمونہ نہیں بن سکتی، جس نے گھر بار، اہل وعیال، مال دولت، صلح جنگ، دوست ودشمن کے تعلقات سے کبھی واسطہ ہی نہ رکھا ہو، وہ اس دنیا کے لئے جو انہی تعلقات سے معمور ہے، کیونکر مثال ہوسکتا ہے، اگر آج دنیا یہ زندگی اختیار کرلے تو کل وہ سنسان قبرستان بن جائے، تمام ترقیاں دفعۃً رک جائیں، اور عیسائی یورپ تو شاید ایک منٹ کے لئے بھی زندہ نہ رہے۔

اور اسی طرح ''آئیڈیل لائف'' کا دیگر معیاروں کے ساتھ سب سے آخری معیار عملیّت ہے عملیّت سے یہ مقصود ہے کہ شارع دین اور بانی مذہب جس تعلیم کو پیش کررہا ہو، خود اس کا ذاتی عمل اُس کی مثال اور نمونہ ہو، اور خود اُس کے عمل نے اس کی تعلیم کو عملی یعنی قابلِ عمل ثابت کیا ہو۔

خوش کن سے خوش کُن فلسفہ، دلچسپ سے دلچسپ نظریہ، اور خوش آئند سے خوش آئند اقوال، ہر شخص ہر وقت پیش کرسکتا ہے، لیکن جو چیز ہر شخص ہر وقت نہیں پیش کرسکتا وہ عمل ہے، انسانی سیرت کے بہتر اور کامل ہونے کی دلیل، اُس کے نیک اور معصوم اقوال، خیالات اور اخلاقی فلسفیانہ نظریئے نہیں، بلکہ اُس کے اعمال اور کارنامے ہیں، اگر یہ معیار قائم نہ کیا جائے تو اچھے اور بُرے کی تمیز اُٹھ جائے، اور دنیا صرف بات بنانے والوں کی مسکن رہ جائے، اب ہمیں یہ پوچھنے کا حق ہے کہ لاکھوں شارعین اور ہزاروں بانیانِ مذاہب میں سے کون اپنی عملی سیرت کو اس ترازو پر تلوانے کے لئے آگے بڑھ سکتا ہے؟

''تو اپنے خداوند خدا کو اپنی ساری جان اور دل سے پیار کر، تو دشمن کو پیار کر، جو تیرے داہنے گال پر تھپڑ مارے تو اُس کے سامنے اپنا بایاں گال بھی پھیر دے، جو تجھ کو ایک میل بیگارے جائے تو اس کے ساتھ دو میل جا، جو تیرا کوٹ مانگے تو اُس کو کرتا بھی دے

دے، تو اپنے مال واسباب کو خدا کی راہ میں دے دے، تو اپنے بھائی کو ستّر دفعہ معاف کر، آسمان کی بادشاہت میں دولت مند کا داخل ہونا مشکل ہے" یہ اور اسی قسم کی بہت سی نصیحتیں نہایت دل خوش کُن ہیں، مگر عمل سے اُن کی تصدیق نہ ہو تو وہ سیرت کا ٹکڑا نہیں، بلکہ وہ صرف معصومانہ شیریں زبانیوں کا ایک مجموعہ ہیں جس نے اپنے دشمن پر قابو نہ پایا ہو، وہ عفو کی عملی مثال کیسے پیش کر سکتا ہے، جس کے خود کچھ نہ ہو، وہ غریبوں اور مسکینوں اور یتیموں کی مدد کیونکر کر سکتا ہے، جو عزیز واقارب، بیوی بچے، نہ رکھتا ہو، وہ انہی تعلقات سے آباد دنیا کے لئے مثال کیونکر بن سکتا ہے، جس نے بیماروں کی تیمارداری اور عیادت نہ کی ہو، وہ اس کا وعظ کیونکر کہہ سکتا ہے جس کو خود دوسروں کے معاف کرنے کا موقع نہ ملا ہو، اس کی زندگی ہم میں سے غضب ناک اور غصّہ ور لوگوں کے لئے نمونہ کیسے بنے گی۔

غور فرمایئے! نیکیاں دو قسم کی ہوتی ہیں، ایک سلبی اور ایک ایجابی، مثلاً آپ پہاڑ کے ایک کھوہ میں جا کر عمر بھر کے لئے بیٹھ گئے، تو صرف یہ کہنا صحیح ہوگا کہ بدیوں اور برائیوں سے آپ نے پرہیز کیا، یعنی آپ نے کوئی کام ایسا نہیں کیا جو آپ کے لئے قابلِ اعتراض ہو، مگر یہ تو سلبی تعریف ہوئی، ایجابی پہلو آپ کا کیا ہے؟ کیا آپ نے غریبوں کی مدد کی محتاجوں کو کھانا کھلایا، کمزوروں کی حمایت کی، ظالموں کے مقابلہ میں حق گوئی سے کام لیا، گرتوں کو سنبھالا، گمراہوں کو راستہ دکھایا، عفو، کرم، سخا، مہمان نوازی، حق گوئی، رحم، حق، کی نصرت کے لئے جوش، جد وجہد مجاہدہ، ادائے فرض، ذمہ داریوں کی بجا آوری، غرض تمام وہ اخلاق جس کا تعلق عمل سے ہے، وہ صرف سلب فعل اور عدمِ عمل سے نیکیاں نہیں بن جائیں گی، نیکیاں صرف سلبی پہلو نہیں رکھتیں، زیادہ تر ایجابی اور عملی پہلو پر اُن کا مدار ہوتا ہے، اس تقریر سے ظاہر ہوگا کہ جس سیرت کا عملی حصّہ سامنے نہ ہو اس کو "آئیڈیل لائف" اور قابلِ تقلید زندگی کا خطاب نہیں دیا جا سکتا کہ انسان اس کی کس چیز کی نقل کرے گا؟ اور کس عمل سے سبق حاصل کرے گا؟ ہم کو وہ صلح وجنگ فقر ودولت ازدواج وتجرد، تعلقات خداوندی وتعلقاتِ عباد، حاکمیت ومحکومیت! سکون وغضب، جلوت وخلوت، غرض زندگی کے

ہر پہلو کے متعلق عملی مثال چاہئے، دنیا کا بیشتر بلکہ تمام تر حصّہ انہی مشکلات اور تعلقات میں الجھا ہوا ہے، اس لئے لوگوں کو انہی مشکلات کے حل کرنے اور انہی تعلقات کو بوجہ احسن انجام دینے کے لئے عملی مثالوں کی ضرورت ہے، قولی نہیں بلکہ عملی، لیکن یہ کہنا شاعری اور خطابت نہیں بلکہ تاریخی واقعہ ہے کہ اس معیار پر بھی سیرتِ محمدیؐ کے سوا کوئی دوسری سیرت پوری نہیں اُتر سکتی۔

ہم نے جو کچھ کہا ہے، اس کو اچھی طرح سمجھ لیجئے، ہم یہ کہنا اور دکھانا چاہتے ہیں، کہ ''آئیڈیل لائف'' اور نمونہ تقلید بننے کے لئے جو حیاتِ انسانی منتخب کی جائے، ضرور ہے کہ اس کی سیرت کے موجودہ نقشہ میں یہ چار باتیں پائی جائیں، یعنی تاریخیت، جامعیت، کاملیّت اور عملیّت ہمارا یہ مقصد نہیں کہ دیگر انبیاء علیہم السلام کی زندگیاں اُن کے عہد اور زمانہ میں ان خصوصیات سے خالی تھیں، بلکہ یہ مقصد ہے کہ اُن کی سیرتیں جو اُن کے بعد عام انسانوں تک پہنچیں، یا جو آج موجود ہیں، وہ ان خصوصیات سے خالی ہیں، اور ایسا ہونا مصلحت الٰہی کے مطابق تھا، تاکہ یہ ثابت ہو سکے کہ وہ انبیاء محدود زمانہ اور متعین قوموں کے لئے تھے، اس لئے اُن کی سیرتوں دوسری قوموں اور آئندہ زمانہ تک محفوظ رہنے کی ضرورت نہ تھی، صرف محمد رسول ﷺ تمام دنیا کی قوموں کے لئے اور قیامت تک کے لئے نمونہ عمل اور قابل تقلید بنا کر بھیجے گئے تھے، اس لئے آپ ﷺ کی سیرت کو ہر حیثیت سے مکمل، دائمی اور ہمیشہ کے لئے محفوظ رہنے کی ضرورت تھی، اور یہی ختم نبوت کی سب سے بڑی عملی دلیل ہے

(بحوالہ معمولی ردّوبدل کے ساتھ خطبات مدراس از علامہ سید سلیمان ندویؒ)

يَا رَبِّ صَلِّ وَسَلِّمْ دَائِمًا اَبَدًا عَلٰى حَبِيْبِكَ خَيْرِ الْخَلْقِ كُلِّهِمِ

❁❁❁

خصوصیت نمبر ۷۳

رسولِ اکرم ﷺ کے لئے سب سے پہلے جنت کا دروازہ کھولا جائے گا

قابلِ احترام قارئین! رسولِ اکرم ﷺ کی امتیازی خصوصیات میں سے یہ تہترہویں خصوصیت ہے، جسکا عنوان ہے "رسولِ اکرم ﷺ کے لئے سب سے پہلے جنت کا دروازہ کھولا جائے گا" جیسا کہ آنے والے اوراق میں اس خصوصیت کی وضاحت کی جارہی ہے، لیکن اس وضاحت سے پہلے گزشتہ خصوصیات کی طرح یہاں بھی بتاتا چلوں، کیونکہ میری زندگی کا یہی سب سے بڑا سرمایا ہے کہ بحمد اللہ دیگر خصوصیات کی طرح اس خصوصیت کو بھی میں نے ریاض الجنۃ میں بیٹھ کر روضہ رسول ﷺ کے سائے میں ترتیب دیا ہے کیونکہ میرا ایمان ہے کہ روضہ رسول ﷺ کے سائے میں بیٹھ کر روضہ اقدس میں آرام فرمانے والے عظیم پیغمبر اور ہم سب کے پیارے آقا ﷺ کی خصوصیت کو لکھنا اور ترتیب دینا بہت بڑی سعادت ہے، میری دلی دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ بار بار مجھے مدینہ بلائے اور پھر اپنے محبوب ﷺ کی محبوب مسجد اور پھر پیارے روصہ کے سامنے بٹھا کر آقا ﷺ کی سیرت کے ہر ہر گوشے کو لکھنے کی توفیق عطا فرمائے آمین۔

بہرحال محترم قارئین! دیگر خصوصیات کی طرح یہ خصوصیت بھی آپ ﷺ کی ایک عظیم واعلیٰ خصوصیت ہے کہ قیامت کے دن جب نفسا نفسی کا عالم ہوگا، اور لوگ حتی کہ انبیاء کرامؑ بھی جنت میں جانے کے منتظر ہونگے، لیکن جنت اس وقت تک نہیں کھلے گی جب تک اللہ کے حکم سے کائنات کے سب سے بڑے پیغمبر حضرت محمد الرسول اللہ ﷺ جنت میں داخل نہیں ہوجائیں گے، چنانچہ آنے والے صفحات میں اسی بات کی وضاحت کی جارہی ہے کہ بے شک آپ ﷺ کے لئے سب سے پہلے جنت کا دروازہ کھولا جائے گا، یقیناً اس

خصوصیت سے خاص طور پر آپ ﷺ کا امتیاز دیگر انبیاء کرامؑ پر واضح ہوتا ہے، دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہم سب کو تمام انبیاء کرامؑ کا احترام وعزت کرنے اور حضور ﷺ کی صحیح صحیح قدر دانی کرنے کی توفیق عطا فرمائے آمین یارب العٰلمین۔ لیجئے اب اس خصوصیت کی تفصیل ملاحظہ فرمایئے۔

تہترہویں خصوصیت کی وضاحت قرآن واحادیث کی روشنی میں

ایک روایت میں آتا ہے کہ جب قیامت کا دن ہوگا تو میرے پاس لواء الحمد ہوگا اور میں تمام رسولوں کا امام اوران کی شفاعت کرنے والا ہونگا۔ایک روایت کے الفاظ یہ ہیں کہ! فرق یہ ہوگا کہ میں اللہ کا حبیب ہوں گا اور یہ بات میں بڑائی سے نہیں کہتا، میں ہی قیامت کے دن لواء حمد کو اٹھائے ہوئے ہوں گا اور یہ بات میں بڑائی کے لیے نہیں کہتا،اور میں ہی اللہ تعالیٰ کے نزدیک اگلوں اور پچھلوں سب میں سب سے زیادہ معزز ہوں گا اور یہ بات میں بڑائی کے طور پر نہیں کہتا،اور قیامت کے دن میں ہی سب سے پہلے شفاعت کرنے والا ہوں گا اور یہ بات میں بڑائی کے طور پر نہیں کہتا،اور میں ہی وہ پہلا آدمی ہوں گا جو جنت کا دروازہ ہلاؤں گا،اللہ تعالیٰ اس کو میرے لیے کھول دے گا اور میں اپنے ساتھ غریب ومسکین مومنوں کو لے کر اس میں داخل ہوں گا اور یہ بات میں بڑائی کی خاطر نہیں کہتا۔

ایک روایت ہے کہ میں قیامت کے دن جنت کے دروازہ پر آؤں گا اور اس پر دستک دے کر کھولنے کی درخواست کروں گا یعنی پکار کر نہیں کھلواؤں گا۔اس وقت جنت کا خازن یعنی رضوان پوچھے گا کہ آپ کون ہیں، میں کہوں گا۔ ''محمدؐ'' اور ایک روایت کے مطابق میں محمد ہوں، تب وہ کہے گا ''مجھے آپ ہی کے لیے حکم دیا گیا ہے کہ آپ سے پہلے کسی کے لیے جنت کا دروازہ نہ کھولوں۔'' ایک روایت میں یہ اضافہ بھی ہے کہ اور یہ حکم دیا گیا ہے کہ آپ کے بعد کسی کے لیے دروازہ کھولنے کے لیے کھڑا نہ ہوں۔

چنانچہ یہ بات آنحضرت ﷺ کی خصوصیات میں سے ہے کہ جنت کا رضوان صرف

آپ کے لیے خود دروازہ کھولے گا اور آپ کے علاوہ دوسرے نبیوں وغیرہ کے لیے دروازہ نہیں کھولے گا بلکہ اس کے بعد یہ ذمہ داری کسی دوسرے خازن کو مل جائے گی۔ آنحضرت ﷺ کی اس خصوصیت کو علامہ قطب خضری نے بہت عظیم قرار دیا ہے۔

فائدہ...... اس سے پہلے یہ بیان ہوا ہے کہ آپ کے لیے اللہ تعالیٰ جنت کا دروازہ کھول دے گا، جبکہ اس روایت میں رضوان جنت کا ذکر ہے، اس سے کوئی اختلاف پیدا نہیں ہوتا کیونکہ اللہ تعالیٰ کے دروازہ کھولنے کا مطلب یہی ہے کہ رضوان جنت سے حق تعالیٰ دروازہ کھلوادیں گے کیونکہ رضوان بھی حق تعالیٰ کے حکم پر ہی دروازہ کھولے گا لہٰذا حقیقت میں دروازہ کھولنے والا اللہ تعالیٰ ہی ہوگا۔

ایک روایت میں ہے کہ میں ہی وہ پہلا شخص ہوں گا جس کے لیے جنت کا دروازہ کھولا جائے گا۔ یہ بات میں بڑائی کی خاطر نہیں کہتا چنانچہ میں جنت کے دروازہ کی زنجیر ہلاؤں گا تو پوچھا جائے گا کون ہے، میں کہوں گا محمد ﷺ، اسی وقت دروازہ کھول دیا جائے گا تب اللہ جبار جل جلالہ، میرے سامنے ہوں گے، میں فوراً ہی سجدے میں گر جاؤں گا۔ یہاں ایک اشکال ہوتا ہے کہ حضرت ادریسؑ تو پہلے ہی جنت میں پہنچ چکے ہیں لہٰذا آنحضرت ﷺ کا سب سے پہلے جنت میں داخل ہونا کیسے ہوگا، اس کے متعلق کہتے ہیں کہ یہاں گفتگو قیامت کے دن کے متعلق ہو رہی ہے جبکہ ادریسؑ قیامت سے بہت پہلے جنت میں داخل ہوئے ہیں لہٰذا اس حدیث سے اس واقعہ کے متعلق کوئی اشکال نہیں ہوتا۔ کیونکہ ان کا جنت میں داخل ہونا دروازہ کھلنے پر ہی ہوا ہو مگر وہ قیامت سے پہلے ہو چکا ہے، جبکہ قیامت کے دن وہ جنت سے باہر نکل کر میدان حشر میں آئیں گے اور اپنی امت کے ساتھ حساب کتاب کے لیے پیش ہوں گے۔

جہاں تک اس روایت کا تعلق ہے کہ سب سے پہلے جو جنت کا دروازہ کھٹکھٹائیں گے وہ بلال حمامہ ہوں گے تو اس روایت کو درست ماننے کی صورت میں کہا جا سکتا ہے کہ ممکن ہے اس سے مراد یہ ہو کہ جنت کا دروازہ وہی کھٹکھٹائیں گے جبکہ آنحضرت ﷺ دروازے کی

زنجیر ہلانے والے پہلے آدمی ہوں گے، یا یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ بلال ابن حمامہ اس امت میں سب سے پہلے آدمی ہوں گے جو جنت کا دروازہ کھٹکھٹائیں گے۔ واللہ اعلم

طبرانی کی کتاب اوسط میں سندِ حسن کے ساتھ حدیث بیان کی گئی ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا! جب تک میں جنت میں داخل نہ ہو جاؤں اس وقت تک وہ تمام نبیوں کے لیے حرام رہے گی اور اسی طرح جب تک کہ میری امت جنت میں داخل نہ ہو جائے اس وقت تک جنت تمام دوسری امتوں کے لیے حرام رہے گی۔ (بحوالہ سیرت حلبیہ)

یَا رَبِّ صَلِّ وَسَلِّمْ دَائِمًا اَبَدًا عَلٰی حَبِیْبِکَ خَیْرِ الْخَلْقِ کُلِّهِم

خصوصیت نمبر ۷۴

رسولِ اکرم ﷺ کو اللہ تعالیٰ نے اپنے ناموں میں سے کچھ نام دیئے

قابلِ احترام قارئین! رسولِ اکرم ﷺ کی امتیازی خصوصیات میں سے یہ چوہتر نمبر خصوصیت ہے، جسکا عنوان ہے "رسولِ اکرم ﷺ کو اللہ تعالیٰ نے اپنے ناموں میں سے کچھ نام دیئے" الحمدللہ دیگر خصوصیات کی طرح اس خصوصیت کو ترتیب دینے کے لئے بھی اللہ تعالیٰ نے روضہ رسول ﷺ کا قرب عطا فرمایا اور روضہ رسول ﷺ کے سائے میں بیٹھ کر میں نے اس خصوصیت کو فائنل ترتیب دیا، اس سعادت کے ملنے پر میں اپنے اللہ کا جتنا زیادہ شکر ادا کروں کم ہے۔

بیشک ہمارے نبی ﷺ کی یہ بھی عظیم خصوصیت ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہمارے نبی ﷺ کو اپنے ناموں میں سے کچھ نام دیئے، جیسا کہ تفصیل آنے والے اوراق میں آرہی ہے، اور جبکہ دیگر انبیاء کرامؑ کی سیرتوں میں ایسی خصوصیت نہیں ملتی، اگر کسی کے نام میں یہ خصوصیت نظر آتی ہے، تو فقط اسی نام میں یا ایک دو ناموں میں لیکن ہمارے نبی ﷺ کے کئی نام اللہ تعالیٰ کے نام کی طرح ہیں، بے شک یہ ہمارے نبی ﷺ کی خصوصی فضیلت ہے، اور جو مقام اللہ تعالیٰ نے ہمارے نبی ﷺ کو عطا فرمایا ہے ان ناموں میں ان ہی مقام ومرتبے کی طرف اشارہ ہے۔ آنے والے اوراق میں حضور ﷺ کے اس طرح کے تمام ناموں کی تفصیل واضح کی گئی ہے، دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہم سب کو اپنے نبی سے سچی محبت کرنے کی توفیق عطا فرمائے، آمین۔ اور حضور ﷺ کی تمام سنتوں پر عمل کرنے اور تمام سنتوں کو ساری دنیا میں عام کرنے کی توفیق عطا فرمائے، آمین بے شک اسی میں ہمارے نجات اور فلاح ہے، اور اسی میں ہماری تمام پریشانیوں کا حل ہے، بہر حال تمہیدی بات ختم کی جاتی ہے، لیجئے اب اس

خصوصیت کی تفصیل ملاحظہ فرمائیے:

چہترہویں خصوصیت کی وضاحت قرآن واحادیث کی روشنی میں

مثلاً رؤف اور رحیم اللہ تعالیٰ کے اسماءِ حسنیٰ میں ہیں اور قرآن پاک میں یہ دونوں نام آپ ﷺ کے لئے استعمال فرمائے گئے ہیں۔ علماء نے تیس سے اوپر اس طرح کے مشترکہ اسماء مبارکہ ذکر کئے ہیں۔ لیکن جو نام اللہ تعالیٰ کے لئے ہیں وہ اللہ کی شان الوہیت کے مطابق ہیں اور یہی اسماء اللہ تعالیٰ کے حبیب ﷺ کے لئے ہیں وہ آپ کی شانِ عبدیت کے مطابق ہیں۔ چنانچہ پہلے ہم کچھ رؤف اور رحیم پر کلام کریں گے اور اسکے بعد انشاء اللہ دیگر ناموں سے متعلق کلام کیا جائے گا۔

آپ ﷺ کے اسمائے مبارک کی تعداد

آنحضرت ﷺ کے اسماء مبارک بہت ہیں جن میں سے کچھ کا ذکر قرآن مجید میں ہے کچھ سابقہ آسمانی کتابوں میں پائے جاتے ہیں، کچھ کا ذکر انبیاء علیہم السلام کی زبان سے ہوا ہے اور کچھ احادیث میں مذکور ہیں۔ تاہم ان کی کل تعداد کے بارے میں کوئی ایک قول نہیں ہے۔ مواہب لدنیہ میں لکھا ہے: رسولِ اکرم ﷺ کے نام اور القاب قرآن مجید میں بہت آئے ہیں۔ چنانچہ بعض علماء نے ننانوے نام جمع کئے ہیں جو اللہ تعالیٰ کے اسماء پاک کی بھی تعداد ہے، قاضی عیاضؒ کا قول منقول ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے ناموں میں سے تیس نام اپنے حبیب کے لئے مخصوص کئے ہیں۔ بعض حضرات نے لکھا ہے کہ اگر سابقہ آسمانی کتابوں اور قرآن وحدیث میں آپ ﷺ کے نام تلاش کئے جائیں تو ان کی تعداد تین سو تک اور ایک قول کے مطابق چار سو پہنچتی، اور قاضی ابو بکر ابن العربی نے، جو مالکی مسلک کے بڑے عالموں میں سے ہیں لکھا ہے! بعض صوفیا کا قول ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ہزار نام ہیں اور اس کے حبیب کے بھی ہزار نام ہیں اور یہ کہ "ناموں" سے مراد وہ اوصاف وصفات ہیں جن سے رسولِ اکرم ﷺ کی ذات متصف ہے اور ہر وصف وصفت سے ایک نام نکلتا ہے۔ امام

سیوطیؒ نے بھی مستقل طور پر ایک کتاب تالیف کی ہے جس میں انہوں نے رسولِ اکرم ﷺ کے اسماء مبارک جمع کئے ہیں اور طیبیؒ نے بائیس نام ذکر کئے ہیں اور ان سب کی وضاحت کی ہے۔

اصل اسم مبارک......رسولِ اکرم ﷺ کا اصل نام جو سب سے زیادہ مشہور و رائج ہے ''محمد'' ہے اور رسولِ اکرم ﷺ کے دادا حضرت عبدالمطلب کا رکھا ہوا نام ہے۔ منقول ہے کہ جب عبدالمطلب سے کسی نے کہا کہ تم نے اپنے پوتے کا نام اپنے آباؤ اجداد کے نام پر کیوں نہیں رکھا اور ایک ایسے نام کو ترجیح دی جو تمہاری قوم اور تمہارے خاندان میں پہلے کسی کا نہیں رہا ہے؟ انہوں نے جواب دیا! میں نے اپنے پوتے کا یہ نام اس امید پر رکھا ہے کہ تمام دنیا والے اس کی توصیف میں رطب اللسان ہوں۔ اور ایک روایت میں یہ الفاظ ہیں! تا کہ آسمانوں پر اللہ تعالیٰ اس کی تعریف و توصیف کرے اور زمین پر دنیا والے رطب اللسان ہوں۔ ایک روایت میں آیا ہے کہ رسولِ اکرم ﷺ کی پیدائش سے بہت پہلے حضرت عبد المطلب نے ایک دن خواب میں دیکھا کہ ان کی پشت سے چاندی کی ایک زنجیر نکلی جس کا ایک سلسلہ آسمان تک چلا گیا، ایک سلسلہ مشرق کی آخری حدوں تک اور ایک سلسلہ مغرب کی آخری حدوں تک پہنچ گیا۔ اس کے بعد وہ زنجیر ایک تناور درخت میں تبدیل ہوگئی اور اس درخت کے پتہ پتہ پر نور پھیل گیا۔ پھر انہوں نے دیکھا کہ ان نورانی پتوں کے نیچے مشرق سے لے کر مغرب تک کے لوگ جمع ہیں۔ عبدالمطلب نے بیدار ہونے کے بعد اس عجیب وغریب خواب کا ذکر لوگوں سے کیا، تعبیر دینے والوں نے اس خواب کو سن کر کہا کہ مبارک ہو تمہاری نسل میں ایک ایسا شخص پیدا ہوگا جس کی تابعداری کرنے والوں کا سلسلہ مشرق سے مغرب تک پھیلا ہوگا، اور زمین و آسمان میں اس کی تعریف ہی تعریف ہوگی۔ چنانچہ رسولِ اکرم ﷺ پیدا ہوئے تو حضرت عبدالمطلب نے آپ ﷺ کا نام ''محمد'' رکھا۔ رسولِ اکرم ﷺ کی والدۂ ماجدہ حضرت آمنہؓ نے بھی حاملہ ہونے کے بعد خواب میں دیکھا تھا کہ ایک شخص نے ان سے کہا کہ تمہارے بطن میں اس امت کا سردار اور پیغمبر ہے، جب تمہارے ہاں ولادت

ہوتو بچہ کا نام ''محمد'' رکھنا۔

روایتوں میں آتا ہے کہ رسولِ اکرم ﷺ کی پیدائش سے پہلے کبھی کسی کا نام ''محمد'' نہیں رکھا گیا تھا، ہاں اہل کتاب نے جب اپنی آسمانی کتابوں میں مذکور پیش گوئیوں کے مطابق لوگوں کو بتایا کہ وہ زمانہ آیا ہی چاہتا ہے جب خدا کے آخری پیغمبر پیدا ہونگے اور ان کا نام ''محمد'' ہوگا تو یہ سن کر چار لوگوں نے اس آرزو میں اپنے بیٹوں کا نام محمد رکھا کہ شرف نبوت سے مشرف ہوں۔ تاہم یہ چار نام بھی رسولِ اکرم ﷺ کے نام سے پہلے نہیں کہے جاسکتے کیونکہ ان چاروں نے بھی رسولِ اکرم ﷺ کا نام ''محمد'' سن کر ہی اپنے بیٹوں کے نام محمد رکھے تھے۔ (بحوالہ مظاہر حق جدید)

اور جیسا کہ عرض کیا کہ اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کو اپنے ناموں میں سے کچھ نام دیئے۔ چنانچہ ارشاد باری تعالیٰ ہے بِالْمؤمنِينَ رؤُفٌ رّحِيمٌ. کہ وہ مومنوں سے بہت پیار کرنے واالا اور اُن پر ہمیشہ رحم کرنے والا ہے۔ آیت بالا میں نبی ﷺ کو رؤُفٌ اور رحِیمٌ کے اسماء سے یاد فرمایا گیا ہے۔ رؤُفٌ: رافت سے مبالغہ کا صیغہ ہے۔ رحیمٌ: رحم سے صفت مشبّہ کا صیغہ ہے۔

یاد رکھنا چاہئے کہ جو صیغے مبالغہ کے اوزان پر آتے ہیں، وہ معنی کثرت وفراوانی کا اظہار کیا کرتے ہیں اور جو صیغے صفت مشبہ کے اوزان پر آتے ہیں، وہ صفت لازم اور معنی ثابت کے مظہر ہوتے ہیں۔ لہٰذا رؤُفٌ کے معنی کامل العطوف ہیں اور رَحِیمٌ کے معنی دائم الرحمت ہیں۔ سورۂ حج اور سورۂ بقرہ میں ہے: اِنَّ اللّٰہَ بِالنَّاسِ لَرَؤُفٌ رَّحِیمٌ. اللہ تعالیٰ انسانوں پر رؤف ورحیم ہے۔

نبی ﷺ کے حق میں یہ امر نہایت شرف وعزت اور غایت تکریم وحرمت کا موجب ہے کہ حضور ﷺ کی صفت میں وہ دو نام بہ حالتِ ترکیبی تجویز فرمائے گئے جو اسی ترکیب کے ساتھ خود ذاتِ پاک سبحانی کے لئے مستعمل ہوئے ہیں۔

ہاں اللہ المحمود کی رافت ورحمت کو عوام الناس پر عام فرمایا گیا ہے اور رسولِ اکرم ﷺ کی

رافت ورحمت کو بالخصوص مؤمنین کے ساتھ خاص کیا گیا ہے۔فہم معانی میں اس عموم وخصوص کا امتیاز زیادہ رکھتے ہوئے مؤمنین کے لئے شکر کا مقام ہے کہ اُن کو رحمت وعطوفت کا مورد ومصداق بنایا گیا ہے۔مناسب مقام سے یہ بحث بھی ایک لطیف بحث ہے کہ کیا دیگر اسمائے مبارکہ میں بھی نبی ﷺ کے لئے ایسا شرف وامتیاز موجود ہے؟

حسّان بن ثابت انصاری ؓ کا شعر ہے:

وشقَّ لهُ مِنْ اِسْمِهٖ لیُجلَّهٗ...............فذُوالعرشِ محمُودٌ وّھٰذا مُحمَّدٌ

عزت افزائی کی غرض سے اللہ تعالیٰ نے حضور ﷺ کا نام اپنے نام سے نکالا ہے۔ اللہ تعالیٰ ''محمود'' ہے اور حضور ''محمد'' ہیں۔

اگر حسّان بن ثابت کی نیت کی اتباع کی جائے، تب تو آپ ﷺ کے اسی ۸۰ سے زیادہ ایسے اسماء گرامی نکلیں گے جنکا توافق وتطابق اسماء اللہ الحسنیٰ سے ہوجاتا ہے۔

بہرحال حضور کے وصف رافت ورحمت کے متعلق مختصراً کچھ لکھا جارہا ہے۔ صحیحین میں ابن مسعود ؓ سے مروی ہے کہ: رسولِ اکرم ﷺ ہم کو گاہ بہ گاہ وعظ سنایا کرتے اس اندیشہ سے کہ روزانہ وعظ کا سننا ہم پر گراں نہ گزرے۔

رسولِ اکرم ﷺ کا یہ اصول ازراہ شفقت ورافت تھا کہ سامعین جس قدر بھی سنیں نشاط طبع اور حضورِ قلب سے سنیں اور آئندہ کے لئے شوق تمام باقی رہے۔

عادتِ مبارکہ تھی کہ جب بہ حالت نماز کسی بچہ کے رونے کی آواز سُن پاتے تو نماز ہلکی فرمادیتے کہ ماں بچہ کو جلد سنبھال سکے۔عادت مبارکہ تھی کہ سوار ہوکر کسی کو پاپیادہ ہمرکاب چلنے کی اجازت نہ فرماتے تھے۔اگرچہ بہت سے فدائی اس خدمت کے تمنائی رہتے، یاتو اسے سوار کرالیتے تھے یا واپس لوٹا دیتے تھے۔

عادت مبارکہ تھی جب کوئی مسلمان مقروض مرجاتا تو اُس کا قرض بیت المال سے قبل از تدفین ادا فرمادیتے تھے، مگر خود کسی مردہ کا مال قبول نہ فرمایا کرتے تھے۔فرمایا کرتے تھے، کسی کی غیبت میرے سامنے مت کرو میں نہیں چاہتا کہ کسی کی طرف سے میری صاف

دلی میں فرق آئے۔ بارہا ایسا ہوا کہ ساری رات امت کے حق میں دعا کرتے ہوئے گزر جاتی، چھوٹے بچوں کو پیار کرتے، ان کو خود سلام کیا کرتے، ان کے سر پر دستِ شفقت رکھتے، گلی میں کھیلتے ہوئے بچوں کو اپنی سواری پر آگے پیچھے سوار کر لیتے، غلاموں کے ساتھ سفید زمین پر بیٹھ کر کھانا کھانے میں شامل ہو جاتے۔ ان سب امور کا ظہور از راہِ شفقت ورافت ہوا کرتا تھا اور اور اس بلند ترین رافت ورحمت کا ظہور حضور ﷺ کے خصائص میں سے تھا۔ (بحوالہ رحمۃ العلمین ج ۳)

اب مناسب ہے کہ آپ ﷺ کے دیگر ناموں کی بھی کچھ وضاحت ہو جائے لہٰذا آپ ﷺ کے ناموں میں سے کچھ کی وضاحت ذیل میں پیش کی جارہی ہے۔

(۱) سیدنا محمد ﷺ...... کا معنی بہت تعریف کیا گیا۔ تعریف میں مبالغہ ہے اور اس میں شک نہیں جتنی بھی تعریف رسولِ اکرم ﷺ کی گئی ہے وہ مخلوق میں سے کسی کی نہیں ہوئی، اللہ نے اپنے نام کے ساتھ کلمہ شہادت میں کلمہ توحید میں اذان اور اقامت میں اپنے نام مبارک کے بعد ان کا نام محمد رسول اللہ ﷺ مقرر فرمایا۔ محمد کے نام پر غور کرو کہ اس کے لغوی معنی کے تحت میں ایک پیشگوئی بھی شامل ہے اور عالم الغیب والشہادۃ کی جانب سے جملہ عوام واہل عالم پر یہ راز آشکار کیا گیا ہے کہ اس اسم کے مسمیٰ کی مدح وثنا دنیا میں سب سے بڑھ کر، سب سے زیادہ توالی وتواتر کے ساتھ کی جائے گی۔

وہ کون ہے، جس کا مقدس نام آج کروڑوں اشخاص کی زبان پر جاری اور قلوب میں ساری ہے وہ کون ہے، جس کے مقدّس نام کی نوبتِ شاہانہ مساجد کے بلند ترین میناروں سے سامعہ نواز ہے۔ وہ کون ہے، جس کی سیرتِ پاک انسانی زندگی کے ہر لمحہ وہر ساعت میں اور ہر درجہ اور ہر مقام پر رہنما ہے۔ وہ کون ہے، جو اپنے افعال میں محمود ہے اور اپنی تعلیم سے محود ہے۔ وہ کون ہے، جس کی رفعت فرش سے عرش تک ملی ہوئی ہے۔ وہ کون ہے، جس کی تعلیم کی وسعت بر وبحر پر چھائی ہوئی ہے۔ بیشک وہ محمد ہے، اسم بھی محمد ہے اور مسمیٰ بھی محمد ہے اور حمد کو اس کی ذات سے نسبت خاص ہے۔ اُسی کے مقام شفاعت کا نام "مقام

محمودؒ' ہے اور اُسی کی امت ''حمّادُون'' کے لقب سے روشناس ہے۔اس کی لائی ہوئی کتاب کا الحمدُ للہِ رَبِّ العلمینَ سے افتتاح ہوتا ہے۔

(۲) سیدنا احمد ﷺ...... یہ بھی حمد میں مبالغہ کا صیغہ ہے جن کی حمد کی گئی ہے ان میں سب سے برتر اور سب سے افضل ہیں۔ہاں اسی کا نام احمد ہے ۔یہ بھی اُسی سرچشمہ ''حمد'' سے نکلا ہے ۔دونوں نام اپنے منبع وماخذ کے اعتبار سے اتحادِ تام رکھتے ہیں اور اشتراک کلیہ کے ساتھ ساتھ انوار وبرکاتِ خاص سے مختص بھی ہیں ۔وہ ''احمد'' ہے اور اسی لئے کائنات کا ذرہ ذرہ اس کا ثنا گستر ومدح خواں ہے۔

وہ ''احمد'' ہے اور اسی لئے اس نے بارش کے قطرات سے اور ریگ کے ذرات سے بڑھ کر اپنے مالک ،اپنے خالق ،اپنے رازق ،اپنے ہادی ،اپنے معطی کی حمد وثنا پھیلائی ہے۔ہاں وہ ''محمد'' ہے اور کُل دنیا اس کی مداح ہے۔وہ ''احمد'' ہے اور کُل دنیا سے بڑھ کر اپنے رب کا حامد ہے۔ ہاں وہ پیارا ہے ،اُسی نے دشمن ودوست سب سے پیار کیا ہے۔وہ حبیب ہے اور اسی نے محبت کا تاج اکمال سے مزیّن فرمایا ہے۔وہ محبوب ہے ،مگر محبّین سے بے نیاز ہے۔وہ مطلوب ہے مگر طالبین سے کوئی احتیاج نہیں رکھتا۔وہ متبوع ہے اور اس کی تبعیّت دوسرے کو مطاع بنا دیتی ہے۔

(۳) سیدنا عفو ﷺ...... معنی ظاہر ہے قرآن میں اور تورات میں رسولِ اکرم ﷺ کا وصف عفو سے بیان کیا گیا ہے۔آپ ﷺ کی فطرت میں اذیت کی برداشت اور غیر کے ساتھ حسن سلوک تھا کبھی اپنے نفس کے لئے کسی سے انتقام نہیں لیا۔انسان کو کوئی تکلیف نہیں پہنچائی کسی مسلم کو لعنت سے یاد نہیں کیا افسوس آج کل مسلمان مسلمان کو بغیر ثبوت شرعی کے کفر میں دھکیلتے ہیں اور اپنی عاقبت کو برباد کرتے ہیں۔ جنگ احد میں دندان مبارک شہید ہو گئے لب مبارک زخمی ہو گیا ،خون چہرہ انور سے بہتا تھا اصحاب کرام رضی اللہ عنہم کو بہت ناگوار گزرا ،عرض کیا آپ ان کے حق میں بددعا کریں تو اس حالت میں یہ جواب فرمایا۔انی لم ابعث لعانا بل بعثت داعیا ورحمة.

وہ عفو ہے، عفو اللہ تعالیٰ کے اسمائے حسنیٰ میں سے ہے اور نبی ﷺ صفاتِ عالیہ میں سے بھی جملہ صفاتِ نبوی ﷺ کی صفاتِ الٰہی کے ظلال ہیں اور رسولِ اکرم ﷺ کے جملہ محاسن عطیاتِ ربانی ہی کے مظاہر ہیں۔ کوہِ تنعیم کے اسّی اعدائے دین کو جنہوں نے رسولِ اکرم ﷺ کو مسلمانوں کی جماعت کے ساتھ مصروف نماز دیکھ کر قاتلانہ حملہ کر دیا تھا، معاف کر دینے والا وہی ہے۔ زینب بنت الحارث بن سلام خیری کو جو مسموم گوشت کا ہدیہ لے کر آئی اقبالِ جرم کے بعد معاف کر دینے والا وہی ہے۔ سردارانِ قریش کو جنہوں نے ۱۳ سال تک اشاعتِ اسلام کو روکا اور اسلام میں داخل ہونے والوں کو مشقِ ستم اور ہدف تیر و نیزہ بنایا، مغلوب کر لئے جانے کے بعد معاف کر دینے والا وہی ہے۔ ابن سلول رئیس المنافقین اور اس کی جماعت اہل یثرب کو بار بار معاف کرنے والا اور ان کی پاجیانہ حرکات سے درگزر کرنے والا وہی ہے۔ جنگ حنین کے چھ ہزار قیدیوں کو ایک زبانی درخواست پر آزاد کرنے والا وہی ہے۔ حسّانؓ فرماتے ہیں:۔

عفوٌ عنِ الزَّلاتِ یَقْبلُ عُذرھُم...... فاِن اَحْسَنُوا فَاللّٰہُ بالْخیرِ اَجْوَدُ

دنیا کی تاریخ ایسے عفو و درگزر کے نظائر پیش کرنے سے قاصر ہے۔

(۴) سیدنا ہادی ﷺ...... ہدایت کے معنی و مفہوم دو ہیں۔ کسی کے دل میں ایمان ڈال دینا آیت ذیل میں اسی مفہوم کو بیان کیا گیا ہے۔ اِنَّکَ لَا تَھْدِی مَنْ اَحْبَبْتَ وَلٰکِنَّ اللّٰہَ یَھْدِی مَنْ یَّشَآء . (قصص) تو ہدایت نہیں دے سکتا جسے تُو پسند کرتا ہے لیکن اللہ ہدایت دیتا ہے جس کو بھی چاہے۔

کسی کو ایمان و یقین کی طرف بلانا اور اپنی دعوت کی حقانیت کو دلائل و براہین روحانی یا عقلی سے اور اپنے افعال حمیدہ و اقوال حکیم سے مستحکم کرنا بلا شائبہ غرض اور بلا آمیزش طمع خالصۃً خیر خواہی و نیک سگالی کے فرائض ادا کرنا۔ اس مفہوم کی تکمیل رسولِ اکرم ﷺ کی ذات پر ہوتی ہے اور آیت ذیل میں اس معنی کو بیان کیا گیا ہے۔ وَاِنَّکَ لَتَھْدِی اِلٰی صِراطٍ مُّسْتَقِیْمٍ۔ تو بالضرور سیدھی راہ کی ہدایت کرنے والا ہے۔

رسولِ اکرم ﷺ نے ہدایت اور دعوت الی الحق کے جملہ بہترین طریقوں کو جمع فرما دیا تھا۔ کشادہ رُوئی، نرم خوئی، خلقِ عظیم ایسی صفات تھیں کہ دُشمن بھی رسولِ اکرم ﷺ کو دیکھ کر اپنی دشمنی بھول جاتا تھا۔ شیریں کلامی، واضح بیانی، ایسی کہ جو لفظ زبان مبارک سے نکلتا، سامع کے قلب میں اُتر جاتا تھا۔

دلائل و براہین کے وار کرنے میں رسولِ اکرم ﷺ نے منطقیوں اور فلسفیوں کی ژولیدہ تقریروں اور مغلق الفاظ وغیرہ کے جملہ مسلک ترک کر دیئے تھے۔ رسولِ اکرم ﷺ کے دلائل انفسی اور آفاقی ہوتے تھے۔ انسان کے سامنے خود اسی کی فطرت کو پیش کر دینا یا انسان کے ماحول کو انسان کے لئے دلیلِ راہ بنا دینا رسولِ اکرم ﷺ کا مبارک شیوہ تھا۔

اللہ تعالیٰ نے رسولِ اکرم ﷺ پر اُن قوانینِ فطرت کو کھول دیا تھا۔ جن پر مخلوق کی آفرینش ہوئی ہے۔ لہٰذا رسولِ اکرم ﷺ کے دلائل بھی براہ راست سرشت انسانی اور خلقت بشری کو متوجہ و بیدار اور مخاطب کرنے والے ہوتے تھے۔

اور بے شک رسولِ اکرم ﷺ نوع انسانی کے لئے ایسا مکمل نمونہ تھے کہ حضور ﷺ کے افعال، آپ ﷺ کے اقوال کے مصداق ہوتے تھے اور آپ ﷺ کے اقوال آپ ﷺ کے افعال کا معیار تھے۔ اس ظاہر و باطن کے توافق اور افعال و اقوال کے تطابق نے رسولِ اکرم ﷺ کو نوعِ بشر کا سچا ہادی بنا دیا تھا۔ ضرار بن الخطاب رضی اللہ عنہ الفہری نے فتح مکہ کے دن رسولِ اکرم ﷺ کے سامنے ایک قصیدہ پڑھا تھا، جس کا ایک شعر یہ ہے:

یا نبیَّ الْھُدیٰ اِلیکَ لِجاجِیْ..............قُریشٌ ولدت حسین بحاء

نابغہ جعدی کا شعر ہے۔

اَتیتُ رسولَ اللہ اذَا جآء بِالھُدیٰ...............وَیتلُوا کتاباً کَا لمُجَرّۃِ نیّراً

(۵) سیدنا مطاع ﷺ...... آپ ﷺ کا ایک نام مطاع بھی ہے، اللہ تبارک وتعالیٰ ہی کی ذات سبحانی ہے جس کی اطاعت مقصود بالذات ہے اللہ تعالیٰ اپنے اطاعت کرنے والوں کی شناخت کے لئے یہ معیار مقرر کر دیتا ہے کہ انبیاء الٰہی کی اطاعت کرنے والے ہی

اللہ تعالیٰ کی اطاعت کرنے والے سمجھے جائیں گے۔اور اطاعت انبیاءؑ سے گریز کرنے والے ہی اطاعتِ ربانی سے گریز کرنے والے قرار دیئے جائیں گے۔اس رسول کو اللہ تعالیٰ نے بہ طورِ قانون محکم ظاہر فرمادیا ہے **وما اَرسلنا مِنْ رَّسولٍ اِلَّا لِیُطاعَ بِاِذْنِ اللہ۔**

اصولی حکم کے بعد ذات مبارک نبوی ﷺ کی نسبت خصوصیت سے فرمادیا **وَمَنْ یُّطِعِ الرسولَ فَقَدْ اَطاعَ اللہ** اس رسول کی جس نے اطاعت کی تو اُس نے بالضرور اللہ ہی کی اطاعت کی ہے۔بعدازاں فرمادیا: **اِنْ تُطیعوہُ تھتَدُوا**،اس کی اطاعت کروگے تو ہدایت یاب بن جاؤ گے۔

قرآن مجید میں **مُطاعٍ ثَمَّ اَمینٌ**۔حضرت جبرائیل علیہ السلام کی صفت میں فرمایا گیا ہے اور سورۂ تحریم میں **وجبریلُ وصالِحُ المؤمنینَ وَالْمَلائِکَۃُ بعدَ ذٰلکَ ظَھیر**،نازل کیا گیا۔مطلب یہ ہوا کہ وہ مطاع آسمانی اور امین وحی ربانی بھی رسولِ اکرم ﷺ کے مددگاروں میں اسی طرح داخل ہیں جیسے دیگر ملائکہ اور جملہ مومنین ہر دو آیات نے رسولِ اکرم ﷺ کا سب سے بڑھ کر مطاع ہونا واضح فرمادیا۔

لہٰذا اب کوئی نبی یا مُرسل،کوئی ملک یا حامل وحی،کوئی پیر و مرشد،کوئی امام،کوئی شہید،یعنی مخلوق الٰہی میں سے کوئی بھی ایسا باقی نہیں رہ جاتا جو سیدنا و مولانا محمد ﷺ کے سامنے مطاع کہلانے کی جرأت کرسکتا ہو،یا جس کی اطاعت محمد ﷺ کی اطاعت کو چھوڑ کر باعثِ ہدایت وقُربِ ربانی بن سکتی ہو حدیثِ پاک **ولو کانَ مُوسیٰ حیّاً لَما وَسِعَہُ اِلَّا اتِّباعِیْ** اسی راز کی کاشف ہے۔ہاں ہر ایک کلمہ خواں اسلام کا دین وایمان یہی ہے کہ قُربِ الٰہی اور رضوان سُبحانی اور مغفرت ونجات کا ذریعہ خالق اور مخلوق کے درمیان صرف ایک ہے اور وہ اِطاعتِ محمدی ﷺ ہے۔ہم اقرار کرتے ہیں کہ اگر آج کوئی شخص سیدنا موسیٰ علیہ السلام کی اطاعت کا مدعی بن کر رسولِ اکرم ﷺ کی اطاعت سے اظہار استغفار کرے تو وہ مغفرت ونجات سے دور ہے اور قُرب ورضوان کے منازل عالیہ سے مہجور۔نبی ﷺ ہی مطاع ہیں اور رسولِ اکرم ﷺ کی اطاعت،اللہ کی اطاعت ہے۔ائمہ دین اور اصحاب کرام کے مدارج

ومناسب اس لئے دیگر مخلوق سے برتر وعالی ہیں کہ یہ بزرگوار رسولِ اکرم ﷺ کی اطاعت میں مستحکم اور کامل ترین ہیں۔

محمد عربی کا بروئے ہر دو سرا ست کسے کہ خاکِ درش نیست خاک بر سر اوست

(۶) سیدنا شاہد ﷺ...... آپ ﷺ کا ایک نام شاہد ہے، چنانچہ اچھا شاہد اور سچا گواہ وہ ہے جس کی شہادت واقعاتِ صحیحہ کو کتمان سے ظاہر میں لے آئے، جس کی شہادت بے خبروں کو باخبر دار بے علموں کو باعلم اور غائبین کو مثلِ حاضر بنادے۔ رسولِ اکرم ﷺ شاہد ہیں۔ اور اَشْھَدُ اَنْ لَّا اِلٰہَ اِلَّا اللہ۔ کی شہادت جملہ عالم کے سامنے رسولِ اکرم ﷺ ہی نے ادا فرمائی ہے اور اپنی شہادت سے رب العٰلمین کے لئے استحقاق الوہیت ومعبودیت ثابت کیا ہے۔ عبادات واستعانت بغیر اللہ کے مسئلہ میں سینکڑوں مذاہب سرگرداں وحیران وپریشان تھے۔ رسولِ اکرم ﷺ ہی کی شہادت نے ان حقائق خفیہ کو آشکار کیا۔ رسولِ اکرم ﷺ ہی نے اَشْھَدُ اَنَّ مُحَمَّداً رَّسُولُ اللہِ کی شہادت ادا کی رسالت ونبوّت کے خصائص وحی ربانی کی حقیقت واعمال کا روح سے تعلق، جزا وسزا کا اعمال پر ترتب، شریعت کی ضرورت اور شرائع الٰہیہ ونوامیس حکمیہ کا استحکام۔ یہ سب رسولِ اکرم ﷺ ہی کی شہادت سے ہوا۔ اللہ اکبر! شاہد کیسی زبردست شہادت اور اعلیٰ صداقت کے ساتھ کھڑا ہوا ہے کہ جہانِ عالم میں شہادت کے لئے اکیلا آیا اور اپنی واپسی سے پیشتر ہزار در ہزار بندگانِ الٰہیہ کو اس شہادت پر قائم بلکہ آئندہ آنے والی نسلوں کے سامنے اُن کو بھی شاہد بنا کر گیا اور تَکُونُوا شُھَدآءَ عَلَی النَّاسِ کی سند عطا فرمایا گیا۔

(۷) سیدنا فاتح...... بمعنیٰ کھولنے والے۔ حدیث معراج میں ہے اللہ پاک نے فرمایا وجعلنک فاتحا وخاتما اور حدیث نبوی ﷺ میں ہے کہ وجعلنی فاتحا وخاتما تو آپ ﷺ فاتح ہیں ہر چیز کے لئے آپ ﷺ فاتح ہیں اور کھولنے والے ہیں امت پر رحمت کے دوازوں کو اور جنت کے دروازوں کو اور خشت اخیر ہیں قصر نبوت کے لئے۔

(۸) سیدنا مفتاح...... اس میں مبالغہ ہے یعنی آپ ﷺ سخت سے سخت امور کے

کھولنے والے ہیں۔

(۹)سیدنا مفتاح الرحمة...... رحمت کو کھولنے والا۔ دنیا میں اگر کوئی کسی پر رحم کرتا ہے تو آپ ﷺ کی متابعت کی وجہ سے ہے اور آخرت میں اگر کسی پر رحم کیا جائے گا تو آپ ﷺ کی شفاعت کی وجہ سے ہوگا تو آپ ﷺ مفتاح رحمت ہیں دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی۔

(۱۰)سیدنا عزیز...... بمعنیٰ غالب جلیل القدر۔ **لانظیر له** بڑی عزت والے ہیں ان کی کوئی نظیر نہیں۔

(۱۱)سیدنا مهین...... اس کے معنی رسول اللہ ﷺ کے حق میں یہ معنی شاہد اور امین کے آتے ہیں۔ رسول اللہ ﷺ اللہ جل شانہ کے احکام کے امین ہیں۔

(۱۲)سیدنا جبار...... شکستہ حال کو جوڑنے والا۔ اس نام سے زبور داؤد علیہ السلام میں مشہور تھے۔ ۴۴ویں باب میں ہے کہ **تقلد ایها الجبار سیفک** اپنی تلوار کو گلے میں ڈال دوائے جابر اور باہمت نبی (اور جہاد کرو کفار سے، اسلام کا بول بالا اور کفر کا منہ کالا کرنے کے لئے) یا یہ معنی کہ شکستہ دل اور پریشان حال بندوں کے دلوں پر جبیرہ یعنی پٹی لگاؤ۔ ان کے دکھ درد میں ان کو سہارا دو۔ یہ نام قرآن مجید کی آیتِ ذیل سے مستنبط ہے: **واخفض جناحک للمؤمنین** . طیور کو دیکھو، وہ اپنے انڈوں یا اپنے بچوں کی تربیت کیسی محبت، کیسے پیار، ہوشیاری اور کیسی نگہداشت سے اپنے شہپروں کے نیچے رکھ کر کرتے ہیں۔ اہل ایمان کے ساتھ نبی ﷺ کی محبت و پیار اور نگہداشت و حفاظت کا سلوک، اس مثال سے بھی بڑھ کر تھا۔ محترم قارئین! بطور نمونہ کے آپ ﷺ کے چند نام خصوصاً وہ نام جو اللہ کے نام سے ملتے ہیں مختصراً آپ کے سامنے پیش کر دیئے، امید ہے کہ اس قدر کلام سے ہماری ترتیب دی ہوئی اس خصوصیت کی وضاحت ہوگئی ہوگی انشاء اللہ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہم سب کو حضور ﷺ سے سچی محبت کرنے کی توفیق عطا فرمائے آمین یارب العٰلمین۔

یَا رَبِّ صَلِّ وَسَلِّمْ دَائِمًا اَبَدًا   عَلٰی حَبِیْبِکَ خَیْرِ الْخَلْقِ کُلِّهِمِ

خصوصیت نمبر ۷۵

رسولِ اکرم ﷺ کا لایا ہوا انقلاب عظیم خصوصیات کا حامل ہے

قابل احترام قارئین! رسولِ اکرم ﷺ کی امتیازی خصوصیات میں سے یہ پچہتر نمبر خصوصیت ہے، جسکا عنوان ہے رسولِ اکرم ﷺ کا لایا ہوا انقلاب عظیم خصوصیت کا حامل ہے الحمدللہ دیگر خصوصیات کی طرح اس خصوصیت کو ترتیب دینے کے لئے بھی اللہ تعالیٰ نے روضہ رسول ؐ کا قرب عطا فرمایا اور روضہ رسول ؐ کے سائے میں بیٹھ کر میں نے اس خصوصیت کو فائنل ترتیب دیا، اللہ تعالیٰ اس کام کو شرفِ قبولیت عطا فرمائے آمین یارب العالمین۔

بہر حال محترم قارئین! ہمارے نبی ﷺ کی یہ خصوصیت بھی عظیم خصوصیت ہے کہ ہمارے نبی ﷺ کا لایا ہوا انقلاب بڑی عظمت وخصوصیات کا حامل ہے، اگر چہ دیگر انبیاء اکرامؑ بھی جو انقلاب لائے وہ بھی خصوصیات رکھتے تھے لیکن ان کی خصوصیات محدود، اور پھر ان کا لایا ہوا انقلاب محدود زمانے تک کے لئے ہوتا تھا، جبکہ ہمارے نبی ﷺ کے لائے ہوئے انقلاب کی خصوصیات بھی بے شمار ہیں اور یہ انقلاب محدود زمانے کے لئے نہیں بلکہ قیامت تک کے لئے ہے، جیسا کہ آنے والے اوراق میں تفصیل سے آپ ﷺ کے لائے ہوئے انقلاب کی خصوصیات کو واضح کیا گیا ہے، انشاء اللہ اس کو پڑھکر آپ کے ایمان میں اضافہ ہوگا، دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہم سب کو اپنے نبی ﷺ کے لائے ہوئے انقلاب پر عمل کرنے اور اس انقلاب کی دعوت کو ساری دنیا میں عام کرنے کی توفیق عطا فرمائے، آمین۔

اب اس خصوصیت کی تفصیل کو ملاحظہ فرمائیے، اللہ تعالیٰ عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے، آمین یارب العالمین۔

پچترہویں خصوصیت کی وضاحت قرآن واحادیث کی روشنی میں

دنیا میں اب تک کئی انقلابات رونما ہو چکے ہیں ۔ایک انقلاب حضور نبی کریم ﷺ نے بھی برپا کیا تھا۔اس محمدی انقلاب کی چند اہم خصوصیات ذہن میں نقش کر لیجئے ۔ یہ وہ پکی باتیں ہیں جن کا کفر کی دنیا کے پاس کوئی جواب نہیں ہوگا۔جب آپ ان سے پوچھیں گے تو وہ اپنی بغلیں جھانکنی شروع کر دیں گے۔

سب سے پہلی خصوصیت تو یہ تھی اللہ کے محبوب ﷺ نے دنیا کے اندر اتنا انقلاب اتنے کم وسائل کے ساتھ پیدا کیا کہ پوری دنیا میں اتنے کم وسائل کے ساتھ اتنا بڑا انقلاب برپا نہیں کیا گیا۔یہ معمولی بات نہیں بلکہ یہ خدائی مدد کی دلیل ہے۔

انقلاب پیدا کرنے کے لئے وقت کی ضرورت ہوتی ہے۔محمدی انقلاب کی دوسری خصوصیت یہ ہے کہ یہ فقط دس سال کے عرصہ میں برپا ہو گیا۔جب آپ ﷺ مدینہ منورہ میں تشریف لے گئے اصل میں اس وقت کام کے کھل کر کرنے کی ابتداء ہوئی ۔فقط دس سال کے عرصہ میں قرآن بھی مکمل نازل ہو چکا تھا۔اور پھر اسلام کا پیغام لے کر بھی چل پڑے تھے۔اس قلیل عرصہ میں اللہ کے محبوب ﷺ نے اس دنیا کو علم واخلاق کا انقلاب برپا کر کے دکھایا اتنے کم وقت میں کوئی بھی اتنا بڑا انقلاب پیدا نہیں کر سکتا۔دس سال کے قلیل عرصہ میں قوموں کا رخ بدل دینا کوئی آسان بات نہیں ہے۔

محمدیؐ انقلاب کی تیسری خصوصیت یہ تھی کہ اس انقلاب کے دوران سب سے کم جانی نقصان ہوا۔تاریخ کی کتابوں میں لکھا ہوا ہے کہ نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کی مبارک زندگی میں جتنی بھی جنگیں لڑی گئیں ان میں مسلمان شہداء اور کفار کی کل تعداد 1062 افراد تھی ۔اس اعتبار سے آپ اس انقلاب کو ''غیر خونی انقلاب'' کہہ سکتے ہیں۔

محترم قارئین !ہمارا یہ اسلامی ملک ہے۔اس میں امن بھی ہے مگر یہاں پر بھی آپ دیکھیں تو مختلف شہروں میں جھگڑوں کے دوران ایک دو ماہ میں ایک ہزار سے زائد انسان قتل

ہو چکے ہونگے۔ لیکن ہمارے محبوب ﷺ نے پوری دنیا میں دس سال میں جو انقلاب پیدا کیا اس میں فقط 1062 انسان کام آئے۔

غور کیجئے کہ بغداد کے اندر ہلاکو خان نے بھی ایک انقلاب برپا کیا تھا۔ مگر ایک دن کے اندر بغداد میں دو لاکھ مسلمانوں کا خون بہایا گیا۔ یہ تو ایک دن کی بات ہے اور پورے انقلاب میں نہ معلوم کتنے لاکھ مسلمان کام آئے تھے۔ فرانس کے انقلاب میں 25 لاکھ انسانوں کو قتل کیا گیا۔ قیامِ پاکستان کے وقت بھی ایک کروڑ انسانوں کو جانیں دینا پڑیں۔ مگر میرے محبوب ﷺ نے اتنے کم جانی نقصان کے ساتھ دنیا کو ہدایت کا راستہ دکھا دیا۔ پوری دنیا میں اس انقلاب کی مثال نہیں ملتی۔ (بحوالہ خطبات فقیر)

آپ ﷺ کا لایا ہوا انقلاب اور اسکے نتائج و تعلیمات

رسولِ اکرم ﷺ جس عظیم الشان پیغام کو لے کر آئے تھے اور جس مہتم بالشان کام کو انجام دینے کے لئے بھیجے گئے تھے، نیک دل اور حقیقت شناس لوگ تو سننے اور دیکھنے کے ساتھ اس کے قبول کرنے پر آمادہ ہو گئے لیکن جن کے دل کے آئینے زنگ آلود تھے، پیغام کی سچائی، وحی کی تاثیر، پیغمبر کی پُر اثر دعوت، اعجاز معصومیت اور اخلاق کے پرتو سے صاف وشفاف ہوتے گئے اور عوائق، موانع، شبہات اور شکوک کی تو بر تو ظلمتیں اور تاریکیاں رفتہ رفتہ چھٹتی چلی گئیں اور اسلام کا نور روز بروز زیادہ صفائی اور چمک کے ساتھ عرب کے افق پر درخشاں اور تاباں ہوتا گیا، یہاں تک کہ ۲۳ برس کی مدت میں ایک متحدہ قومیت، ایک متحدہ سلطنت، ایک متحدہ اخلاقی نظام، ایک کامل قانون، ایک مکمل شریعت، ایک ابدی مذہب اور عملی جماعت، خدا پرستی، اخلاق ایثار، تدین، تقویٰ ایمانداری، اخلاق اور سچائی کا ایک مجسم عہد یعنی ایک نئی زمین اور ایک نیا آسمان پیدا ہو گیا، اور گویا یہی حقیقت تھی، جس کی طرف آپ نے اپنی امت کے سب سے بڑے مجمع (حجۃ الوداع) میں اپنی وفات سے تقریباً دو ماہ پیشتر یہ ارشاد فرمایا، جس کا مفہوم یہ ہے کہ: ہاں اس زمانہ کا دور اپنی اسی حالت پر آ گیا جس

حالت پر اس دن تھا، جس دن خدا نے آسمان اور زمین کو پیدا کیا۔

اور یہی حقیقت تھی جس کی نسبت رسولِ اکرم ﷺ نے اپنی وفات سے کچھ دنوں پیشتر ایک نہایت، پُر درد وداعی تقریر کے آخر میں یہ الفاظ فرمائے، قد ترکتم علی البیضاء لیلھا کنھارھا، میں تم کو ایک روشن راستہ پر چھوڑ جاتا ہوں جس کی روشنی کا یہ حال ہے کہ اس کی رات بھی دن کے مانند ہے، اور آخری حجۃ الوداع کے مجمع عام میں تکمیل کی بشارت آئی کہ الیوم اکملتُ لکُم دینکُم واتممتُ علیکُم نعمَتِی (مائدہ) آج میں نے تمہارا دین کامل کر دیا اور اپنی نعمت تم پر ختم کر دی۔

پروفیسر مارگولیتھ جن کی تائیدی شہادت بہت کم مل سکتی ہے، لکھتے ہیں:۔ "محمد ﷺ کی وفات کے وقت ان کا سیاسی کام غیر مکمل نہیں رہا، آپ ایک سلطنت کی جس کا ایک سیاسی و مذہبی دارالسلطنت مقرر کیا گیا تھا، بنیاد ڈال چکے تھے، رسولِ اکرم ﷺ نے عرب کے منتشر قبائل کو ایک قوم بنا دیا تھا، رسولِ اکرم ﷺ نے عرب کو ایک مشترک مذہب عطا کیا، اور ان میں ایک ایسا رشتہ قائم کیا جو خاندانی رشتوں سے زیادہ مستحکم اور مستقل تھا، (بحوالہ لائف آف محمدؐ)

ایک دور (یورپ) کے بیگانہ مستشرق کی بہ نسبت جس علم، عرب اور اسلام کے متعلق صرف چند کتابوں سے مستعار ہے، خود ایک عرب عیسائی اہل قلم کو فیصلہ کا زیادہ حق حاصل ہے، بیروت کے مسیحی اخبار الوطن نے ۱۹۱۱ء میں لاکھوں عرب عیسائیوں کے سامنے یہ سوال پیش کیا تھا کہ وہ دنیا کا سب سے بڑا انسان کون ہے اس کے جواب میں ایک عیسائی عالم (داور مجاعص) نے لکھا ہے۔

دنیا کا سب سے بڑا انسان وہ ہے جس نے دس برس کے مختصر زمانہ میں ایک نئے مذہب، ایک نئے فلسفے، ایک نئی شریعت، اور ایک نئے تمدن کی بنیاد رکھی، جنگ کا قانون بدل دیا اور ایک نئی قوم پیدا اور ایک نئی طویل العمر سلطنت قائم کر دی، لیکن ان تمام کارناموں کے باوجود اُمی اور ناخواندہ تھا، وہ کون؟ محمد بن عبد اللہ قریشی، عرب اور اسلام کا پیغمبرؐ، اس پیغمبر نے اپنی عظیم الشان تحریک کی ہر ضرورت کو خود ہی پورا کر دیا، اور اپنی اور اپنے پیروؤں

کے لئے اور اس سلطنت کے لئے جس کو اس نے قائم کیا، ترقی اور دوام کے اسباب بھی خود مہیا کردیئے اس طرح کہ قرآن اور احادیث کے اندر وہ تمام ہدایات موجود ہیں، جن کی ضرورت ایک مسلمان کو اس کے دینی یا دنیاوی معاملات میں پیش آسکتی ہیں، حج کا ایک سالانہ اجتماع فرض قرار دیا، تاکہ اقوام اسلام میں اہل استطاعت ایک مرکز پر جمع ہوکر اپنے دینی وقومی معاملات میں باہم مشورے کرسکیں، اپنی امت پر زکوٰۃ فرض کرکے قوم کے غریب طبقہ کی حاجت پوری کی قرآن کی زبان کو دنیا کی دائمی اور عالمگیر زبان بنادیا تاکہ وہ مسلمان اقوام کے باہمی تعارف کا ذریعہ بن جائے، قوم کے ہر فرد کو ترقی کا موقع اس طرح عنایت کیا کہ یہ کہہ دیا کہ ایک مسلمان کو کسی دوسرے مسلمان پر صرف تقویٰ کی بناء پر بزرگی حاصل ہے، اس بناء پر اسلام ایک حقیقی جمہوریت بن گیا، جس کا رئیس قوم کی پسند سے منتخب ہوتا ہے، مسلمانوں نے ایک مدت تک اس اصول پر عمل کیا، یہ کہہ کر کہ عرب کو عجم پر اور عجم کو عرب پر کوئی فوقیت نہیں، اسلام میں داخل ہونا ہر شخص کے لئے آسان کردیا، نومسلموں کے لئے اسلامی ملکوں میں عیش وآرام اور امن واطمینان سے سکونت کی ذمہ داری یہ کہہ کر اپنے اوپر لے لی، کہ تمام مخلوق خدا کی اولاد ہے، تو خدا کا سب سے زیادہ محبوب وہ ہے جو اس کی اولاد کو سب سے زیادہ فائدہ پہنچائے، خاندانی اور ازدواجی اصطلاحات بھی اس کی نظر سے پوشیدہ نہ رہیں اس نے نکاح ووراثت کے احکام مقرر کئے، عورت کا مرتبہ بلند کیا، نزاعات اور مقدمات کے فیصلے کے قوانین بنائے، بیت المال کا نظام قائم کرکے قومی دولت کو بیکار نہ ہونے دیا، علم کی اشاعت اور تعلیم اس کی کوششوں کا بڑا حصہ رہی، اس نے حکمت کو ایک مومن کا گمشدہ مال قرار دیا، اسی سبب سے مسلمانوں نے اپنی ترقی کے زمانہ میں ہر دروازہ سے علم حاصل کیا، کیا ان کارناموں کا انسان دنیا کی سب سے بڑی ہستی قرار نہ پائے گا۔

انگلستان کے مشہور انشاپرداز کارلائل نے اپنے ہیروز اینڈ ہیرو دورشپ" میں لاکھوں پیغمبروں اور مذہب کے بانیوں میں صرف محمد (ﷺ) ہی کے وجود گرامی کو اس قابل سمجھا کہ وہ آپ کو نبوت کا ہیرو قرار دے، انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا کا مضمون نگار "محمد" آپ کی نسبت کہتا

ہے:۔قرآن سے اس شخص کے روحانی ارتقاء کا پتہ چلتا ہے، جو تمام نبیوں اور مذہبی لوگوں میں سب سے زیادہ کامیاب رہا۔ الغرض دوست و دشمن سب کو اس کا اعتراف ہے کہ انبیاء میں یہی برگزیدہ ہستی ہے جس نے کم سے کم مدت میں اپنی بعثت اور رسالت کے زیادہ سے زیادہ فرائض ادا کئے، اور اصلاحاتِ انسانی کا کوئی گوشہ ایسا نہ چھوڑا، جس کی تکمیل اس کی تعلیم اور عمل سے نہ ہوگئی ہو، اور یہ اس لئے کہ تمام انبیاء میں خاتمِ نبوت، مکمل دین، اور آخری معلم کی حیثیت آپ ہی کو عطا ہوئی تھی، اگر انسان کی عملی و اخلاقی و دینی ضرورتوں کا کوئی گوشہ آپ کے فیض سے محروم رہ کر تکمیل کا محتاج ہوتا تو آپ کے بعد بھی کسی آنے والے کی حاجت باقی رہ جاتی، حالانکہ آپ نے فرمادیا کہ ''میرے بعد کوئی نبی نہیں میں نبوت کی عمارت کی آخری اینٹ ہوں'' (ﷺ)

آپ ﷺ کی تعلیمات کی یہی ہمہ گیری ہے جس پر کوتاہ بینوں کو آج نہیں بلکہ خود صحابہؓ کے عہد میں بھی تعجب ہوتا تھا، بعض مشرکوں نے حضرت سلمان فارسیؓ سے مذاقاً کہا کہ تمہارے پیغمبر تم کو ہر چیز کی تعلیم دیتے ہیں، یہاں تک کہ اس کی بھی کہ تم کو قضائے حاجت کیونکر کرنی چاہئے، حضرت سلمانؓ نے کہا ہاں یہ سچ ہے کہ آپ نے ہم کو یہ حکم دیا ہے کہ ہم ایسی حالت میں قبلہ رخ نہ بیٹھیں نہ اپنے داہنے ہاتھ سے طہارت کریں، اور نہ تین ڈھیلوں سے کم استعمال کریں، جن میں کوئی ہڈی اور گوبر نہ ہو، نبوتِ محمدی کی تعلیمات کی یہ ہمہ گیری ہی اس کی تکمیل کی دلیل ہے، اور یہ معلوم ہوتا ہے کہ کہ وہ پست سے پست اور غیر متمدن اقوام سے لے کر بلند سے بلند اور متمدن سے متمدن قوموں تک کے لئے یکساں تعلیمات اور ہدایات رکھتی ہے، عرب کے بدویوں اور قریش کے رئیسوں دونوں کے لئے رسولِ اکرم ﷺ کی بعثت تھی، اس لئے آپ کی تعلیمات میں پست کو بلند اور بلند کو بلند تر بنانے کی برابر کی ہدایات ہیں، آج یہی چیز ہے کہ افریقہ کے وحشیوں میں اسلام اپنی تعلیمات کے ساتھ تنہا جاتا ہے، اور ان کو متمدن اور مہذب بنانے کے لئے مذہب سے باہر کسی تعلیم کی اس کو ضرورت پیش نہیں آتی ہے، لیکن عیسوی مذہب کو چند اخلاقیات کو چھوڑ کر جن کا ماخذ انجیل

ہے ،عقائد پادریوں کی کونسلوں سے ،دعائیں اور عبادات کلیساؤں کے حکمرانوں سے اور تہذیب وتمدن کی تعلیمات یورپ کے بے دینوں اور ملحدوں سے حاصل کرنی پڑتی ہیں لیکن اسلام میں محمد رسول اللہ ﷺ کے علاوہ کچھ نہیں ،عقائد ہوں کہ عبادات اور دعائیں ، اخلاق ہوں کی آدابِ تمدن ،خانگی معاملات ہوں یا لین دین کے کاروبار ،انسانوں کے ساتھ معاملہ ہو، یا خدا کے ساتھ سب کا ماخذ محمد رسول اللہ ﷺ کی ہمہ گیر تعلیمات ہیں۔

رسولِ اکرم ﷺ کی ان ہمہ گیر تعلیمات کی کتاب جو انسانی زندگی کے ہر شعبہ پر حاوی ہے، چار ابواب پر منقسم ہے اور ان ہی کے مجموعہ کا نام اسلام ہے۔

آپ نے بتایا ہے کہ ہر انسان کا ایک تعلق تو اپنے خالق کے ساتھ ہے، اور دوسرا اپنے خالق کی دوسری مخلوقات کے ساتھ اسی مفہوم کو دوسری عبارت میں یوں کہو کہ اس کا ایک تعلق اپنے آقا اور مالک کے ساتھ ہے اور دوسرا اپنے آقا اور مالک کے غلاموں کے ساتھ یا یوں کہو کہ اس کا ایک رخ تو آسمان کی طرف ہے اور دوسرا زمین کی سمت ،اس کو ایک لگاؤ تو عالمِ غیب سے ہے اور دوسرا عالمِ شہود سے ، پہلے کے ساتھ اس کا تعلق ایک مہربان آقا اور فرمانبردار غلام کا ہے ،اور دوسروں کے ساتھ اس کا تعلق برادری اور بھائی چارے کا ہے ،خالق اور مخلوق یا خدا اور بندہ کے درمیان جو علاقہ اور رابطہ ہے ،اس کا تعلق اگر صرف ہمارے ذہنی قویٰ اور قلبی حالات سے ہے ،تو اس کا نام عقیدہ ہے، اور اگر ان قلبی حالات کے ساتھ ہمارے جسم وجان اور مال وجائداد سے بھی ہے ،تو اس کا نام عبادت ہے ،باہم انسانوں اور انسانوں میں ،یا انسانوں اور دوسری مخلوقات میں جو علاقہ ورابطہ ہے ،اس کی حیثیت سے جو احکام ہم پر عائد ہیں، اگر ان کی حیثیت محض قانون کی ہے تو اس کا نام معاملہ ہے ،اور ان کی حیثیت ،قانون کی نہیں ، بلکہ روحانی نصیحتوں اور برادرانہ ہدایتوں کی ہے ،تو اس کا نام اخلاق ہے۔

قرآن پاک کی اصطلاح میں پہلے تعلقات کی مضبوطی اور استحکام کا نام ایمان ہے، اور دوسرے تیسرے اور چوتھے کی بجا آوری کا نام عمل صالح ہے، اور ان ہی دونوں کے مجموعہ

پر کامل نجات کا انحصار ہے، عمل صالح کی تین قسمیں ہیں، خدا کے سامنے اپنی عبودیت کا اظہار اور اس کے احکام کی تعمیل، بندوں کے ساتھ کاروبار اور معاملہ میں قانونِ الٰہی کی پابندی ،اور ان کے ساتھ محبت ،الفت ،اور نیکی اور بھلائی کا برتاؤ،اور اگر اس لحاظ سے کہ ان میں سے ہر ایک عمل کو جس میں خدائی کی خوشنودی اور رضامندی مقصود ہو، اسلام عبادت کہتا ہے لیکن اصطلاح میں پہلے کا نام عبادات،اور دوسرے کا نام معاملات اور تیسرے کا نام اخلاق ہے ،الغرض محمد رسول اللہ ﷺ جو عالمگیر شریعت اور دائمی ہدایت لے کر آئے ،وہ ان ہی چاروں عنوانوں کا مجموعہ ہے،یعنی عقائد،عبادات،معاملات اور اخلاق،ان ہی کی اصلاح تعلیم اور تکمیل کے لئے رسولِ اکرم ﷺ کی بعثت ہوئی ،اور یہی آپ کے پیغمبرانہ فرائض کے اصلی کارنامے ہیں۔ (بحوالہ جستہ جستہ سیرت النبی ج۴)

یَا رَبِّ صَلِّ وَسَلِّمْ دَائِمًا اَبَدًا عَلٰی حَبِیْبِکَ خَیْرِ الْخَلْقِ کُلِّهِم

مآخذ و مراجع

کی تفصیلی فہرست جلد نمبر ۴ کے آخر میں ملاحظہ فرمائیں

جزاک اللہ